مدنی معاشرہ

(عہدِ رسالت میں)

تالیف: اکرم ضیاء العمری

ترجمہ: عذرا نسیم فاروقی

ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد

مدنی معاشرہ

عہد رسالت میں

تالیف: اکرم ضیاء العمری

ترجمہ: عذرا نسیم فاروقی

ادارہ تحقیقات اسلامی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

کتاب : مدنی معاشرہ: عہدِ رسالت میں

مؤلف : اکرم ضیاء العمری

مترجم : عذرا نسیم فاروقی

ناشر : ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد

اشاعت اوّل: جولائی ۲۰۰۵ء

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، ادارہ تحقیقات اسلامی

کوائف فہرست سازی دورانِ طباعت

العمری، اکرم ضیاء

مدنی معاشرہ: عہدِ رسالت میں/ اکرم ضیاء العمری؛ ترجمہ، عذرا نسیم فاروقی

۱- اسلام - تاریخ - دورِ نبوت ۲- عرب - تاریخ ۳- عرب - معاشرتی حالت

۴- مدنی معاشرہ (ا) فاروقی، عذرا نسیم، مترجم (ب) عنوان

۲۲ dc ۲۹۷٫۰۹۰۲

ISBN-969-408-(256-0)

مطبع: مطبع ادارہ تحقیقاتِ اسلامی - اسلام آباد

فہرست

حصہ اوّل

(معاشرے کی تنظیم اور خصوصیات)

حصہ دوم

(مشرکین کے خلاف جہاد)

پیش لفظ

آقائے دو جہاں رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے خداوندِ کریم کے تخاطب — ورفعنا لک ذکرک — کے متنوع مظاہر میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ آپؐ کی ذاتِ ستودہ صفات اور تعلیمات پر آئے روز نئی کتابیں اور مقالات لکھے جا رہے ہیں، اور دنیا کے گوشے گوشے میں بسنے والے انسان اپنی ضرورت اور ذوق کے مطابق ان کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اِس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ نے آقائے دو جہاںؐ کی زندگی اتنی تفصیل کے ساتھ اپنے دامن میں محفوظ رکھی ہے کہ آپؐ کی سیرت لکھتے ہوئے اہلِ قلم کو کسی خلا کا احساس نہیں ہوتا، تاہم مسلمانوں کی علمی روایت میں ابتدائی دور ہی سے محدثین کرام اور سیرت نگاروں کے درمیان طرزِ تحقیق میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ بعض اوقات محدثینِ کرام جن روایات کو اپنے کڑے معیار کے مطابق مسترد کر دیتے ہیں، سیرت نگار اُن سے استفادہ کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محدثین کرام کی مرتبہ کتب احادیث ہی سے سیرت کا مطالعہ کیا جائے؟ اگر یہ زاویہ نظر اختیار کیا جائے تو بعض اوقات تاریخی نوعیت کی معلومات دستیاب نہیں ہوتیں، اور اگر صرف تاریخ و سیرت کی ابتدائی کتابیں ہی پیش نظر رکھی جائیں تو آقائے دو جہاںؐ کا برپا کردہ معاشرہ اپنی ساری رعنائیوں اور تابانیوں کے ساتھ پڑھنے والے کے سامنے نہیں آتا۔

یہ سوال پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری نے سیرت نگاری کا ایک منہج وضع کرنے کی کوشش کی ہے جو محدثین کرام کے اصولِ تحقیق کے مطابق ہے، اور جدید مغربی مورخین کے اختیار کردہ اصولِ تحقیق پر بھی پورا اترتا ہے۔ انہوں نے تاریخ و سیرت کی روایات کو مکمل طور پر

مسترد بھی نہیں کیا، بلکہ سرمایۂ حدیث کے ساتھ انہیں مناسب انداز میں اہمیت دی ہے۔ ڈاکٹر عمری نے اپنے منہجِ تحقیق کو زیرِ نظر کتاب کے پہلے حصے میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، اور ڈاکٹر خالد یحییٰ بلینکن شپ نے اپنے تعارفی کلمات میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے مسلمان اہلِ علم کو یہ چیلنج درپیش ہے کہ تاریخ اسلام کو محدثین کرام کے اختیار کردہ اصولِ تحقیق کے مطابق لکھا جائے۔ ماضی میں تاریخ نگاری کو مسلم علمی روایت میں وہ مقام اور اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جس کی وہ واقعی مستحق تھی۔ اس عدمِ توجہی کا نتیجہ ہے کہ آج تاریخِ اسلام کا تصور دھندلا گیا ہے اور اسلام کے بنیادی امور کے بارے میں ایسے خیالات کو قبولیت حاصل ہو گئی ہے جو مسلمانوں کی وحدت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری جو معاصر مسلم مورخین میں بلند مقام رکھتے ہیں، ۱۹۴۲ء میں موصل (عراق) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں جامعہ بغداد سے تاریخ اسلام میں ایم۔ اے کیا۔ بعد ازاں ۱۹۷۴ء میں جامعہ عین الشمس۔ قاہرہ سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ جامعہ بغداد اور جامعہ اسلامیہ — مدینہ منورہ میں تاریخ اسلام کے استاد رہے ہیں۔ اُنہوں نے تدریس کے ساتھ تاریخِ اسلام، اور بالخصوص سیرۃ النبیؐ پر بعض اہم متون کی تصحیح و تحشیہ کا فریضہ انجام دیا ہے، اور متعدد کتابیں تالیف و تصنیف کی ہیں۔ اُن کی مرتبہ و مصححہ کتابوں میں المعرفة والتاريخ (یعقوب بن سفیان الفسوی)، ازواج النبی (محمد بن زبالہ) اور مسند خليفه بن خياط (ابن خیاط العصفوری البصری) شامل ہیں۔ اُن کی ذاتی تالیفات میں بحوث في السنة المشرقه، الرسالة والرسول، قيام المجتمع الاسلامي من منظور الحضاري، التراث والمعاصرة اور المجتمع المدني في عهد النبوة شامل ہیں۔

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی آخر الذکر کتاب کا انگریزی ترجمہ "ادارہ فکر اسلامی۔ واشنگٹن ڈی۔ سی" نے شائع کیا تھا جسے مرحومہ عذرا نسیم فاروقی (نومبر ۱۹۵۶۔ ۱۴ اگست ۲۰۰۴ء) نے مدنی معاشرہ (عہد رسالت میں) کے نام سے اُردو میں منتقل کیا، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور

نہ تھا کہ مرحومہ اپنی کاوش کو مطبوعہ شکل میں دیکھ سکتیں، تاہم ہمیں یقین ہے کہ اُن کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے، اور آج اِس ترجمے کی اشاعت پر اُن کی روح شاد ہو گی۔

مرحومہ عذرا نسیم فاروقی برصغیر کے ایک بلند نسبتوں کے حامل خانوادے کی چشم و چراغ تھیں، اور اپنے خانوادے کی معروف تقویٰ شعاری، للّٰہیت اور علم ونظر کی خوبیوں سے متصف تھیں۔ مرحومہ نے اپنی زندگی میں دینِ اسلام کے پیغام کی ترسیل واشاعت میں زبان وقلم سے بھرپور کام لیا۔ خواتین کے دینی ودعوتی اجتماعات کے انعقاد وانصرام، اور ان میں درس وتقریر کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترجمہ و تالیف کا قابل قدر کام کیا۔ اُن کی دو مختصر تالیفات Purification of Soul اور The Qur'an Speaks to Us دعوۃ اکیڈمی۔اسلام آباد نے شائع کی ہیں۔ الادب المفرد (تالیف امام محمد بن اسمٰعیل بخاری) کا انگریزی ترجمہ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تالیف The Muslim Conduct of State کا اردو ترجمہ، اور تفسیر مواهب الرحمن کے بعض حصوں کی تسہیل بھی اُن کی کاوشوں میں شامل ہے۔ آخر الذکر تینوں کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔

مرحومہ عذرا نسیم فاروقی نے زیر نظر ترجمہ ادارہ فکر اسلامی (اسلام آباد شاخ) کی درخواست پر کیا تھا۔ ہم "ادارہ فکر اسلامی" کے ذمہ داروں کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کی اشاعت کے لیے ادارہ تحقیقات اسلامی۔اسلام آباد کو پسند کیا، نیز مرحومہ کے لیے دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے (آمین)۔

مرحومہ کی رحلت کے بعد اس مسودے کی نوک پلک درست کرنے میں ہمیں جن اصحاب کا تعاون حاصل رہا، ان میں جناب خورشید احمد ندیم ہمارے شکریے کے بالخصوص مستحق ہیں جنہوں نے وقت نکال کر ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

شعبۂ تالیف وترجمہ

ادارہ تحقیقات اسلامی۔اسلام آباد

تعارف

عصر حاضر کے فاضل مصنف اکرم ضیاء العمری کی کتاب **مدنی معاشرہ(عہد رسالت میں)** صدر اسلام کے مطالعے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس میں مغربی دنیا کے مستشرقین اور عالم اسلام میں ان کے بعض ہم نوا مصنفین کے اختیار کردہ بعض بنیادی تصورات کا رد بھی کیا گیا ہے۔

جیسا کہ پروفیسر عمری کی کتاب سے واضح ہو جاتا ہے، مغرب کے تاریخ نگار اسلامی تاریخ، بالخصوص اس کے دورِ اوّلیں کا مطالعہ کرتے وقت صحیح نہج اختیار کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

اگرچہ عام طور پر اہل مغرب کی تاریخ نگاری کی روایت معروضیت کے اعلیٰ ترین معیاروں پر زور دیتی ہے اور حقائق کی تہہ تک پہنچنے کو اپنی منزل قرار دیتی ہے، تاہم صدرِ اسلام کے بارے میں مغرب کے مؤرخین کا رویہ قدیم مذہبی روایات، بالخصوص ''یہودی - عیسائی تہذیبی روایت'' کے بارے میں ان کے غیر یقینی نتائجِ فکر سے متاثر دکھائی دیتا ہے، جسے مسلمانوں اور یورپ کے طویل مخاصمانہ تعلق نے دو چند کر دیا ہے اور اس پر مستزاد بعض اہل قلم کے شخصی تعصبات ہیں۔ اس بات نے اسلام کے بارے میں مغربی مطالعے کو غیر مغربی تاریخ کے دوسرے مطالعات کی نسبت کم معیاری بنا دیا ہے۔ اسلام کے حوالے سے ان خصوصی مشکلات کے علاوہ ان کا ایک اور فطری رجحان یہ بھی رہا ہے کہ وہ مسلسل کوئی نئی چیز تخلیق کرنے کے درپے رہتے ہیں، ان کے نزدیک کوئی نیا مطالعہ قدیم روایت سے جس قدر مختلف ہو، اتنا ہی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ مطالعۂ اسلام کے میدان میں مغربی اہل علم کے اس رجحان نے بھی بہت پراگندگی پھیلائی ہے، کیوں کہ اس طرح انہیں قیاس آرائیوں کا ایک میدان ہاتھ آ گیا، مگر طبیعت کی یہ جولانیاں اس بات کی مستحق نہیں کہ انہیں کسی علمی کاوش کا نام دیا جائے۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مغربی مصنفین نے عہدِ رسالت کے مدنی دور کے بارے میں کوئی بھی مفید کام نہیں کیا، مگر ان کا نمایاں کام بھی عام طور پر دو قسم کے رجحانات پر مشتمل ہے

جو پہلے سے طے شدہ ہیں۔ ان کی یہ کاوشیں نہ صرف مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صریحاً متعارض ہیں، بلکہ علمی معیاروں پر بھی ناقابل قبول ہیں۔ ان میں سے ایک تو ان کا یہ رجحان ہے کہ وہ تاریخی شخصیات کے ساتھ مادہ پرستانہ محرکات کو منسوب کرتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص نظریاتی نقطۂ نظر کا اظہار ہے نہ کہ کسی تاریخی حقیقت کا۔ اس طرح کے رجحانات میں یہ امکان قطعی طور پر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے کہ دوسرے خطوں اور زمانوں کے لوگ مغرب کے مخصوص رویّے سے مختلف رجحانات بھی رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ قدیم اسلامی فتوحات کو غنیمت کے حصول اور مال کے لالچ سے مربوط کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں، جیسا کہ قرآن میں بھی اشارہ ملتا ہے کہ بعض اوقات مالِ غنیمت کی خواہش بھی کچھ ذہنوں میں موجود تھی، لیکن حصولِ غنیمت کو مسلمانوں کا اوّلیں اور بنیادی مقصد قرار دینا دراصل اسلام کے علانیہ مقصد اور اس کی اہمیت سے یکسر انکار ہے، جو تمام زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکیت قائم کرنا ہے۔(۱) مثال کے طور پر اموی خلفاء کا پرجوش مجاہدین پر مشتمل افواج کے ذریعے زابلستان جیسے انتہائی غریب اور حصولِ غنیمت کے امکانات سے بالکل خالی کوہستانی مقامات پر بار بار فوجی کارروائی کرنا ابتدائی مسلمانوں کے اخلاص کا ثبوت ہے جو مادی امکانات کے نہ ہونے کے باوجود اسلام کی راہ میں لڑتے تھے۔(۲)

اکثر مغربی اہل علم اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے درمیان محرکات کے باب میں قیاس آرائیوں سے زیادہ اہم ایک اور اختلاف ہے جس کا تعلق تاریخی معلومات کے مآخذ سے ہے۔ اصل اور بنیادی نزاع تو خود حدیث کی حجیت ہی کے بارے میں ہے اور دوسرا نزاع ایک تاریخی مأخذ کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کے متعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مدنی دور کے متعلق یہ نزاع اس لیے بہت دوررس اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ زیادہ تر احادیث اس دور سے بحث کرتی ہیں۔

مغربی اہل علم کا رجحان بالعموم حدیث کو مسترد کرنے کا ہے، کیوں کہ ان لوگوں کے خیال میں یہ ایک بعد کی ایجاد ہے۔ اس خیال کی بنیاد ان کی نظر میں یہ ہے کہ طویل عرصے تک احادیث کو زبانی طور پر روایت کیا گیا(۳) اور بعد میں انہیں تحریری شکل میں مدون کیا گیا۔ اس طرح مغربی اہل علم نقد و تحقیق کی ان ساری کوششوں کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں جو ان مسلمان علماء نے انجام دی ہیں،

جنہوں نے قرون اولیٰ میں مختلف احادیث کی صحت کو جانچنے کے معیار قائم کر دیے تھے۔ یہ بات تو درست ہے کہ ان علمائے اسلام کو اپنی تحقیقات میں جدید تکنیکی سہولتیں حاصل نہیں تھیں، لیکن اس کے باوجود ان حضرات کی تحقیقات کے نتائج کو یکسر مسترد کر دینا محض ایک احمقانہ بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے احادیث کو پرکھنے کے ایسے کڑے معیار قائم کیے تھے جن کے نتیجے میں بہت سی روایات کو چھان پھٹک کر مقابلتاً کم تعداد میں ایسی احادیث جمع کی گئی تھیں جن کی صحت اور استناد کا درجہ بہت بلند تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان علماء نے احادیث کو پرکھنے کا جو طریقۂ کار اختیار کیا، وہ تاریخی تنقید کے جدید مغربی طریقۂ کار کے لیے تقدم کا درجہ رکھتا ہے۔ دونوں طریقہ ہائے کار کا مقصد ایک ہی تھا، یعنی حقیقت تک رسائی۔ یہ بات بالکل بدیہی اور سمجھ میں آنے والی تھی کہ مسلمان علماء سب سے پہلے یہ کام کریں کہ حدیث کی روایات کو قبول کرنے کے لیے ان کو قابل اعتبار مآخذ تک پہنچانے کے لیے اپنی صلاحیتیں بروے کار لائیں۔ آج کی مغربی تاریخ نگاری کیا کام کرتی ہے؟ یہی نا کہ اقوال کی صحت کو پرکھنے کے لیے بعینہٖ وہی طریقہ اختیار کرتی ہے جو مسلمان محدثین نے ایجاد کیا تھا۔ اگر مسلمان اہل علم سے کچھ فروگزاشتیں بھی ہوئی ہوں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کے طریقۂ کار ہی کو غلط یا قابلِ استہزاء سمجھ لیا جائے۔ مسلمان اہل علم کے وضع کردہ طریقۂ کار کو، جب بھی بعض مخصوص واقعات کی چھان بین کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، تو یہ طریقۂ کار اپنا لوہا منوا کر رہتا ہے، مثال کے طور پر غلط روایات کے حوالے سے شہرت کے حامل راوی سیف بن عمر الاسیدی، جس کی گھڑی ہوئی روایتوں پر مشہور مستشرق ولہاوزن اور اس کے متعدد مغربی پیرووں نے بڑا واویلا کیا ہے، اس کی ان ساری روایات کو صدیوں پہلے خود قرون اولیٰ کے مسلمان اہل علم شدومد سے مسترد کر چکے ہیں، اگرچہ ظاہراً یہ روایتیں سنی نقطۂ نظر سے پسندیدہ ہو سکتی تھیں۔ (۴)

مسلمانوں کو صحاح ستہ، خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں شامل روایاتِ حدیث پر جو اعتماد اور مضبوط بھروسہ ہے، اس سے قطع نظر، یہ بات بھی اپنی جگہ طے ہے کہ احادیث کے وہ مجموعے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ان کی صحت کسی کی نظر میں بالآخر جو بھی قرار پائے، یہ

تمام مجموعے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں تمام ''تاریخی'' مآخذ جتنے قدیم، یا ان سے بھی قدیم تر یقیناً ہیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے تاریخ کی پانچ اہم ترین تصنیفات ان اصحاب کی ہیں: واقدی (م ۸۲۳ء/ ۲۰۷ھ)، ابن ہشام (م ۸۳۴ء/ ۲۱۸ھ)، ابن سعد (م ۸۴۵ء/ ۲۳۰ھ)، بلاذری (م ۸۹۲ء/ ۲۷۹ھ) اور طبری (م ۹۲۳ء/ ۳۱۱ھ) (۵)، جب کہ امام بخاری (م ۸۷۰ء/ ۲۵۶ھ) اور امام مسلم (م ۸۷۵ء/ ۲۶۱ھ) کے مرتب کردہ احادیث کے مجموعے ان مذکورہ بالا تاریخی تصنیفات مرتب کرنے والوں ہی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ احادیث کے بعض دیگر مجموعے جنہیں امام مالک (م ۷۹۴ء/ ۱۷۹ھ) اور امام احمد بن حنبل (م ۸۵۵ء/ ۲۴۱ھ) نے مرتب کیا تھا، اس سے بھی پہلے کے ہیں۔

درحقیقت احادیث کے مجموعوں اور ''تاریخی'' تصنیفات میں اس بناء پر امتیاز روا رکھنا اور مؤخرالذکر کو محض اس مفروضے کی بنیاد پر ترجیح دینا کہ احادیث کے مجموعے نظریاتی طور پر زیادہ متعصبانہ ہیں، بہت ہی کمزور بات ہے۔ اس کی بڑی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ یہ ساری تصنیفات اور مجموعے دراصل اہل علم کی ایک ہی جماعت کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی چھان پھٹک کے بارے میں تاریخی توثیق کا زیادہ کڑا معیار اختیار کیا گیا اور راویوں کے سلسلوں کی بڑی سخت چھان بین کی گئی۔ یہ درست ہے کہ ان ذرائع کو اختیار کرنے کے بعد بھی احادیث کی روایات کے قطعی درست ہونے کی مطلق ضمانت تو نہیں دی جا سکتی، تاہم اس کڑے معیار اور تنقیدی جائزے سے گزرنے کے بعد کم از کم ان احادیث کے مجموعوں کو تاریخی مآخذ میں قابلِ لحاظ مقام ضرور مل جانا چاہیے۔ ان مجموعوں کے مندرجات یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر غور کیا جائے اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔ خاص طور پر معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام روایات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے جن کی اسانید سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مکمل ہیں، کیوں کہ ان کے مآخذ کو آسانی دریافت کر کے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے راوی کون ہیں اور کس درجۂ استناد پر فائز ہیں۔

بنابریں یہ بات ہوا کا تازہ جھونکا ہے کہ موجودہ تصنیف میں پروفیسر اکرم ضیاء العمری نے اس علمی توازن کو برقرار رکھا ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مطالعے

میں احادیث کو بھی ان کا مناسب مقام دیا جائے اور انہیں اس عہد کے ایک تاریخی مآخذ کے طور پر قبول کیا جائے۔قرون اولی کے مسلمانوں کے منہج کو اختیار کرتے ہوئے پروفیسر اکرم ضیاء العمری نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر روایت کو اس کے سلسلۂ رواۃ کے درجۂ استناد کی روشنی میں پرکھ کر درست ثابت کیا۔ایسا کرتے ہوئے انہوں نے سب سے پہلے تو ان مآخذ پر بھروسہ کیا جن کا درجہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی نگاہ میں بلند تھا، جیسے بخاری اور مسلم، کیوں کہ ان کی روایت کردہ احادیث عموماً صحیح قرار دی گئی ہیں، خصوصاً صحیح بخاری وہ کتاب ہے جس کا معتدبہ حصہ تاریخی روایات، بطور خاص مغازی پر مشتمل ہے۔اکرم ضیاء العمری اس بات ہی پر اکتفاء نہیں کرتے، بلکہ وہ احادیث کے دیگر مجموعوں اور تاریخی تصنیفات سے بھی معلومات لیتے ہیں۔ان کی روایات کو پرکھنے کے لیے مصنف نے قرون اولیٰ کی ان کتابوں سے مدد لی ہے جن میں احادیث کے راویوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ وہ رجال کی کتابوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں اور بکثرت طویل توضیحی حاشیے بھی دیتے ہیں۔یہ ذرائع اختیار کر کے مصنف نے واقعات کی سب سے زیادہ قابل اعتماد صورت کو درست ثابت کیا ہے۔

اکرم ضیاء العمری کی یہ تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ مہارت سے ترتیب شدہ کئی ابواب پر مشتمل ہے اور متنوع موضوعات سے بحث کرتا ہے۔پہلے دو ابواب میں اس بات سے تفصیلی بحث کی گئی ہے کہ سیرت اور حدیث کے مطالعے کے لیے بہترین تاریخی اسلوب کیا ہونا چاہیے۔جہاں پروفیسر اکرم ضیاء العمری تاریخ کے مطالعے پر نقدِ حدیث کے اصولوں کا انطباق کرتے ہیں، وہاں وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان اصولوں کے استعمال کرنے میں لچک ہونا چاہیے، کیوں کہ محض ''صحیح'' اور ''حسن'' احادیث واقعات کو صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتیں۔اس بناء پر العمری کا خیال یہ ہے کہ ''ضعیف'' احادیث سے کام لیا جانا ضروری ہے، مگر ان کا استعمال شرعی احکام یا تعامل کے اثبات کے معاملے میں نہیں ہونا چاہیے۔آخرالذکر کے لیے صرف ''صحیح'' اور ''حسن'' احادیث ہی قابل قبول ہوسکتی ہیں۔صحیح اور مستند روایات، چوں کہ مقابلتاً کم تعداد میں ملتی ہیں اور ''ضعیف'' احادیث میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے سیرت کے

بارے میں بعض تاریخی نکات کی بابت خاصے اختلاف کا موجود ہونا ممکن ہے۔اس طرح کے نکات پر بحث کرنے میں پروفیسر العمری کی عالمانہ شان نمایاں ہے۔ وہ مختلف ذرائع سے مواد کو یکجا کر کے بعض اوقات کسی معروف نقطۂ نظر کے برخلاف کسی دوسری رائے کو قبول کرتے ہیں۔ ان کی اس تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مسلمان اہل علم معروضیت اور علمیت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں شامل درمیانی ابواب (سوم تا دہم) میں مدینے کی حقیقی مسلم سیاست کے متعدد پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔اس ضمن میں بعض خصوصی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے،مثال کے طور پر کتاب کے اس حصے میں مواخات کے نظام، مسجد نبوی میں مقیم غریب مسلمانوں، یعنی اصحابِ صفہ اور میثاقِ مدینہ سے بحث کی گئی ہے۔العمری کی تصنیف کا بہترین حصہ یہی مباحث ہیں۔مواخات کے متعلق بحث کرتے ہوئے وہ یہ بات زور دے کر کہتے ہیں کہ اس کا مقصد مہاجرین اور انصار کے مابین اتحاد قائم کرنا تھا۔اس طرح پیغمبر ﷺ اور حضرت علیؓ کے مابین مبیّنہ مواخات اس بحث سے خارج ہوجاتی ہے جو ہجرت تک قائم نہ ہوسکی تھی، اگرچہ یہ بات معروف ذرائع سے بیان ہوئی ہے۔اصحابِ صفہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے اس تفصیلی فہرست کو اختیار کیا ہے جو ابو نعیم (م ۱۰۳۹ء/۴۳۰ھ) نے حلیة الأولياء میں دی ہے اور یہ بات ثابت کی ہے کہ ان اصحاب میں کچھ غیر معروف نام بھی شمار کیے گئے ہیں۔اس بحث سے مستشرقین کے اس دعوے کی بھی تردید ہوجاتی ہے کہ اصحاب الصفہ کی اصطلاح بعد کی اختراع ہے۔(٦) اسی طرح میثاقِ مدینہ پر بحث کرتے ہوئے مصنف دو الگ الگ معاہدوں میں امتیاز کرتے ہیں جن میں سے ایک تو یہودیوں کے ساتھ کیا گیا تھا اور دوسرا ان غیر یہودیوں کے ساتھ، جو وہاں رہتے تھے۔

پہلے حصے کے آخر میں، باب یازدہم اور دوازدہم میں العمری نے اس مہم کا تذکرہ کیا ہے جو یہودیوں کے خلاف ہوئی تھی اور بالآخر مدینے سے ان کے اخراج پر اس کا اختتام ہوا تھا۔اس سلسلے میں ان کی بحث ان واقعات کی معروف تعبیر کے مطابق چلتی ہے، چنانچہ وہ حال ہی میں کی جانے والی ان کاوشوں کو قبول نہیں کرتے جن میں اس بات کا انکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بنو قینقاع کو جلا

وطن کیا گیا تھا، یا بنو قریظہ کو سزا دی گئی تھی۔

کتاب کا دوسرا حصہ جس کا ذیلی عنوان ہے: ''مشرکین کے خلاف جہاد''، صرف رسول اللہ ﷺ کی جنگی مہمات، یعنی مغازی سے بحث کرتا ہے۔ یہ حصہ عہدِ مدنی کے بیشتر اہم سیاسی واقعات کا بھی احاطہ کرتا ہے کیوں کہ صدر اسلام کے علمائے سیرت نے ان مہمات ہی کے حوالے سے اس عہد کی ترتیبِ زمانی قائم کی تھی۔ ایک مختصر تعارفی باب میں جو تاریخی منہج سے متعلق ہے، مصنف نے اس بات کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے کہ تنقیدِ حدیث کے روایتی اسلامی طریقے کو جدید مغربی اندازِ تحقیق سے مربوط کرنا چاہیے۔ اسلام میں جہاد کے اصولوں اور اس کے مفہوم پر ایک باب میں بحث کرتے ہوئے انہوں نے تمام غزوات پر الگ الگ گفتگو کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک غزوے کے متعلق موجود روایات کی قدر و قیمت پر بحث کرتے ہوئے وہ شریعت اسلامیہ کے ان اصولوں اور رویّوں پر بات کرتے ہیں جو اس غزوے کے واقعات سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس حصے میں صرف مشرکین اور بازنطینی لوگوں کے خلاف مہمات سے بحث کی گئی ہے جب کہ یہودیوں کے ساتھ معرکوں کا تذکرہ دوسرے حصے میں شامل کیا گیا ہے۔

العمری کی تصنیف کا سب سے زیادہ متاثر کن پہلو مراجع کا استعمال ہے۔ ان کی فہرستِ مراجع اور توضیحی اشارات میں نہ صرف یہ کہ تمام معیاری ''تاریخی'' مآخذِ سیرت کا تذکرہ ملتا ہے، بلکہ بہت سی دیگر تصنیفات کا بھی۔ وہ مدنی عہد کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے لیے جہاں تک ممکن ہوتا ہے، قرآن کریم کا بھی حوالہ دیتے جاتے ہیں۔ کتبِ حدیث میں بہت سی اہم معلومات ایسی ہیں جو بعض ضائع شدہ مآخذ سے لی گئی ہیں، ان کے بارے میں مصنف کی علمی مہارت واقعتاً قابلِ داد ہے۔ خاص طور پر ان کی یہ مہارت ابن حجر عسقلانی کی ضخیم اور عظیم کتاب **فتح الباری** کے بارے میں بہت نمایاں ہے جس کا وہ کثرت سے حوالہ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں العمری بعض دیگر تاریخی مآخذ کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں۔ ان مآخذ میں ابن کثیر کے ساتھ ساتھ ایک اور بہت قدیم اور اہم مأخذ خلیفہ بن خیاط (م ۸۵۴ء/ ۲۴۰ھ) قابلِ ذکر ہے۔ متعدد نکات کے متعلق بحث کرتے ہوئے مصنف نے واقدی کے کام کی کمزوری کو بیان کیا ہے جو ابتدائی دور سے تعلق رکھنے کے باوجود بہت

سے ایسے مواد پر مشتمل ہے جسے داستان گوئی میں شمار کیا جا سکتا ہے اور جو معروضیت کے معیار سے بھی خاصا پست ہے۔ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ واقدی کے شاگرد ابن سعد کو بھی اپنے استاد کی غلطیوں کا اندازہ تھا اور انہوں نے ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش کی۔

مغربی قارئین کو العمری کی یہ تصنیف اس لیے مفید نظر آئے گی کہ اس تصنیف میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ دور کے مسلمان رسول اللہ ﷺ کے مشن کے مدنی عہد کے بارے میں کس بات کو درست، یا غالباً درست سمجھتے ہیں، خاص طور پر جب نقدِ حدیث کے اصولوں کی روشنی میں اس عہد کا جائزہ لیا جائے۔ اس طرح العمری یہ کوشش کرتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان علماء کی قبول کردہ صحیح روایات کی روشنی میں، یا ان کے مقرر کردہ معیاروں کا اطلاق کر کے حاصل شدہ درست روایات کی روشنی میں تاریخ کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔ انگریزی میں لکھی گئی کسی اور تصنیف میں یہ خصوصیات موجود نہیں ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں لکھی گئی سیرت کی بہت سی عربی کتابوں میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن، جیسا کہ العمری نے تفصیلاً اپنے توضیحی اشارات میں بیان کیا ہے، ان کتابوں میں بالعموم قوی اور ضعیف احادیث کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ العمری کی پیش کردہ تصویر بنیادی اعتبار سے روایتی طور پر بیان کردہ سیرت ہی کے مطابق ہے، لیکن قاری کو یہ بات نظر آئے گی کہ مصنف نے حقائق کو بڑی حد تک صاف اور سادہ بنا کر پیش کیا ہے اور ان روایات کو یا تو ترک کر دیا ہے، یا انہیں اپنے حواشی میں جگہ دی ہے جن کا درجۂ استناد کمزور تھا، تاکہ واقعات کی مضبوط ترین اور مستند ترین تصویر پیش کی جا سکے۔

خالد یحییٰ بلینکن شپ

سی ایٹل - واشنگٹن

۲۴ ربیع الاوّل ۱۴۰۹ء مطابق ۳ نومبر ۱۹۸۸ء

دیباچہ

تمام تعریفوں کی مستحق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ درود اور سلام پہنچے نبی آخر الزمان ﷺ کی ذات اقدس پر، آپ ﷺ کے اہل بیت، آپ ﷺ کے صحابۂ کرامؓ اور ان تمام لوگوں پر جنھوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر

میں نے اپنی اس کتاب کو ایک طویل عرصے میں مکمل کیا ہے اور بنظر غائر اس کے مندرجات پر توجہ دی ہے۔ اس کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ محدثین کے اختیار کردہ جرح و تعدیل کے اصولوں کو تاریخی روایات پر منطبق کروں، یعنی وہ طریقۂ کار جو انھوں نے علم حدیث کے باب میں اختیار کیا، وہی تاریخی واقعات کے سلسلے میں اپناؤں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل و کرم سے میری یہ کاوش سود مند رہی ہے۔ اگر اسی منہج کو اختیار کر کے سیرۃ النبی اور خلفائے راشدین کی حیاتِ مبارکہ قلم بند کی جائے جس پر موجودہ کتاب لکھی گئی ہے تو اس کے لیے ایک کل وقتی اور طویل المیعاد کام کا بیڑا اٹھانا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ اہل علم بہت جلد اس ضرورت کا احساس کریں گے، اور اسلامی تاریخ کے طالب علم اور محققین میری اس کتاب پر اپنی قیمتی آراء سے مجھے نوازیں گے اور اس پر تعمیری تنقید بھی کریں گے۔ ان کے خیالات، یقیناً میرے لیے انتہائی مفید ثابت ہوں گے۔ جہاں تک محدثین کے اختیار کردہ منہج کو تاریخی واقعات و بیانات پر منطبق کرنے کا تعلق ہے تو اس راہ میں ابھی ہم نے پہلا قدم ہی رکھا ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے جس کے لیے نہ صرف حدیث کی اصطلاحات پر مکمل گرفت کی ضرورت

ہے، بلکہ تاریخی روایات کی مکمل سمجھ اور پرکھ بھی درکار ہے۔ مجھے ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر ایسے متعدد مقالات کی رہنمائی اور نگرانی کرنے کا موقع ملا ہے جن کا تعلق اسی موضوع سے تھا، یعنی کتبِ حدیث اور مغازی (عسکری مہمات) میں شامل تاریخی روایات کے تنقیدی جائزے سے تھا۔ اس تحقیق و مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، ان کی اچھی طرح چھان پھٹک کی جائے۔ ان مقالات میں سے کچھ تو مکمل ہو چکے ہیں اور کچھ پر تحقیق کی جا رہی ہے۔

میرے خیال میں یہ عظیم الشان تجربہ جو گزشتہ چھ برس سے مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر کیا جا رہا ہے، اس قابل ہے کہ اسے سیرت نگاری کے باب میں ایک بڑی کامیابی قرار دیا جا سکے، اگرچہ اس راستے میں کچھ ایسی مشکلات حائل ہیں جو عام طور پر ہر کام کی ابتداء میں ہوا ہی کرتی ہیں، مگر میں اس معاملے میں بہت پرامید ہوں کہ ہم ان شاء اللہ اس منصوبے کو مزید آگے بڑھانے میں ضرور کامیاب ہوں گے اور سیرۃ النبی ﷺ اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ دوبارہ لکھی جائے گی جس میں تمام تاریخی روایات ایک مکمل اور مستند دستاویز کی شکل میں موجود ہوں گی اور یوں اسلام کے صحیح مقاصد، تصورات اور خصوصیات زیادہ نکھر کر سامنے آئیں گی۔

اللہ تعالیٰ نیتوں کے احوال جاننے والا ہے اور وہی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی فرمانے والا ہے۔

ڈاکٹر اکرم العمری

حصہ اوّل

www.KitaboSunnat.com

معاشرے کی تنظیم اور خصوصیات

اسلام کے اوّلیں دور کی تاریخ نگاری کا منہج

تمہیدی نکات

تاریخِ اسلام کو از سرِنو قلم بند کرنے کی ضرورت ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ۱۹۶۰ء کے عشرے سے علمائے اسلام کی خصوصی توجہ مرکوز رہی ہے۔ان علمائے کرام کی نظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ اسلام کی تدوینِ نو اس انداز سے کی جائے کہ وہ اسلامی تصورِ تاریخ سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہو۔اس معاملے میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرتے وقت اسی منہج کو اختیار کیا جائے جو محدثین کرام نے اختیار کیا ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تاریخِ اسلام کی از سرِنو تدوین کا کام ایک طویل، مشکل اور صبر آزما منصوبہ ہے۔ یہ عظیم الشان تاریخ چودہ صدیوں پر محیط ہے۔اس دشوار اور صبر آزما کام میں جو مشکلات درپیش ہیں وہ دراصل دو وجوہ سے ہیں۔ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ یہ تاریخ ایک طویل عرصے پر پھیلی ہوئی ہے، اور دوسری وجہ اس تاریخ کے متنوع اور گوناگوں مآخذ ہیں۔اس تنوع کا ایک سبب تو وہ طریقے ہیں جن کے تحت مختلف مآخذ کو ترتیب دیا گیا، اور دوسرے وہ پہلو ہیں جن پر ایک خاص دور میں زیادہ توجہ دی گئی۔ان مشکلات میں مزید اضافہ اس وجہ سے بھی ہو جاتا ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور ہی سے مسلمان نہ صرف سیاسی میدان میں بعض مشکلات سے دوچار ہوئے، بلکہ بعد کے ادوار میں بعض دیگر پہلوؤں سے بھی مسلمانوں کا نظامِ زندگی متاثر ہوتا رہا۔ ان پہلوؤں میں سماجی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل نمایاں ہیں۔اس سے بھی زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ بیسویں صدی

کے دوران میں اسلام کے بنیادی عقائد اور شریعت کے اصولوں میں بھی تحریف اور تبدیلی کرنے کی بعض مذموم کوششیں کی گئیں۔ ان تمام اسباب کی بناء پر تاریخ اسلام کی حرکت کے بعض بنیادی اسباب کی تعبیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے اس کام کو اسلام کے اوّلیں عہد کی تعبیرِ نو تک ہی محدود رکھا ہے۔ اسلام کا یہ ابتدائی عہد حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اور خلفائے راشدین کے زرّیں ادوار پر مشتمل ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ایمان مسلمانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والا سب سے بڑا محرک تھا۔ ہمارے ابتدائی مآخذ عموماً روایات کو نقل کرنے کا جو اسلوب اختیار کرتے ہیں، اس میں وہ محدثین کے طرز پر پہلے راویوں کے نام بیان کرتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ اس وجہ سے بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی زندگیوں میں اسلام کی تمام تعلیمات پورے طور پر نافذ العمل تھیں۔ اسلام کا ابتدائی دور ہمارے لیے وہ بے مثال نمونہ ہے جس کی ادنیٰ جھلک موجودہ مسلمان معاشروں میں لانے کے لیے آج کے مسلمان جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی اس کتاب میں یہ بھی کوشش کی ہے کہ تاریخ نگاری کا جو مخصوص اسلامی پس منظر ہے، اس کے اہم خطوط کو اجاگر کروں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے تاریخی تحقیق کے منہج کو ''مصطلح الحدیث'' کے اصول کے مطابق ڈھالنے کے مسئلے پر بھی بحث کی ہے۔ میں نے اپنی اس تصنیف میں یہ بات بھی حقائق و دلائل کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ اسلام لکھنا دراصل مسلمان مؤرخین ہی کا حق ہے، بالکل اسی طرح جیسے دوسری اقوام کی تاریخیں انہی قوموں کے افراد نے لکھی ہیں، چاہے اس تاریخ نگاری میں کچھ دوسرے افراد نے بھی حصہ لیا ہو۔ اس طرح ہم مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ اپنی اس ملّی ذمہ داری کو محسوس کریں کہ تاریخِ اسلام ہمیں اپنے لیے ہی لکھنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی تہذیب، اپنے نظریے اور اپنی اقدار کو اپنے فہم کے مطابق اختیار کریں۔ اغیار بھی اس کام میں کچھ حصہ لے سکتے ہیں، مگر اپنے محدود دائرے میں رہتے ہوئے، لیکن ہونا یہ چاہیے کہ ان کی تحریریں ہمارے تصورِ تاریخ کی حقیقت اور ورثے کو واضح اور بیان کرنے والا اصل اور واحد مآخذ نہ ہوں اور نہ دنیا کے

سامنے ہمارے اصل ورثے کو محض ان تحریروں کے ذریعے ہی پیش کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جو صورت حال اس وقت مسلمانوں کو درپیش ہے، وہ اس سے قطعاً مختلف ہے جو دراصل ہونا چاہیے تھی۔ عالم اسلام کی تہذیبی پس ماندگی پوری طرح اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ کی نہ تو صحیح قدر و قیمت جان سکے اور نہ اس تاریخ کو صحیح طور پر مرتب ہی کر کے دنیا کے سامنے لا سکے۔ دنیائے اسلام میں ان لوگوں کی اکثریت کو جن کا تعلق تاریخ کے مطالعے سے ہے، دو واضح اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو اسلامی ورثے کو ناپسند کرتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ یہی ورثہ دراصل مسلم ممالک کی ثقافتی پس ماندگی کا بنیادی سبب ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کے نزدیک تو فلسطین میں صیہونیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی پے در پے شکستوں کی وجہ بھی مسلمانوں کا یہی ورثہ ہے۔ مسلمان مؤرخین کے اس گروہ کا پختہ خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ماضی اور حال کے درمیان ایک دیوارِ برلن قائم کر دینا چاہیے۔ یوں مسلمانوں کی جدید نسلوں کو اسلام کے ادبی ورثے اور تہذیب و ثقافت سے مکمل طور پر الگ تھلگ ہو کر ماضی سے اپنا رشتہ یکسر کاٹ دینا چاہیے۔ مؤرخین کا دوسرا گروہ وہ ہے جو چند ایسے بے عمل اور سست لوگوں پر مشتمل ہے جو تاریخی مضامین محض ایک پیشے اور ذریعۂ روزگار کے طور پر رقم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کام زیادہ تر مستشرقین کے تراجم پر منحصر ہوتا ہے اور اس میں نہ تو کسی تحقیق کی کوشش کی گئی ہوتی ہے، نہ اصل مآخذ تک پہنچنے کی کوئی سعی ان کے ہاں ہوتی ہے، اور نہ ان کے ہاں کوئی اچھوتا خیال یا نادر نظریہ ملتا ہے۔ یہ لوگ اس بات کی بھی پروا نہیں کرتے کہ ان کی تحریروں کے ذریعے مستشرقین کے زہر آلود خیالات مسلم دنیا تک پہنچ رہے ہیں۔

تاریخ اسلام سے غفلت کی یہ صورت حال یوں اور بھی تلخ ہو گئی ہے کہ ایک تو دنیائے اسلام میں فکری تحریک کمزور اور ماند رہی، دوسرے دنیائے اسلام عالمی فکری رجحانات کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرق اور مغرب میں ثقافتی تفاوت گہرا ہو گیا جس کا آغاز یورپ کی نشأۃ ثانیہ سے ہوا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں شاذ

و نادر ہی کوئی ایسی کتاب ملتی ہے جس میں سنجیدگی کے ساتھ کسی مسلمان مفکر نے تاریخ اسلام پر علمی کام کیا ہو۔ اس وجہ سے یہ بات زیادہ باعث حیرت نہیں کہ اس تمام عرصے کے دوران میں مسلمان قلم کاروں کی تصنیف کردہ جتنی کتب بھی سامنے آئی ہیں، ان میں سے بیشتر درحقیقت مستشرقین ہی کے مطالعے پر مبنی ہیں اور انہی کے خیالات اور تصورات کی صدائے بازگشت ہیں۔

چنانچہ اسلام کے وہ سچے پیروکار جو نئی نسل کا رشتہ ایمان اور اپنے ملّی ورثے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑنے کے خواہاں ہیں، انہیں تاریخ کے میدان میں تحقیق کی ذمہ داریوں کا ادراک کرنے اور انہیں سنجیدگی سے انجام دینے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہی حضرات تنہا اس بات کی اہلیت رکھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی معاشرے کے صحیح تصورات کی نشر واشاعت کریں۔ یہ حضرات سچے عقیدے کی حلاوت کو محسوس کرنے والے لوگ ہیں اور انہوں نے اپنے کردار کے اندر اس عقیدے کے اثرات کو سمو لیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اسلامی معاشروں کے اصل مقاصد اور صحیح رجحانات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے یہی حضرات اس بات کے اہل ہیں کہ تاریخ اسلام کی صحیح سمت متعین کرنے میں مؤثر کردار ادا کریں۔

اسلام کا تصورِ تاریخ بھی دراصل کائنات، انسان اور حیات کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصورات سے ماخوذ ہے۔ اسلام کے کائناتی نظریے کی بنیاد اسلامی عقیدے پر رکھی گئی ہے جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ، اس کی کتابوں، اس کے پیغمبروں، روزِ آخرت اور تقدیر پر ایمان سے عبارت ہے، لہٰذا اسلام میں تاریخ کی جو تعبیر کی گئی ہے وہ اسلام کے بنیادی عقائد سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ یہ ایسا فطری تصورِ تاریخ ہے جس کی بنیاد انسان کے فطری روّیوں، اس کے بے ساختہ جذبات اور محرکات پر رکھی گئی ہے جس کی واضح مثال مدینے کے پہلے اسلامی معاشرے میں سامنے آتی ہے۔ یوں تاریخ اسلام کی ایک واضح سمت اور مخصوص رفتار ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو اسے عام انسانی تاریخ سے ممتاز کرتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تاریخ کے اوپر وحی الٰہی کی واضح چھاپ موجود ہے۔ اسلامی تاریخ کا یہ وصف اس حقیقت کا مرہون منت ہے کہ تاریخ اسلام کے عوامل و محرکات میں ایمان ایک ایسی حقیقت ہے جو اس کی تمام دیگر

خصوصیات پر حاوی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کا تصورِ تاریخ نہ تو کوئی مادہ پرستانہ تصور ہے جو انسانی تاریخ پر محض مادہ پرستی کے اثرات سے بحث کرتا ہو، جیسے کارل مارکس کے نظریۂ تاریخ میں پیداوار کے ذرائع وغیرہ سے متعلق بحث بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اور نہ اسلامی تاریخ کی کوئی مادی تعبیر ہی کی جاسکتی ہے جو صرف ماحول، موسم اور جغرافیے کے تاریخ پر اثرات کو بیان کرتی ہو۔ یہ دراصل تاریخِ انسانی کی ایک مغربی تشریح ہے جو سراسر مادی ہے جب کہ تاریخ کی اسلامی تعبیر واضح طور پر اس حقیقت پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے کہ تاریخی مدوجزر اور معاشرتی تغیر وتبدل میں انسان کی ذمہ داری مرکزی اور اس کا کردار بنیادی ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو انسان رضائے الٰہی کے دائرے میں رہ کر ادا کرسکتا ہے۔ اسی طرح تاریخ اسلام کی کوئی نسلی تعبیر بھی نہیں ہوسکتی جو صرف کسی مخصوص نسل یا قوم کے محدود کردار پر زور دیتی ہو۔ اس کے برعکس اسلام تمام اہل اسلام کے کردار کو ان کے اصل کام کے تناسب سے قبول اور تسلیم کرتا ہے۔ مزید براں اسلام نے تاریخ کی جو تعبیر کی ہے، وہ کسی فرقہ واریت کی بناء پر بھی نہیں ہے کہ کہا جاسکے کہ تاریخی حقائق کی قیمت پر کوئی ایسی توجیہ پیش کی گئی ہو جس سے کسی مخصوص گروہ کا مفاد حاصل ہوتا ہو۔

یہ تمام افکار ایسے ہیں جن کی وضاحت کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، لیکن اس کتاب کے محدود دائرے میں اس بحث کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان افکار کے بنیادی تصورات کا خاکہ پیش کروں، اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں ان پر الگ سے مفصل بحث کروں گا۔

تاریخ کی اسلامی تعبیر کے عمومی خدوخال

قرآن کریم میں بیان کردہ تاریخی حقائق کی رعایت

ابتدائے آفرینش سے دنیا میں توحید کا اصول رائج تھا اور شرک کا ظہور بہت بعد میں ہوا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً.فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ... وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ...(البقرة ۲:۲۱۳)

اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسانیت دراصل ایک ہی جماعت تھی اور توحید کے خالص اصول پر قائم تھی، لیکن جب انسانوں نے توحید کا عقیدہ ترک کر کے مختلف راہوں میں بھٹکنا شروع کر دیا تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست دکھانے کی غرض سے اپنے پیغمبر بھیجے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق قرآن کریم سے ہوتی ہے، لیکن اس کے برعکس جب ہم قدیم تاریخی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس ضمن میں بعض مسلمان مؤرخین کے بیانات قرآن کریم سے یکسر مغایرت رکھتے ہیں۔ ان مؤرخین کے بیانات کے مطابق انسانیت کا ابتدائی مذہب جانوروں، درختوں اور دیگر مظاہرِ فطرت کی عبادات پر مشتمل تھا، پھر ایک طویل فکری ارتقاء کے نتیجے میں انسان توحید کی منزل تک پہنچا۔ ان علمائے تاریخ کی نظروں میں فرعون کو قدیم ترین موحد گردانا جاتا ہے، کیوں کہ اس نے مصر کے تمام خداؤں سے انکار کر کے صرف ایک سورج کی پرستش پر زور دیا تھا۔ اس مغالطے کی دو وجوہ ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ کچھ مسلمان مؤرخین ایسے ہیں جو اس معاملے میں وحی اور نبوت کو

مستند ذریعۂ علم کے طور پر قبول نہیں کرتے اور اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ متعدد خداؤں کی عبادت سے لے کر ایک سچے خدا کی پرستش تک عقیدے کا ارتقاء انسانی کاوش کے نتیجے میں ہوا ہے، یوں ایک خدا کا نظریہ انسانیت کے فکری اور ثقافتی ارتقاء کے نتیجے میں سامنے آیا۔

مغالطے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض مسلمان مؤرخین نے ڈارون کے تصورات کے زیر اثر اس کے نظریۂ ارتقاء کو مذہبی عقائد پر بھی چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مسلمان مؤرخ سب سے پہلے تاریخ انسانی کے متعلق قرآن کریم نے جو بنیادی حقائق بتائے ہیں، انہیں سمجھ کر ذہن نشین کرے اور انسانی تاریخ رقم کرتے ہوئے ان بنیادی حقائق سے رہنمائی حاصل کرے۔ اگر تاریخ نگاری کے دوران میں اس کے سامنے ایسے نظریات آئیں جو قرآن کریم کے بیانات سے متضاد ہوں تو اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ جب تک یہ محض تصورات ہیں اور ثابت شدہ حقائق کے معیار پر پورا نہیں اترتے، انہیں یکسر مسترد کر دے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج کل کی رائج الوقت قدیم تاریخ کا بیشتر مواد آثارِ قدیمہ کے ذرائع سے حاصل شدہ تصورات پر مبنی ہے، جب کہ ان ذرائع سے حاصل کردہ معلومات بہت محدود اور مختصر ہیں۔ یہ معلومات اس خلا کو پر کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں جو قدیم تاریخ نگاری کے سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ ایک غیر مسلم مؤرخ کو تو بے شک یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اس کے پاس تاریخی معلومات حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ موجود نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ آثار قدیمہ کی کھدائی کے نتیجے میں کچھ دریافت کر لے اور اس سے چند معلومات اخذ کر لے، لیکن ایک مسلمان مؤرخ کا معاملہ اس سے قطعاً مختلف ہے، اس کے پاس وحی الٰہی کی صورت میں ایک مستند ترین اور انتہائی قابلِ اعتماد ذریعہ موجود ہے (جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے): ''اس پر جھوٹ کا دخل نہیں، آگے سے اور نہ پیچھے سے''۔ (فصلت ۴۱: ۴۲)

قرآن کریم وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو ہر قسم کے تغیر اور تبدل سے پاک ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس عظیم الشان صحیفۂ آسمانی کو محفوظ فرما کر مسلمانوں کو ایک جلیل القدر اور

بے بہا نعمت سے نوازا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں مسلمان اس کتابِ الٰہی کی تلاوت اسی طرح کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے جس طرح یہ نازل ہوئی تھی اور تمام فرزندان توحید کے قلوب میں اس ایمان کی تپش اور حرارت تاحال قائم ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ یہی اللہ کا نازل کردہ کلام ہے۔ یقین کی اس کیفیت نے انسانوں کے دل، دماغ، رویوں اور طور طریقوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہاں تک کہ اسی ایمانی کیفیت نے ان کے معاشروں اور تہذیب و تمدن کا رخ یکسر موڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا اعزاز اور اکرام ہے جو امت مسلمہ کے علاوہ کسی قوم کو کبھی حاصل نہ ہو سکا۔

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے طرز عمل کے مقاصد کا ایک جائزہ

ایک اسلامی معاشرے میں بنیادی عقائد اور اخلاقی اصولوں کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، اس لیے اس معاشرے کے افراد کے مابین روابط سب سے بڑھ کر اس جذبے سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں کہ ان کے ہر عمل کا محرک رضائے الٰہی اور آخرت میں اجر و ثواب کا حصول ہے۔ ایک بہترین مسلمان اپنے عمل میں کسی اور غرض کو شامل نہیں ہونے دیتا۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال میں اپنی نیت اور ارادے کو واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خاص رکھے، خواہ وہ جہاد کے عمل میں مصروف ہو، یا اپنا تزکیہ کرنے میں، یا کسی بھی قسم کی معاشرتی، معاشی یا سیاسی سرگرمیوں میں۔ خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں مسلمان کی زندگی کا واحد مرکز و محور رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ مسلمان یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ اگر اس نے اپنی نیت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے وابستہ کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا وہ عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ حدیث میں اس بات کی یوں وضاحت کی گئی ہے: ''اللہ تعالیٰ کوئی ایسا عمل قبول نہیں کرتا جو خالصتاً اس کی خاطر نہ کیا گیا ہو''۔ اگر آج بھی یہ سوچ باشعور مسلمانوں کی رہبر اور رہنما نظر آتی ہے تو کیا اس جذبۂ محرکہ نے صحابہ کرامؓ اور ان کے فوراً بعد آنے والی نسل، یعنی تابعین، جو انسانوں کا بہترین گروہ تھا، کی زندگیوں پر اثرات مرتب نہ کیے ہوں گے؟

قرونِ اولیٰ میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کی جس طرح تعلیم اور تربیت کی، ان

کے باطن کی صفائی اوران کے قلوب واذہان کی تطہیر کی اوران کے عقائد واعمال میں اخلاص پیدا کر کے ان کا رخ خدائے وحدۂ لاشریک کی طرف پھیر دیا۔ یہ سب ہمیں صاف طور پر یہ باور کراتا ہے کہ ان لوگوں کی عسکری مہمات کا محرک کوئی دنیاوی جذبہ، یا مادی منفعت کا حصول نہیں تھا، بلکہ ان کے اندر جو تڑپ تھی وہ اسلام کی نشرواشاعت کی تھی۔ وہ دنیا میں اسلام کا کلمہ بلند کرنے کے اعلیٰ عزم سے سرشار تھے۔ ان کی کوشش اس بات پر مرکوز تھی کہ مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہوں، انسانوں کے معاملات کا نظم ونسق بہتر ہواوران علاقوں کے تمام مسائل اسلامی تعلیمات کے مطابق حل کیے جائیں۔ یہ ایسے فاتح تھے جنہیں مفتوحہ علاقوں پر غلبہ حاصل کرنے، یا ان کی دولت ہتھیانے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ وہ صحرا کی مشکل اور کٹھن زندگی سے فرار چاہتے تھے، جیسا کہ اطالوی مؤرخ پرنس کائتانی اور دیگر مستشرقین نے خیال آرائی کرنے کی کوشش کی ہے۔

معروف قدیم مؤرخِ اسلام طبری نے روایت کیا ہے کہ جب ربعیؓ بن عامر ایرانی سردار رستم کے دربار میں داخل ہوئے تو رستم نے ان سے پوچھا: ''تم یہاں کس مقصد سے آئے ہو''؟ ربعی نے جواب دیا: ''ہم یہاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے آئے ہیں اور ہمیں اس مقصد سے بھیجا گیا ہے کہ انسان کو انسان کی پرستش سے نجات دلا کر اسے خداے وحدۂ لاشریک کے آگے جھکا دیں، اس دنیا کی تنگیوں اور سختیوں سے نکال کر اسے آخرت کی وسعت اور فراخی میں داخل کریں اور دیگر مذاہب کے مظالم سے اسے نجات دلا کر اسلام کا عدل وانصاف عطا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے اس دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تا کہ اس کی مخلوق کو اس کے دین کی طرف بلائیں''۔

مسلمانوں کے سفیر ربعیؓ بن عامر نے ایرانیوں کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ محض ان کے ذاتی احساسات نہیں تھے، بلکہ ان خیالات سے وہ سوچ پوری طرح ظاہر ہوتی ہے جو اس دور کے مسلمان قائدین اور اکثر مجاہدین میں غالب اور نمایاں تھی۔ اگر چہ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اس وقت بدوؤں کا ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو جہاد کے جذبے کے ساتھ

ساتھ مادی فوائد اور غنیمت کے حصول میں بھی دلچسپی رکھتا تھا، تاہم یہ طبقہ نہ تو امت کے اصل قائدین کی نمائندگی کرتا تھا اور نہ اس عظیم الشان تحریک کے اصل مقاصد ہی کا علمبردار تھا۔ ہمیں یہ بات ضرور بیان کرنا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ ایک انسانی معاشرہ ہوتا ہے، اس معاشرے میں جہاں ایک طرف زعماء اور قائدین کی ایسی جماعت موجود ہوتی ہے جو بلند ترین اخلاقی معیارات کی حامل اور روحانیت کی اعلیٰ ترین بلندیوں کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے، ان لوگوں کے عزائم اور ارادے خالصتاً لوجہ اللہ ہوتے ہیں، وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں، اور ان کی تمام تر کوششیں اور جدوجہد اسی منزل کو حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ اسی معاشرے میں مسلمانوں کا وہ طبقہ بھی پایا جاتا ہے جس کی ایمانی سطح مندرجہ بالا طبقے کی سطح تک نہیں پہنچی ہوتی، اور وہ اس کم از کم معیار پر پورا اترتے ہیں جس کے باعث انہیں مسلمان کہا جا سکے۔ ہمیں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہہ دینا چاہیے کہ قرونِ اولیٰ کی تاریخ رقم کرنا صرف اس مسلمان کا حق ہے جو ہمہ وقت ان حقائق کو ذہن میں رکھتا ہو اور روزانہ ان کلمات کو دہراتا ہو: ''آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہان کا، کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھے حکم ہوا'' (الانعام ۶:۱۶۲-۱۶۳)

ایسا مسلمان اپنے دماغ اور جذبات پر مکمل طور پر صرف قرآن اور سنت ہی کو اثر انداز ہونے کی اجازت دیتا ہے، وہ اپنی شخصیت کی تشکیل میں ہدایت کے انہی دو سرچشموں کے اثرات کو قبول کرتا ہے اور اس کے تمام اعمال اور کردار پر انہی کی تعلیمات کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب اور مستشرقین اس بات کے سمجھنے میں قطعاً ناکام رہے ہیں کہ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے اقدامات کے اصل محرکات کیا تھے۔ اس ناکامی کی ایک مثال وہ رویّہ ہے جو مشہور مستشرق ہنری لیمنس کے سقیفۂ بنی ساعدہ کے واقعہ پر کیے جانے والے تبصرے میں سامنے آتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ شوریٰ کے نفاذ کی پہلی مثال ہے جس میں اقلیت نے اکثریت سے اپنی بات منوائی۔ اس واقعے کے بارے میں جب مذکورہ مستشرق اپنا فیصلہ دیتا ہے تو اس کے

ذہن میں پندرہویں اور سولہویں صدی کے فرانسیسی درباروں کی وہ ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہوتی ہیں جنہیں سامنے رکھ کر وہ اس واقعے کی انتہائی بے ہودہ اور بھیانک تصویر کشی کرتا ہے۔ اس پورے واقعے کو توڑ مروڑ کر وہ یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جو اجلاس منعقد ہوا تھا، وہ دراصل ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کی ایک مشترکہ سازش تھی جو ان حضرات نے آپس میں مل کر تیار کی تھی۔ اس کے بقول اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ یہ تینوں اصحاب مل کر یکے بعد دیگرے خلافت حاصل کر لیں۔

مستشرقین کا مطالعۂ اسلام اور مطالعۂ تاریخِ اسلام متفرق رویوں کا حامل ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذہنی سطح، معیارات اور ان کے مذہبی اور نسلی تعصبات کے مدارج مختلف ہیں، تاہم اس قسم کا مطالعہ کرنے والے محققین کا تعلق زیادہ تر ان لوگوں سے ہے جو اسلام سے بالکل بے گانہ ماحول کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہی فلسفوں اور اپنی ہی ثقافتوں کے ماحول میں جیتے جاگتے ہیں۔ اس پس منظر کے ساتھ ظاہر ہے کہ ان کے لیے اسلام کی صحیح قدر پہچاننا مشکل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے ایک صاحبِ ایمان مسلمان کے رویے کے اصل محرکات کو سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ اس رویے کو نہ تو انفرادی سطح پر سمجھ سکتے ہیں اور نہ معاشرتی سطح پر ہی اس کی اہمیت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ وہ جب اسلامی تاریخ کے واقعات کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے یورپ کی تاریخ پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ دونوں تاریخیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی فرق رکھتی ہیں۔ مزید براں ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اہل یورپ کا یہ وطیرہ بھی رہا ہے کہ وہ ساری دنیا کو اپنے تاریخی واقعات کے تناظر ہی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوں کہ یورپ ماضی قریب میں حربی اور فنی میدانوں میں آگے رہا ہے، اس سے ان لوگوں کے اندر یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ ہر خوبی کو اپنے ساتھ منسوب کیا جائے اور ہر نقص کو دوسروں کے سر تھوپ دیا جائے۔ مشہور مؤرخ ٹائن بی نے دنیا کی تہذیبی تاریخ پر اپنی جو تصنیف مرتب کی ہے، اس میں تاریخ اسلام کو بہت ہی مختصر جگہ دی ہے، حالانکہ دنیا کی تاریخ میں اسلام کا جتنا حصہ ہے، اس اعتبار سے یہ یقیناً ناکافی ہے۔

مستشرقین کے کام میں بنیادی غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے، اس کی روح کو جاننے اور اسلامی معاشرے، اور پھر اس معاشرے کی تاریخ پر اسلامی روح کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کا صحیح ادراک کرنے میں سخت ناکام رہے ہیں۔ یہی ایسی فاش غلطی ہے جو ہمیں ان کے تحقیقی کام کو قبول کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اس کام میں خصوصاً ان کی وہ تحقیقات شامل ہیں جن کا تعلق سیرت اور خلفائے راشدین کے زمانے سے ہے۔ یہی وہ عہدِ زرّیں ہے جب اسلامی نظریۂ حیات اپنی بھرپور عملی شکل میں دنیا کے سامنے آیا تھا۔

تہذیب کی قدر شناسی

ایک مسلمان مؤرخ کسی بھی تہذیب کو محض اس کی مادی کامیابیوں کے پیمانے سے نہیں پرکھتا، بلکہ وہ اس پر بھی غور کرتا ہے کہ خالق نے اپنی مخلوق کو جن بنیادی امور کی انجام وہی کا حکم دیا ہے، انہیں اس تہذیب نے کس حد تک انجام دیا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’اور میں نے نہیں پیدا کیے جن وانس سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں‘‘ (الذاریات ۵۱: ۵۶)۔

گویا ایک عظیم الشان تہذیب کی علامت یہ ہے کہ وہ سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور مادی پہلوؤں سے ایک ایسا موزوں اور سازگار ماحول مہیا کرنے میں کامیاب ہو جائے جس میں انسانوں کے لیے ایک خدا کی بندگی اختیار کرنے کے مواقع میسر آ جائیں اور وہ اپنی تمام دنیاوی سرگرمیوں میں خداے واحد کے احکام کو آسانی کے ساتھ پوری پابندی سے اس طرح بجا لائیں کہ معاشرے کا کوئی ادارہ اس نصب العین کے حصول میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ معاشرتی اداروں کو یہ اجازت ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مذہبی عقائد اور ان کی عملی ترویج کے درمیان کسی قسم کا تضاد پیدا کرنے کی کوشش کریں، یا کسی شخص پر یہ دباؤ ڈالیں کہ اللہ تعالیٰ جو تمام جہانوں کا رب ہے، اس کی طرف سے اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان سے انحراف کرے۔ ایک مسلمان مؤرخ کی نظر میں دنیا کی کوئی تہذیب اپنے علوم وفنون اور ادب میں کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، اپنی خوراک، لباس، سامانِ آرائش وزیبائش اور فنون تعمیر میں اس نے کتنے ہی کمالات کیوں نہ حاصل کر لیے ہوں اور مادی ترقی کے دیگر میدانوں میں چاہے وہ اوجِ

ثریا کو کیوں نہ چھو رہی ہو، لیکن وہ تہذیب اس وقت تک ''پس ماندہ'' اور ''ناقص'' رہے گی، جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے اور شریعت کی شکل میں اس کے احکام کی بجا آوری کا نظام قائم کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

دیگر تہذیبوں کی مانند اسلامی تہذیب بھی تاریخ کے متعدد ادوار سے گزری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی بہت سی مادی کامیابیاں ایسی ہیں جنھیں اس تہذیب کے ابتدائی زمانے میں محسوس نہیں کیا گیا۔ ہمیں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اسلامی تہذیب کے قابلِ ذکر کارنامے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مؤرخ ایڈم میٹز اس رائے کا علمبردار ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں اسلامی تہذیب وتمدن اپنے عروج اور کمال کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا تھا، کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں خدائے واحد کی عبادت کے لیے ماحول انتہائی سازگار تھا، لیکن جب چوتھی صدی ہجری کے مسلمانوں کے روّیوں کا موازنہ پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں کے اسلامی طرزِ عمل سے کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مؤخرالذکر کا طرزِ عمل شریعت کی تعلیمات کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''سب سے زیادہ بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں، اس کے بعد وہ لوگ جو اس کے بعد آئیں گے، اور اس کے بعد وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے''۔

لیکن غیر مسلم مؤرخین کو اس اصول کی صداقت اور منطقیت اس لیے سمجھ نہیں آتی کہ انھوں نے اپنی ہی (مغربی) تہذیب کی اقدار کو اپنا واحد پیمانہ قرار دے رکھا ہے، لیکن وہ مسلمان مؤرخ جس نے خود کو مغربی اقدار، معیارات اور تصورات سے آزاد کر لیا ہے، اس کی نظر میں یہ ساری صورتِ حال واضح اور صاف ہے۔ اس زمانے میں عالم اسلام میں شعور اور بیداری کی جو نئی لہر اٹھی ہے، اس کے گہرے اثرات مسلمانوں کی عمومی بصیرت اور دور اندیشی پر بھی پڑے ہیں۔ اس کی وجہ سے آج کا مسلمان اس قابل ہوا ہے کہ اپنی سوچ کا رخ اور پیمانہ خود معین کرے۔ موجودہ بیداری کے اثرات کا یہ واضح نتیجہ نکلا ہے کہ مسلمانوں کی نوجوان نسل نے خود کو مغربی تہذیب کی ذہنی غلامی سے آزاد کر لیا ہے۔ اسلام کے صحیح شعور اور ایمان کی حرارت نے

انہیں روحانی اور فکری سطح پر برتری، خود اعتمادی، آزادی فکر اور ملی حمیت کا احساس دلایا ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ ایک نئی تہذیب کی بناء ڈالنے کی راہ میں پہلا درست قدم یہی ہوتا ہے، جو الحمدللہ اٹھا لیا گیا ہے۔

قرونِ اولیٰ کی تاریخ مرتب کرتے وقت ''معذرت خواہانہ'' اور ''دفاعی'' رویے کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

بعض مسلمان مؤرخین کی موجودہ معذرت خواہانہ روش دراصل اس نفسیاتی اور فکری تسلط کا نتیجہ ہے جو مغرب نے اپنی ثقافتی یلغار کے ذریعے کچھ مسلمانوں کے ذہنوں پر قائم کر رکھا ہے۔ اس مخصوص سوچ کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ بعض مسلمان مؤرخین جب اسلام کے تصورِ جہاد یا اسلامی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا انداز بے حد معذرت خواہانہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی تمام فوجی مہمات رومی اور ایرانی حملوں کے جواب میں جزیرہ نمائے عرب کے دفاع کے لیے تھیں، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پیش آنے والے غزوات کا تذکرہ بھی اسی معذرت خواہانہ انداز میں کرتے ہیں جس سے یہ تصور سامنے آتا ہے، گویا یہ تمام غزوات مدینے کے دفاع کے سلسلے میں پیش آئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے اعلیٰ علمی مقام کے باوجود اپنی شہرۂ آفاق تصنیف سیرۃ النبی میں اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

بعض مسلمان مؤرخین کی جسارت تو یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے محض اس وجہ سے بعض معروف اور مستند واقعات کو مسترد کر دیا ہے کہ وہ ان واقعات کا جواز ثابت کرنے کے لیے کوئی معذرت خواہانہ بنیاد فراہم نہ کر سکے، مثال کے طور پر ایک مؤرخ نے ابن اسحٰق کی ان روایات کا انکار کر دیا جو بنو قریظہ کے جنگجوؤں کے قتل کے بارے میں آئی ہیں، حالانکہ حدیث، سیرت اور تاریخ کی تمام مستند کتب ان روایات کی تائید کرتی ہیں۔ اس طرح کے رویّے سے مترشح ہوتا ہے کہ خود مصنف کو ان لوگوں کے قتل کے جواز پر شبہہ ہے۔ اسلامی تاریخ کی تعبیر نہ تو معذرت خواہانہ انداز میں کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا منشاء اپنے دفاع میں جواز ہی فراہم کرنا ہونا چاہیے، بلکہ اسلامی تاریخ کی ایک محکم بنیاد ہے، اور وہ بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ اسلام مکمل حق ہے اور

جو کچھ بھی اس سے متعارض ہے، وہ سب سراسر باطل ہے۔ دین اسلام میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جس بات کا بھی حکم دیا ہے، خواہ وہ جہاد ہو یا کوئی دوسرا حکمِ خداوندی، وہ بہر حال صحیح اور درست ہے اور اس کے لیے کوئی دوسرا جواز تلاش کرنے، یا معذرت پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، چاہے وہ حکم الٰہی بیسویں صدی کی مغربی ذہنیت کے لیے کتنا ہی عجیب اور ناقابل قبول ہو۔ ہمیں اسلام اور اس کی تاریخ کو کسی خاص زمانے کے مزاج اور نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کسی کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، کسی خاص زمانے کے لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہوں وہی چیز ایک دوسرے زمانے کے لوگوں کے لیے سخت ناپسندیدہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں ایک چیز کسی ایک علاقے کے لوگوں کی نظروں میں محبوب ترین ہو اور وہی چیز کسی دوسرے خطے کے باسیوں کی نگاہوں میں مبغوض ہو۔ صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہر چیز کو پرکھ سکتی ہے اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کرسکتی ہے اور یہ حقیقت اس کے جاری کردہ قوانین، یعنی شریعت اسلامی میں پوری طرح ظاہر و باہر ہوکر سامنے آ گئی ہے۔ انسان ایک فانی مخلوق ہے۔ اس کی ذاتی آراء، خواہشات یا گمان اس حیثیت کے حامل نہیں ہوتے کہ قطعی طور پر درست اور صائب ترین فیصلہ دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔

تاریخ نگاری میں شرعی اصطلاحات کا استعمال

تاریخ اسلام کو جب اسلامی تناظر میں لکھا جائے گا تو شرعی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہوگا۔ ان شرعی اور قانونی اصطلاحات کے بڑے واضح اور متعین معنی ہیں اور ان کے ذریعے اسلام کے شرعی مفاہیم اور قانونی تصورات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ تصورات ان پیمانوں کا کام دیتے ہیں جن کے ذریعے افراد اور واقعات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر قرآن کریم میں لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے: مومن، کافر اور منافق۔ ان تینوں الفاظ میں سے ہر لفظ ایک مخصوص اور متعین مفہوم کا حامل ہے جس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے۔ ہمیں ان اصطلاحات کو استعمال کرنے سے اجتناب نہیں برتنا چاہیے، اور

نہ ان کی جگہ ایسی اصطلاحات ہی کو استعمال کرنا چاہیے جو غیر اسلامی حلقوں میں رواج پاگئی ہیں، مثلاً دایاں بازو یا بایاں بازو، یا اس قسم کی دیگر اصطلاحات جو شریعت سے نہ صرف مغایر ہیں، بلکہ مبہم، غیر متعین اور کثیر الجہات ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جب اسلام کی تہذیبی اور ثقافتی کامیابیوں کو ناپا جا رہا ہو تو اس سیاق و سباق میں خالص اسلامی اصطلاحات ہی کو استعمال کیا جانا چاہیے، مثال کے طور پر مسلمان فقہاء اور علمائے شریعت نے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں جیسے خیر، شر، حق، باطل، عدل اور ظلم، ان کی جگہ موجودہ زمانے کے مغربی الفاظ جیسے ترقی پسند (progressive) اور رجعت پسند (reactionary) وغیرہ سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے۔

کچھ مسلمان لکھنے والوں نے ایسی اصطلاحات استعمال کرنے کی فاش غلطی کی ہے جن کا اسلام کی پوری لغت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس بے احتیاطی سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام پر جاہلی فکر غالب نہ آ جائے اور ہم غلط اصطلاحات میں گم ہو کر اپنی اصل شناخت ہی نہ کھو بیٹھیں۔

اسلامی تاریخ کو از سر نو مرتب کرتے وقت اسلام کی فقہی اصطلاحات کا استعمال اس لیے اشد ضروری ہے کہ اسلام کے اصل منہج کو باقی رکھا جا سکے اور اس کی مخصوص دینی شناخت کو فروغ حاصل ہو، مزید براں اسلامی شرعی اصطلاحات مغربی اصطلاحات کے مقابلے میں زیادہ صاف اور واضح ہیں۔

اب ہم اس سوال سے بحث کرتے ہیں کہ اس سے کیا مراد ہے کہ اسلامی تاریخ پر تحقیق اسی انداز سے کی جائے جس انداز میں محدثین نے حدیث پر تحقیقی کام کیا ہے۔

محدثین کے سامنے مختلف مناہج تھے جن کے معیار پر وہ حدیث کو پرکھتے تھے، اور پھر اس حدیث کا درجہ متعین کیا کرتے تھے، جیسے ''صحیح'' اور ''ضعیف'' وغیرہ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ہم قرونِ اولیٰ کی تاریخ مرتب کریں گے تو اس دور سے متعلق تاریخی روایات کو اس منہج کے مطابق کیوں کر پرکھیں گے؟ یہ روایات اس لحاظ سے حدیث سے مشابہ ہیں کہ ان میں ایک سند

(یعنی راویوں کا سلسلہ) ہوتی ہے اور اس سند کے ساتھ ایک متن متعلق ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ناقد یہ بات معلوم کر سکتا ہے کہ ان افراد کے نام کیا ہیں جنہوں نے یہ واقعہ روایت کیا اور یہ کہ انہوں نے اس واقعہ کو کس انداز میں نقل کیا ہے۔ ان راویوں کے بارے میں معلومات علم رجال کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کتب میں ان افراد کے بارے میں مکمل تفصیلات ملتی ہیں، مثلاً ان کے تمام حالات اور بطور راوی ان کا مقام و مرتبہ۔ مثال کے طور پر ایک حدیث کو ''صحیح'' تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے کسی ''عادل'' اور ''ضابط'' نے روایت کیا ہو۔ ''عادل اور ضابط'' اس مسلمان کو کہتے ہیں جو نہ صرف قابلِ اعتماد کردار رکھتا ہو، بلکہ شاندار اور قابل اعتماد حافظے کا بھی مالک ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس شخص نے کسی دوسرے ''عادل'' اور ''ضابط'' شخص سے اس حدیث کو روایت کیا ہو اور راویوں کے پورے سلسلے میں یہی معیار برقرار رہے، اور یوں سند میں کسی قسم کا نقص یا غیر معیاری خصوصیت نہ پائی جاتی ہو۔ اس طرح ایک تاریخی روایت کے ''صحیح'' ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کے تمام راوی عینی گواہوں سمیت نیک کردار کے حامل افراد ہوں (ان کی یادداشت بہت غیر معمولی طور پر اچھی ہو جس میں غلطی کا کوئی شبہہ نہ ہو)، اور انہیں یہ روایت یا تو زبانی یاد ہو، یا انہوں نے وضاحت کے ساتھ اسے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہو۔ اس کے علاوہ ان کا بیان ایسے تمام دیگر راویوں کے اس طرح کے ملتے جلتے بیانات سے مطابقت بھی رکھتا ہو جو فن اسناد میں مہارت تامہ رکھنے میں معروف ہوں۔ اگر یہ روایت ان راویوں کے بیانات کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو تو اسے ''غریب'' تصور کیا جائے گا، اور اس کی جگہ زیادہ وزنی بیانات کو ترجیح دی جائے گی۔ علاوہ ازیں تاریخی بیانات ہر قسم کے ان دیکھے نقائص سے پاک ہونے چاہییں، جیسے لطیف جھوٹ، ''ارسال'' (جب راویوں کے سلسلے میں سے ایک کڑی گمنام ہو)، یا متن میں عدم تسلسل۔ اگر محدثین کے معیار کے مطابق کوئی تاریخی روایت ''صحیح'' کا درجہ نہیں رکھتی تو پھر اسانید کا جائزہ لینا چاہیے۔ کسی خاص واقعہ کے متعلق تمام بیانات کو جمع کر کے یہ جائزہ لینا چاہیے کہ آیا وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی ایک بیان مختلف اسانید کے ذریعے نقل کیا گیا ہے تو اس سے اس بیان کے مستند

ہونے کا امکان زیادہ قوی ہو جائے گا، کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ متعدد راوی مل کر جھوٹ بولنے کی کوئی سازش کریں گے، یا اتفاقاً وہ ایک ہی جھوٹ بولیں گے۔

جہاں جہاں تاریخی بیانات سے سابقہ پیش آئے، وہاں محدثین کے منہج کو ضرور سامنے رکھا جانا چاہیے۔ محدثین خود بھی اس وقت نرم اور لچک دار انداز اختیار کرتے ہیں، جب وہ تاریخی روایات بیان کرتے ہیں۔ اس بات کا مشاہدہ قدیم ترین اور سب سے زیادہ قابل اعتماد مؤرخین جیسے ابن اسحٰق، خلیفہ بن خیاط اور طبری کے ہاں بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام مؤرخین بہت سی تاریخی روایات نقل کرتے ہیں جو یا تو ''مرسل'' ہیں یا ''منقطع''۔ طبری بھی اکثر و بیشتر بہت سے کمزور اور ناقابل اعتماد راویوں جیسے ہشام بن کلبی، سیف بن عمر التمیمی اور نصر بن مزاحم وغیرہ کی سند پر تاریخی بیانات روایت کرتے ہیں۔ بلاشبہ قدیم مؤرخین نے تاریخی روایات کو جو بغیر کسی چھان پھٹک کے قبول کیا ہے اور انہیں اس سخت تنقیدی معیار پر نہیں پرکھا جس پر حدیث کو پرکھا جاتا ہے تو اس وجہ سے آج کے مؤرخ پر ایک بھاری ذمہ داری آن پڑتی ہے۔ قدیم مؤرخین عموماً اسناد میں ذکر کیے گئے راویوں پر ہی اعتماد کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دورِ جدید کے مسلمان مؤرخ کو اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھانا چاہیے کہ وہ یہ متعین کرے کہ کون کون سی تاریخی روایات ''صحیح'' ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے محدثین کے طریقۂ کار کو سمجھا جائے، پھر اسے تاریخی روایات پر اسی طرح منطبق کیا جائے جس طرح احادیث پر منطبق کیا گیا ہے۔ آج یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا یہ خلیفہ بن خیاط اور طبری جیسے حضرات کے لیے آسان تھا، کیوں کہ وہ لوگ محدثین کے منہج تحقیق سے بخوبی آشنا تھے۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم قدیم مؤرخین کے کسی کارنامے کو گھٹائیں، یا ان کے مرتبے کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے بہر حال ہمارے لیے ابتدائی مواد کا تمام ذخیرہ اسناد کے ساتھ مہیا کیا ہے، اور اسی وجہ سے ہم اسے پرکھنے کے قابل ہو سکے ہیں، خواہ یہ کتنا ہی مشکل کام ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ ''صحیح'' روایات کو تمام ناقص روایات سے چھانٹ کر الگ کر دینے کے بعد اگلا قدم کیا ہوگا؟

ہمیں سب سے پہلے ''صحیح'' روایات کو قبول کرنا ہوگا، اس کے بعد ''حسن'' کو اور اس کے بعد وہ تمام ''ضعیف'' روایات قبول کی جائیں گی جن کی تائید دوسری آزاد ''اسانید'' سے ہوتی ہے اور اس وجہ سے انہیں ''موٗیّدہ'' (تائید شدہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس طریقۂ کار کو اپنا کر قدیم اسلامی تاریخ کی واقعاتی مشکلات کا از سرِ نو حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں تعارض پایا جائے تو پھر قوی ترین حدیث کو لیا جائے گا، لیکن ''ضعیف'' حدیث جس کی کہیں سے نہ تو تائید ملتی ہو اور نہ اسے کسی اور ذریعے ہی سے تقویت ملتی ہو، اسے اس خلا کو پر کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا جو کسی ''صحیح'' یا ''حسن'' حدیث سے پُر نہ کیا جا سکتا ہو، لیکن یہ طریقہ صرف اس وقت اختیار کیا جائے گا جب اس مسئلے کا تعلق عقیدے یا شریعت سے نہ ہو۔ اس سلسلے میں عام اصول یہ ہے کہ بنیادی عقائد اور شرعی احکام سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں انسان کو نہایت سخت اور متشدد ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا زمانہ قانونی نظائر سے بھرا ہوا ہے۔ خلفائے راشدین اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے تھے۔ فتوحات کے نتیجے میں اسلامی ریاست میں وسعت پیدا ہوئی تو گوناگوں مسائل نے جنم لیا۔ ان مسائل کے متعلق خلفائے راشدین کے جو فیصلے سامنے آتے ہیں، انہیں اپنے لیے مثال بنا کر ہمیں ان کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے۔

مؤرخ کو صرف اس وقت نرم انداز اختیار کرنا چاہیے، جب اس کے سامنے شہروں کی تعمیر، یادگار مقامات، آبپاشی کی نہروں کے بارے میں روایات ہوں، یا مثال کے طور پر ایسی روایات جو جنگوں اور مجاہدین کی شجاعت اور ایثار وغیرہ کے متعلق تفصیلات بیان کرتی ہوں۔

جب ہم حدیث کے منہج کو اختیار کرنے کا اصول اپنا لیں گے تو پھر ہم سیرت اور خلفائے راشدین کے عہد کا مطالعہ کرنے کی غرض سے احادیث کے وسیع ذخیرے کو استعمال کر سکیں گے۔ ہم ایسا اس لیے کریں گے کہ سیرت اور عام تاریخ کے مقابلے میں محققین نے حدیث کا جائزہ زیادہ باریک بینی کے ساتھ لیا ہے، مثال کے طور پر **صحیح بخاری** اور **صحیح**

مسلم حدیث کی وہ کتب ہیں جن کو مستند مانا گیا ہے اور ان دونوں کتابوں میں جو حدیث بھی شامل کی گئی ہے وہ ''صحیح'' سمجھی جاتی ہے۔ قدیم محققین تو غیر معمولی حافظے کے مالک تھے ہی، جدید مصنفین کے دقیق مطالعے سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان دونوں کتب میں دی گئی جزوی تفصیلات بھی ہر قسم کی تنقید سے پاک ہیں، کیوں کہ ان کا مأخذ معروف ہے اور یہ بات صرف بخاری اور مسلم تک ہی محدود نہیں ہے۔ ان اسباب کی بناء پر بخاری اور مسلم نے سیرت اور خلفائے راشدین کے عہد کے بارے میں جو کچھ روایت کیا ہے، ہم اسے مستند سمجھ کر قبول کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم بقیہ چار کتب حدیث اور موطا امام مالک کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، کیوں کہ یہ کتب بھی مقبولیت اور اعتماد کے اعلیٰ درجے کی حامل ہیں، اگرچہ مستند ہونے کے لحاظ سے وہ اس پائے کی نہیں ہیں، جیسے صحیحین (یعنی **صحیح بخاری** اور **صحیح مسلم**)، کیوں کہ یہ کتابیں ''ضعیف'' روایات سے مکمل طور پر پاک نہیں ہیں۔

کتب حدیث میں سیرت کے متعلق معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے، اگرچہ سیرت کے تمام واقعات کا ان میں احاطہ نہیں کیا گیا۔ اس طرح حدیث کا منہجِ تنقید اور سیرت کے متعلق روایات اور عمومی تاریخ پر اس منہج کو لاگو کرنے کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جب نامور علمائے حدیث، جیسے حافظ ابن سید الناس نے **عیون الاثر فی المغازی والشمائل والسیر** میں اور حافظ ذہبی نے **تاریخ اسلام** میں سیرت کے متعلق تحقیقی کام کو جمع کیا تو انہوں نے خصوصی طور پر ان چھ کتابوں سے استفادہ کیا: **صحیح بخاری**، **صحیح مسلم**، **سنن ابی داؤد**، **جامع ترمذی**، **سنن نسائی** اور **سنن ابن ماجہ**، تاہم انہوں نے دیگر کتب سیرت اور عمومی اسلامی تاریخ کے مآخذ کی طرف بھی رجوع کیا۔

اس موقع پر ایک اہم حقیقت کی نشان دہی کرنا بے حد ضروری ہے، کیوں کہ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے تو سیرت اور خلافت کے بارے میں ہمارے تصورات غلط رخ اختیار کر سکتے ہیں۔ دراصل کتب حدیث ان روایات کی تائید اور تصدیق کرتی ہیں جو کتب سیرت اور تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بات سیرت کی دو کتابوں، یعنی محمد بن اسحٰق بن یسار (م ۱۵۱ھ)

اور موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۶ھ) کی تصانیف کے بارے میں بطور خاص درست معلوم ہوتی ہے۔ اول الذکر کتاب جو ہم تک پہنچی ہے، وہ سیرت ابن ھشام کے نام سے معروف ہے اور مؤخر الذکر جو ابن ہشام کی نظیر ہے، واقدی کی مغازی ہے جن پر محدثین روایات گھڑنے کا الزام لگاتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کی سند کو بہت زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے، اگرچہ محدثین کرام اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سیرت میں ان کا علم بڑا وسیع اور زرخیز تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ واقدی کے کام کا محتاط مطالعہ بتاتا ہے کہ محدثین کرام کی رائے ان کے بارے میں کچھ ایسی غلط نہیں ہے، بے شمار راوی ایسے ہیں جن پر واقدی نے اعتماد کیا ہے، لیکن علم الرجال کی کتابوں میں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

بہت سے مستشرقین کے ہاں ایک بڑا غلط رجحان یہ پایا جاتا ہے (اور بہت سے مسلمان مؤرخین نے بھی ان کے اس رجحان کو خاموشی کے ساتھ تسلیم کیا ہے) کہ وہ واقدی کی مغازی کو اتنا اونچا درجہ دیتے ہیں کہ اسے بعض اوقات ابن اسحٰق کی سیرت پر بھی ترجیح دینے لگتے ہیں، دراں حالیکہ سیرت ابن اسحق واقدی کی کتاب سے کہیں زیادہ مستند اور واضح ہے۔ ابن اسحٰق نے جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ بہت سے پہلوؤں سے احادیث کی کتب سے مطابقت رکھتی ہیں۔ کتب حدیث اور کتب سیرت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کتب سیرت میں بہت سی وہ روایات شامل ہوتی ہیں جن کی اسانید یا تو ''مرسل'' ہیں، یا ''منقطع''، لیکن یہی روایات اکثر و بیشتر کتبِ حدیث میں مکمل اسانید کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ یہ حقیقت کتبِ سیرت میں پائی جانے والی روایات کی تائید کرتی ہے۔

تاہم ہمیں یقینی طور پر سیرت نگاری میں کچھ تبدیلیاں بھی لانا پڑیں گی اور غیر مستند چیزیں چھوڑنا ہوں گی۔ ہم کتب سیرت کو کتب حدیث کے مقابلے پر رکھ کر ان کا جائزہ لیں گے اور تاریخی روایات کو بھی انہی اصولوں پر جانچیں اور پرکھیں گے جن پر احادیث کو پرکھا گیا ہے۔ آئندہ آنے والے ابواب میں ہم ان نتائج پر بحث کریں گے جو حدیث کے منہج کو تاریخ نگاری کے میدان میں اختیار کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہیں وہ نتائج جو میں نے اس موضوع پر

اپنے مطالعے کے دوران میں محسوس کیے ہیں:

۱- سیرت کے بارے میں ہمیں جو علم حاصل ہے، اس کے مستند ہونے کا یقین

یہ بلاشبہ اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان رحمت کا ایک پہلو ہے کہ اس نے ان کے لیے اپنے نبی کی سیرت کو محفوظ فرما دیا ہے، تا کہ وہ اسے اپنے لیے عملی نمونہ بنا کر ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر سکیں۔

۲- اس سلسلے میں نئی اور جدید معلومات کا اضافہ

یہ نئے اضافے جو کتبِ حدیث میں دیے گئے ہیں، اس پہلو سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ کتبِ سیر و تاریخ محض مغازی کے تذکرے تک محدود تھیں اور ان میں سیرت کے معاشرتی، معاشی اور انتظامی پہلوؤں پر زیادہ تفصیلات نہیں ملتی تھیں۔

۳- مختلف موضوعات کی توضیح

مثال کے طور پر بنو مصطلق کے خلاف جو غزوہ پیش آیا، اس کے بارے میں مؤرخین اور محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام بخاری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اوپر اچانک حملہ فرمایا، تاہم کتبِ سیرت کا بیان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں پہلے سے جنگ کی دھمکی دی تھی، اور یہ کہ انہوں نے جنگ کی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ مزید براں یہ لڑائی درحقیقت مریسیع کے کنویں کے قریب پیش آئی۔

اس صورت حال میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ دشمن کو پہلے سے جنگ کی دھمکی دینے کے متعلق اسلام کا نقطۂ نگاہ کیا ہے؟ اس معاملے میں ہمیں فقہاء کی تین مختلف آراء نظر آتی ہیں:

(الف) دشمن کو فوری حملے سے خبردار کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ یہ رائے مازری اور قاضی عیاض کی ہے۔

(ب) تمام حالات میں یہ ضروری ہے کہ دشمن کو حملے سے پہلے خبردار کر دیا جائے۔ یہ رائے امام مالک اور بعض دیگر فقہاء کی ہے۔

(ج) وہ دشمن جسے ابھی دعوت اسلام نہیں دی گئی، اسے حملے سے خبر دار کرنا ضروری ہے، لیکن وہ دشمن جس تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے (اور وہ اسے مسترد کر چکا ہے)، اسے حملے سے آگاہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس رائے کے حامل امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور ان کے متبعین ہیں اور ان تینوں آراء میں یہ آخری رائے ہی قوی تر ہے۔

جہاں تک بنو مصطلق کا تعلق ہے، ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی، اس لیے امام بخاری کی یہ روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اوپر اچانک حملہ فرمایا تھا، اس رائے سے پوری مطابقت رکھتی ہے جو مضبوط ترین ہے اور سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، لہٰذا ابن اسحٰق اور دیگر سیرت نگاروں کی رائے کو ترجیح دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ اس رائے کو محض اس لیے ایک دلیل کے طور پر ہی لانا چاہیے کہ امام بخاری کی رائے کے مقابلے میں وہ زیادہ دل کو لگتی ہے، جب کہ وہ قرآن کی اس آیت سے بھی متعارض ہے: ''اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر'' (الانفال ۸: ۵۸)۔

۴۔ سیرت کے بعض موضوعات میں مختلف تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں عصر حاضر میں کسی حد تک غلط سمجھا گیا ہے، کیوں کہ عصرِ حاضر کا تحقیقی کام محض سیر اور تاریخ کی بنیاد پر کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ''نظام مواخات'' اور وہ دستاویز جو رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے آغاز میں مدینے کے دستور کی حیثیت سے مرتب کرائی، لیکن ہمیں اتنی بڑی تبدیلی بھی نہیں لانا چاہیے جو سیرت کے اس ڈھانچے کو ہی تبدیل کر دے جو قدیم مصنفین کا اختیار کردہ ہے اور چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے مابین معروف رہا ہے۔ جب ہم کتبِ سیرت اور کتبِ حدیث کا ایک تقابلی مطالعہ کریں گے تو یقیناً ہم تفصیلات کا ایک وسیع ذخیرہ ایسا پائیں گے جو دونوں قسم کی کتب میں مشترک ہوگا۔ یہ اس بات کی ایک علامت ہے کہ رب کریم نے اپنے نبی کی سیرت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ فرمایا ہے تاکہ یہ ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں کے لیے ایک نور بن کر رہنمائی کرے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے تابعین اور

ان کے تلامذہ میں ایسے نمایاں محدثین پیدا فرمائے جنہوں نے ابتداء ہی میں سیرت کو صفحاتِ قرطاس پر محفوظ کرلیا تھا۔ ان لوگوں نے ان صحابۂ کرامؓ سے سیرت کا تمام مواد حاصل کیا جنہوں نے سیرت کے تمام واقعات کا بذاتِ خود نہ صرف مشاہدہ فرمایا تھا، بلکہ ان میں شریک رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کے واقعات کے وجود میں آنے اور ان واقعات کو محفوظ کرنے کے درمیان کوئی خلا پیدا نہیں ہوا۔ اگر ایسا کوئی خلا واقع ہوا ہوتا تو یقیناً ان واقعات کے متون میں یا تو تحریف ہو چکی ہوتی، یا ان میں اضافے ہو جاتے، اور یا یہ حقائق سرے سے گم ہو چکے ہوتے۔ مزید براں اگر ہم سیرت نگاروں کے ناموں کا جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو محدث بھی ہیں۔ وہ صرف واقعات نقل کرنے والے قلم کار ہی نہیں، بلکہ انہیں سیرت کے استنادی پہلو سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے بہت سے مناہج کو ترقی دی تھی۔ ان کا انداز سنجیدہ، علمی اور ہر قسم کی مبالغہ آمیزی سے پاک ہے۔ یہ حضرات محض کتابی علم، جھوٹی شہرت اور بناوٹی بیانات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

۲

محدثین کے اصول اختیار کرنے میں لچک کی ضرورت

بلاشبہ کسی تاریخی بیان کو قبول کرنے کے لیے ان شرائط پر اصرار کرنا غیر ضروری ہے جو حدیث کے مستند ہونے کے لیے لازمی ہیں۔ وہ بیانات جو ان سخت شرائط پر پورے اتریں گے، وہ تاریخِ اسلام کے تمام واقعات کی تفصیلات اور مختلف ادوار کا احاطہ کرنے میں ناکام رہیں گے اور اس سے لازمی طور پر تاریخی بیانات میں بڑے بڑے خلا واقع ہوں گے۔ اگر ہم اس صورتِ حال کا مقابلہ دیگر اقوام کی تاریخوں کے ساتھ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ دنیا کی تمام تاریخیں اس قسم کے خلا سے مملو ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ ان تاریخوں کی بنیاد اکثر و بیشتر مجہول اور صرف ایک ہی نوعیت کے بیانات پر ہے، اس لیے اسلام کے اولین دور کے بعد آنے والے ادوار کے بارے میں یہ بات کافی ہے کہ مؤرخ کی امانت اور اس کی یادداشت پر ہمیں یقین ہو جائے تاکہ جو کچھ اس نے محفوظ کیا ہے، اس کے استناد کو تسلیم کیا جا سکے۔ نقدِ حدیث کے اصول کو اس وقت استعمال کرنا چاہیے، جب مختلف مؤرخین کے بیانات میں مطابقت اور ہم آہنگی یا تسلسل نہ ہو۔

ایک مؤرخ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دیانت دار، امانت دار اور نیکوکار ہونے کی تمام شرائط پوری کرتا ہو، اسی صورت میں دیگر اقوام اور ان کے کردار کے بارے میں اس کے بیانات کو قابل قبول سمجھا جائے گا۔ علاوہ ازیں تاریخِ اسلام کے تمام ادوار کو اسلام ہی کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جانا چاہیے۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر ہم تاریخ کے کسی خاص دور کو نئے سرے سے اسلام کی روشنی میں جانچیں تو اس دور کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر میں واضح تبدیلی آ سکتی ہے، مثال کے طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے معاملے میں یہی صورت اس وقت پیش آئی جب

چار سو مسلمان مؤرخین نے تاریخی ریکارڈ کا از سرنو جائزہ لیا، اور اس کی تاریخی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم اموی، عباسی اور دیگر تاریخی ادوار کا نئے سرے سے مطالعہ کریں اور ان ادوار کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں تو شاید ان ادوار کے بارے میں ہمارا جو موجودہ تصور ہے، اس میں خاصی تبدیلی آئے، یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ ہماری تاریخ نگاری میں بعض واقعات کے ضمن میں تشویش ناک حد تک تحریفات کی گئی ہیں۔

میں آج کے مسلمان مؤرخین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ تاریخِ اسلام کا عمیق مطالعہ کریں جس کا مقصد تاریخ کی اسلامی تعبیر و توضیح اور اس کے نمایاں خدوخال کو اجاگر کرنا ہو۔ اس مطالعے کے ذریعے ناقدانہ منہج کی وہ جہتیں متعین کی جائیں جن سے تاریخِ اسلام کے متعلق تمام بیانات کا معروضی جائزہ لیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی نوجوان نسل کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ جب وہ تاریخی واقعات اور اسلامی تاریخ کی جلیل القدر شخصیات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو محض چند تاریخی کتب پر اکتفاء نہ کریں اور نہ ان تاریخی کتابوں کو کڑے تنقیدی معیار پر پرکھے بغیر قبول کریں۔ بصورتِ دیگر انہیں تاریخ اسلام کی ایک تحریف شدہ تصویر قبول کرنے کا خطرہ مول لینا پڑے گا، کیوں کہ جن راویوں پر طبری اور دوسرے مؤرخین نے اعتماد کیا ہے، وہ زیادہ تر اپنے ذاتی میلانات اور تعصّبات کے زیرِ اثر تھے اور مختلف سیاسی اور فرقہ وارانہ رجحانات کے دباؤ میں تھے۔ اموی اور عباسی ادوار کے واقعات رقم کرنے والے تاریخ نگار زیادہ تر شخصی تصورات اور تعصبات کا شکار رہے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر کامل ایمان رکھنے والے مؤرخین (جو ان اثرات سے واقف اور ان کا صحیح ادراک رکھتے ہیں، جو اسلام نے تاریخ پر مرتب کیے ہیں اور جو مستقبل میں بھی بدستور مرتب ہوتے رہیں گے) کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تاریخِ اسلام کی تدوینِ نو کا بیڑا اٹھائیں۔

مآخذِ سیرت

سیرت کے مطالعے کے لیے مختلف مآخذ ہیں جن میں سے کچھ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں قرآن، حدیث، کتبِ شمائل و دلائل، کتبِ سیرت اور عام تاریخ کی کتابیں شامل

ہیں۔ان کے علاوہ کچھ مآخذ ایسے ہیں جنہیں ثانوی اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ان میں وہ کتابیں شامل ہیں جو خاص طور پر سیرت یا تاریخ سے متعلق تو نہیں ہیں، لیکن اس قسم کے موضوعات پر مشتمل ہیں جو سیرت کے مطالعے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ثانوی نوعیت کے مآخذ میں، مثال کے طور ان کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو ادب، شاعری، سوانح، رجال، جغرافیے، فقہ، علم الانساب اور لغات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اگر سیرت کا مطالعہ کرتے وقت ان تمام مآخذ کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو سیرت کی ایک زیادہ مکمل اور مفصل تصویر سامنے آئے گی۔

میں کوشش کروں گا کہ ایسے تمام مآخذ کی ایک زیادہ واضح تصویر پیش کروں، ان کی صحیح قدر و قیمت کو واضح کروں اور یہ بتاؤں کہ ان سے کس طرح زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلی چیز جو ایک محقق کے سامنے رہنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام مآخذ ایک سطح کے اور ایک جیسے معیار کے نہیں ہیں۔ ان کے مستند اور قوی ہونے کی حیثیت میں فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب کے ساتھ ایک جیسا معاملہ نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا کسی قرآنی آیت یا حدیث کا موازنہ کسی بھی تاریخی یا ادبی نوعیت کی روایت سے نہیں کیا جا سکتا۔(۱) ان تمام مآخذ کی اپنی اپنی قدر و قیمت کو پہچاننا پڑے گا اور پھر ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ درجے پر رکھنا ہوگا۔

مآخذِ سیرت کی فہرست میں اعلیٰ ترین درجہ، ظاہر ہے کہ قرآن کریم کو حاصل ہے۔ قرآن کریم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا کلامِ برحق ہے جو اس نے اپنے رسول ﷺ پر وحی کی صورت میں الفاظ اور معانی کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اس کتاب میں عقیدے اور شریعت کے متعلق احکام شامل ہیں۔ اس میں وہ احکام اور ہدایات بھی شامل ہیں جو ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل و ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔(۲) قرآن کریم کی آیاتِ احکام ان معاشرتی، معاشی اور سیاسی امور کی بابت قانون سازی کرتی ہیں جن کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے پہلی اسلامی ریاست کی قیادت فرمائی۔

قرآن کریم میں ہمیں جا بجا سیرت کے مختلف واقعات، مثلاً بدر، احد، خندق اور حنین کا حوالہ ملتا ہے۔(۳) ان مقامات پر ان حالات کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن میں یہ غزوات پیش

آئے، بالخصوص ان واقعات کے نفسیاتی پہلو ایسے ہیں جو اس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہمیں کسی اور مآخذ میں نہیں ملیں گے۔

قرآن کریم نے حجاز میں مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین مادی اور فکری تصادم کو بہت محکم اور نپے تلے انداز میں بیان کیا ہے۔(۴) گزشتہ اقوام کے بارے میں قرآن کریم میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کی وجہ سے مسلمانوں کا تاریخی تناظر بہت وسیع ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تاریخی مطالعہ ماضی کے پیغمبروں اور گزشتہ زمانوں کی اقوام کو محیط ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب سے باہر رونما ہونے والے واقعات، مثلاً رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ، کے ساتھ مسلمانوں کا جو تعلق رہا ہے، اس نے مسلمانوں کی اس جانب رہنمائی کی کہ وہ روم، ایران، ترکی، حبشہ اور دیگر اقوام و ملل کی تاریخوں کا مطالعہ کریں اور اس مقصد کے لیے مواد جمع کریں۔(۵)

تاہم ہمیں یہ امید نہیں رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں ہمیں تمام تاریخی واقعات کی تفصیلات ملیں گی، کیوں کہ قرآن کریم بنیادی طور پر تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دستورِ حیات ہے۔ مزید براں بے شمار قرآنی آیات ایسی بھی ہیں جن کا سیاق و سباق اور زمانۂ نزول جاننا بے حد مشکل ہے جس کی دو وجوہ ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ روایات میں اس قسم کی معلومات بالعموم ناپید ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر بالفرض اس بارے میں کوئی معلومات میسر بھی ہوں تو وہ بعض اوقات باہم متعارض ہوتی ہیں۔(۶) اس سلسلے میں مستند اور غیر مستند روایات کو الگ الگ کرنا پڑے گا، اس کے باوجود اگر کوئی تضاد باقی رہا تو پھر ان روایات کا تجزیہ کرکے اور ان کے شکوک و شبہات کو دور کرکے روایات کی تصدیق کی جائے گی۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہم قرآن کریم سے اس وقت تک کماحقہٗ استفادہ نہیں کر سکتے، جب تک ہم مستند کتبِ تفسیر کی طرف رجوع نہ کریں، بالخصوص وہ تفاسیر جو ''تفسیر بالماثور''، یعنی روایات کی بنیاد پر لکھی جانے والی تفاسیر کے طور پر معروف ہیں، مثلاً تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ۔ اسی طرح ان کتب کی طرف بھی رجوع

کرنا ہوگا جن میں ناسخ ومنسوخ، اسباب نزول اور قرآن کے دیگر علوم کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

موجودہ زمانے کے بہت سے مؤرخین نہایت فخر کے ساتھ ان کتب کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن وہ عربی زبان کے معانی اور اسلوب کے معاملے میں محض اپنی سمجھ پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ شدید غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں، مثال کے طور پر اس قرآنی آیت کو سمجھنے میں مستشرقین نے سخت ٹھوکر کھائی ہے: **هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم** (وہی ہے جس نے اٹھایا اَن پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا) (**الجمعہ ۶۲:۲**)۔

مستشرقین کا خیال ہے کہ لفظ ''امی'' سے مراد دین سے ناواقفیت ہے، جبکہ یہ محض لکھنے اور پڑھنے سے عدمِ واقفیت پر منطبق ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جابجا حضرت محمد ﷺ کو ''نبی امی'' کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے (مثال کے طور پر، **الاعراف ۷:۱۵۷**)۔

یہ خیال قطعی طور پر غیر عقلی ہے کہ ایک نبی جو دین دے کر بھیجا گیا ہو، اس سے بذات خود ناواقف ہو۔

ایک مفسر کے لیے ضروری ہے کہ اس کا فکری رجحان مستند تفاسیر کی جانب ہو، تاکہ قرآنی الفاظ کو ٹھیک ٹھیک معانی پہنائے جائیں۔ قرآن کے پیغام کو اپنی ذاتی خواہشات یا رائے یا کسی خاص مکتبِ فکر کا پابند نہ بنایا جائے، اور یہی علمی دیانت کا تقاضا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک حدیثِ مبارک میں اپنی امت کو اس بارے میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''جو شخص قرآن کریم میں اپنی رائے شامل کرتا ہے، یا اس کے متعلق بغیر علم کے کوئی بات کہتا ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے''۔ (۷)

علمِ سیرت کا مطالعہ کرتے وقت حدیث کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث اسلامی عقائد اور اخلاق کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ ''احکام'' کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے اندر عبادات کے تمام مسائل بھی آ جاتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں سیاسی، مالیاتی اور انتظامی امور بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔ علم

حدیث کے مطالعے کے بغیر اسلام کی تصویر نامکمل رہتی ہے اور حدیث میں بیان کردہ تمام مسائل کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی انتظامی، اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی سے تو تھا ہی، اس کے علاوہ ان مسائل کا تعلق آپ کے بعد آنے والے عہد سے بھی ضرور تھا، اس لیے آپ کی سنت کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ بہت گہرا تھا۔ اسی طرح چند کتب احادیث، مثلاً **صحیح بخاری** میں مغازی اور سوانح کے متعلق علیحدہ ابواب ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتبِ احادیث میں سیرت کے بارے میں جو مواد پایا جاتا ہے، وہ مستند ہے، اور اس پر بھرپور اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور اسے تاریخ کی عام کتابوں اور مغازی پر ترجیح دی جا سکتی ہے، بالخصوص اگر یہ مواد صحیحین میں پایا جاتا ہو۔ یہ کتبِ حدیث محدثین کی اس ان تھک محنت کا نچوڑ ہیں، جو انہوں نے حدیث کو جانچنے، پرکھنے اور اس کے متن اور سند کو تنقید کے کڑے معیار سے گزارنے میں انجام دی۔ صحت کی جس مضبوط کسوٹی پر حدیث کو پرکھا گیا ہے، اس معیار پر تاریخ کو نہیں جانچا گیا، لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کتبِ حدیث کی نوعیت یہ ہے کہ وہ مغازی اور سیرت کے واقعات پر کماحقہٗ روشنی نہیں ڈالتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتبِ حدیث کے ذریعے حالات و واقعات کی مکمل تصویر کشی نہیں کی جا سکتی، لہٰذا اگر مصنف یہ چاہتا ہے کہ اسے کسی الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ان کتبِ سیرت کے ذریعے اپنی تصویر کو مکمل کرے جو استناد کے حوالے سے اعلیٰ پائے کی کتابیں مانی جاتی ہیں۔ (۹)

ہماری کتبِ احادیث جس انداز میں مرتب کی گئی ہیں، ان کی ترتیب یا تو ان صحابۂ کرامؓ کے ناموں کے مطابق عمل میں لائی گئی ہے جنہوں نے ان احادیث کو روایت کیا ہے، جیسے مسانید جن میں عظیم ترین **مسند امام احمد ابن حنبل** ہے، یا ان کتب کی ترتیب و تدوین ان کے نفسِ مضمون کے مطابق عمل میں لائی گئی ہے، جیسے صحاح ستہ ہیں۔ ہر دو نوعیت کی کتب میں تاریخی اور زمانی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مورخ کو حدیث سے استفادہ کرنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ کی وہ کتابیں جو قدامت کے لحاظ

سے ممتاز ہیں، بڑی حد تک اس کمی کی تلافی کر دیتی ہیں۔ قدیم ترین کتب احادیث جو ہم تک پہنچی ہیں وہ **موطأ امام مالک**، بخاری اور مسلم کی **صحیحین**، **سنن ابی داؤد**، **جامع ترمذی**، **سنن نسائی**، **سنن ابن ماجہ**، **سنن الدارمی** اور امام احمد بن حنبلؒ کی **مسند** ہیں۔ (۱۰)

دلائل نبوت اور شمائل رسول پر مشتمل کتب (یعنی وہ کتب جن میں نبوت کے دلائل (۱۱) اور رسول اللہ ﷺ کے خصالِ حمیدہ بیان کیے گئے ہیں) ان معجزات اور علامات پر روشنی ڈالتی ہیں جن سے حضور ﷺ کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ کتب احادیث ان ابواب پر بھی مشتمل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت، آپؐ کی ذاتی عادات و خصائل اور آپؐ کی نبوت کے دلائل و براہین سے بحث کرتے ہیں، لیکن جن قدیم مصنفین نے خصوصی طور پر ان موضوعات کا احاطہ کیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

- محمد بن یوسف الفریابی (م۲۱۲ھ)—یہ ایک محدث ہیں اور ان کی کتاب **دلائل النبوۃ** ایک قابل اعتماد کتاب ہے۔
- علی بن محمد المدائنی (م۲۱۵ھ)—ان کی کتاب **آیات النبی** کے نام سے ہے۔ (۱۲)
- داؤد بن علی الاصبہانی (م۲۷۰ھ)—ان کی کتاب **اعلام النبوۃ** ہے۔
- ابن قتیبہ (م۲۷۳ھ)—ان کی کتاب **اعلام رسول اللہ** ہے۔
- ابن ابی حاتم (م۳۲۷ھ)—ان کی کتاب کا نام بھی **اعلام النبوۃ** ہے۔
- ابوبکر بن ابی الدنیا (م۲۸۱ھ)
- ابوعبداللہ ابن مندہ (م۳۹۵ھ)
- ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی (م۴۱۵ھ)—ان کی کتاب **تثبیت دلائل النبوۃ** طبع ہو چکی ہے۔
- ابوعباس جعفر بن محمد المستغفری (م۴۳۲ھ)

○ ابوبکر احمد بن حسین البیہقی (م ۴۵۸ھ)—ان کی کتاب **دلائل النبوہ و معرفۃ احوال صاحب الشریعۃ** زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ یہ چند ضعیف اور موضوع احادیث کے ساتھ ساتھ صحیح اور حسن احادیث پر مشتمل ہے۔ ذہبی نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ (۱۳)

○ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (م ۴۵۰ھ)—اس موضوع پر ان کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

○ ابوالقاسم اسمٰعیل الاصفہانی (م ۵۳۵ھ)

○ عمر بن علی بن الملقن (م ۸۰۴ھ)— ان کی کتاب **خصائص افضل المخلوقین** کے نام سے ہے۔

○ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)—ان کی کتاب **الخصائص الکبریٰ** کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں سیرت، دلائل اور شمائل جیسے موضوعات شامل ہیں۔

خصائص نبوی ﷺ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن میں نے صرف چند ایک کا ہی ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ اس فہرست میں ان تمام کتب کو شامل نہیں کیا گیا جو اس موضوع پر لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر بے حد کام کیا گیا ہے۔

شمائل کی کتب وہ ہیں جو اخلاق، آداب اور رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک کے متعلق ہیں۔ وہ قدیم ترین مصنفین جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ اس موضوع پر کام کیا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

○ داؤد بن علی الاصبہانی (م ۲۷۰ھ)— ان کی کتاب **صفۃ اخلاق النبی** کے نام سے ہے۔ (۱۴)

○ حافظ ترمذی (م ۲۷۹ھ) — ان کی کتاب **الشمائل النبویۃ و الخصائص المصطفویہ** مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

○ ابوشیخ عبداللہ بن محمد بن حیان الاصبہانی (م ۳۶۹ھ)—ان کی کتاب **صفۃ اخلاق النبی** کے نام سے ہے۔

○ ابوشیخ عبداللہ بن محمد بن حیان الاصبہانی (م ۳۶۹ھ)—ان کی دوسری کتاب اخلاق النبی و آدابہ شائع ہوچکی ہے۔

○ ابوسعید عبدالملک بن محمد نیشاپوری (م ۴۰۶ھ)— ان کی کتاب کا نام کتاب شرف المصطفی ہے۔

○ ابوعباس المستغفری (م ۴۳۲ھ)—ان کی کتاب شمائل النبی ﷺ کے نام سے موجود ہے۔

○ قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) کی کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفی۔ یہ کتاب بھی شائع شدہ ہے اور جامع ترین کتب میں سے ایک ہے۔

○ حافظ سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب مناهل الصفافی تخریج احادیث الشفاء میں ان احادیث کے مآخذ کی وضاحت کی ہے جو کتاب الشفاء میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کی یہ کتاب بھی شائع ہوچکی ہے۔

علماء کی خاصی تعداد نے الشفاء کی شروح لکھی ہیں جن میں درج ذیل علمائے کرام شامل ہیں:

○ علی قاری (م ۱۰۱۴ھ)۔ ان کی کتاب شرح الشفاء شائع ہوچکی ہے۔

○ الخفاجی (م ۱۰۶۹ھ)۔ ان کی کتاب کا نام ہے: نسیم الریاض فی شرح الشفاء للقاضی عیاض۔

○ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کی تصنیف جو مطبوعہ ہے، شمائل الرسول کے نام سے موسوم ہے۔

صحت کے اعتبار سے سیرت کی امہاتِ کتب کا درجہ، ظاہر ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد ہی آتا ہے، البتہ کتبِ سیرت کی شاندار علمی قدر و قیمت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدیم ترین کتبِ سیرت بالکل ابتدائی زمانے میں ہی تحریری شکل میں آچکی تھیں اور یہ تابعین کا زمانہ تھا۔ اس وقت صحابہ کرامؓ کی پوری ایک نسل موجود تھی جس نے سیرت نگاری پر کوئی

تنقید نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ لکھا گیا، اسے صحابہ کرامؓ نے درست تسلیم کیا۔ صحابہ کرامؓ دنیا کی وہ خوش نصیب ترین جماعت تھے جو نہ صرف سیرت النبی ﷺ کے دور سے بذاتِ خود گزرے تھے، بلکہ اس دور کے تمام واقعات میں انہوں نے بنفسِ نفیس شرکت بھی کی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی محبت اور جاں نثاری کے جذبے سے سرشار تھے اور ان کے دلوں میں آپؐ کی ایک ایک سنت کا اتباع کرنے اور آپ کی ہر ایک ادا کی پیروی کرنے کی تڑپ موجود تھی۔ یہی وہ ٹھوس اور بنیادی وجہ تھی جو اس امر کا باعث بنی کہ صحابہ کرامؓ نے علم سیرت کے مطالعے کو بڑے پیمانے پر وسعت دی اور اس کی حفاظت کا ذریعہ بنے۔ سیرت نبوی ﷺ دراصل اسلامی تعلیمات کی عملی تشکیل کا نام تھا۔

دورِ جدید میں متعدد ایسے تحقیقی کام سامنے آئے ہیں جن میں اُن تابعین کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے جنہوں نے سیرت نگاری کے میدان میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جنہوں نے بعد میں ان کی پیروی کی، (۱۵) لیکن جرح و تعدیل کے متعلق ان کا پیمانہ کیا تھا، اس کی وضاحت ہمیں نہیں ملتی۔ ان کے کام کی نوعیت حدیث کے مطالعے سے مختلف تھی، انہوں نے مصطلح الحدیث کے قواعد وضوابط کو سامنے رکھے بغیر یہ کام انجام دیا۔ ان ابتدائی سیرت نگاروں کے نام درج ذیل ہیں:

- ابان بن عثمان بن عفانؓ (م ۱۰۱-۱۰۵ھ) ـــ یہ تابعی ہیں اور ایک قابل اعتماد محدث ہیں۔
- عروہ بن زبیر بن (۱۶) عوامؓ (م ۹۶ھ) ـــ یہ بھی تابعی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک قابل اعتماد محدث بھی۔ ان کا شمار مدینے کے معروف ترین فقہاء میں کیا جاتا ہے۔
- عامر بن شراحیل الشعبی (م ۱۰۳ھ) ـــ یہ ایک قابل اعتماد عالم حدیث ہیں۔ انہوں نے مغازی پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ (۱۷)
- عاصم بن عمر بن قتادہ (م ۱۱۹ھ) ـــ یہ ایک قابل اعتماد محدث ہیں۔
- محمد بن مسلم بن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) ـــ اپنے زمانے کے عظیم ترین محدثین کرام میں سے ایک ہیں۔ جرح و تعدیل کے نامور علماء نے انہیں قابل اعتماد تسلیم کیا ہے۔ یہ پہلے شخص ہیں

جنہوں نے ایک ہی مقام سے اسناد جمع کرنے کا آغاز کیا، تا کہ واقعات کی ترتیب اور تسلسل قائم رہے اور اسناد کی وجہ سے واقعات کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ زہری پر یہ تنقید کی جاتی تھی کہ وہ اپنے متعدد اساتذۂ کرام سے حدیث روایت کیا کرتے تھے، لیکن یہ نشاندہی نہیں کرتے تھے کہ کس شیخ سے کون سی حدیث روایت کی گئی ہے۔ یہ تنقیدی نکتہ جسے قاضی عیاض نے متقدمین کی جانب سے نقل کیا ہے، نووی اور عراقی جیسے عظیم علماء نے اسے یکسر مسترد کر دیا ہے، اور اس کی وضاحت یہ کی ہے کہ ان کے اس عمل میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ اوّل تو وہ جو کرتے ہیں، اسے صاف طور پر واضح کر دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے تمام ہی اساتذۂ کرام قابل اعتماد تھے۔ (۱۸)

○ یزید بن رومان الاسدی المدنی (م ۱۳۵ھ) --- یہ ایک قابل اعتماد تابعی ہیں۔ انہوں نے عروہ اور زہری کی روایتوں کی بنیاد پر مغازی کی ایک کتاب مدون کی۔ ابن اسحٰق نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ (۱۹)

○ عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم (م ۱۳۵ھ) --- ایک قابل اعتماد محدث اور تابعی ہیں۔

○ موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) --- ایک قابل اعتماد محدث ہیں اور زہری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ امام مالک نے مغازی پر ان کی کتابوں کی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ مغازی پر وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں اور ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۲۰) اس ضمن میں یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ "موسیٰ بن عقبہ کی وہ کتاب جو زہری سے روایت کی گئی ہے، اپنے موضوع پر صحیح ترین کتب میں سے ایک ہے"۔ (۲۱) ان کے بارے میں امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ "اگرچہ مغازی پر موسیٰ بن عقبہ کی کتاب مختصر ہے اور بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو دوسری کتب میں پائی جاتی ہیں، مگر اس میں موجود نہیں ہیں۔ اس کے باوجود مغازی پر کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو موسیٰ بن عقبہ کی کتاب سے زیادہ 'صحیح' ہو (۲۲)"۔

ذہبی اس سلسلے میں فرماتے ہیں: "موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کی ضخامت زیادہ نہیں ہے، ہم نے اسے پڑھوا کر سنا ہے، اس کا اکثر حصہ 'صحیح' اور 'مرسل جید' ہے، لیکن اس میں اختصار ہے اور یہ مزید وضاحت اور تکمیل کی محتاج ہے"۔ (۲۳)

○ محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (م ۱۳۱ھ)— ان کی کتاب کا نام ہے **المغازی**۔ (۲۴)

○ سلیمان بن طرخان التیری (م ۱۴۳ھ)— یہ تابعی ہیں اور قابل اعتماد محدث ہیں۔

○ معمر بن راشد (م ۱۵۳ھ)— یہ بھی ایک قابل اعتماد محدث ہیں اور زہری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ''وہ علم کا ایک بھرا ہوا جام ہیں اور صدق و صفا، نیکی و تقویٰ، عجز و انکسار اور علم و تحقیق کا پیکر ہیں''۔ (۲۵)

○ محمد بن اسحٰق (م ۱۵۱ھ)— ان کا شمار بھی زہری کے تلامذہ میں ہوتا ہے اور مغازی کے میدان میں امام کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی روایات ''صحیح'' کے درجے تک تو نہیں پہنچتیں، لیکن ''حسن'' ہیں، بشرطیکہ وہ اسناد میں یہ وضاحت کردیں کہ کس نے ان سے روایت کیا ہے؟ کیوں کہ وہ ''مدلس'' ہیں۔ ان کی سیرت میں ''حسن'' اور ''ضعیف'' دونوں قسم کی احادیث شامل ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں: ''میں نے ان کی احادیث کا جائزہ لیا، لیکن مجھے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ 'ضعیف' ہیں۔ ممکن ہے کہ چند ایک مقامات پر ان سے کوئی لغزش ہوئی ہو جیسی دوسروں سے بھی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی قابل اعتماد اہل علم ایسا نہیں ہے جس نے ان کا حوالہ دینے میں کوئی جھجک محسوس کی ہو، یا ان کے اوپر کسی قسم کا اعتراض کیا ہو''۔

یہ شہادت اپنی جگہ بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ابن عدی کو اونچا مقام حاصل ہے، یا وہ حدیث کے مستند ہونے کے بارے میں شدت کے قائل ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ شہادت اس بنیاد پر دی ہے کہ انہوں نے محمد بن اسحٰق کی روایات کا باقاعدہ تجزیہ کیا ہے اور محض قدیم ناقدین کے اقوال پر ہی اکتفاء نہیں کیا جو ابن اسحٰق پر الزام تراشی کے گرد گھومتے ہیں، اور ان پر جبریت، شیعیت اور تدلیس (۲۶) کے الزامات لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ ابن اسحٰق پر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے ہشام بن عروہ بن زبیر کی اہلیہ محترمہ فاطمہ سے جو روایت قلمبند کی ہے، اس میں انہوں نے امکانی طور پر کذب کا ارتکاب کیا۔ اگرچہ ان کا یہ مبینہ جھوٹ ثابت نہیں کیا جا سکا اور متعدد ائمہ ناقدین نے جن میں امام احمد بن حنبلؒ بھی شامل تھے، اس الزام کی تردید کر دی۔ حافظ ذہبی اس سلسلے میں رقم طراز

ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن اسحٰق انساب کی تفصیلات میں بہت آگے تک چلے گئے، حالانکہ بہتر یہ ہوتا کہ وہ اختصار سے کام لیتے۔ مزید براں وہ غیر ضروری طور پر اشعار نقل کرتے ہیں، حالانکہ انہیں حذف کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے ہاں بڑے پیمانے پر ایسی باتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن کی انہوں نے تصدیق نہیں کی، لیکن انہوں نے بہت سا 'صحیح' مواد حذف کر دیا جس تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی کتاب پر نظر ثانی کر کے اس کی تصحیح کی جائے اور جو چیزیں ان سے چھوٹ گئی ہیں، انہیں شامل کیا جائے''۔ (۲۷)

ابن اسحٰق کی حدیث کا مقام متعین کرتے ہوئے حافظ ذہبی کہتے ہیں: ''ابن اسحٰق نسبتاً ایک اونچا مقام رکھتے ہیں، لیکن خاص طور پر سیرت کے میدان میں، جبکہ حلال اور حرام کے متعلق احادیث کے میدان میں ان کی روایات کا معیار 'صحیح' کے درجے سے گر کر 'حسن' کے درجے تک آ جاتا ہے، سوائے اس صورت کے جب وہ تنہا روایت کر رہے ہوں، یا کہیں سے ربط ٹوٹ گیا ہو، کیوں کہ اس صورت میں حدیث کو 'منکر' قرار دے دیا جاتا ہے''۔ (۲۸)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیرت کے باب میں ان کی تمام روایات مستند ہیں، کیوں کہ اس میں چند روایات ایسی ہیں جو ''منکر'' اور ''منقطع'' ہیں، جیسا کہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں کہتے ہیں: ''ابن اسحٰق کو سیرت میں تعمق حاصل ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان کے ہاں اس میدان میں کوئی کمزوری پائی جاتی ہے، سوائے اس کے کہ انہوں نے سیرت میں کچھ 'منکر' اور 'منقطع' روایات نقل کی ہیں''۔ (۲۹)

○ ابو معشر السندھی (م ۱۷۱ھ)— یہ مغازی کے ماہر، لیکن حدیث میں کمزور (ضعیف) ہیں، تاہم ان کی یہ کمزوری اضافی ہے، جس کے باوجود ان کی حدیث کو نقل کیا جا سکتا ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ یہ احادیث محمد بن کعب اور محمد بن قیس سے روایت کی گئی ہوں۔ یہ اصول اعتدال پسند ناقدین کے ہاں پایا جاتا ہے۔ محدثین کرام کا یہ اصول ہے کہ وہ ''ترجیح'' کے طریق کار کو اپناتے ہوئے، جہاں کہیں حدیث کے معتدل ناقدین اور انتہا پسند ناقدین کی رائے میں تضاد واقع ہو، وہ اعتدال پسند ناقدین کی رائے کو قبول کر لیتے ہیں۔ (۳۰)

○ عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم المدنی (م ۱۷۶ھ)— یہ ایک قابل اعتماد محدث ہیں اور مغازی پر ان کی کتاب موجود ہے۔(۳۱)

○ یحییٰ بن سعید الاموی (م ۱۹۴ھ)— ایک قابل اعتماد محدث ہیں جنھوں نے مغازی پر لکھا ہے۔

○ ولید بن مسلم الدمشقی (م ۱۹۶ھ)— ایک قابل اعتماد محدث ہیں۔

○ یونس بن بکیر (م ۱۹۹ھ)— سیرت ابن اسحٰق کے راویوں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے مغازی پر اضافہ کیا جس کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے۔(۳۲)

○ محمد بن عمر واقدی (م ۲۰۷ھ)— اپنے علم کی وسعت کے باوجود محدثین کی رائے میں ''ضعیف'' ہیں۔ ان کی روایات میں بنیادی عقائد، اخلاق اور شریعت کے بارے میں کوئی دلائل نہیں پائے جاتے۔ ان کی یہ روایات ان واقعات کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں جن کا بنیادی عقائد و اخلاق اور شرعی احکام وضوابط سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کی مغازی کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ انہوں نے مختلف سندوں سے ایسی روایات شامل کی ہیں جن کے راویوں کا کوئی ذکر علم الرجال میں موجود نہیں ہے۔ ابن سعد نے چند ایک روایات واقدی سے نقل کی ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان روایات کے انتخاب میں بے حد احتیاط سے کام لیا ہے، کیوں کہ ان روایات کی سندوں میں جن راویوں کے نام آئے ہیں، ان کا تذکرہ علم الرجال کی کتب میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ واقدی کی سندوں میں جن اشخاص کا ذکر ہے، وہ حدیث کی روایت کے سلسلے میں غیر معروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتبِ رجال ان راویوں کی سوانح میں خاموش ہیں۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ واقدی یا ان کے کچھ اساتذہ نے یہ نام اختراع کر لیے ہوں۔

اس بات سے ہمیں وہ وجہ سمجھ آ جاتی ہے جس کی بناء پر ائمۂ حدیث نے تنقید کرتے ہوئے ان پر جھوٹ بولنے اور حدیث گھڑنے کا الزام لگایا، اور اچھی طرح اندازہ کر کے انہیں مسترد کر

دیا۔اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بہت سے ائمہ کا طریقۂ نقد وجرح یہ تھا کہ وہ کسی راوی کی روایات جمع کر کے ان پرغور وخوض کیا کرتے تھے اور پھران روایات کی بنیاد پراس راوی کو پرکھا کرتے تھے۔

○ محمد بن عائذ الدمشقی (م ۲۳۴ھ)— ایک قابل اعتماد محدث ہیں۔ابن حجر نے ان کی مغازی کا ایک منتخب حصہ پڑھا ہے(المعجم المفهرس میں اس کا تذکرہ موجود ہے،ص ۲۷ الف)۔

○ علی بن محمد المدائنی (م ۲۲۵ھ)—ابن عدی کا کہنا ہے کہ یہ صاحب حدیث کے میدان میں مضبوط نہیں ہیں۔ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کی سوانح کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب خصوصی طور پران راویوں کی سوانح سے متعلق ہے جوضعیف ہیں۔اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ابن حجر کے نزدیک وہ حدیث میں قابل اعتماد نہیں ہیں،تاہم ان کی سوانح میں کچھ ایسی باتوں کا تذکرہ ملتا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کے علاوہ ''اخبار'' میں قابل اعتماد ہیں۔اس کے باوجود سیرت کے کچھ موضوعات ایسے ہیں جن میں المدائنی کو امتیاز حاصل ہے اور انہوں نے ان موضوعات پر ایک علیحدہ کتاب میں بحث کی ہے۔ یہ موضوعات اس لحاظ سے بے حداہمیت کے حامل ہیں کہ یہ سیرت کے معاشرتی اور معاشی پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

○ عبداللہ بن محمد بن نفیل (م ۲۳۴ھ)—انہوں نے مغازی پر ایک کتاب لکھی ہے،قابل اعتماد ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار احادیث کے حافظ بھی ہیں۔

○ صالح بن اسحٰق الجرمی النحوی (م ۲۲۵ھ)—حدیث اور اخبار میں ان کا نام اونچا ہے۔انہوں نے سیرت پر ایک قابل تعریف کتاب لکھی ہے۔(۳۳)

○ اسمٰعیل بن جمیع (جُمیع)(م ۲۷۷ھ)—ان کی کتاب کا نام ہے،اخبار النبی و مغازیه و سرایاه (۳۴)

○ احمد بن حارث الخراز (م ۲۵۸ھ)— ان کی تالیف مغازی النبی و سرایاه وازواجه کے نام سے موسوم ہے۔

- عبدالمالک بن محمد الرقاشی البصری (م ۲۷۶ھ)۔۔ان کی کتاب کا نام **المغازی** ہے۔ یہ صدوق ہیں، لیکن غلطیاں کر جاتے ہیں۔
- ابراہیم بن اسمٰعیل العنبری الطّوسی (م ۲۸۰ھ)۔۔ان کی کتاب **المغازی** ہے۔
- اسمٰعیل بن اسحٰق القاضی (م۲۸۲ھ)۔۔ان کی کتاب **المغازی** ہے۔

سوانح کی کتابوں میں بے شمار ایسے تابعین، اتباع تابعین اور ان کے بعد آنے والوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سیرت سے بھی واقف تھے اور اس کے ساتھ دلی وابستگی رکھتے تھے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں:

- ابواسحٰق بن عبداللہ السبیعی (م ۱۲۷ھ)
- یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ المدنی (م ۱۲۸ھ)
- داؤد بن حسین الاموی (م ۱۳۵ھ)
- عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز حنفی (م ۱۶۲ھ)
- محمد بن صالح بن دینار (م ۱۶۲ھ)
- عبداللہ بن جعفر المخرمی المدنی (م ۱۷۰ھ)

ان حضرات کے بارے میں یہ دعویٰ تو نہیں کیا گیا کہ انہوں نے سیرت پر کتابیں تحریر کیں، لیکن سیرت سے ان کی دلچسپی اور اس کے مطالعے کے ذوق کا حوالہ ملتا ہے،(۳۵) اسی لیے میں نے ان اصحاب کے اسمائے گرامی کو سیرت نگاروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔

یہ علمائے کرام سیرت نگاری کے میدان میں پہلا قدم رکھنے والے ہیں۔ ناقدینِ حدیث نے ان میں سے اکثر کو خاص طور پر ''عدالت'' اور ''ضبط'' کے حوالے سے مستند قرار دیا ہے۔ یہ وہ دو شرائط ہیں جو علمائے کرام نے راویوں کو مستند قرار دینے کے لیے عائد کی تھیں۔ اگر محدثین کرام، جنہوں نے کسی راوی کو مستند قرار دینے کے لیے سخت ترین شرائط کا معیار قائم رکھا ہوا تھا، بعض راویوں کو مستند قرار دے دیتے ہیں (۳۶) تو ان کی یہ سند علمائے کرام کے اس کام کو جو وہ سیرت کے میدان میں انجام دیتے ہیں، بے انتہا علمی رفعت اور بلندی عطا کر دیتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے نبی کی سیرت کو ہر قسم کے نقصان، تغیر، تبدل اور مبالغہ آرائی سے محفوظ رکھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے محدثینِ کرام کو پیدا فرمایا جنہوں نے سیرت کی حفاظت کی اور اس کے ابتدائی مآخذ کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ فرما دیا، قبل اس کے کہ مؤرخین اور داستان گو حضرات اس طرف آتے۔ سیرت کے مآخذ کا یہ ایک اہم اور ممتاز جزو ہے جو تاریخ اور اخبار کی دیگر کتب میں نہیں ملتا۔ اس جزو کی اہمیت اور امتیاز کا سبب یہ ہے کہ محدثین کرام نے روایت کرنے میں حد سے زیادہ امانت اور دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ علم کے روشن مینار تھے جنہوں نے روایات کی اسناد اور متون دونوں پر کڑی تنقید کے واضح اصول مرتب کیے تھے۔ ان کا طریقۂ کار انتہائی سنجیدہ اور ہر قسم کے اضافے یا مبالغے سے پاک تھا۔

جن عظیم سیرت نگاروں کا تذکرہ میں نے کیا ہے، ان کا بہت سا کام ایسا ہے جو ضائع ہو چکا ہے، لیکن مندرجہ ذیل مآخذ جو ہم تک پہنچے ہیں، ان کی بنیاد اول الذکر سیرت نگاروں کے کام پر رکھی گئی ہے۔ ان مآخذ کے ذریعے ان کی طرف سے ہمیں بہت کچھ مواد مع اسناد کے ملا ہے۔ بعد کے کاموں کی بنیاد ابتدائی کاموں پر رکھی گئی ہے، نہ صرف مواد کے لحاظ سے، بلکہ اس طریقۂ کار کے لحاظ سے بھی جس کے مطابق مواد کو کتاب میں سمویا گیا ہے۔ **سیرت ابن هشام** ان اہم ترین مآخذ میں سے ایک ہے جو ہم تک پہنچے ہیں۔

سیرت ابن هشام دراصل، حک واضافہ کے ساتھ **سیرت ابن اسحٰق** کی نئی شکل ہے۔ اس ترمیم شدہ شکل میں ابن ہشام نے اس میں مندرج بہت سی اسرائیلی روایات اور اشعار حذف کر کے اس میں لغت اور علم الانساب کے متعلق معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ اس نظر ثانی کے بعد علماء کی اکثریت نے اس سیرت کو قبول کیا ہے اور ابن ہشام کے بعد آنے والے مصنفین نے اس کتاب پر اعتماد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغازی میں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کی جو تصویر کشی کی گئی ہے، وہ اس سے بہت قریب ہے جو حدیث کی کتب صحاح میں بیان کی گئی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی سند ہے جو سیرت کی اس کتاب کو حاصل ہے۔ حافظ سہیلی (م ۵۸۱ھ) نے اپنی کتاب **روض الانف** میں **سیرت ابن هشام** کی شرح کی ہے۔

اس کے علاوہ دیگر مآخذ یہ ہیں:

○ مغازی الواقدی مؤلفہ محمد بن عمر واقدی (م ۲۰۷ھ)— محمد بن عمر واقدی نے سیرت ابن اسحق پر کچھ اضافے کیے ہیں۔(۳۷) انہوں نے ان روایات کے بارے میں اپنی رائے دی ہے جو زیادہ قابل اعتماد ہیں۔(۳۸) علمائے کرام اس بات کے معترف ہیں کہ انہیں علم سیرت سے ایک خاص تعلق ہے، لیکن محدثین کرام انہیں ''ضعیف'' قرار دیتے ہیں۔(۳۹) نسائی کا بیان ہے: ''وہ [واقدی] حدیث گھڑتے ہیں''۔ امام شافعی، ابوداؤد اور ابن ابی حاتم بھی ان پر حدیث گھڑنے کا الزام لگاتے ہیں۔ امام احمد کا کہنا ہے کہ وہ کذاب ہے۔

ابن عدی کا بیان ہے: ''ان کی حدیث معروف نہیں ہے اور انہوں نے بہت زیادہ مشکل پیدا کر دی ہے''۔

ابن حجر نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے: ''وہ اپنے علم کی وسعت کے باوجود 'متروک' ہیں''۔(۴۰)

ابن سید الناس نے اس سلسلے میں ان کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن دیگر ناقدین کی آراء کے سامنے یہ دفاع کمزور پڑ جاتا ہے۔

○ الطبقات الکبری مؤلفہ محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ)— اس کتاب کی پہلی دو جلدوں میں خاص طور پر سیرت سے بحث کی گئی ہے۔ ابن سعد قابل اعتماد ہیں اور انہوں نے واقدی کی روایات میں سے جو بہترین ہیں، ان کا انتخاب کیا ہے (خطیب بغدادی اور ابن حجر بھی اس پر متفق ہیں)، تاہم انہوں نے ''ضعفاء'' (کمزور اہل علم) کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے۔ ابن سعد واقدی سے اتنا زیادہ نقل کرتے ہیں کہ ابن ندیم نے ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے واقدی کا کام چوری کیا ہے، مگر ابن سعد کے کام کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے قلم کار ہیں جن کا اپنا طریقۂ کار ہے۔ انہوں نے واقدی سے اسی قدر نقل کیا ہے جس قدر دیگر اساتذہ سے۔ ان اساتذہ میں سے جو زیادہ مشہور ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: عفان بن مسلم، عبید اللہ بن موسیٰ اور فضل بن دکین۔ یہ تینوں محدثین قابل اعتماد اور نہایت امانت دار ہیں۔(۴۱)

○ تاریخ خلیفہ بن خیاط (م ۲۴۰ھ)— خلیفہ بن خیاط ایک قابل اعتماد محدث ہیں اور امام بخاری کے اساتذہ میں شامل ہیں جن سے انہوں نے اپنی صحیح کے لیے استفادہ کیا۔ ان کی کتاب عام تاریخ کی ایک کتاب ہے۔ کتاب کے آغاز میں مختصر طور پر سیرت کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اور ابن اسحٰق کو سامنے رکھا گیا ہے۔ (۴۲)

○ انساب الاشراف مؤلفہ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری (م ۲۷۹ھ)— یہ عام تاریخ کی ایک کتاب ہے اور اس کتاب کی ترتیب انساب کے لحاظ سے عمل میں لائی گئی ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ بلاذری نے سیرت کے لیے مخصوص کیا ہے۔ محدثین بلاذری کو ''ضعیف'' قرار دیتے ہیں۔ ابن حجرؒ نے ''ضعفاء'' کے بارے میں اپنی کتاب لسان المیزان میں اس کی سوانح کا حوالہ دیا ہے۔

○ تاریخ الرسل و الملوک مؤلفہ محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)— کتاب کا ایک حصہ خاص طور پر سیرت سے متعلق ہے۔ طبری امانت دار ہیں اور انہوں نے زیادہ تر ابن اسحٰق کی کتاب پر اعتماد کیا ہے۔ طبری کا طریقۂ کار یہ نہیں ہے کہ وہ جن روایات کا تذکرہ کرتے ہیں، ان پر نقد وجرح کر کے یہ بتائیں کہ وہ ''صحیح'' ہیں یا ''ضعیف''، بلکہ وہ ان روایات کو ''اسناد'' کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں، اور یہ فیصلہ قاری کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان روایات کے متعلق اپنی رائے قائم کرے کہ ان میں کون سی مناسب اور موزوں ہیں۔ (۴۳)

○ الدرر فی اختصار المغازی و السیر مؤلفہ ابن عبدالبر قرطبی (م ۴۶۳ھ)— یہ اپنے زمانے کے عظیم ترین محدثین میں سے ایک تھے۔ انہوں نے ابن ابوکثم کی سیرت کو اپنے سامنے رکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حدیث کی دیگر کتب کو بھی۔ (۴۴) انہوں نے صرف ایک مقام پر واقدی سے نقل کیا ہے۔ (۴۵) انہوں نے یہ نشان دہی کر دی ہے کہ انہوں نے واقدی کی مغازی کو روایت کیا ہے۔ (۴۶) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب (۴۷) کا عمومی ڈھانچا ابن اسحٰق کی کتاب کو سامنے رکھ کر تیار کیا ہے، لیکن انہوں نے ''اسناد'' کا ذکر کرنا زیادہ ضروری نہیں سمجھا۔

○ جوامع السیرۃ مؤلفہ ابن حزم ظاہری (م ۴۵٦ھ)—انہوں نے ''اسناد'' نقل کرنے کا جو علمی طریقہ ہے، اسے نظر انداز کر دیا اور مآخذ کی کوئی نشاندہی نہیں کی۔ (۴۸) ابن حزم ظاہری بیان کرتے ہیں کہ کون سی روایات زیادہ قابل اعتماد ہیں، اور ان ہی روایات کو انہوں نے محفوظ کیا ہے۔انہوں نے تاریخی واقعات کی تحقیق کی ہے۔(۴۹) انہوں نے زیادہ تر تلخیص پر توجہ دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیرت سے کہانیاں اور اشعار حذف کر دیے ہیں۔(۵۰)

○ الکامل فی التاریخ مؤلفہ ابن اثیر جزری (م ٦۳۲ھ)—ابن اثیر ایک قابل اعتماد مؤرخ ہیں۔الکامل تاریخ کی ایک کتاب ہے جس کا ایک حصہ سیرت کے لیے مختص کیا گیا ہے۔

○ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر مؤلفہ ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ)—یہ ایک امانت دار محدث ہیں۔ ذہبی اور ابن کثیر نے انہیں مستند قرار دیا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب میں ان کتبِ احادیث اور کتبِ تاریخ سے بہت کچھ نقل کیا ہے جو ان کے زمانے سے پہلے لکھی گئیں۔انہوں نے اپنی کتاب کے تعارف میں اپنے مآخذ کی نشاندہی کی ہے۔

○ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد مؤلفہ ابن قیم الجوزیہ (م ۷۵۱ھ)—یہ اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے۔ان کی کتاب شمائل، ادب، فقہ اور مغازی کے علوم میں گراں قدر و قیمت کی حامل ہے، کیوں کہ یہ ان تمام علوم کا جامع مجموعہ ہے۔

○ السیرۃ النبویۃ مؤلفہ حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ)—یہ ایک قابل اعتماد مصنف اور ایک ممتاز نقاد ہیں، بالخصوص محدثین کے اصولوں کو منطبق کرنے میں ان کا جواب نہیں۔ ان کا شمار ان اصحاب میں کیا جاتا ہے جنہوں نے متون کی تحقیق و تدقیق میں ان اصولوں کو پوری طرح برتا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب میں جن روایات کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے محض چند ایک پر تنقید کی گئی ہے۔

○ البدایۃ والنہایۃ مؤلفہ حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ)—یہ عام تاریخ کی کتاب ہے جس کا ایک حصہ سیرت سے متعلق ہے۔ابن کثیر کا شمار قابل اعتماد ائمہ میں ہوتا ہے جنہوں نے متون کی مکمل طور پر تحقیق کی۔ ذہبی، ابن حجر اور ابن عماد الحنبلی نے انہیں مستند قرار دیا ہے۔

○ امتاع الاسماع — یہ مقریزی کی تصنیف ہے جو قابل اعتماد ہیں۔ مقریزی نے تلخیص کا طریقہ اختیار کیا ہے اور ''اسناد'' کے نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ امتاع کے متعلق سخاوی فرماتے ہیں: ''اس میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جو قابل تنقید ہیں''۔ (۵۱)

○ المواھب اللدنیہ بالمنح المحمدیة — یہ احمد بن محمد قسطلانی (م ۹۲۳ھ) کی تصنیف ہے۔

○ شرح المواھب اللدنیة مصنفہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ) — مواھب اور اس کی شروح کا شمار شمائل اور سیرت کی جامع ترین کتب میں ہوتا ہے۔

○ السیرة الحلبیہ — یہ برہان الدین الحلبی (م ۸۴۱ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اسرائیلی روایات سے بہت سی غیر ضروری کہانیاں اور تفصیلات شامل کی گئی ہیں۔ (۵۲) مصنف نے روایات کی ''اسناد'' کو حذف کر دیا ہے اور صرف ''خبر'' کے راوی کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے اس کی چند ''غریب احادیث'' کی وضاحت کی ہے اور اس کے علاوہ کچھ تبصرے کیے ہیں۔

○ سبل الھدیٰ و الرشاد فی سیرة خیر العباد — یہ محمد بن یوسف دمشقی الشامی (م ۹۴۲ھ) کی تالیف ہے۔ مولف نے تین صد سے زائد کتب میں سے اپنی کتاب کے لیے مواد جمع کیا ہے۔

مذکورہ بالا کام سیرت پر وہ اہم ترین کام ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ صحت کے اعتبار سے یہ تمام مآخذ قرآن حکیم اور حدیث شریف کے بعد آتے ہیں، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتبِ سیرت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ صحت کے اسی درجے پر ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تمام سیرت ''صحیح'' کے درجے پر ہو، بلکہ اس میں ''صحیح'' اور ''ضعیف'' دونوں درجوں کی روایات پائی جاتی ہیں، لہٰذا جب ہم سیرت کا مطالعہ کریں تو سب سے پہلے ہمیں اُس پر اعتماد کرنا چاہیے جو ''صحیح'' ہے، پھر ہمارے سامنے سیرت کا جو نقشہ بنتا ہے، اسے ان روایات سے مکمل کریں جو ''حسن'' ہیں، لیکن ہمیں بنیادی عقائد اور شرعی احکام اور اصولوں کے بارے میں قطعاً ان روایات کا حوالہ نہیں دینا چاہیے جو ''ضعیف'' ہیں، البتہ ان

مقامات پر سیرت سے استفادے میں کوئی حرج نہیں ہے جہاں ہمیں کوئی قوی تر روایت نہ مل رہی ہو اور معاملہ محض اخلاقی اقدار کی حوصلہ افزائی کرنے کے متعلق ہو، یا فن تعمیر، زراعت اور دستکاری وغیرہ سے متعلق ہو۔

محدثین کرام نے ذاتی طور پر جو طریقۂ کار اختیار کیا، وہ یہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی (م ۱۹۷ھ) کے بقول: ''جب ہم رسول اللہ ﷺ سے کوئی ایسی چیز روایت کرتے ہیں جو حلال، حرام اور احکام کے متعلق ہو تو ہم 'اسناد' کے بارے میں بہت سخت ہوتے ہیں، اور 'اسناد' میں جن افراد کا ذکر ہے، ان کا سخت تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، لیکن جب ہم کوئی ایسی روایت کرتے ہیں جو اخلاقی فضائل، ثواب اور سزا سے متعلق ہو تو ہم 'اسناد' میں سخت رویہ نہیں رکھتے اور افراد کے معاملے میں بھی نرمی اختیار کرتے ہیں''۔ (۵۴)

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ سیرت کے ''متون'' اور ''اسناد'' کو محدثین کے اصولِ تنقید کے مطابق پرکھا جائے۔ اس ضمن میں جو چیز ہمارے لیے مددگار ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ سیرت کے تمام اہم ترین مآخذ ہر روایت کا تعارف ''اسناد'' کے ساتھ کرتے ہیں اور بکثرت راویانِ سیرت ایسے ہیں جو محدثین بھی ہیں اور ان کے سوانحی حالات کتبِ رجال میں مذکور ہیں۔ ان کتب میں ان کا درجہ بھی متعین ہے اور جرح و تعدیل کے حوالے سے ان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، یہ کتابیں اس کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔

موجودہ زمانے کے کچھ مصنفین حدیث کے منہج کو استعمال نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ناقابلِ عبور گھاٹی ہے، افراد اور ان کے مقام و مرتبہ کو جاننے میں کئی مشکلات درپیش ہیں اور اس پر مستزاد علوم الحدیث میں مہارت پیدا کرنا اور حدیث کے منہج کو تاریخی تنقید پر منطبق کرنے کا تجربہ کرنا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اس منہج کو دیگر وجوہ کی بناء پر نظرانداز کیا ہے۔ وہ اس منہج کو کمزور بنا کر پیش کرتے ہیں، کبھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے فوائد کم ہیں، کبھی اس کی اہمیت کو مشکوک کرتے ہیں اور کبھی اس کے نقائص کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض مصنفین علوم الحدیث کی حقیقت سے نابلد ہیں۔

اسد رستم جو ایک مسیحی ہے اور کسی خاص مذہب کے بارے میں اس کے اندر کوئی تعصب نہیں پایا جاتا، اس نے محدثین کے طریقۂ نقد کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور کھلے دل سے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ محدثین نے پہلی بار یہ طریقہ وضع کیا اور یہ ان کی ایک منفرد کامیابی ہے۔ رستم نے اپنی کتاب مصطلح التاریخ میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔ سیرت اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے وقت تنقید کا یہ طریقۂ کار اختیار کرنا بہت ضروری ہے، لیکن اس میدان میں صحت اور صداقت کا خیال رکھنا بے حد اہم ہے، کیوں کہ یہ میدان عقیدے، شریعت اور اسلامی شخصیت کی تشکیل کے متعلق ہے۔ اس بات کی اب بھی اشد ضرورت ہے کہ خلفائے راشدین کے دور، نیز اموی اور عباسی ادوار کا مطالعہ کرنے میں اس طریقۂ کار کو اختیار کیا جائے۔ کتب تاریخ ایک مجموعہ ہے ان منتخب بیانات کا جو ''اخباریوں'' نے روایت کیا ہے۔ ان لوگوں کے مختلف سیاسی اور فرقہ وارانہ مقاصد تھے اور وہ دنیاوی خواہشات اور اغراض میں گھرے ہوئے تھے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص صرف ابومخنف کی روایات کے ذریعے عہدِ اموی کی ایک مکمل تصویر پیش کرنا چاہے تو وہ اس تصویر سے بالکل مختلف ہوگی جو صرف عوانہ بن حکم اور ابو یقظان النسابہ کی روایات کے ذریعے پیش کی جائے گی۔

ضمنی مآخذ

صحت، صداقت اور اہمیت کے اعتبار سے قرآن کریم، حدیث شریف اور متخصصانہ کتبِ سیرت کے بعد ضمنی مآخذ کا نمبر آتا ہے۔ تمام ابتدائی مآخذ سے رجوع کرنے کے بعد تصویرِ سیرت کو مکمل کرنے میں جو خلا اور کمی باقی رہ جاتی ہے، وہ ان ضمنی مآخذ کے ذریعے پُر کی جاتی ہے۔ ادبی ذخیرے میں سیرت کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کا تعلق اس زمانے کی ثقافت، معیارِ زندگی، خوراک اور لباس کے انداز اور رسم و رواج وغیرہ سے ہے، بالخصوص شاعری کو ایک اہم تاریخی دستاویز سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ شاعری علمی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتی ہے اور شجاعت پر توجہ مرتکز کرتے ہوئے جنگوں کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ یہاں سیرت

کے واقعات بیان کرنے کے ضمن میں حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک اور عبداللہؓ بن رواحہ کے عظیم الشان کردار کا ذکر کرنا کافی ہوگا لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ علمی کام ان امور پر مشتمل ہے جو ''شاذ''، ''غریب'' اور ''طریف'' ہیں۔ اس قسم کے جتنے بھی تحقیقی کام ہوئے ہیں، ان کا تعلق انہی امور سے ہے، روزمرہ کے واقعات سے نہیں۔ اس طرح ان کتب کے مشمولات کو عمومی رنگ دینے کا نقصان واضح ہو جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے متعلق جو کتب ہیں، وہ اس نسل کے حالات پر مشتمل ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھی اور تمام واقعات کی عینی شاہد تھی۔ ان کتابوں کے ذریعے مستند تاریخی مواد حاصل ہوتا ہے، اگرچہ یہ مواد بہت محدود اور منتشر نوعیت کا ہے، تاہم اس میں سے کچھ مواد ایسا ہے جو اس نسل سے متعلق ''اخبار'' سے بحث کرتا ہے۔ بقیہ سوانحی کتب (کتب الرجال) ان کتب سے مطابقت رکھتی ہیں جو صحابہ کرامؓ سے متعلق ہیں۔ یہ کتابیں ان افراد کا ایک مفید تعارف ہیں جن کا ذکر کتبِ سیرت کی ''اسناد'' میں کیا گیا ہے۔ کتبِ سیرت کے مآخذ کے مطالعے پر یہ کتابیں بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہیں اور محققین نے ان ہی کی بنیاد پر اسناد پر نقد کیا ہے۔

جغرافیے کی تاریخی کتابیں جزیرہ نمائے عرب کی اس سرزمین پر روشنی ڈالتی ہیں، جہاں سیرت کے واقعات نے جنم لیا، مثلاً یہ کتابیں وہاں کی طرزِ زندگی اور زرعی پیداوار کی تفصیلات، مختلف مقامات کے درمیان فاصلوں اور قبائل کی تقسیم پر معلومات مہیا کرتی ہیں۔

اس طرح ان ضمنی مآخذ کے ذریعے سیرت کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ مکمل کرنے میں اور جزوی تفصیلات کو واضح کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اب تک جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ مآخذِ سیرت کا ایک مختصر جائزہ ہے۔ میں آخر میں صرف یہی کہوں گا کہ ہمیں تاریخی تنقید اور تعبیر کے ایک جامع طریقۂ کار کی فوری ضرورت ہے۔ جب تک تاریخی تنقید اور تعبیر کے طریقے درست نہیں ہوں گے، اسلامی تاریخ کا مطالعہ محدود اور نامکمل رہے گا اور ہم امت کی تاریخی زندگی کی مکمل تشریح و توضیح پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔

یورپی فکر کے تحت تاریخ کی ماہیت اور تاریخی تنقید و تعبیر پر متعدد تحقیقی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے بعض کا عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے،(۵۴) لیکن اس قسم کی کتابوں میں مغرب کے نقطۂ نگاہ کی جھلک پائی جاتی ہے جس کی بنیاد یورپ کے فلسفۂ حیات پر رکھی گئی ہے۔ان تحقیقات کا اطلاق یورپ کی تاریخ کی بنیاد پر کیا گیا ہے،اور ان مسائل کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن کا خاص تعلق تاریخ یورپ کے مطالعے سے ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی اسی سطح پر مطالعاتی کام کریں،مگر اس مطالعے کی بنیاد ہمارے عقیدے پر ہو،اس میں ہماری تاریخ کی مناسبت سے رد و بدل کیا گیا ہو،اور یہ کام ہماری تاریخ کو یورپی نقطۂ نظر سے نہ دیکھے۔

یہاں پر یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ بہت سے مسلمان مصنفین نے اس سلسلے میں ابتدائی کام انجام دیا ہے(۵۵) اور اسلامی پس منظر میں تاریخ مرتب کرنے کے لیے مفید تجاویز دی ہیں،تاہم یہ تجاویز زیادہ دوررس نہیں ہیں اور کوئی قابل عمل طریقۂ تحقیق پیش نہیں کرتیں اور نہ کوئی ایسا جامع نظریہ ہی فراہم کرتی ہیں جس پر تاریخِ اسلام کی تشریح کی بنیاد رکھی جا سکے اور جس کے لیے سچے اسلامی اصولوں سے رہنمائی لی گئی ہو۔

حواشی

۱- ابوریحان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی کتاب اضواء علی السنة المحمدیة میں اس قسم کی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

۲- محمد دروازہ نے اپنی کتاب سیرة الرسول میں سیرت کے حوالے سے قرآنی آیات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

۳- غزوۂ بدر کی تفصیلات سورة الانفال،غزوۂ احد کی سورة آل عمران،غزوۂ خندق کی سورة الاحزاب اور غزوۂ حنین کی تفصیلات سورة التوبہ میں دی گئی ہیں۔ان کے علاوہ دیگر سورتوں میں بھی ان واقعات کی تفصیلات ملتی ہیں۔

۴- اس فکری تصادم کا ذکر سورة البقرة اور مادی تصادم کا ذکر سورة الحشر اور سورة الاحزاب میں کیا گیا ہے۔

۵- دوری، نشأة علم التاریخ عند العرب، ص ۱۸، ص ۵۱؛ صالح العلی، محاضرات فی تاریخ العرب قبل الاسلام

۶- صالح العلی، محاضرات فی تاریخ العرب قبل الاسلام

۷- مقدمہ تفسیر ابن کثیر

۸- دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب المغازی

۹- صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی مصطلق پر بغیر اعلانِ جنگ کے حملہ کیا۔ آیت کے مطابق یہ بیان آپؐ کے عام طریقے سے متعارض ہے۔ کتبِ سیرت اس بات پر روشنی ڈالتی ہیں کہ آپؐ نے بنو مصطلق کو پہلے سے جنگ کا انتباہ کر دیا تھا۔ اس سے پتہ یہ چلا کہ اگر ہم ان اسلامی قوانین کو سمجھے بغیر جو حملے سے پہلے دشمن کو خبردار کرنے سے متعلق ہیں، اپنے کو محض صحیحین تک محدود رکھیں گے تو ہم نہ صرف غلطی کا شکار ہوں گے، بلکہ الجھن میں بھی مبتلا ہو جائیں گے۔ دیکھیے: محمد الغزالی، فقه السیرة، طبع چہارم، ص ۳۰۸-۳۱۰

۱۰- مفتاح کنوز السنة۔ اس کتاب سے ان اہم احادیث کی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے جو سیرت کے موضوع سے متعلق ہیں۔ وینسنک اور دیگر مستشرقین کی مشترکہ تصنیف المعجم المفهرس فی الفاظ الحدیث النبوی بھی سیرت سے متعلق احادیث کی تلاش میں معاون ہو سکتی ہے۔

۱۱- صحیح بخاری، ۲:۲۶، طبع بولاق؛ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث

۱۲- ندیم، الفهرست، ص ۱۱۳

۱۳- سیر اعلام النبلاء، ۶:۱۱۶

۱۴- الندیم، الفهرست، ص ۲۷۴

۱۵- سیرت نگاری پر جامع ترین کتب میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- ہوروویٹز، المغازی الاولی و مؤلفوها
- مارگولیوتھ، دراسات عن المورخین العرب
- عبدالعزیز الدوری، نشأة علم التاریخ عند العرب
- صالح العلی، محاضرات فی تاریخ العرب قبل الاسلام کا ایک باب
- جواد علی، تاریخ العرب فی الاسلام میں سیرة النبی کا ایک باب
- سیدا سمٰعیل کاشف، دراسة فی مصادر التاریخ الاسلامی
- حسین نثار، نشأة التدوین التاریخ عند العرب

مغازی کے ابتدائی مصنفین پر جو خصوصی تحقیقی کاوشیں کی گئیں، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- دوری، دراسته فی سیرة النبی و مولفها ابن اسحٰق
- فک، محمد بن اسحٰق کے بارے میں انگریزی میں تحقیقی مقالہ
- خالد العلی، علی مدائنی کے بارے میں ایک مقالہ
- اکرم العمری، موسیٰ بن عقبہ کے بارے میں مقالہ

۱۶- ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی نے حال ہی میں عروۃ بن زبیر کی روایات کو جمع کر کے شائع کرایا ہے۔

۱۷- خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۱۲:۲۳۰

۱۸- نووی، شرح صحیح مسلم، ۵:۶۲۳؛ عراقی، طرح التثریب، ۸:۴۷

۱۹- ابن حجر، تھذیب التھذیب، ۹:۲۲۵

۲۰- ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۶:۱۱۵

۲۱- ایضاً، ۶:۱۱۷

۲۲- خطیب، الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع، ص ۲۲۵

۲۳- ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۲:۱۱۵-۱۱۶

۲۴- انساب الاشراف، ۱:۱۱۲، ۳۵۱

۲۵- ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۷:۶

۲۶- ایضاً، ۷:۱۳۹

۲۷- ایضاً

۲۸- ایضاً، ۷:۴۷۔ طرح التثریب فی شرح التقریب (۸:۴۷) میں کہا گیا ہے کہ "مصنفین کا ابن اسحٰق کی حدیث کو قبول کرنا ایک معروف بات ہے، لیکن وہ مدلس ہے۔ اگر وہ اپنی اسناد میں یہ وضاحت کر دیں کہ انہوں نے کس سے روایت کیا ہے تو ان کی حدیث قابل قبول ہوگی"۔

۲۹- میزان الاعتدال، ۳:۴۶۹

۳۰- رجوع کیجیے: ابن حبان، المجروحون، ۳:۶۰؛ بخاری، تاریخ الکبیر، ۸:۱۱۴؛ خطیب، تاریخ بغداد، ۱۳:۴۲۷؛ ذہبی، سیر اعلام ۷:۴۳۵-۴۴۰؛ ابن حجر، تھذیب، ۱۰:۴۲۰-۴۲۱

۳۱- ندیم، الفھرست، ۲۸۲

۳۲- الاصابة فی تمییز الصحابة، ۱:۲۴۲

۳۳- خطیب، تاریخ بغداد ۹:۳۱۴

۳۴- ندیم، الفهرست، ۱۱۲

۳۵- دیکھیے: ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، ۲:۲:۲۶۰؛ خطیب، تاریخ بغداد، ۱۲:۲۳۰؛ ابن حجر، تهذیب، ۱۱:۲۶۳-۲۶۷، ۵:۱۷۲، ۶:۳۸۸، ۱۱:۲۹۳؛ تاریخ التراث العربی، ۲:۴۵۶

۳۶- اکرم العمری، تعارف تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۲۴-۲۵

۳۷- مرسڈن جونز، تعارف مغازی الواقدی، ۳۴؛ دوری، نشاة علم التاریخ عند العرب، ص ۳۱

۳۸- مرسڈن جونز، تعارف مغازی الواقدی، ص ۳۴

۳۹- دیکھیے: ان کی سوانح، خطیب، تاریخ بغداد، ۳:۲۱

۴۰- دیکھیے: ان کی سوانح، ابن حجر، تهذیب، تقریب التهذیب

۴۱- اکرم العمری، بحوث فی تاریخ السنة المشرفة

۴۲- اکرم العمری، تعارف تاریخ خلیفه ابن خیاط، ص ۲۶-۲۷

۴۳- طبری، تاریخ الرسل و الملوک (ابوالفضل ابراہیم)، ۱:۸

۴۴- شوقی ضیف، تعارف الدرر، ص ۸

۴۵- ابن عبدالبر، الدرر، ص ۳۹

۴۶- ایضاً، ص ۲۷۶

۴۷- ایضاً، ۲۹، نیز دیکھیے: شوقی ضیف، تعارف الدرر، ص ۱۲

۴۸- جوامع السیرة میں خلیفہ بن خیاط سے نقل کا تذکرہ تین مقامات پر کیا گیا ہے اور تین ہی مقامات پر ابوحسان زیادی کی تاریخ سے اور ایک مقام پر ابن عبدالبر کی الدرر سے نقل کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ان کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے محسوس کیا ہے کہ انہوں نے معمولی تبدیلی کے ساتھ الدرر سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ شوقی ضیف نے جوامع السیرة کے تعارف میں اس بات کی تصدیق کی ہے، اور الدرر کے تعارف میں بھی اس کی تائید ملتی ہے۔

۴۹- تعارف جوامع السیرة، ص ۱۰

۵۰- ایضاً، ص ۱۳

۵۱- سخاوی، الاعلان بالتوبیخ، ضمیمہ علم التاریخ عند المسلمین (روزینتھال)، ص ۳۰

۵۲- جواد علی، تاریخ العرب قبل الاسلام، السیره النبویة، ص ۱۰

۵۳- فتح المغيث، ۱:۲۸۴

۵۴- مثال کے طور پر دیکھیے:

- Collingwood,The Idea of History
- Edward Carr,What is History ?
- A.L.Raus,History: Its Influence and Benefit
- Frederick Engels, Socialist Interpretation of History
- Langelois Wisimbos, Historical Criticism
- Concerning Historical Knowledge Ernest Cassirer,
- Joseph Hors,The Importance of History
- Emery Naf, Historians and the Spirit of Poetry

۵۵- سیّد قطب، فی التاریخ فکرة و منهاج؛ فتحی عثمان، اضواء علی التاریخ الاسلامی؛ عبدالرحمٰن الحاجی، نظرات فی دراسته التاریخ الاسلامی؛ عماد الدین خلیل، التفسیر الاسلامی للتاریخ؛ عبدالحمید صدیقی، تفسیر التاریخ

۳

مدنی معاشرہ: قبل از ہجرت

مدینہ منورہ کو قدیم زمانے میں یثرب کہا جاتا تھا جو سرسبز و شاداب خطۂ زمین پر واقع ایک نخلستان ہے جہاں پانی کی فراوانی ہے اور جسے چاروں طرف سے سیاہ آتشیں چٹانوں نے گھیر رکھا ہے۔ ان آتشیں چٹانوں میں دو چٹانیں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک حرہ واقم جو شہر کی مشرقی سمت میں واقع ہے اور دوسری حرہ وبرہ جو مغرب کی جانب ہے۔ حرہ واقم زیادہ شاداب اور حرہ وبرہ کے مقابلے میں زیادہ گنجان ہے، جب کہ شہر کے شمال میں احد کا پہاڑ اور جنوب مغرب میں عسیر نامی کوہسار واقع ہے۔ ان کے علاوہ مدینے میں کئی وادیاں ہیں جن میں سے مشہور ترین بطحان، مذینب، مہزور اور عقیق ہیں۔ ان وادیوں کا سلسلہ جنوب سے شمال کی طرف چلا جاتا ہے۔

معینی نے اپنی تحریروں میں لفظ یثرب استعمال کیا ہے جو اس کے قدیم ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔(۱) اسلام سے پہلے مدینے کی تاریخ زیادہ تر گمنام اور منتشر ہے، البتہ جوں جوں ہم اسلام کے اوّلیں دور کا مطالعہ کرتے ہیں، اس شہر کے خدوخال بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

یہودیوں کی آبادی

مدینہ منورہ اور بالعموم حجاز میں آباد یہودیوں کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں کہ انہوں نے کب اور کہاں سے نقل مکانی کر کے اس خطے میں سکونت اختیار کی۔ جو رائے دل کو سب سے زیادہ لگتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں شام سے نقل مکانی کی۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور تھا اور یہ اس زمانے کے بعد کی بات ہے جب

رومیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے ایک صدی قبل شام اور مصر پر، اور دوسری صدی میں نباتیوں پر غلبہ پا لیا تھا۔ رومیوں کے تسلط نے یہودیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کی طرف نکل جائیں اور اس طرح دور چلے جانے سے رومیوں کے غلبے سے بھی محفوظ رہیں، تاہم ۷۰ء میں شہنشاہ طیطس نے یہودیوں کی اس بغاوت کو کچل کر رکھ دیا جو انہوں نے رومیوں کے خلاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے کے بعد یہودیوں کی نقل مکانی میں مزید تیزی پیدا ہوئی اور یوں ان یہودیوں کی کچھ تعداد یثرب میں آ کر آباد ہو گئی۔ اس کے علاوہ یہودیوں کی ایک اور بڑی تعداد اس وقت حجاز پہنچی جب ۱۳۲ء اور ۱۳۵ء کے درمیان رومیوں کے خلاف ان کی ایک اور بغاوت ناکام ہو گئی۔ ان مختلف گروہوں نے مل کر مدینے اور حجاز میں ایک قوم کی شکل اختیار کر لی۔ (۲)

یہودیوں کے معروف قبائل بنو نضیر اور بنو قریظہ یثرب میں آ کر آباد ہو گئے۔ ان کے یہاں آباد ہونے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اس شہر کی زرخیز زمین نے انہیں اپنی طرف مائل کیا، دوسری بڑی کشش جو انہوں نے یہاں محسوس کی، وہ یثرب کی تجارتی شاہراہ تھی جو شام کو جاتی تھی۔ ان قبائل نے شہر کے مشرقی جانب حرہ واقم میں سکونت اختیار کی جو یثرب کا سب سے زیادہ زرخیز علاقہ تھا۔ (۳) یہودیوں کا ایک اور مشہور قبیلہ بنو قینقاع تھا جس کی اصلیت کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ اصلاً یہودی تھے جو باہر سے حجاز آئے تھے، یا وہ عرب تھے جنہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ یہی اختلاف رائے یہودیوں کے دیگر چھوٹے چھوٹے قبائل کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے جن کا ذکر عربی مآخذ میں ملتا ہے۔ یہودیوں کے چھوٹے قبائل یہ ہیں: بنو عکرمہ، بنو محمرؔ، بنو زعورا، بنو شطیبہ، بنو جشم، بنو معاویہ، بنو مرید، بنو قصیص اور بنو ثعلبہ (۴)

ان عربی مآخذ سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ ان تمام یہودیوں کی کل تعداد کتنی تھی، البتہ کتب سیرت میں لڑنے والوں کو شمار کیا گیا ہے جو عام طور پر ہر قبیلے کے بالغ مرد ہوتے تھے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق قبیلہ بنو قینقاع میں سات سو، تقریباً اتنے ہی قبیلہ بنو نضیر میں، اور ۷۰۰

اور ۹۰۰ کے درمیان بنوقریظہ کے لڑنے والے افراد تھے۔(۵) اس طرح تینوں یہودی قبائل کے لڑنے والوں کی تعداد دو ہزار سے کچھ اوپر تک جاتی ہے۔ وہ تمام چھوٹے چھوٹے قبائل ان کے علاوہ ہیں جو شہر کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ سمہودی نے ان کی تعداد بیس سے زیادہ بتائی ہے۔(۶)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربوں کے مضبوط ہونے سے پہلے مدینے کے معاشرے پر یہودیوں کو مکمل طور پر اقتصادی، سیاسی اور فکری غلبہ حاصل تھا۔ یہودیوں نے اس معاشرے پر جہاں اپنے گہرے اثرات مرتب کیے، وہیں یثرب کے گردونواح میں بسنے والے متعدد عرب قبائل کا اثر بھی قبول کیا، مثال کے طور پر یہودی قلعہ بندی کا تصور شام سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور انہوں نے یثرب میں جو قلعے تعمیر کیے، ان کی تعداد انسٹھ تھی۔(۷) علاوہ ازیں وہ صنعت وزراعت کے میدانوں میں خاص مہارتیں لے کر آئے تھے جن کی وجہ سے یثرب میں کھجور، انگور، انار اور مختلف قسم کے میووں اور غلوں کی کاشت نے بہت ترقی کی۔ انھی کی وجہ سے مرغ بانی اور مویشیوں کی افزائش و پرداخت پر خاص توجہ دی جانے لگی۔ پارچہ بافی کی صنعت بھی اس زمانے میں وجود میں آئی۔ یہودیوں نے عرب قبائل کے جو اثرات قبول کیے، ان کے نتیجے میں اُن میں بعض نمایاں خصوصیات پیدا ہوئیں۔ ان خصوصیات میں فیاضی، شاعری اور ہتھیاروں کا استعمال شامل ہیں۔ یہودیوں کے اندر قبائلی شعور اتنا نمایاں ہو گیا تھا کہ وہ ایک مذہبی گروہ کے طور پر یک جانہ رہ سکے، یہاں تک کہ حضور ﷺ کے زمانے میں جب انہیں جلا وطنی کا منہ دیکھنا پڑا، ان کے درمیان قبائلی تصادم پایا جاتا تھا۔ ان یہودی قبائل کی اقتصادیات کا سارا دارومدار سود پر تھا، اور سود کا چلن اس زمانے میں مکے کے تجارتی معاشرے میں بھی موجود تھا۔

عرب آبادی

عرب کے دو معروف قبیلوں اوس اور خزرج کا تعلق یمن کے ایک عظیم الشان قبیلے ازد سے تھا جس کے لوگوں نے مختلف زمانوں میں یمن سے شمال کی جانب نقل مکانی کی۔ اس نقل مکانی کا آغاز غالباً ۲۰۷ء سے ہوا۔ یہ وہی دور ہے جب قبیلہ خزاعہ نے مکے جا کر وہاں کی سکونت

اختیار کر لی۔ یہودی اوس اور خزرج کے آنے سے پہلے یثرب میں آ کر آباد ہو چکے تھے، اس لیے شہر کے شاداب ترین علاقوں پر ان کا قبضہ تھا اور وہاں کے شیریں پانی کے ذرائع بھی ان کے تصرف میں تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اوس اور خزرج کو مجبوراً ریگستانی علاقوں میں آباد ہونا پڑا۔

وہ کیا اسباب تھے جن کی بناء پر قبیلہ ازد کو نقل مکانی کرنا پڑی؟ اس بارے میں مؤرخین مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ ان کی نقل مکانی کی بنیادی وجہ العرم کا مشہور سیلاب اور مآرب بند کی تباہی ہے، جبکہ دوسرے لوگ اس سے اختلاف کرتے ہوئے نقلِ مکانی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جب سیاسی عدم استحکام اور معاشی زوال کی وجہ سے بحیرۂ احمر پر رومیوں کا غلبہ ہو گیا تو قبیلہ ازد کو مجبوراً وہاں سے کوچ کرنا پڑا۔ یہی آخرالذکر توجیہ زیادہ دل کو لگتی ہے، کیوں کہ وہاں کے باشندوں (بشمول ازد) پر اس کے دوررس اثرات پڑے تھے۔ ان لوگوں کی اکثریت مآرب بند کے علاقے سے باہر آباد تھی۔ (۸) قبیلہ ازد کے جو لوگ یثرب میں یہودیوں کے ساتھ جا کر آباد ہوئے، وہی اوس اور خزرج کہلائے۔

قبیلہ اوس نے العوالی کے علاقے میں بنو قریظہ اور بنو نضیر کے ساتھ سکونت اختیار کی اور قبیلہ خزرج مدینے کے زیریں علاقوں میں بنو قینقاع کی ہمسائیگی میں رہائش پذیر ہوا۔ جس علاقے میں اوس کے لوگ آباد ہوئے، وہ اس سے زیادہ زرخیز تھا، جہاں خزرج کو جگہ ملی تھی۔ یہ تفاوت طرفین میں وقتاً فوقتاً تصادم کا موجب بنتا رہا۔ (۹)

سدیو نے ان کی نقل مکانی کی جو تاریخ متعین کی ہے، وہ ۳۰۰ء ہے اور یثرب میں ان کے مکمل غلبے کی تاریخ ۴۹۲ء ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں کی معیشت اور آبادی میں کچھ تبدیلیاں ایسی واقع ہوئیں جو عربوں کے حق میں جاتی تھیں۔ یہ تبدیلیاں عربوں کی تعداد اور دولت میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ (۱۰) اوس اور خزرج کی کل آبادی کتنی تھی؟ اس کے بارے میں کوئی یقینی اطلاع تو نہیں ملتی، البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر ان دونوں قبائل کی طرف سے جو مجاہدین شریک ہوئے تھے، ان کی تعداد چار ہزار کے قریب

تھی۔(۱۱) اس میں شبہ نہیں کہ معیشت اور آبادی میں ہونے والے تغیرات نے یثرب میں، جہاں یہودیوں کو بالادستی حاصل تھی، ان عرب قبائل کے غلبے کی راہ ہموار کر دی۔ اس صورت حال میں یہودیوں نے اپنے اثرات کو برقرار رکھنے کے لیے اوس اور خزرج کے باہمی اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کی، اور دونوں میں اختلافات کے بیج بونے شروع کیے، یہاں تک کہ وہ بالآخر دونوں قبائل کے درمیان منافرت پیدا کرنے اور جنگیں برپا کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سلسلے کا آخری تصادم، جنگ بعاث تھی جو ہجرت سے پانچ برس قبل لڑی گئی تھی اور اس جنگ میں قبیلہ اوس نے اپنی فوجی برتری کے سبب خزرج کو شکست دے دی تھی جو اس سے قبل اکثر فاتح قرار پاتے تھے۔ اوس کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہودیوں کے ساتھ خزرج کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تھا، لیکن خزرج کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اوس کے سر پر یہ خطرہ بھی منڈلا رہا تھا کہ یہودی یثرب پر دوبارہ غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس خطرے کے پیش نظر دونوں قبائل نے مصالحت کی کوششیں شروع کر دیں، یہاں تک کہ دونوں قبائل میں اس امر پر اتفاق رائے ہو گیا کہ خزرج کے ایک شخص کو یثرب کا بادشاہ نامزد کر دیا جائے۔ یہ مذکورہ شخص عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جو جنگ بعاث کے دوران میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ غیر جانب دار رہا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ بعاث کے بعد بھی عربوں کا اقتدار اور برتری یہودیوں کے اوپر قائم رہی۔

بلاشبہ اسلام سے پہلے اگر اوس اور خزرج کے درمیان تصادم کی وجہ سے دونوں جانب کچھ تلخیاں پیدا ہوئیں تو اس کے ساتھ ہی ان کے درمیان امن سے رہنے کا داعیہ بھی پیدا ہوا، اور یہ داعیہ اس وقت زیادہ مضبوط ہو گیا، جب اہل یثرب نے اسلام کے لیے اپنے سینے کھول دیے۔ یہ تاریخی اقدام ان کے مابین امن اور اخوت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ حضرت عائشہؓ اہل مدینہ پر جنگوں کے اثرات اور ان کے قبولِ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

جنگ بعاث حضور ﷺ کی مدینے میں تشریف آوری سے قبل لڑی گئی تھی، چنانچہ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو اوس اور خزرج ایک دوسرے کے حریف تھے، اور

ان کے زعماء قتل کیے جا چکے تھے، یا زخمی ہو گئے تھے، یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی آمد سے قبل ایسی صورت حال پیدا فرما دی کہ لوگ تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہوں۔(۱۲)

حواشی

۱۔ جواد علی، تاریخ العرب قبل الاسلام، ۳:۲۹۵

۲۔ جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ۲: ۵۱۳-۵۱۴؛ محمد بیومی مہران، دراسات فی تاریخ العرب القدیم، مقالہ تحقیق جامعہ اسلامیہ محمد بن سعود (۱۹۷۷/ ۱۳۹۷ھ)، ص ۴۴۸-۴۵۰

۳۔ احمد ابراہیم الشریف، مکہ و المدینہ فی الجاھلیة و عھد الرسول، ص ۲۸۸

۴۔ سمہودی، وفاء الوفاء، ۱:۱۱۲-۱۱۶؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۲۵۹

۵۔ ابن ہشام، سیرۃ، تدوین و ترتیب محی الدین عبدالحمید، ۲:۴۲۸، ۳:۲۵۹؛ دیکھیے: مکہ و المدینہ، ص ۲۹۴

۶۔ الوفاء، ۱:۱۱۲

۷۔ ایضاً، ۱:۱۱۶

۸۔ احمد ابراہیم، مکہ و المدینہ، ص ۳۱۵؛ محمد بیومی، تاریخ العرب القدیم، ص ۳۵۸-۳۵۹

۹۔ احمد ابراہیم، مکہ و المدینہ، ص ۳۳۸-۳۴۰

۱۰۔ سمہودی، وفاء الوفاء، ۱:۱۲۵-۱۲۶

۱۱۔ احمد ابراہیم، مکہ و المدینہ، ص ۳۴۳

۱۲۔ صحیح بخاری، ۵:۴۴، ۵:۶۷؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۱:۱۸۳

۴

مدنی معاشرے پر اسلام کے اثرات

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب، ہر فلسفہ اور ہر مذہب کی کچھ نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو تہذیب جتنی زیادہ گہری، جامع اور مضبوط ہوگی، اتنے ہی زیادہ وہ اپنی حدود کے اندر رہنے والے افراد پر اپنے اثرات چھوڑے گی۔ بہت سے نظریہ ہائے حیات ایسے ہیں جو آپس میں مماثلت رکھتے ہیں اور ان کے درمیان محض جزدی اختلاف پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر عصرِ حاضر میں رائج تمام مادہ پرستانہ نظریہ ہائے حیات اسی نوعیت کے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک نظریے سے دوسرے نظریے کی جانب منتقل ہوگا تو اسے اپنی زندگی میں کوئی بنیادی اور یکسر تبدیلی لانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، محض اتنی تبدیلی آئے گی کہ اس کی دلی وابستگی اور اس کا اعتماد ایک نظریے سے کم ہو کر دوسرے سے زیادہ ہو جائے گا۔ نظریۂ حیات کی اس تبدیلی کے لیے کوئی خاص جدوجہد بھی نہیں کرنا پڑتی، کیوں کہ یہ نظریات فرد کی روزمرّہ سرگرمیوں اور پختہ عادات واطوار پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے، چنانچہ اس کی عملی زندگی میں ان کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔

البتہ یہ بات اسلام پر صادق نہیں آتی، کیوں کہ اسلام ایک ایسا نظریۂ حیات ہے جس نے آغاز ہی سے اپنے ماننے والوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا اور افراد کے رویوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اپنے ماننے والے لوگوں کے انسان، کائنات اور زندگی کے متعلق تمام تصورات، افکار اور پیمانے مکمل طور تبدیل کر دیے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نظریے نے معاشرے کی پوری اٹھان اور اس کا مکمل ڈھانچا

ہی بدل کر رکھ دیا۔ جہاں اس نظریے نے مروج معاشرے کے چند پہلوؤں کا بالکل خاتمہ کر دیا، وہیں اس نے چند ایک نئے پہلوؤں کا اضافہ بھی کیا۔

الغرض انسانی زندگی میں اسلام کے لائے ہوئے اثرات نہایت گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ جہاں تک بنیادی عقائد کا تعلق ہے، تو اسلام کی تعلیمات ایسی ہیں جو ایک ہی جست میں تمام حسی معبودوں (یعنی جنہیں دیکھا اور چھوا جا سکتا ہے) کی یکسر نفی کر کے انسان کو اس خدائے واحد سے روشناس کراتی ہیں جس کی نہ تو کوئی تصویر کشی کی جا سکتی ہے اور نہ اس کی کوئی مثال ہی دی جا سکتی ہے: "کوئی چیز اس کے مثل نہیں" (الشوریٰ ۴۲:۱۱)، نیز "اسے تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے" (الانعام ۶:۱۰۳)۔

اسے صرف اس کی تعریف کے ذریعے جانا جا سکتا ہے جو اس نے خود اپنی کتاب میں اپنے بارے میں بیان کی اور اس کے فرستادہ رسول امینؐ کے الفاظ میں ہم تک پہنچی۔ اس ذاتِ یکتا کی نہ تو کوئی مثال ہے اور نہ اس کو کسی سے تشبیہ ہی دی جا سکتی ہے۔

اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک فرسودہ ذہن کو جس کی رسائی محض ظاہری اور حسی اشیاء تک تھی، ایک ہی جست میں تہذیب کے اس اعلیٰ مرتبے تک پہنچا دیا کہ وہ خدا کی توحید، تنزیہ اور ربوبیت کا قائل ہو گیا۔ علاوہ ازیں اسلام کی ان بنیادی تعلیمات کے نتیجے میں افراد کے رویوں میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں (ذرا غور کیجیے کہ زمانۂ جاہلیت کا انسان کیا تھا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد وہ کیا ہو گیا)۔ اس دائرۂ رشد و ہدایت میں آنے کے بعد اب ایک عرب اپنے معاشرتی تعلقات اور زندگی کے معاملات میں شترِ بے مہار نہیں رہا، اس کی زندگی زیادہ منظم اور بامقصد ہو گئی۔ زندگی کے ہر گوشے میں وہ شریعت کا پابند ہو گیا۔ عمومی اخلاقی رویے اور جملہ عادات و اطوار سے لے کر اس کا سونا جاگنا، کھانا پینا، شادی و طلاق اور خرید و فروخت کے معاملات شریعت اسلامی کے پابند ہو گئے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ عادات و اطوار انسان کی شخصیت پر اس قدر حاوی ہوتے ہیں کہ پختہ عادات و اطوار کو بالکل فراموش کر کے یکسر نئی خصوصیات اپنے اندر پیدا کر لینا ایک بہت ہی دشوار کام ہوتا ہے، مگر اسلام اپنے ماننے

والوں کے دلوں میں جو ایمانِ محکم پیدا کرتا ہے، اس کی طاقت نے ان عربوں کے لیے اس امر کو سہل بنا دیا تھا کہ وہ اپنے جاہلی تشخص کو مٹا دیں اور اسلام کی تمام اقدار کو اپنے اندر سمو کر بالکل ایک نئی شخصیت کو جنم دیں۔ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے عادی ہو گئے اور انہوں نے اپنی تمام معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کو اس کی ذات کے ساتھ مربوط کر لیا، کیوں کہ اسلام میں عبادت کا ایک ایسا جامع تصور دے دیا گیا ہے جو ان تمام حرکات وسکنات پر محیط ہے جو رضائے الٰہی کے لیے کی جائیں۔ اسلام کے ماننے والوں نے نماز کو حرزِ جان بنایا جو دین اسلام میں ایک ستون کی حیثیت رکھتی ہے اور دن میں پانچ مرتبہ مقررہ اوقات پر ادا کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی طبیعت بسا اوقات سستی کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، لیکن ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے حضور جس قدر سرِ تسلیم خم کرتا ہے، وہ اتنا ہی زیادہ فرض شناس بن جاتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے اور خود بھی اس کے پابند رہیے (طٰہٰ ۲۰:۱۳۲)۔

[اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے صبر اور استقامت درکار ہے]۔ اسی طرح روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس سے فرد کا روزمرّہ کھانے پینے کا نظام الاوقات شدید متاثر ہوتا ہے۔ اس عبادت کو بجا لانے کے لیے بھی ایک مضبوط قوتِ ارادی اور عزمِ مصمم کی ضرورت ہوتی ہے۔ زکوٰۃ اسلام کا وہ رکن ہے جس میں ایک شخص کو اپنی بچت میں سے کچھ حصہ جو اس نے ایک سال تک رکھ چھوڑا ہو، قربان کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ مالی عبادت ہے جو انسان کو لالچ اور بخل سے محفوظ کرتی ہے۔ زکوٰۃ کی روح یہ ہے کہ اس بات کا اظہار کیا جائے کہ ایک مسلمان دولت سے کہیں بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔ یہ دولت سے محبت ہی تھی جس کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں بہت سے مرتدین نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ صرف اس صورت میں اسلام پر قائم رہیں گے جب انہیں زکوٰۃ ادا کرنے سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ اسلام کے رائج کردہ نئے اصول وضوابط پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کے لیے یہ کیسے روا ہو سکتا تھا کہ وہ اس معاشرے کے رگ وریشہ میں

پیوست ماضی کے ناپسندیدہ اطوار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، مثال کے طور پر شراب نوشی، نکاح کے تمام غیر اسلامی طریقے اور سود وغیرہ جس پر مکے اور دوسرے شہروں کی تجارت قائم تھی۔ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل فرمان پر لبیک کہتے ہوئے تمام گزشتہ عاداتِ بد سے اپنے آپ کو نجات دلائی۔

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعے کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو اب بھی کیا تم باز نہ آؤ گے! (المائدہ ۵: ۹۰-۹۱)

جونہی حرمتِ شراب کا حکم نازل ہوا، اللہ تعالیٰ کے حکم پر بلا چون و چرا لبیک کہتے ہوئے انصارِ مدینہ نے شراب سے بھرے ہوئے مٹکے گھروں سے باہر لا کر گلیوں میں انڈیل دیے اور زبانِ حال سے یوں گویا ہوئے: ''اے ہمارے مالک! ہم نے شراب نوشی ترک کر دی ہے''۔

شراب نوشی جس سے مدینے کے مسلمان یکسر کنارہ کش ہو گئے۔ اس معاشرے کی ایک ایسی پختہ عادت بن چکی تھی جس کی جڑیں ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بڑی گہری تھیں۔ وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری میں مدینے کی گلیوں میں بے دریغ بہائی گئی، دراصل ان کا مادی سرمایہ تھا جسے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے قربان کر دیا، اس مالک و مولیٰ کے سامنے جو کائنات کا مالک بھی ہے اور رازق بھی۔

عرب کے لوگ کبھی کسی باقاعدہ ریاست کے ماتحت نہیں رہے تھے۔ ان کے ہاں قبائلی نظام مروج تھا۔ اسلام سے قبل کے طویل ادوار میں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف علاقوں میں جتنی بھی ریاستیں ابھریں، وہ سب کی سب رفتہ رفتہ معدوم ہو چکی تھیں۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں قبائلی اور بدویانہ طرزِ زندگی رائج تھا۔ اسلام نے اپنی آمد کے ساتھ ریاست کا واضح

تصور عطا کیا اور اسے عملاً نافذ کر کے افراد اور قبائل کو اس تصور کے ساتھ مربوط کیا۔ ریاستِ مدینہ کی تشکیل مکمل طور پر ایک نظریے کی بنیاد پر عمل میں لائی گئی اور تاریخ میں پہلی بار اسلام کے ماننے والوں نے ریاست کو وسعت دے کر جزیرہ نمائے عرب کو متحد اور یکجا کیا۔ عرب کی سیاسی تاریخ میں یہ ایک خوش آئند پیش رفت تھی۔

شہرِ مدینہ میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلام کی بدولت نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کی تعلیمات نہ صرف اپنے اندر گہرائی اور جامعیت رکھتی ہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہونے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتی ہیں: ''ہم (دین کی) اس حالت پر ہیں جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور دوسرا کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ سے خوب تر ہو''؟ (البقرۃ ۲:۱۳۸)

[اس دوررس تبدیلی کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اس پر ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے]۔

۵

مدنی معاشرے پر ہجرت کے اثرات

مسلمان مکے سے ہجرت کر کے یثرب آئے تو شہر کا نام مدینۃ النبی یا مدینہ ہوگیا۔ مدینے آنے والے ان مہاجرین کا تعلق قریش کی مختلف شاخوں سے تھا۔ جزیرہ نمائے عرب کے تمام مسلمانوں کے لیے فرض تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینے میں سمٹ آئیں، اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا، جب تک ہجرت کے آٹھویں سال فتح مکہ پر سرکاری طور پر روک نہ دیا گیا۔

ہجرت اسلام کی تاریخ کا ایک نہایت عظیم الشان واقعہ ہے۔ اس واقعے کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اسلامی کیلنڈر کا آغاز اسی واقعے سے کیا گیا اور اس کیلنڈر کی بنیاد سیّدنا عمرؓ بن خطاب نے رکھی۔

ہجرت اس حقیقت کا ایک بیّن اور جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو اپنے عقائد اور نظریات سے والہانہ لگاؤ ہے۔ ہجرت کرنے والے مسلمانوں نے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے گھر بار، مال و دولت، اہل خانہ اور دوست احباب کو ترک کر دیا۔ جب قریش نے حضور ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت صہیب رومیؓ کو ہجرت سے روکنے کی کوشش کی اور ان پر یہ اعتراض کیا کہ انہیں اپنے ساتھ اپنا مال لے جانے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ یہ مال انہوں نے مکے میں کمایا ہے تو صہیبؓ نے ایک شانِ بے اعتنائی سے اپنا سارا مال قریشِ مکہ کے سامنے پھینک دیا اور بغیر کسی مال و اسباب کے ہجرت پر روانہ ہو گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو آپ نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''صہیب نے یقیناً ایک نفع بخش تجارت کی ہے''۔(۱) اسی طرح کفارِ مکہ نے حضور ﷺ کے ایک اور نامور صحابی حضرت ابو سلمہؓ کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی اہلیہ اور فرزند کے ساتھ ہجرت کر سکیں، لیکن یہ

رکاوٹ حضرت ابوسلمہؓ کی ہجرت کے آڑے نہیں آئی اور وہ اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر تنہا ہی سفرِ ہجرت پر روانہ ہو گئے۔ تقریباً ایک برس اس حالت میں گزرا کہ حضرت ابوسلمہؓ کی بیوی ام سلمہؓ ہر روز روتے ہوئے وادی ابطح جایا کرتیں اور شام ڈھلے تک وہاں رہتیں۔ ایک سال کی جدائی کے بعد وقت آیا کہ وہ اپنے بیٹے سلمہ کے ساتھ ہجرت کر سکیں اور اپنے شوہر کے پاس جا کر رہ سکیں۔ (۲) مختصر یہ کہ ہجرت ایک ایسا مرحلہ تھا جو مشکلات سے بھرپور تھا اور مسلمانوں کے لیے عقائد کی پختگی اور دنیاوی مال و متاع پر اپنے ایمان کو ترجیح دینے کا ایک کڑا امتحان بھی تھا۔

ہجرت کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کی تعلیم و تربیت کتنی ٹھوس بنیادوں پر کی تھی۔ تعلیم و تربیت کا یہ اعلیٰ ترین معیار ہی تو تھا جس کی بناء پر آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں اٹھانے، قوانینِ الٰہی کو دنیا میں نافذ کرنے اور اس راہ میں جدوجہد کرنے کے قابل ہوئے، اور جب ریاست مدینہ کے قیام و استحکام کا مرحلہ آیا تو وہ اس میں سرخرو ٹھہرے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مسلمانوں کی ہجرت کے لیے مدینے کا انتخاب فرمایا۔ ایک صحیح روایت کے مطابق اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''تمہارا مقام ہجرت مجھے دکھا دیا گیا ہے۔ یہ نمکیات والی سرزمین ہے، دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور اس خطے میں کھجور کے درخت پائے جاتے ہیں'' (بخاری، مسلم)۔

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے اپنے سفر کو مؤخر کیے رکھا اور اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی یہ مشورہ دیا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہ آ جائے، وہ بھی اپنے سفر کو ملتوی رکھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''ابوبکر صدیقؓ نے سفر ہجرت کی تیاری بالکل مکمل کی ہوئی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں مشورہ دیا کہ ابھی جلدی نہ کریں۔ مجھے امید ہے کہ بارگاہِ الٰہی سے بہت جلدی مجھے ہجرت کی اجازت مل جائے گی (اس وقت آپ بھی میرے ہمراہ ہجرت کریں)''۔ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے نبی کو کوچ کا حکم دیا تو آپؐ نے صرف حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور اپنے اہل خانہ کو اس کی اطلاع دی۔ کفار مکہ جو مسلمانوں کی

ہجرت پر سخت غیظ وغضب میں مبتلا تھے، (انہوں نے اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے) حضور ﷺ کو شہید کرنے کی ایک (ناپاک اور گھناؤنی) سازش تیار کی۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس واقعے کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اور اس واقعہ کا بھی ذکر کیجیے جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت (بڑی بڑی) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آیا آپ کو قید کرلیں، یا آپ کو قتل کر ڈالیں، یا آپ کو جلاوطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا، اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے'' (الانفال ۸: ۳۰)۔

بالآخر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے سفرِ ہجرت پر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے جبلِ ثور کا راستہ منتخب کیا اور ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے۔ قریشِ مکہ نے ان دونوں مقدس ہستیوں کا پیچھا کیا اور غار کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ غار کے باہر سے ان کے پاؤں بخوبی نظر آتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اضطراباً عرض کیا: ''اگر ان میں سے کسی نے نیچے اپنے پیروں کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں آسانی سے دیکھ لے گا''۔ رسول اللہ ﷺ نے کامل اطمینان اور تسکین کے ساتھ جواب دیا: ''ابوبکر! ان دو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے'' (۳)۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا رخ وہاں سے پھیر دیا اور وہ اپنی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔ تین روز غارِ ثور میں قیام کرنے کے بعد آپؐ صحرا کے راستے مدینے کی جانب روانہ ہوئے۔ (۴) اس وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک ترپن سال اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اکاون سال تھی۔ یقیناً جو قلب اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہو جائے، اسے دنیا کی کوئی چیز بھی اپنے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اسلام کا اعلان تھا کہ یہ ایک مکمل دستورِ حیات ہے، اس کی روشنی میں عبادات اور زندگی کے تمام معاملات کی تنظیمِ نو کی جائے۔ اس پیغام پر عمل درآمد کے لیے ایک علیحدہ خطۂ زمین اور ایک امت کی ضرورت تھی، جہاں قرآن وسنت کے قوانین نافذ کیے جائیں۔ ان قوانین کی مدد سے ایک مثالی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس ریاست میں انسانی تاریخ کا بہترین معاشرہ ابھر کر سامنے آیا۔ یہی ایک ایسا نمونہ ہے جس کی پیروی کرنا مسلمانوں پر ہر زمانے اور ہر مقام پر لازم ہے۔ اس نمونے پر عمل پیرا ہو کر

مسلمان دونوں جہانوں کی فلاح پا سکتے ہیں اور جاہلیت کی تاریکیوں سے نکل کر اپنے آپ کو ہر طرح کے کرب اور اضطراب سے محفوظ رکھ سکتے ہیں، کیوں کہ مسلمانوں کے لیے رجوع الی اللہ اور اتباعِ رسول کے سوا کہیں بھی جائے پناہ اور نجات نہیں۔

مدینے کی جانب رسول اللہ ﷺ کی ہجرت اس وقت تک مؤخر رکھی گئی، جب تک صحابہ کرامؓ کی اکثریت نے ہجرت نہیں کر لی۔ اس دوران میں ہجرت کے عمل کی حوصلہ افزائی اور ہجرت کرنے والوں کے بلند درجات اور فضائل کے تذکرے پر مشتمل بہت سی قرآنی آیات نازل ہوتی رہیں۔ مدینے کی اس نئی ابھرتی ہوئی ریاست کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ان مہاجروں کی مدد اور ان کی قوت کی اشد ضرورت تھی جن کا ایمان و یقین اخلاص کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھا جا چکا تھا، کیوں کہ ایک طرف تو مدینہ شہر میں پائے جانے والے مسلمانوں کے اندرونی دشمن یہودی، مشرکین اور منافقین اس نوزائیدہ مملکت کو ناکام بنانے کے درپے تھے، اور دوسری جانب مدینے کی یہ چھوٹی سی شہری ریاست اپنے اطراف و جوانب سے مشرکانہ، بت پرستانہ اور بدویانہ قوتوں میں گھری ہوئی تھی۔ ہجرت کے عمل نے کفارِ مکہ کو سخت پریشان اور بے چین کر دیا تھا جو بعثت کے آغاز ہی سے اسلام کو ناکام بنانے کے لیے اس کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ جب ہجرت عمل میں آ گئی تو ان دشمنانِ اسلام نے اپنی نظریں مدینے پر جما لی تھیں اور اسلامی ریاست کے ارتقاء کا جو عمل شروع ہو چکا تھا، اس کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ ہجرت کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر متعدد قرآنی آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعے ہجرت کا حکم بھی دیا گیا اور اس کی فضیلت واضح کرتے ہوئے مہاجروں کے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ بھی کیا گیا۔ ان آیات میں اہل اسلام کے دشمن سے مقابلہ کرنے کی خصوصی اہلیت کا اعتراف کیا گیا اور ان کے تحفظ کا خدائی وعدہ یاد دلایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہجرت کرنے والوں کو رزقِ کثیر کی بشارت بھی سنائی: ’’اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا تو اس کو روے زمین پر جانے کے لیے بہت جگہ ملے گی اور بہت گنجائش۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی

طرف ہجرت کروں گا، پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا، اللہ کے ذمہ" (النساء ۴: ۱۰۰)۔

یعنی اگر کوئی شخص ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر سے نکلا، لیکن راستے میں وفات پا گیا تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اسے اس شخص کی طرح ہی ثواب عطا فرمائیں گے جو ہجرت کر چکا ہے۔ "اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے لیے) اپنا وطن چھوڑا، پھر وہ لوگ (کفر کے مقابلے میں) قتل کیے گئے، یا مر گئے، اللہ تعالیٰ ان کو ضرور ایک عمدہ رزق دے گا" (الحج ۲۲: ۵۸)۔

مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے بہترین رزق کی ضمانت دی ہے جو اس کی خاطر ہجرت کریں، خواہ وہ میدان جنگ میں مارے جائیں، یا گھر پر طبعی موت مریں۔

علاوہ ازیں قرآن کریم نے ان تمام لوگوں کو جو ہجرت کی استطاعت رکھتے تھے، کفار کے ساتھ مل کر رہنے کی ممانعت کی۔

بے شک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے کو گناہ گار کر رکھا تھا تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کس کام میں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے۔ وہ کہتے ہیں، کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی۔ تم کو ترکِ وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہیے تھا۔ سو ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے کے لیے وہ بری جگہ ہے، لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ راستے سے واقف ہیں، سو ان کے لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑے مغفرت کرنے والے ہیں"
(النساء ۴: ۹۷-۹۹)۔

کفار کے ساتھ مل جل کر رہن سہن اختیار کرنے کی اس لیے مذمت کی گئی کہ ایک تو اس طرح ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا اور دوسری طرف مسلمانوں کی صنعت وزراعت سے وہ فائدہ اٹھاتے۔ اس کا تیسرا لازمی نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ جنگ کی صورت میں وہ مسلمانوں کو

مسلمانوں ہی کے خلاف لڑنے پر مجبور کرتے جیسا کہ غزوۂ بدر میں ہوا۔ ہجرت نہ کرنے کا ایک اور نقصان یہ پیش آتا کہ مسلمانوں کو دین سے دور کرنے کی خاطر ان پر کفار کے تشدد میں اضافہ ہوتا اور مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد اس کی لپیٹ میں آ جاتی۔ یہ بھی قدرتی بات ہے کہ اسلامی ریاست سے جغرافیائی طور پر دور رہنے سے مسلمان اپنی ریاست کے بہت سے فوائد سے بھی محروم رہتے۔ نہ تو وہ دیگر مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں حصہ لے سکتے اور نہ اپنی تعداد کے ذریعے مسلمانوں کے استحکام ہی کا باعث بن سکتے تھے۔ ان تمام اسباب کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضور ﷺ نے اعلان فرمایا: ”جو شخص ایک غیر مسلم کے ساتھ رہے گا اور اپنے کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کرے گا، وہ دراصل اسی جیسا شمار ہوگا“ (سنن ابی داؤد)۔

کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی اولاد اور بیویوں کے کہنے میں آ کر ہجرت میں تاخیر کی، لیکن جب انہوں نے کچھ عرصہ گزارنے کے بعد ہجرت کی تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ جنھوں نے ان سے پہلے ہجرت کی تھی، وہ علم دین کے حصول میں ان سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ اس پر انہوں نے اپنے اہل خانہ کو سزا دینا چاہی جو اس خسارے کا سبب بنے تھے۔ اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ”اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں، سو تم ان سے ہوشیار رہو“ (التغابن ۶۴:۱۴)۔

ان تمام تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شروع ہی سے ہجرت ہر مسلمان کے اوپر فرض کی گئی تھی اور یہ فرضیت غزوۂ خندق، یعنی ۵ ھ تک برقرار رہی۔ یہ وہ موقع تھا جب مسلمانوں نے اپنے خلاف جمع ہونے والی تمام متحدہ طاقتوں کا مقابلہ کیا اور اسلامی ریاست کا دفاع اور اس کی حفاظت کرنے کی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ اب ریاست کو نئے مہاجروں کی طاقت اور قوت کی مزید ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اب وہ مقام آ گیا تھا کہ مدینے کی اسلامی ریاست دفاعی حیثیت سے نکل کر از خود حملہ آور ہونے کی طاقت حاصل کر چکی تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس غزوے سے فارغ ہو کر فرمایا: ”اب ہم ان پر حملہ کریں گے اور وہ کبھی ہم پر حملہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے“۔

علاوہ ازیں شہر مدینہ اب بڑھتی ہوئی آبادی، اس کی خوراک اور رہائش وغیرہ کی ضروریات کا متحمل نہیں تھا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے بعد کچھ مہاجروں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں، کیوں کہ اب مدینے میں ان کے مزید قیام کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ''تمہاری ہجرت تمہارے اونٹوں کی رکاب میں ہے''۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا اپنے قبائل میں واپس جا کر رہنا اس لحاظ سے بھی مفید تھا کہ وہ وہاں دعوت وتبلیغ کا آغاز کر کے بیرونِ مدینہ اسلام کی اشاعت کا کام کر سکتے تھے۔

تاہم اس وقت تک ہجرت کے اختتام کا کوئی باقاعدہ اور عام اعلان نہیں کیا گیا، یہ اعلانِ عام فتح مکہ کے بعد کیا گیا۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا: ''اب، جب کہ مکہ فتح ہو چکا ہے، آئندہ سے مکے سے مدینے ہجرت کی فرضیت ساقط کی جاتی ہے، لیکن جہاد اور اس کے عزائم جوں کے توں باقی ہیں اور اگر کسی وقت بھی مسلمانوں کا امیر جہاد کی دعوت دے تو تم فوراً اطاعت کرنا''۔ حضور ﷺ کے اس فرمان کے بعد ہجرتِ مدینہ لازم نہیں رہی تھی، لیکن جہاد اور ہجرت کی نیت ان لوگوں کے لیے جو اس کام کا بیڑا اٹھا چکے تھے، یا جن پر دشمن حملہ آور ہو جائے، ان سب کے لیے باقی رہی، تاہم ایسے نومسلموں کا معاملہ مختلف ہے جو غیر مسلم اکثریت کے علاقے میں رہائش پذیر ہوں اور وہ اپنے دین کے باعث ظلم وتشدد کا شکار ہوں، اس طرح کے لوگوں کے لیے ہجرت کا قانون نافذ العمل ہے، بشرطیکہ وہ اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔

ہجرت کی وجہ سے مدینے کی آبادی اور اس کے بسنے والوں میں ایک تنوع ابھر کر سامنے آیا۔ اب اس شہر کی آبادی محض اوس وخزرج کے قبائل اور یہودیوں پر مشتمل نہیں تھی، بلکہ قبیلۂ قریش کے مہاجرین اور بے شمار دوسرے عرب قبائل یہاں آ کر رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ مدینے کے معاشرے کا ڈھانچا دینی عقائد اور محکم معاشرتی اصولوں کی مضبوط بنیادوں پر تعمیر کیا گیا تھا اور یہ بنیادیں قبائلی اور دیگر تمام تعلقات سے زیادہ مضبوط اور اعلیٰ تر تھیں۔ آئندہ صفحات میں جب ہم دستورِ مدینہ کا جائزہ لیں گے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس کے ذریعے کس طرح امت

کی وحدت کا ایک عظیم الشان تصور ابھر کر سامنے آیا۔ مدینے کی آبادی کی تقسیم ان کے عقائد اور نظریات کی بنیاد پر کی گئی تھی اور کل آبادی تین گروہوں میں منقسم تھی، یعنی مومن، منافق اور یہودی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چاروں طرف سے مدینے پر مہاجروں کا جو سیلاب امڈ آیا تھا، اس سے بے شمار معاشی اور سماجی مسائل پیدا ہوئے جنہیں بڑی دور اندیشی کے ساتھ حل کرنا تھا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب نظامِ مواخات نافذ کیا گیا۔

حواشی

۱۔ الحاکم، المستدرک، ۳:۳۹۰۔ ان کا بیان ہے کہ امام مسلم کے معیار کے مطابق یہ روایت ''صحیح'' ہے۔

۲۔ دیکھیے: الاصابة، ۸:۲۲۲

۳۔ صحیح بخاری، ۷:۲۱۷؛ صحیح مسلم، ۷:۱۰۹

۴۔ احمد بن حنبل، المسند، حدیث ۳۵۱؛ نیز دیکھیے: ابن کثیر، البدایة، ۳:۱۸۷-۱۸۸

دورِ نبوی کا نظامِ مواخات

اسلام کی نظر میں تمام مومن رشتۂ اخوت میں جڑے ہوئے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں'' (الحجرات ۴۹:۱۰)۔ اسی رشتے کی بناء پر اسلام تمام اہل ایمان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گہرے برادرانہ تعلقات قائم کریں اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون بنیں۔ اس باب کا خصوصی موضوع وہ نظامِ مواخات ہے جو حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کے درمیان قائم کیا تھا۔ اس نظام کے ذریعے ان کے مابین وہ مخصوص حقوق وفرائض وجود میں آئے تھے جو عام اہل ایمان کے آپس کے حقوق وفرائض سے بڑھ کر ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

مشہور مؤرخ اور جغرافیہ دان بلاذری لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہجرت سے پہلے ہی مکے میں مسلمانوں کے درمیان اس بنیاد پر نظامِ مواخات قائم فرما دیا تھا کہ وہ حق کی پاسداری کے لیے ایک دوسرے کے مددومعاون بن کر رہیں گے، چنانچہ جن صحابہ کرامؓ کے درمیان مکے میں مواخات قائم کر دی گئی تھی، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

☆ حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ

☆ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ

☆ حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف

☆ حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود

☆ حضرت عبیدؓ بن حارث اور حضرت بلال حبشیؓ

☆ حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص

☆ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ

☆ حضرت سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ

اور حضور ﷺ نے بذات خود حضرت علیؓ کے ساتھ رشتۂ مواخات مستحکم فرمایا۔(۱)

بلاذری قدیم ترین مؤرخ ہے جس نے مکے میں ہونے والی اس مواخات کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن عبدالبر (م۴۶۳ھ) کے ہاں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن ابن عبدالبر نے بلاذری کا حوالہ دیے بغیر اس بات کو بیان کیا ہے۔(۲) اسی طرح ابن سیّدالناس نے ان دونوں مصنفین کی فراہم کردہ معلومات کو اس صراحت کے بغیر پیش کیا ہے کہ ان دونوں حضرات میں سے کس کے ذریعے اسے یہ معلومات حاصل ہوئیں۔ (۳) حاکم نے المستدرک میں جامع ابن عمیر کے سلسلۂ اسناد کے ساتھ اسے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے ابوبکرؓ اور عمرؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور عثمانؓ بن عفان کے درمیان رشتۂ مواخات قائم کر دیا تھا''۔

حاکم اور ابن عبدالبر نے ابوالشعثاء سے ابن عباسؓ کی سند پر یہ روایت نقل کی ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے زبیرؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان مواخات قائم فرمائی تھی''۔

اس کے برعکس ابن قیم اور ابن کثیر دونوں کا رجحان اس طرف ہے کہ مکے میں مواخات قائم نہیں ہوئی تھی۔ ابن قیم کہتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین مکہ کے درمیان آپس میں مواخات قائم کرا دی تھی اور حضرت علیؓ کو اپنا مواخاتی بھائی قرار دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مدینے میں مواخات قائم کی گئی تھی، کیوں کہ مہاجرینِ مکہ اور انصار مدینہ کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کرنے کی اشد ضرورت تھی، لیکن مہاجرین مکہ کے درمیان آپس میں مواخات قائم کرانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، کیوں کہ ایک تو ان کے درمیان اخوتِ اسلامی کا عام رشتہ قائم تھا اور دوسرے ان حضرات کے مابین

قرابت کے تعلقات موجود تھے، پھر وہ سب ایک ہی شہر کے باسی تھے، لیکن مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کرنے کی واقعی ضرورت تھی۔ (۴)

مشہور مؤرخ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بہت سے دیگر مصنفین نے بھی مواخاتِ مکہ کا انہی وجوہ کی بنا پر انکار کیا ہے جن کا ذکر ابن قیم کے ہاں ملتا ہے۔ (۵) ابن کثیر اور ابن قیم کی آراء میں اس لیے بھی زیادہ وزن محسوس ہوتا ہے کہ سیرت کی قدیم ترین اور مستند کتب میں مواخاتِ مکہ کا کوئی ذکر نظر نہیں آتا۔ بلاذری واحد مصنف ہیں جس نے یہ معلومات جمع کی ہیں، لیکن اس نے بغیر کسی سند کے صرف لفظ قالوا (انہوں نے کہا) سے روایت درج کی ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت ''ضعیف'' ہے، نیز نقاد بلاذری کو فی ذاتہ ضعیف سمجھتے ہیں۔ اگر بالفرض مکے میں مواخات قائم بھی ہوئی تھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن دو افراد کے درمیان مواخات کرائی گئی تھی، وہ محض ان کے درمیان باہمی مشاورت اور تعاون تک محدود تھی اور وراثت کے حقوق اس میں شامل نہیں تھے۔

مواخاتِ مدینہ

مکے سے جن لوگوں نے مدینے ہجرت کی، انہیں مختلف معاشی، معاشرتی اور صحت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات تو سب لوگ جانتے ہیں کہ مہاجرین اپنے اہل وعیال اور اپنا بیشتر مال و دولت مکے ہی میں چھوڑ کر آ گئے تھے۔ یہ لوگ تجارت میں تو مہارت رکھتے تھے جو قریش کا خاص امتیازی وصف تھا، لیکن زراعت اور صنعت کے شعبوں سے یہ حضرات قطعاً ناآشنا تھے، جب کہ مدینے کا معاشی نظام تمام کا تمام زراعت اور صنعت پر ہی قائم تھا۔

تجارت کے لیے چونکہ سرمایہ درکار رہتا ہے، اس لیے مہاجرین فوری طور پر ایک نئے معاشرے میں اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ مدینے کی نوزائیدہ ریاست بے شمار مسائل سے دوچار تھی جن میں سرفہرست مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا۔ مہاجرین اس علاقے میں نووارد اور اس معاشرے سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ وہ اپنے اہل وعیال اور تمام احباب کو مکے میں چھوڑ آئے تھے جن کے ساتھ اب ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مدینے میں شدید قسم کی تنہائی کا شکار تھے اور اپنی سرزمین کی یاد سے بھی بیگانہ نہیں تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نئے

شہر کی آب و ہوا بھی ان کے پرانے وطن سے مختلف تھی جس کی وجہ سے کچھ مہاجرین بخار میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں فوری توجہ کی ضرورت تھی، اور ایسا عارضی حل چاہیے تھا جو میزبانی کی عمومی رسوم ہی تک محدود نہ ہو۔ انصارِ مدینہ نے مہاجرین کی مدد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، انہوں نے ایثار اور خلوص کی وہ اعلیٰ مثالیں قائم کیں جو کتاب اللہ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کی مستحق قرار پائیں: ''اور وہ (انصار) انہیں اپنے سے مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ خود فاقے ہی سے ہوں'' (الحشر ۵۹:۹)۔

انصارِ مدینہ نے سخاوت اور فیاضی کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے تمام نخلستان اپنے اور اپنے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر لیں گے، کیوں کہ یہ نخلستان آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ان نخلستانوں کا انتظام اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں، لیکن ان کا جو پھل اترے، اس میں اپنے مہاجر بھائیوں کو بھی شریک کر لیا کریں۔ (۶) اب یہ معلوم نہیں کہ یہ شرکت کس قسم کی تھی، آیا مہاجرین فصل کی آمدنی میں برابر کے اور مستقل شریک تھے، یا اس شرکت کا مقصد انصار کی طرف سے مہاجرین کے لیے وقتی معاونت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مہاجرین زراعت کے کاموں میں حصہ لیں۔ اس کی دو وجوہ تھیں، ایک وجہ تو یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ ان مہاجرین سے جہاد اور تبلیغ کا کام لینا چاہتے تھے، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مہاجرین زراعت سے مکمل طور پر نابلد تھے (۷) جس کا اظہار بھی ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔ اسی وجہ سے مدینے کی زرعی پیداوار میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

اسی طرح انصار نے اپنی تمام اضافی اراضی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہمارے مکانات بھی آپ کے لیے حاضر ہیں۔ حضور ﷺ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے مہاجر صحابہ کرامؓ کے لیے اس زمین پر کچھ مکانات تعمیر کرائے جو انصار نے پیش کی تھی اور کچھ اس زمین پر جو کسی کی ملکیت نہیں تھی۔ (۸)

انصار کے اس فیاضانہ برتاؤ نے مہاجرین کے دل موہ لیے۔ وہ انصار کی سخاوت اور

فیاضی کا برملا اعتراف کیا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ! ہم نے انصار جیسے لوگ کبھی نہیں دیکھے، وہ بہترین لوگ ہیں۔ اگر ان کے پاس تھوڑا ہے، تب بھی وہ مدد کرنے سے نہیں چوکتے اور اگر ان کے پاس زیادہ ہو، تب بھی ایثار میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ انہوں نے ہر ضرورت میں بڑھ چڑھ کر ہماری مدد کی ہے، یہاں تک کہ اپنی خوشیوں میں ہمیں اس حد تک شریک کیا ہے کہ ہمیں لگتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے تمام تر اجر و ثواب کے مستحق وہی قرار پائیں گے''۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً فرمایا: ''نہیں! بلکہ جب تک تم ان کی تعریف و توصیف کرتے رہو گے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو گے، (یعنی تم بھی ثواب کے مستحق گردانے جاؤ گے)''۔(۹)

نظامِ مواخات کی قانون سازی

مہاجرین کے لیے انصار کے تمام تر مالی ایثار اور فیاضی کے باوجود ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں مہاجرین کو قانونی طور پر ایک باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ بالخصوص مہاجرین کا مرتبہ اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ ان کے مسائل کو اس طرح حل کیا جائے کہ وہ خود کو انصار کے اوپر بوجھ محسوس نہ کریں۔ بنابریں مواخات کے نظام کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی۔ مواخات کو قانونی حیثیت دینے کی تاریخ کے متعلق جتنی روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان میں معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قانون سازی ہجرت کے پہلے برس ہی عمل میں آ گئی تھی۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا یہ قانون مسجدِ نبوی کی تعمیر کے دوران میں نافذ کیا گیا یا اس کے بعد۔(۱۰) ابن عبدالبر کے خیال میں ہجرت کے پانچویں مہینے کی کسی تاریخ کو مواخات کے نظام کو قانونی شکل دی گئی،(۱۱) جبکہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد اور جنگ بدر(۱۲) سے پہلے یہ کام ہوا، تاہم وہ بھی کسی خاص تاریخ کا تعین نہیں کرتے۔

روایات میں آتا ہے کہ اس قانون کا باقاعدہ اعلان حضرت انسؓ بن مالک کے گھر پر کیا گیا۔(۱۳) یہ مواخات انصار اور مہاجرین کے درمیان کرائی گئی اور رسول اللہ ﷺ نے دو دو

بھائیوں کی جوڑیاں تشکیل دے دیں، جن میں سے ایک کا تعلق انصار سے اور دوسرے کا مہاجرین سے تھا۔ مواخات ۹۰ اشخاص کے مابین کرائی گئی جن میں سے ۴۵ افراد مہاجرین میں سے اور ۴۵ انصار میں سے تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ کوئی مہاجر ایسا نہیں بچا تھا جس کا بھائی چارہ کسی انصاری سے قائم نہ کر دیا گیا ہو۔ (۱۴) تاریخ اسلام اور سیرتِ نبوی ﷺ کے تمام قدیم مآخذ اس پر متفق ہیں کہ مواخات مہاجرین اور انصار کے درمیان کرائی گئی تھی، لیکن ابن سعد لکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور مواخات بھی عمل میں آئی تھی جو مہاجرین کے درمیان آپس میں کرائی گئی تھی، لیکن انہوں نے اس کی کوئی مزید تفصیل بیان نہیں کی جس سے یہ پتا چلتا کہ اس مواخات کا کیا مقصد تھا اور اس کے نتیجے میں کیا حقوق وفرائض متعین کیے گئے تھے، تاہم دیگر مآخذ نے نہ تو اس بات کو کوئی وزن دیا ہے اور نہ اس پر کوئی تبصرہ ہی کیا ہے۔ (۱۵)

مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کے قیام کے لیے جو قانون بنایا گیا، اس کے نتیجے میں باہم بھائی بننے والے دو اشخاص کو ایک دوسرے کے اوپر خاص حقوق حاصل ہو گئے تھے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ وہ باہم معاونت کیا کریں گے، اور یہ باہمی معاونت کسی خاص معاملے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ زندگی کے تمام مسائل پر محیط تھی۔ خواہ وہ مادی مسائل ہوں یا روحانی۔ ایک دوسرے کی مدد اور دیکھ بھال سے لے کر باہمی محبت اور دوستانہ روابط تک اس تعاون کے دائرے میں شامل تھے، یہاں تک کہ مواخات کے نظام میں یہ امر بھی شامل تھا کہ دو افراد جو آپس میں بھائی قرار دیے گئے ہیں، قطع نظر دیگر رشتہ داروں کے، وہ ایک دوسرے کی وراثت کے بھی حقدار ہوں گے۔ ان تمام حقوق نے مواخات کے رشتے کو اتنا گہرا اور اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ خونی اور نسلی تعلق بھی اس کے آگے ماند پڑ گیا تھا۔ (۱۶)

انصار اس بات پر خوش تھے کہ انہیں اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کرنے اور ان کے لیے قربانی دینے کا موقع ملا۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انصار نے دل کی گہرائیوں سے مواخات کی پاسداری کی اور اس پر عمل درآمد کرنے میں اپنے انتہائی جذبات کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک منفرد اور یگانۂ روزگار مثال حضرت سعدؓ بن ربیع (انصاری) اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن

عوف (مہاجر) کی ہے۔ حضرت سعدؓ نے پورے جذبۂ اخوت کے ساتھ اپنے مواخاتی بھائی عبدالرحمٰنؓ سے کہا: ''میرے پاس جتنی دولت ہے، میں اسے اپنے اور تمہارے درمیان آدھا آدھا تقسیم کرلوں گا۔ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جس کے ساتھ بھی تم نکاح کرنا چاہو، میں اسے طلاق دینے کے لیے تیار ہوں، تم مقررہ میعاد گزرنے کے بعد اس سے شادی کر لینا''۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اسی جذبے کے ساتھ جواب دیا: ''اللہ تمہارے مال اور تمہاری بیویوں کو تمہارے لیے باعث برکت بنائے، مجھے بازار کا رستہ دکھادو''۔ جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بازار سے لوٹے تو ان کے پاس مکھن اور پنیر تھا جو انہوں نے اپنی تجارت میں نفع کے طور پر کمایا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ ایک روز حضور ﷺ نے میرے چہرے پر زرد رنگ کی خوشبو کے آثار دیکھے تو پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟ عبدالرحمٰن!'' میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں نے انصار کی ایک خاتون سے شادی کر لی ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تو ولیمے کا اہتمام کرو، چاہے ایک بکری ہی ذبح کرلو''۔ (۱۷)

بلاشبہ اس بے مثال اخوت اور باہمی خلوص کی تصویر دیکھ کر انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے جس کی مثال پوری تاریخِ انسانی میں دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا شریفانہ اور غیرت مندانہ رویہ اور اپنے مواخاتی بھائی سے فائدہ نہ اٹھانے کا جذبہ بھی اسی قدر قابل تحسین ہے جس قدر ابن ربیعؓ کی فیاضی اور ایثار قابل قدر ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک لائق اور تجربہ کار تاجر تھے اور اپنی نئی اجتماعی زندگی میں اپنا مقام خود پیدا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد ان کی مالی حالت اس قدر مستحکم ہوگئی تھی کہ انہوں نے نہ صرف شادی کر لی، بلکہ سونے کی کچھ مقدار بھی اپنی اہلیہ کو مہر کے طور پر ادا کی، (۱۸) اور پھر ایک وقت آیا کہ ان کے کاروبار میں بہت برکت پیدا ہوئی اور ان کے مال میں اتنا زیادہ اضافہ ہوگیا کہ ان کا شمار مسلمانوں کے دولت مند ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ عسرت کے دنوں میں بھی انہوں نے مانگنے سے ہمیشہ اجتناب کیا اور اپنے ہاتھ کو اوپر والا ہاتھ ہی بنائے رکھا جو دینے پر تو آمادہ رہتا ہے، مگر لیتا کبھی نہیں۔

مواخاتی بھائیوں کے درمیان وراثت کی تنسیخ

مواخاتی بھائیوں کے درمیان وراثتی حقوق کی تنفیذ ایک ایسا عارضی اور وقتی حل تھا جو ان غیر معمولی حالات اور مسائل کے پیشِ نظر کیا گیا تھا جن سے ریاستِ مدینہ ابتداء میں دو چار تھی۔ جب مہاجرین مدینے کی زندگی کے عادی ہو گئے اور وہاں اپنا معاش کمانے کے قابل ہو گئے اور غزوۂ بدر کے موقع پر انہیں اتنی غنیمت بھی حاصل ہو گئی جو ان کے لیے کافی تھی تو پھر وراثت کا نظام اپنی اصل حیثیت پر واپس آ گیا جس کی بنیاد قرابت پر تھی اور جو انسانی فطرت سے قریب تر تھا۔ مواخاتی بھائیوں کے درمیان وراثتی حقوق قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعے منسوخ کر دیے گئے:(۱۹) ''اور جو لوگ رشتہ دار ہیں، کتاب اللہ میں ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حقدار ہیں'' (الانفال ۸:۷۵)(۲۰)۔

یہ وہ آیت ہے جو وراثت کے اس قانون کو منسوخ کر دیتی ہے جس کی بنیاد مواخات کے نظام پر رکھی گئی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کی رائے میں قرآن مجید کی یہ آیت بھی اس قانون کو منسوخ کرتی ہے: ''اور ہر ایسے مال کے لیے جس کو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں۔۔۔ (النساء ۴:۳۳)۔

ان کی رائے میں قرآن مجید کی اس آیتِ مبارکہ میں لفظ ''موالی'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خونی رشتے کی بناء پر وراثت کا حق رکھتے تھے اور قرآن کے ان الفاظ ''اور وہ لوگ جن کے ساتھ تم نے عہد باندھا ہے'' کا مصداق وہ مہاجرین ہیں جو مواخات کی بناء پر وراثت کے حقدار قرار پائے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مواخات کے نظام میں سے صرف باہمی وراثت کے قانون کو منسوخ کیا گیا تھا، لیکن ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعاون، ہمدردی اور مشاورت کی اخلاقی ذمہ داریاں جوں کی توں قائم رکھی گئی تھیں، البتہ مواخاتی بھائیوں کے لیے یہ گنجائش موجود تھی کہ اگر وہ چاہیں تو ایک دوسرے کے لیے وصیت کے ذریعے کچھ ترکہ چھوڑ سکتے ہیں، (۲۱) مگر وصیت کے بغیر وہ ترکے میں ایک دوسرے کے حقدار نہیں تھے۔ امام نووی بھی اسی بات کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے تو جن دو افراد کو آپس میں بھائی بنایا گیا ہے، ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہ بنیں۔ علمائے اسلام کی اکثریت اسی رائے کی حامل ہے، لیکن جہاں تک اسلامی اخوت، اطاعتِ الٰہی پر متحد ہونے، دینی معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرنے، نیکی اور حق کو قائم کرنے میں تعاون کرنے کا تعلق ہے تو یہ ہمیشہ اپنی قانونی شکل میں موجود رہیں گے اور کبھی منسوخ نہیں ہوں گے۔ (۲۲)

ابن سعد وہ واحد مصنف ہیں جنھوں نے عروہ بن زبیر کی سند پر ایک روایت نقل کی ہے۔ اس روایت سے بھی مواخاتی بھائیوں کے مابین قانونِ وراثت کی تنسیخ کا پتہ چلتا ہے۔ اس روایت کی رو سے یہ قرآنی آیت: ''اور جو لوگ رشتہ دار ہیں کتاب اللہ میں ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حقدار ہیں'' (الانفال ۸:۷۵)، جنگ احد (۲۳) کے بعد نازل ہوئی جو شوال ۳ھ میں پیش آئی تھی۔

یہ بات تعجب خیز ہے کہ ابن حجر (۲۴) نے حضرت حتات التمیمیؓ اور حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے درمیان مواخات کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دوران میں جب حضرت حتاتؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت معاویہؓ کو اس مواخات کی بنیاد پر حضرت حتاتؓ کی وراثت میں حصہ ملا تھا۔ ابن حجر نے بھی اس واقعہ پر محض حیرت کا اظہار کرنے پر ہی اکتفاء کیا ہے، کیوں کہ حضرت حتاتؓ کے بہت سے بیٹے تھے جو ان کے صلبی وارث (۲۵) تھے۔ ابن حجر نے مواخات کی بنیاد پر قائم ہونے والی وراثت کی تنسیخ کا کوئی حوالہ پیش نہیں کیا جو ۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ روایت صرف اسی صورت میں مستند قرار دی جا سکتی ہے، جب یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت حتاتؓ نے حضرت معاویہؓ کو اپنے ترکے میں سے کچھ حصے کا بذریعہ وصیت وارث قرار دیا تھا۔

وراثت کی تنسیخ کے بعد مواخات کا تسلسل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مواخات قائم کرنے کے عمل کو وراثت کی

تنسیخ کے بعد بھی جاری رکھا، لیکن اسے محض ایک دوسرے کی مدد، تعاون اور مشاورت تک محدود کر دیا، اور وراثتی حقوق ساقط کر دیے تھے۔ اسی طرح کچھ روایات ہمیں ایسی بھی ملتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ ﷺ نے حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کے درمیان مواخات قائم کی تھی، جبکہ حضرت سلمان فارسیؓ غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے درمیانی عرصے میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے واقدی اور بلاذری نے اس قسم کی روایات کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ (۲۷) اسی طرح ابن کثیر نے اس روایت کو مسترد کیا ہے جس کی رو سے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو حضرت معاذؓ بن جبل کا مواخاتی بھائی قرار دیا جاتا ہے، کیوں کہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب خیبر فتح ہونے کے بعد مدینے آئے تھے اور یہ ۷ھ (۲۸) کا ابتدائی عرصہ تھا۔ اسی بنیاد پر حضرت حتاتؓ اور حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کا مواخاتی تعلق بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے، کیونکہ حضرت معاویہؓ نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا تھا جو ۸ھ کا واقعہ ہے۔ اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ غزوۂ بدر کے بعد وراثتی حقوق تو منسوخ ہو چکے تھے، لیکن مواخات کا نظام بدستور نافذ العمل رہا تو پھر ہماری نظر میں مؤرخین کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ مندرجہ بالا تمام روایات کو رد کر دیں۔

اگر ہم یہ قبول کر لیں کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کی قانونی تشکیل سے پہلے اور بعد میں بھی ایسی مواخات قائم ہوئی تھی جس میں وراثتی حقوق شامل نہیں تھے تو پھر ہمیں وہ الجھن ہی پیش نہیں آئے گی جو ابن اسحٰق کو اس وقت پیش آئی تھی جب انہوں نے ان تمام افراد کی فہرست تیار کی جنہیں آپس میں بھائی بھائی بنایا گیا تھا۔ ابن اسحٰق نے تو اس میں وہ روایت بھی شامل کی جس سے حضور علیہ ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیان اور حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے درمیان مواخات قائم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تمام حضرات مہاجر تھے اور ابن اسحٰق کی مرتب کردہ فہرست کے بقیہ تمام ناموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مواخات ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کے درمیان قائم کی گئی تھی۔ (۲۹) ابن کثیر، حضور علیہ ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیان اور حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ کے درمیان مواخاتی تعلق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے

ہیں کہ بظاہر اس مواخاتی تعلق کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، سوائے اس کے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو کسی اور کے سپرد کرنا اس لیے پسند نہیں فرمایا کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو بچپن ہی سے لے لیا تھا اور بذات خود ان کی تربیت اور کفالت فرمائی تھی۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ کے درمیان مواخات کی کوئی حکمت بظاہر نظر نہیں آتی، سوائے اس کے کہ حضرت زیدؓ اس کے امیدوار ہوں اور حضرت حمزہؓ نے اپنے کو خود ان کی دیکھ بھال کے لیے پیش کیا ہو اور حضور ﷺ نے اس بناء پر ان کے درمیان مواخات کرادی ہو۔

ابن کثیر کی یہ توجیہ اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ دیگر مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حمزہؓ کا مواخاتی تعلق حضرت کلثومؓ بن ہدم یا کسی اور شخص کے ساتھ قائم کیا گیا تھا، اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کا حضرت اسیدؓ بن حضیر کے ساتھ مواخاتی تعلق تھا۔ (۳۰)

حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیان جو مواخات قائم ہوئی، اس کے نتیجے میں دونوں کو وراثتی حقوق بھی لازماً ملتے ہیں، جبکہ حدیث کی رو سے کوئی شخص حضور ﷺ کا وارث نہیں ہوسکتا۔ بلاذری یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی مواخات حضرت سہلؓ بن حنیف (۳۱) کے ساتھ ہوئی تھی۔ بلاذری نے مزید یہ بات بھی نقل کی ہے کہ حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیان اور حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ کے درمیان مواخات مکہ میں عمل میں آئی تھی۔ (۳۲)

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم بخوبی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیان اور حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ کے درمیان فی الواقع مواخات عمل میں آئی تھی تو یہ ایک ایسی مواخات تھی جس کی بنیاد محض باہمی تعاون اور ہمدردی پر تھی، اور وراثتی حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مزید براں یہ ایک ایسی مواخات تھی جو اُس موقع پر عمل میں نہیں آئی، جب حضرت انسؓ بن مالک کے گھر پر سرکاری طور پر نظامِ مواخات کا باقاعدہ قیام عمل میں لایا گیا، بلکہ اس کا زمانہ مختلف ہے۔ (۳۳)

آخر میں حتمی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جو نظامِ مواخات قائم کیا گیا تھا اور اسے ایک قانونی حیثیت دے دی گئی تھی، وہ ہمیشہ ناقابل تنسیخ رہے گا، البتہ اس

نظام میں سے وراثتی حقوق منہا کر کے منسوخ کر دیے گئے تھے۔ ہر زمانے میں مسلمان اس نظام کو اپنے ہاں قائم کر سکتے ہیں۔اس کی بنیاد باہمی تعاون، ہمدردی اور مشاورت پر ہوگی اور اس کے نتیجے میں چند ایسے مخصوص حقوق ایک دوسرے پر عائد ہوں گے جو عام اخوتِ اسلامی کے حقوق سے بڑھ کر ہوں گے۔

مسلمانوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کا مکمل مظاہرہ اسی طرح ہو سکتا ہے، جب وہ ضرورت کے وقت ایمان اور اسلام کے رشتے کو ترجیح اور فوقیت دیتے ہوئے اپنے تمام دیگر معاشرتی، علاقائی اور قومی تعلقات وتعصّبات کی قربانی دیں۔

حواشی

۱- بلاذری، انساب الاشراف، ۱:۲۸۰

۲- ابن عبدالبر، الدّرر، ص۱۰۰

۳- ابن سیدالناس، عیون الاثر، ۱:۱۸۹

۴- زاد المعاد، ۲:۷۹۔ ابن قیمؒ کے استاد ابن تیمیہؒ پہلے اس بات کا انکار کیا کرتے تھے کہ مہاجرین کے درمیان مواخات عمل میں آئی تھی، خاص طور پر وہ اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ حضورﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیان مواخات قائم ہوئی تھی، کیوں کہ مواخات کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے پیش آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضورﷺ اور آپؐ کے کسی صحابی کے درمیان، یا دو مہاجروں کے درمیان مواخات کا رشتہ استوار ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ابن تیمیہ، منهاج السنة النبوية، ۴:۹۶۷

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''یہ ایک روایت (نص) کی تردید ہے۔اس کی بنیاد قیاس پر رکھی گئی ہے (قرآن کریم اور سنت رسول علیہ الصلوۃ والسلام سے عقلی استدلال کا نام قیاس ہے جو اسلامی قانون کا ایک مأخذ ہے)، اور اس روایت کو رد کرنے سے نظام مواخات کی حکمت کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے مہاجر ایسے تھے جو دوسرے مہاجروں کے مقابلے میں دولت، قبائلی تعلق اور جسمانی قوت کے لحاظ سے زیادہ مضبوط تھے، چنانچہ رسول اللہﷺ نے ایک کمزور اور ایک طاقتور کے درمیان مواخات قائم کرا دی، تا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔اسی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے کس بناء پر اپنے اور حضرت علیؓ کے درمیان مواخات قائم کی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کی عہد طفولیت سے پرورش فرمائی تھی، جب کہ رسول اللہ ﷺ مقام نبوت سے بھی سرفراز نہیں فرمائے گئے تھے اور اسی زمانے سے حضرت علیؓ مسلسل آپؐ کی سرپرستی میں رہے تھے۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے درمیان مواخات قائم ہوئی۔ دونوں اصحابؓ کے درمیان مواخات ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ یہ دونوں ہی اصحاب مہاجر تھے''۔ فتح الباری، ۷:۲۷۱

۵- السیرۃ النبویۃ،۲:۳۲۴

۶- بخاری، صحیح بخاری،۵:۳۹

۷- ایضاً،۲:۳۲۸

۸- بلاذری، انساب الاشراف، ۱:۲۷۰

۹- ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۲۰۰؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ،۲:۳۲۰

۱۰- ابن عبدالبر، الدرر، ص۹۶؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۲۰۰

۱۱- ابن عبدالبر، الدرر، ص۹۶

۱۲- ابن سعد، طبقات، حصہ اول، فصل ۲:۹

۱۳- ایضاً؛ ابن قیم، زاد المعاد،۲:۷۹؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۲۰۰؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ،۲:۳۲۴

۱۴- بلاذری، انساب الاشراف، ۱:۲۷۰؛ ابن سعد، طبقات، حصہ اول، فصل ۲:۹

۱۵- ابن سعد، طبقات، حصہ اوّل، فصل ۲:۹

۱۶- بخاری، صحیح بخاری،۳:۱۱۹، ۶:۵۵-۵۶، ۸:۱۹۰-۱۹۱؛ صحیح مسلم،۴:۱۹۶۰؛ ابن سعد، طبقات، حصہ اوّل، فصل ۲:۹؛ بلاذری، انساب، ۱:۲۷۰؛ ابن عبدالبر، الدرر، ص۹۶؛ ابن قیم، زاد المعاد،۲:۷۹؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۲۰۰

۱۷- نسائی، سنن، ۶:۱۳۷

۱۸- بخاری، صحیح،۵:۳۹

۱۹- ابن سعد، طبقات، حصہ اول، فصل ۲: ۹؛ بلاذری، انساب، ۱: ۲۷۰-۲۷۱؛ ابن قیم، زاد المعاد،۲:۷۹؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۲۰۰

۲۰- اس آیت کی تفسیر کے لیے مزید دیکھیے: شوکانی، فتح القدیر،۲:۳۳۰-۳۳۱۔ اس آیت کے سبب

نزول کے لیے دیکھیے : طیالسی، مسند، ۲: ۱۹؛ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۷: ۲۸ (ان کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے اصحاب "صحیح" ہیں)۔

۲۱- بخاری، صحیح بخاری ۳: ۱۱۹، ۶: ۵۵-۵۶، ۸: ۱۹۰-۱۹۱

۲۲- صحیح مسلم، ۴: ۱۹۶۰

۲۳- سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول، ۲۶۰۔ سلسلہ ابن سعد سے ملتا ہے۔ شوکانی، فتح القدیر، ۲: ۳۳۰-۳۳۱ (وہ کہتے ہیں: اسے ابن سعد، ابن ابی حاتم اور حاکم سے روایت کیا گیا جنہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ "صحیح" ہے۔ علاوہ ازیں اسے ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے)۔

۲۴- ابن حجر نے اسے ابن عبدالبر سے نقل کیا، اور ابن حجر نے ابن اسحٰق، ابن ہشام اور ابن کلبی پر اعتماد کیا۔

۲۵- ابن حجر، الاصابۃ، فصل ۲، ص ۳۰

۲۶- بخاری، صحیح بخاری، ۳: ۴۷، ۵: ۸۸

۲۷- بلاذری، انساب، ۱: ۴۷۱

۲۸- ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۲: ۳۲۶

۲۹- ابن ہشام، السیرۃ، ۴: ۲۲۲

۳۰- ابن ہشام، السیرۃ، ۱: ۵۰۴-۵۰۷

۳۱- بلاذری، انساب، ۱: ۴۷۰

۳۲- ایضاً

۳۳- ایضاً، حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ کی مواخات کے بارے میں مسند احمد میں بھی ایک روایت موجود ہے۔

انسانی تعلقات کی مضبوط ترین بنیاد عقیدہ ہے۔

بلاشبہ تعلقات کی بہت سی اقسام ہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں، مگر انسان بے شمار قبائل اور قوموں میں منقسم ہیں، اور مختلف ممالک میں بسنے کی وجہ سے لاتعداد گروہوں میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ مختلف قومیتوں کے لوگ مذہبی یا کسی اور غرض کی بناء پر ایک جھنڈے کے تحت جمع ہو جاتے ہیں، جبکہ دوسری طرف قرابت کا تعلق اور ایک ہی آباء واجداد کی نسل سے ہونا بھی ایک مضبوط ترین رشتہ تصور کیا جاتا ہے، جس کی بنیاد پر ہمیشہ سے قدیم انسانی معاشرے تشکیل پاتے رہے ہیں۔ جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو جزیرہ نمائے عرب اور اس کے گرد ونواح میں لوگ قبائل میں منقسم تھے۔ اہل فارس قومیتوں میں بٹے ہوئے تھے اور بازنطینی سلطنت میں مختلف مذہبی گروہوں کی شکل میں یہ تقسیم موجود تھی۔ اسلام نے تمام لوگوں کو باہمی ہم آہنگی کے ساتھ آپس میں متحد کرنے کے لیے عقیدے کو مضبوط ترین اور اہم ترین بنیاد قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے باقی تمام روابط اور انسانی تعلقات کو نہ صرف جائز رکھا، بلکہ مستحسن قرار دیا، تاآنکہ وہ اس کے عطا کردہ بنیادی اصول کے ساتھ متصادم نہ ہوں۔ اسلام نے معاشرتی تحفظ اور وراثت کے قوانین وضع کیے، نیز دوسرے معاشرتی امور، مثلاً ہمسایوں کے ساتھ تعلقات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حقوق وفرائض جیسے تمام معاملات کو قانونی شکل دی۔ اسلامی قانون ایک قبیلے کے تمام افراد کے باہمی تعلقات کو منظم کر کے اس کے نتیجے میں باہم فدیہ دینے کے متعلق امور کو منضبط کرتا ہے، انہیں ایک دوسرے کا فدیہ دینے پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی شہر کے بسنے والوں کے آپس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے اس شہر

کے غرباء کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اپنے شہر کے امراء سے زکوٰۃ لینے کے وہ زیادہ مستحق ہیں، لیکن (ان تمام تعلقات کی حیثیت ثانوی ہے)، انہیں کسی بھی درجے میں عقیدے کے تعلق پر فوقیت نہیں دینا چاہیے۔ اگر ان تعلقات کی بناء پر عقیدے کا تعلق متاثر یا مجروح ہو تو پھر ان تمام تعلقات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

اسلام کی نظر میں، انسانوں کے درمیان اشتراک کی اصل بنیاد محض عقیدہ ہے۔ یہ وہ اشتراک ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے باپ، بیٹے، بیوی اور قبیلے تک سے ناتا توڑ لیتا ہے، چنانچہ جب حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کا بدر کے میدان میں اپنے مشرک باپ سے آمنا سامنا ہوا تو آپ نے نہ صرف اس سے جنگ کی، بلکہ اسے کیفر کردار تک پہنچا کر دم لیا۔ جنگ کے خاتمے پر جب حضرت ابوعبیدہؓ نے دیکھا کہ ان کے کافر باپ کی لاش کو بدر کے کنویں میں پھینکنے کے لیے گھسیٹ کر لے جایا جا رہا تھا، تو انہوں نے کوئی ہمدردی ظاہر نہیں کی۔ (۱)

ابن اسحٰق لکھتے ہیں: ''ابن وہب جو بنوعبدالدار کے حلیف تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس بدر کے قیدیوں کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے ان کے متعلق دیکھ بھال کی ذمہ داریوں کو اپنے چند صحابہ کرامؓ کے درمیان تقسیم کر دیا اور یہ فرمایا کہ 'ان کے ساتھ بہترین معاملہ کرنا'۔ ابوعزیز بن عمیر بن ہاشم جو حضرت مصعبؓ بن عمیر کے حقیقی بھائی تھے، وہ بھی ان قیدیوں میں شامل تھے۔ ابوعزیز کہتے ہیں: 'میرے بھائی مصعبؓ بن عمیر میرے پاس سے گزرے اور ان انصاری سے جن کے پاس میں قید تھا، بولے: 'اسے ہرگز رہا نہ کرنا، اس کی ماں بہت دولت مند ہے، شاید وہ اس کی خاطر تمہیں بھاری فدیہ ادا کرے گی'''۔ (۲)

ابن ہشام لکھتے ہیں کہ یہ ابوعزیز وہ شخص تھے جنہوں نے بدر کے موقع پر نضر بن حارث کی ہلاکت کے بعد مشرکینِ مکہ کا علم اٹھا رکھا تھا۔ جب ان کے بھائی حضرت مصعبؓ بن عمیر نے ابوالیسر سے جن کے ہاتھوں میں یہ گرفتار تھے، ان کے متعلق اس طرح گفتگو کی تو ابوعزیز نے ان سے شکایتاً کہا: ''میرے بھائی! یہ تم میرے بارے میں کیا مشورہ دے رہے ہو؟'' مصعبؓ نے (اسلامی اخوت سے سرشار لہجے میں) جواب دیا: ''میرے بھائی ابوالیسر

ہیں، تم نہیں ہو'۔

امام ابوعیسیٰ ترمذی (۳) روایت کرتے ہیں، اور اس روایت کی سند کو وہ ''حسن'' اور ''صحیح'' قرار دیتے ہیں کہ ابن ابی عمر نے ہمیں بتایا کہ سفیان نے عمرو بن دینار سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے جابر بن عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''ہم لوگ ایک مہم پر تھے (سفیان کا خیال ہے کہ غالباً یہ غزوہ بنی مصطلق کا ذکر ہے) کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو دھکا دے دیا--- عبداللہ بن ابی بن سلول کو جب اس واقعے کا پتہ چلا تو بولا: 'معاملات اتنا آگے جا چکے ہیں! خدا کی قسم! جب ہم مدینے لوٹیں گے تو ہم میں سے جو مضبوط ہوگا وہ کمزور کو نکال باہر کرے گا'۔ اس کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عبداللہ نے اسے جواب دیا: 'خدا کی قسم! تم مدینے میں قدم نہیں رکھ سکتے، جب تک اپنی زبان سے یہ اقرار نہ کرلو کہ رسول اللہ ﷺ مضبوط ہیں اور تم کمزور ہو'، اور عبداللہ بن ابی کو زبان سے یہی کہنا پڑا''۔

ویسے حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی اپنے باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے اور اس کا بے حد احترام کرتے تھے، (۴) لیکن ان کی رائے میں عقیدے کا مقام سب سے زیادہ بلند تھا اور ایمان کو باقی ہر شے پر ترجیح حاصل تھی۔ یہی پس منظر تھا جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کا باپ مسلمانوں کی توہین کرتا ہے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیش کش کی کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر کے اس کا سر لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں رکھنے کے لیے تیار ہیں۔ (۵)

قرآن کریم نے ایمان اور عقیدے کی اسی فوقیت کو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے واقعے کے ضمن میں بیان کیا ہے:

اور جب نوح نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ ''اے میرے رب! میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور آپ احکم الحاکمین ہیں'' (اور بڑی قدرت والے ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''اے نوح! یہ شخص (ہمارے علم ازلی میں) تمہارے (ان) گھر والوں میں نہیں (جو ایمان لا کر نجات پائیں گے)، بلکہ یہ (خاتمے تک) تباہ کار (یعنی کافر رہنے والا ہے)، سو مجھ سے ایسی

چیز کی درخواست مت کرو جس کی تم کو خبر نہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم (آئندہ) نادان نہ بن جاؤ (یعنی ایسی دعا نادانی کی بات ہے)''۔(النساء ۵: ۴۵-۴۶)

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے یہاں یہ امر واضح کر دیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا تعلق خونی رشتے کی وجہ سے حضرت نوحؑ کے خاندان کے ساتھ تھا، مگر اس کے باوجود وہ حضرت نوحؑ کے خاندان کا ایک حصہ نہ بن سکا، کیوں کہ اس نے حق کو جھٹلایا، نہ تو خدا پر یقین کیا اور نہ اس کے رسول ہی کا اتباع کیا۔ قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان علیحدگی اور قطع تعلق کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ''اس کا رویّہ صالح نہیں ہے''۔ جب اتنا قریبی تعلق بھی اس بناء پر منقطع ہوسکتا ہے کہ یہ تعلق ایمان کی راہ میں حائل تھا تو پھر ظاہر ہے کہ خون، نسل، رنگ اور قومیتوں کے رشتے بھی اس وقت آسانی کے ساتھ توڑے جاسکتے ہیں جب یہ رشتے ایمان کے اعلیٰ تقاضوں سے ٹکرا رہے ہوں۔

اسلام نے اخوت اور جگری تعلقات کو محض مومنوں تک محدود رکھا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں'' (الحجرات ۴۹: ۱۰)۔ اس کے ساتھ ہی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اہل کفر کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی ممانعت کی ہے، چاہے وہ مشرکین ہوں، یہودی ہوں یا عیسائی اور خواہ وہ ان کے باپ، بھائی اور بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر اہل ایمان ایسا کریں گے تو غلط کریں گے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے غیر مسلم کے ساتھ انتہائی قریبی تعلقات قائم کر لینا سخت گناہ ہے:

اے ایمان والو! اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو (اپنا) رفیق مت بناؤ، اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے (ایسا) عزیز رکھیں (کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہے) اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا، سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں (التوبہ ۹: ۲۳)۔

قرآن کریم نے ایک مسلمان کے تمام دنیاوی مفادات وتعلقات کو ترازو کے ایک

پلڑے میں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت و ایمان کی خاطر تمام جدوجہد کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنے معاشرتی تعلقات اور مفادات کو ایمانی مفادات پر ترجیح نہ دیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں کساد ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جس کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (سزائے ترک ہجرت) بھیج دیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا (التوبہ ۹:۲۴)۔

سورۃ التوبہ کی مندرجہ بالا آیات ہجرتِ مدینہ کے لیے مسلمانوں کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے نازل ہوئی تھیں، کیوں کہ مدینے کی نوزائیدہ مملکت کا دفاع اسی طرح ممکن تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابہ کرامؓ ایمان کی اس آزمائش پر پورے اترے اور انھوں نے اپنے خاندان، دولت اور جائیدادیں جو انھیں بہت محبوب تھیں، نیز تمام دنیاوی تعلقات اور مفادات قربان کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خاطر مدینے ہجرت کی۔

اس کے بعد ہی مدینے کا معاشرہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس کی بنیاد ایمان اور اسلام کے ساتھ وفاداری پر رکھی گئی تھی، جہاں اس بات پر سب کا یقین کامل تھا کہ دوستی اور تحفظ صرف اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مومنوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ دراصل یہی سب سے زیادہ عظیم الشان تعلق ہے، کیوں کہ یہ تعلق وحدتِ ایمان، وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ تمام مومن ایک دوسرے کے دوست اور محافظ ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ ان کا ایک عام فرد بھی اخوت کی اسی لڑی میں پرویا ہوا ہے (ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)۔ یہ معاشرہ ہر اس شخص کے لیے اپنا سینہ کھولے ہوئے ہے جو اس میں شامل ہونا چاہے، قطع نظر اس کے کہ وہ کس رنگ اور کس نسل سے

تعلق رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنے تمام غیر فطری رویوں کو ترک کر کے اسلامی شخصیت کے اصول اپنا لے تا کہ وہ بھی ان تمام حقوق سے فیض یاب ہو سکے جو باقی مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

حواشی

۱- ابن ہشام، سیرۃ ۲: ۷۵
۲- دیکھیے: ابن کثیر، البدایۃ والنهایۃ، ۱: ۱۰۶-۱۰۷
۳- ترمذی، سنن، ۵: ۹۰، کتاب التفسیر
۴- حمیدی، مسند، ۲: ۵۲۰
۵- ہیثمی، مجمع الزوائد، ۹: ۳۱۸

۸

مودت: مدنی معاشرے کی اساس

مدنی معاشرہ بنیادی طور پر محبت اور باہمی ہمدردی کی بنیاد پر قائم ہوا تھا جیسا کہ حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے: ''تمام مسلمان باہمی محبت، آپس کے تعلقات اور ہمدردی میں ایک جسم کی طرح ہیں۔ جب ایک حصہ تکلیف محسوس کرتا ہے تو پورا جسم اس کی مدد کے لیے سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے''۔ (۱) موانست، باہمی محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ قربت کا احساس وہ جذبات ہیں جن کی بنیاد پر مسلم معاشرے کے تمام افراد آپس میں اپنے تعلقات استوار کرتے ہیں، چاہے وہ بوڑھے ہوں یا جوان، امیر ہوں یا غریب، اور حاکم ہوں یا محکوم۔

اسلامی تعلیمات بھی اس بات پر زور دیتی ہیں کہ معاشرے میں محبت کا فروغ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صحیح معنوں میں مومن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔ (۲) مسلم معاشرہ خودغرضی اور استحصال سے پاک ہوتا ہے، جہاں معاشرے کے تمام افراد زندگی کے مسائل سے نمٹنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''جو کوئی اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا'' (۳)۔ ''اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب تک اس کا بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے''۔ (۴)

مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات کا دارومدار باہمی احترام پر ہے۔ کوئی امیر کسی غریب کو حقیر نہیں سمجھ سکتا، نہ کوئی حاکم کسی محکوم کو اور نہ کوئی طاقتور کسی کمزور کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ایک شخص کے برا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے

مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے‘‘۔(۵)

مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر غصے کی حالت میں کسی مسلمان کے اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات کمزور ہو جائیں، یا ٹوٹ جائیں تو یہ حالت تین دن سے زیادہ باقی نہیں رہنا چاہیے۔حدیثِ مبارک ہے:’’ایک مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق کرے‘‘۔(۶)

محبت کی ان بنیادوں کو تحائف اور ہدایا کے لین دین سے مستحکم کیا گیا ہے۔’’ایک دوسرے کو تحائف دو اور اس طرح آپس کی محبت میں اضافہ کرو‘‘۔(۷) معاشرے کے امیر لوگ معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے رقم خرچ کرتے ہیں اور اس طرح اس خلا کو پُر کر دیتے ہیں جو معاشرے میں دولت کی ناہمواری کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ دولت مند اپنی دولت میں سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کی گئی ہے، اس طرح وہ اپنی دولت کے ذریعے معاشرے کے مساکین اور محتاجوں کی مدد کرتے ہیں۔ دوسری طرف، امراء کی دولت میں کسی قسم کا اضافہ غرباء کی آزردگی کا سبب نہیں بنتا، کیوں کہ یہ اضافہ خیرخواہی اور ہمدردی کے جذبات کے ساتھ ان کی طرف بھی آئے گا اور وہ بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں:

> مدینے میں رہنے والے تمام انصار میں ابوطلحہؓ وہ واحد شخص تھے جن کے پاس کھجور کے سب سے زیادہ باغات تھے اور انہیں اپنی تمام جائیداد میں جو چیز سب سے زیادہ محبوب تھی، وہ ایک باغ تھا جس کا نام بیرحاء تھا۔ یہ باغ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا۔ حضور ﷺ اکثر اس باغ میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کا پانی پیا کرتے تھے۔

جب قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی:’’تم ہرگز نیکی نہیں پا سکتے، جب تک کہ اپنی محبوب ترین چیز خرچ نہ کرو‘‘(آل عمران ۹۲:۳) تو حضرت ابوطلحہؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:’’یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے،

جب تک اپنی محبوب ترین چیز خرچ نہ کرو اور میری محبوب ترین چیز بیرحاء ہے، لہٰذا میں اسے اللہ کی خاطر صدقہ کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کا بہترین عوض مجھے اللہ تعالیٰ کے دربار سے ملے گا۔ جس طرح بھی اللہ کا حکم ہو، آپ اس باغ کو استعمال کر لیں"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ ایک ایسا باغ ہے جو بہت زیادہ پھل دیتا ہے، تم نے جو کچھ کہا ہے، وہ میں نے سن لیا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ تم اس باغ کو اپنے اعزہ و اقارب کے درمیان تقسیم کر دو"۔ ابوطلحہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں ایسا ہی کروں گا جیسا آپ مجھے حکم دیتے ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے یہ باغ اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔ (۸)

صحابہ کرامؓ میں جو لوگ مخیرّ اور صاحبِ ثروت تھے وہ اس ذمہ داری کو بخوبی محسوس کرتے تھے جو دولت مند ہونے کی حیثیت سے ان کے اوپر عائد ہوتی تھی۔ اگر وہ معاشرے میں کوئی ایسی ضرورت محسوس کرتے تھے جسے ریاست پورا نہیں کر سکتی تھی، یا وہ ضرورت ریاست کے علم میں نہ ہوتی تو وہ بذاتِ خود آگے بڑھ کر اس ضرورت کو پورا کر دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایک موقع پر حضرت عثمانؓ نے اپنا ایک عظیم الشان تجارتی قافلہ جو ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا اور وہ تمام کے تمام گندم، گھی اور خشک میووں سے لدے ہوئے تھے، غریب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں مدینے میں شدید قسم کا اقتصادی بحران آ گیا تھا اور تاجروں نے حضرت عثمانؓ کو اس تمام مال کے لیے پانچ گنا زیادہ قیمت ادا کرنے کی پیش کش کر رکھی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: "اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مجھے اس سے دس گنا زیادہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے تمام مال غریب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن سے مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے، یقیناً ایسے ہی تھے ہمارے نیک اور پرہیزگار آباء و اجداد۔ یہی وجہ تھی کہ اس معاشرے میں نہ تو کوئی طبقاتی تفاوت سامنے آیا اور نہ ان تعلیمات پر عمل کے نتیجے میں کبھی کوئی طبقاتی کشمکش ہی پیدا ہو سکی۔ دراصل اس معاشرے میں لوگوں کی تقسیم اس بناء پر کی ہی نہیں گئی تھی کہ ان کی اقتصادی

حالت کس درجے کی ہے۔ اس معاشرے میں کوئی طبقہ دوسرے طبقے سے متصادم نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ اپنی طویل تاریخ میں کبھی کسی قسم کی طبقاتی کشمکش سے نہیں گزرا، کیوں کہ اس معاشرے نے کبھی امیر کی غریب پر یا حاکم کی محکوم پر برتری کو تسلیم نہیں کیا۔ اسلام نے اپنے آغاز سے ہی انسانوں کے درمیان کسی ایسے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جس کی بنیاد رنگ، نسل یا قومیت پر ہو۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح برابری کا برتاؤ کرتے ہیں جس طرح ایک کنگھی کے دندانے بالکل برابر اور مساوی ہوتے ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی فرد بھی دوسرے سے بہتر نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام پر عمل درآمد میں زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ اسلامی معاشرے کے دروازے دنیا کے ہر فرد کے لیے ہر وقت کھلے ہیں، اور یہ ایسا معاشرہ ہے جس کے تمام افراد کو ترقی کرنے اور اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے یکساں مواقع میسر ہوتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے معاشرتی تضادات نہیں پائے جاتے، نہ تو کسی غریب کو اس بات سے روکا جا سکتا ہے کہ وہ کسی امیر خاتون سے شادی کرے اور نہ کسی کمزور شخص کو اس بات سے ہی منع کیا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرے کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ جائے اور کوئی بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکے۔ نہ اس معاشرے میں کوئی طبقہ ایسا ہے جو کسی فرد کو آگے بڑھنے سے روک سکے۔ اگر اسلامی معاشرے کا تہذیبی اور تمدنی ارتقاء ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہتا، اور اگر آج اسلامی معاشرہ انسانیت کی رہنمائی کر رہا ہوتا تو ایک مستحکم اور ترقی یافتہ معاشرے کے قیام کے لیے اسلام کے اثرات وثمرات زیادہ واضح ہو کر سامنے آ جاتے۔ اسلامی معاشرہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس کی بنیاد محبت اور ہمدردی پر ہوتی ہے۔ یہ ایسا معاشرہ نہیں ہوتا جس میں ہر سطح پر نفرتیں پروان چڑھتی رہیں اور باہمی تصادم جگہ پا کر انسانی معاشرت کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مدینے کے اسلامی معاشرے کے ان لوگوں کا جنھیں ہر لحاظ سے اہل ثروت میں شمار کرنا چاہیے، یہ طرزِ عمل تھا تو پھر اس معاشرے کے غریب اور کمزور لوگوں کا کیا رویہ تھا؟ اِس کا جائزہ ہم اگلے باب میں لیں گے۔

حواشی

۱- صحیح مسلم

۲- صحیح بخاری ، صحیح مسلم

۳- ترمذی، امام احمد

۴- ترمذی، ابو داؤد

۵- صحیح مسلم

۶- صحیح بخاری ، صحیح مسلم

۷- ابویعلیٰ، ابن عساکر

۸- صحیح بخاری،۶:۳۱،کتاب التفسیر

9

امیر اور غریب کی مشترک جدوجہد

مدینے میں جو نیا اسلامی معاشرہ وجود میں آیا، اس میں امیر اور غریب دونوں کو جدوجہد کے یکساں مواقع حاصل تھے۔ اس معاشرے میں اسلامی عقیدے کی شکل میں ایک ایسی مضبوط قوت موجود تھی جس نے طبقاتی کشمکش کو پیدا ہونے سے روکے رکھا، امیر اور غریب کے درمیان بھائی چارے کا تعلق پیدا کیا اور معاشرے میں عمومی اتحاد اور اتفاق رائے کی وہ فضا قائم کی جو اس عظیم الشان جہاد کے لیے ضروری تھی جس کی خاطر اس معاشرے کو تیار کیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے جابجا مدینے کے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے جس سے بخوبی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ اس معاشرے میں بعض غریب ترین مسلمانوں کا ایک گروہ کس انداز میں زندگی بسر کرتا تھا:

(صدقات میں) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں، (اور اسی وجہ سے) وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادتاً) امکان نہیں رکھتے اور ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے، ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے، (البتہ) تم ان کو ان کے طرزِ عمل سے پہچان سکتے ہو (کہ فقر و فاقہ سے چہرے پر اثر ضرور آ جاتا ہے)۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے اور جو مال خرچ کرو گے، بے شک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے (البقرۃ ۲:۲۷۳)۔

ابن سعد (۱) طبقات میں ایک روایت نقل کرتے ہیں جس کی سند کعب القرظی سے جا کر ملتی ہے۔ اس روایت کی رو سے مندرجہ بالا آیت اہلِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

طبری اپنی تفسیر قرآن میں (۲) مجاہد اور سُدی کی سند پر روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ آیت بعض غریب مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی ہے''۔ آئندہ سطور میں ہم ان غریب مسلمانوں کی زندگی کی ایک تصویر پیش کریں گے۔ یہ حضرات اس اوّلیں اسلامی معاشرے کے شہری تھے اور انہیں اہلِ صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

غریب مہاجرین

مسلمانوں کے مکے سے مدینے ہجرت کرنے کے بعد جو سب سے بڑا مسئلہ ابھر کر سامنے آیا، وہ ان مہاجرین کے لیے معاش کا بندوبست تھا جو مشرکین مکہ کے ظلم وستم سے اپنے دین کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے گھر اور جائیداد کے ساتھ مال واسباب بھی مکے ہی میں چھوڑ کر آ گئے تھے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سے مہاجر حضرات ایسے تھے جو مدینے آتے ہی کوئی کام کرنے کے قابل نہ تھے، کیوں کہ مدینے کا پورا معاشی نظام زراعت پر مشتمل تھا، اور مہاجروں کو زراعت کا کوئی تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں قطعاً کوئی مہارت حاصل نہیں تھی، کیوں کہ اُن کے شہر، مکے کا معاشرہ مکمل طور پر ایک تجارتی معاشرہ تھا۔ مدینے میں نہ تو ان کے پاس کوئی زرعی زمین تھی اور نہ کوئی سرمایہ ہی، وہ تو اپنی تمام دولت مکے میں چھوڑ آئے تھے۔ انصارِ مدینہ نے اس موقع پر مہاجرین کی ہر ممکن مدد کی، لیکن اس کے باوجود کچھ مہاجر ایسے رہ گئے تھے جنہیں ٹھکانے کی ضرورت تھی، مزید براں مہاجرین کی مدینے میں آمد کا سلسلہ مسلسل جاری تھا اور غزوۂ خندق تک بلا انقطاع جاری رہا، اس وقت تک مسلمانوں کی بڑی تعداد مدینے میں آ کر آباد ہوتی گئی۔ اس دوران میں مدینے کے گردونواح سے بھی بے شمار قافلے یہاں آتے رہے۔ یہ قافلے ایسے افراد پر مشتمل ہوتے تھے جن کی مدینے میں کوئی بھی شناسائی نہیں تھی۔ ایسے تمام غریب الوطن مہاجروں کو مدینے میں فوری طور پر عارضی یا مستقل رہائش درکار تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے سب سے پہلے ان غریب مہاجروں کو ٹھکانا مہیا کرنے کی فکر کی جو وقتاً فوقتاً قافلوں کی شکل میں آپ کے پاس پہنچ رہے تھے۔

صفہ

اس آبادکاری کا بہترین موقع حضور ﷺ کے سامنے اس وقت آیا، جب تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا اور نماز کا رخ بیت المقدس سے تبدیل کر کے خانۂ کعبہ کی طرف کر دیا گیا۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کے مدینے ہجرت کرنے کے ۱۶ ماہ بعد پیش آیا۔ (۳) اس جغرافیائی تبدیلی کے سبب پہلے قبلے کی دیوار خود بخود مسجد نبوی کی پشت پر آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے اوپر چھت تعمیر کرنے کا حکم دیا اور یہ جگہ ''صفہ'' یا ''ظلّہ'' کہلانے لگی جس کے لغوی معنی چبوترے یا سائے کے ہیں (۴)، اسے تین جانب سے کھلا رکھا گیا تھا۔ (۵)

ابن جبیر نے **الرحلة** میں لکھا ہے کہ صفہ ایک گھر کا نام تھا جو قبا میں واقع تھا اور وہاں اہلِ صفہ رہتے تھے، لیکن سمہودی کے خیال میں جن لوگوں کو ''اہلِ صفہ'' کہہ کر پکارا جاتا تھا، وہ بعد میں اس مذکورہ گھر میں منتقل ہو گئے تھے، اس لیے اس گھر کا بھی یہی نام پڑ گیا، جیسا کہ ابن جبیر نے نشاندہی کی ہے، لیکن ''صفہ'' نام کی اصل نسبت اس گھر سے نہیں ہے، بلکہ اس نام کا تعلق مسجد نبوی کے اس مخصوص حصے سے ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔

اس بات کا توصحیح طور پر اب علم نہیں ہے کہ صفے پر کتنے لوگوں کے رہنے کی گنجائش تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑی تعداد اس چبوترے پر سما سکتی تھی، کیوں کہ ایک روایت کی رو سے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اس چبوترے کو شادی کی ایک دعوت کے لیے استعمال کیا تھا جس میں تین سو لوگ شریک تھے۔ اگر چہ ان میں سے کچھ حضرات مسجد سے ملحق ایک حجرے میں بھی تشریف فرما تھے جو حضور ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کا تھا۔ (۶)

صفے کے مکین

سب سے پہلے جن لوگوں نے صفے پر رہائش اختیار کی، وہ مہاجر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جگہ کو صفة المهاجرین کہا جانے لگا۔ (۷) رسول اللہ ﷺ کے پاس مختلف مقامات سے آنے والے وفود کے ساتھ جو لوگ اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا

اقرار کرنے آیا کرتے تھے، وہ بھی اسی صفّے پر قیام کیا کرتے تھے۔ (۸) حضور ﷺ کے پاس جو ملاقاتی آیا کرتے تھے، ان میں اگر کسی کا کوئی شناسا (عریف) مدینے میں موجود ہوتا تو وہ اس کے ساتھ قیام کرتا تھا، بصورت دیگر اسے اہلِ صفہ کے ساتھ ٹھہرایا جاتا تھا۔ (۹) حضرت ابو ہریرہؓ وہ صحابی تھے جو صفّے پر مستقل رہائش رکھنے والے اور عارضی قیام کرنے والے دونوں کے درمیان رابطے کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ اصحابِ صفہ میں سے کسی کو طلب فرمانا چاہتے تھے تو آپ حضرت ابو ہریرہؓ کو اس پر مامور فرما دیا کرتے تھے، کیوں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نہ صرف ان تمام حضرات سے واقف تھے، بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ عبادات اور جہاد میں کون کس درجے پر ہے۔ (۱۰) مہاجر حضرات اور بیرونِ شہر سے آنے والے اصحاب کے علاوہ انصار میں سے بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنے لیے صفّے پر رہائش رکھنا پسند کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی پسند اور اپنے اختیار سے زاہدانہ زندگی گزارنا چاہتے تھے، باوجود اس کے کہ ان کی مالی حالت مستحکم تھی اور مدینے میں ان کے گھر بار موجود تھے۔ ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں: کعبؓ بن مالک انصاری، حنظلہؓ بن ابی عامر انصاری (یہ وہی صحابی ہیں جو غزوۂ احد میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے اور فرشتوں نے انہیں غسل دیا) اور حارثہؓ بن نعمان انصاری وغیرہ۔ (۱۱)

چونکہ اہلِ صفہ کا تعلق مختلف قبائل سے تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ انہیں الاوفاض کہہ کر پکارا کرتے تھے جس کے معنی ہیں ''ملے جلے لوگ''۔ اہلِ صفہ کو یہ نام دیے جانے کی ایک اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پاس چمڑے کا ایک تھیلا رکھتا تھا جسے ''وفضہ'' کہا جاتا تھا۔ اس تھیلے کو کھانا رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لیکن پہلی توجیہ زیادہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ (۱۲)

اصحابِ صفہ کے نام اور ان کی تعداد

اہلِ صفہ کی تعداد مختلف اوقات میں بدلتی رہی تھی۔ جس زمانے میں مدینے کے باہر سے وفود آتے تو ان کی تعداد بڑھ جایا کرتی تھی اور جب یہ مہمان رخصت ہو جایا کرتے تھے تو یہ

تعداد گھٹ جاتی تھی، لیکن یہاں مستقل رہائش رکھنے والوں کی تعداد عام طور پر ستر کے قریب رہتی تھی (۱۳)۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ تعداد بہت زیادہ بڑھ جایا کرتی تھی، یہاں تک کہ اکیلے حضرت سعدؓ بن عبادہ بعض اوقات اسّی اسّی لوگوں کی دعوت کرتے تھے، جبکہ باقی اہل صفہ دیگر صحابہ کرامؓ کے مہمان ہوتے تھے۔ (۱۴)

سمہودی لکھتے ہیں کہ ابونعیم نے **الحلیة** میں اصحابِ صفہ کی ایک فہرست دی تھی جس کی رو سے ان کی تعداد ایک سو سے متجاوز تھی، (۱۵) تاہم ابونعیم نے جو نام درج کیے ہیں، ان کی تعداد صرف ۵۲ ہے، اور ان میں سے پانچ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق اصحاب صفہ سے نہیں۔ ابونعیم وہ واحد مصنف ہیں جنہوں نے اصحابِ صفہ میں سے مشہور ناموں کی ایک طویل فہرست ہمیں فراہم کی ہے۔ انہوں نے یہ فہرست ایک اور قدیم مآخذ سے نقل کی ہے جس کا نام انہوں نے بیان نہیں کیا۔ غالباً یہ فہرست ابوعبدالرحمٰن السلمی (م ۴۱۲ھ) کی کتاب سے لی گئی ہے جو انہوں نے اصحابِ صفہ کے بارے میں لکھی ہے۔ (۱۶) ابونعیم نے اصحاب صفہ کی جو فہرست نقل کی ہے اس میں ان صحابہ کرامؓ کے نام شامل ہیں (اس فہرست میں ان ناموں کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے جو دیگر مآخذ سے دستیاب ہوئے ہیں):

۱۔ ابو ہریرہؓ (ابونعیم کا خیال ہے کہ ان کا شمار اصحابِ صفہ میں ہوتا ہے)۔ (۱۷)

۲۔ ابوذر غفاریؓ (ابونعیم کے خیال میں یہ بھی اصحابِ صفہ میں شامل تھے)۔ (۱۸)

۳۔ واثلہؓ بن اسقع (۱۹)

۴۔ قیسؓ بن طہفہ الغفاری (ان کا خیال ہے کہ یہ صحابی بھی اصحابِ صفہ میں سے ایک ہیں)۔ (۲۰)

۵۔ کعبؓ بن مالک انصاری (۲۱)

۶۔ سعیدؓ بن عامر بن حذیم جمحی

۷۔ سلمان فارسیؓ

۸۔ اسماءؓ بن حارثہ بن سعید اسلمی

۹- حنظلہؓ بن ابی عامر انصاری (غسیل الملائکۃ)

۱۰- حازمؓ بن حرملہ

۱۱- حارثہؓ بن نعمان انصاری النجاری

۱۲- حذیفہؓ بن اسید ابوسُریحہ انصاری

۱۳- حذیفہؓ بن یمان (یہ مہاجر تھے، لیکن وہ انصار کے حلیف بن گئے تھے، اس لیے ان کا شمار انہی میں کیا جاتا تھا۔)

۱۴- جاریہؓ بن جمیل بن شبہ بن قرط

۱۵- جعیلؓ بن سراقہ ضمری

۱۶- جرہدؓ بن خویلد (یا ابن رازح) اسلمی (۲۲)

۱۷- رفاعہؓ ابولبابہ انصاری (کہا جاتا ہے کہ ان کا نام بشیر بن عبدالمنذر تھا اور ان کا تعلق قبیلہ بنوعمرو بن عوف سے تھا)۔

۱۸- عبداللہ ذوالبجادینؓ

۱۹- دکینؓ بن سعید مزنی (یا خثعمی) (۲۳)

۲۰- خبیبؓ بن یساف بن عنبہ

۲۱- خریمؓ بن اوس طائی

۲۲- خریمؓ بن فاتک اسدی

۲۳- خنیسؓ بن حذافہ سہمی

۲۴- خبابؓ بن الارت

۲۵- الحکم ابن عمیر الثمالیؓ

۲۶- حرملہؓ بن ایاس (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا نام حرملہؓ بن عبداللہ العنبری تھا)۔

۲۷- زیدؓ بن خطاب

۲۸- عبداللہؓ بن مسعود

۲۹- طفاویؓ دوسی

۳۰- طلحہؓ بن عمر نضری

۳۱- صفوانؓ بن بیضاء فہری

۳۲- صہیبؓ بن سنان رومی

۳۳- شدادؓ بن اسید

۳۴- شقرانؓ (رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام)

۳۵- سائبؓ بن خلاد

۳۶- سالمؓ بن عمیر، قبیلہ اوس سے

۳۷- ابن عمروؓ بن عوف، بنو ثعلبہ سے

۳۸- سالمؓ بن عبید اشجعی

۳۹- سفینہؓ (آپ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے)۔

۴۰- سالمؓ (آپ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے)۔

۴۱- ابو رزینؓ

۴۲- اغر مزنیؓ

۴۳- بلالؓ بن رباح

۴۴- براءؓ بن مالک انصاری

۴۵- ثوبانؓ (آپ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے)۔

۴۶- ثابتؓ بن ودیعہ انصاری

۴۷- ثقیفؓ بن عمرو بن شمیط اسدی

۴۸- سعدؓ بن مالک ابو سعید خدری

۴۹- عرباضؓ بن ساریہ (۲۴)

۵۰- غرفہ ازدیؓ (۲۵)

۵۱- عبدالرحمنؓ بن قرط (۲۶)

۵۲- عبادؓ بن خالد غفاری (۲۷)

ابونعیم نے بعض ایسے حضرات کے نام بھی اس فہرست میں شامل کر دیے ہیں جنہیں اصحابِ صفہ میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اصحابِ صفہ میں باقاعدہ طور پر شامل نہیں تھے۔ (۲۸) وہ حضرات یہ ہیں!

۱- سعدؓ بن ابی وقاص: جو لوگ انہیں اصحابِ صفہ میں شمار کرتے ہیں، وہ اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا کہ قرآن کریم کی یہ آیت ''اور ان لوگوں کو نہ نکالیے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے خاص اس کی رضامندی کا قصد رکھتے ہیں'' (الانعام ۶:۵۲)، ان ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ تفسیر ابن کثیر کے مطابق یہ آیت مکے میں نازل ہوئی ہے اور اصحابِ صفہ سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔

۲- حبیبؓ بن زید بن عاصم انصاری النجاری: ان کا تعلق عقبہ والوں سے تھا، لیکن غلطی سے ان کا نام اصحابِ صفہ کے ساتھ بھی لکھا گیا۔

۳- ابوایوب انصاریؓ: ان کا تعلق بھی ''عقبہ'' والوں سے ہے۔

۴- حجاجؓ بن عمرو مازنی انصاری

۵- ثابتؓ بن ضحاک انصاری

اصحابِ صفہ کی علم دوستی، عبادت اور جہاد

اصحابِ صفہ نے اپنے آپ کو حصولِ علم کے لیے وقف کر دیا تھا اور عبادات کی خاطر یہ حضرات مستقل مسجد میں قیام کرتے تھے۔ وہ غریبانہ اور زاہدانہ زندگی کے عادی تھے۔ یہ حضرات تنہائی کے لمحات میں نوافل ادا کرتے، قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہتے اور اس کی آیات پر مل کر غور و فکر کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے آپ کو ہمہ تن ذکر الٰہی میں مشغول رکھا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ افراد نے لکھنا بھی سیکھ لیا تھا اور ایک صاحب ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی کمان حضرت عبادہؓ بن صامت کو اس لیے ہدیہ کر دی تھی کہ حضرت عبادہؓ نے

انہیں قرآن پڑھنا اور لکھنا سکھایا تھا۔(۲۹) ان میں سے چند ایک ایسے بھی تھے جو اپنے علم اور حفظِ حدیث کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچے، جیسے حضرت ابو ہریرہؓ جن کی شہرت بیسیوں احادیث کے راوی کی حیثیت سے ہے، اسی طرح حضرت حذیفہؓ وہ ہستی ہیں جنھیں فتن کی احادیث روایت کرنے میں سند مانا جاتا ہے۔

لیکن اصحابِ صفہ نے حصول علم اور عبادت میں گہری مشغولیت کے باوجود اپنے آپ کو معاشرتی زندگی میں حصہ لینے اور جہاد میں شرکت کرنے سے الگ تھلگ نہیں رکھا۔ اصحابِ صفہ میں سے بہت سے ایسے تھے جنھوں نے بدر کے معرکے میں جامِ شہادت نوش کیا، مثال کے طور پر صفوانؓ بن بیضاء، زیدؓ بن خطاب، خریمؓ بن فاتک اسدی، خبیبؓ بن یساف، سالمؓ بن عمیر اور حارثہؓ بن نعمان انصاری۔(۳۰) اصحابِ صفہ میں سے چند ایک نے غزوۂ احد میں شرکت کی اور شہادت سے سرفراز ہوئے، جیسے حنظلہ الغسیلؓ (۳۱)۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے جیسے جرہد بن خویلد اور ابوسریحہ غفاریؓ (۳۲)۔ کچھ نے خیبر کے موقع پر شہادت کا نذرانہ پیش کیا جیسے ثقیف بن عمروؓ (۳۳)۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو تبوک کے مقام پر شہید ہوئے جیسے عبداللہ ذوالبجادینؓ (۳۴)، کچھ یمامہ کے میدان میں شہید ہوئے جیسے سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ اور زیدؓ بن خطاب (۳۵)۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصحابِ صفہ کی راتیں عبادت میں اور دن مہمات کے سر کرنے میں صرف ہوتے تھے۔

اصحابِ صفہ کا لباس

اصحاب صفہ کے پاس اتنا کپڑا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کو صحیح طور پر سردی سے بچا سکیں، یا اپنا تن ڈھانپ سکیں۔ ان کے پاس اوڑھنے کے لیے کوئی چادر نہ ہوتی تھی۔(۳۶) اصحابِ صفہ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کے پاس کپڑوں کا ایک مکمل جوڑا موجود ہو،(۳۷) ان کے پاس ایک کپڑا ہوتا تھا جسے وہ اپنی گردن سے باندھ لیا کرتے تھے (۳۸)، یا ان کے پاس صرف ایک لنگوٹ ہی ہوتا تھا جسے وہ اپنے جسم پر کس لیا کرتے تھے۔(۳۹) کچھ لوگوں

کے پاس صرف اتنا ہی کپڑا ہوتا تھا جس سے وہ اپنے جسم کو نصف پنڈلی تک ہی ڈھانپنے کے قابل ہوتے تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا لباس ان کے گھٹنوں تک بھی نہ پہنچتا تھا۔ مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ''حوتکیہ'' (۴۰) استعمال کرتے تھے جو سر ڈھانپنے کے کام آتا تھا۔ (۴۱)

''خنف'' ایک یمنی چادر کا نام تھا جو بھدے اور معمولی قسم کے سوت سے تیار کی جاتی تھی، (یہ بھی بعض کے استعمال میں تھی)۔ (۴۲) بعض اوقات ان کا لباس اتنا ناکافی ہوتا تھا کہ انہیں باہر آنے سے شرم محسوس ہوتی تھی۔ (۴۳) ان کے کپڑے جلدی میلے ہو جاتے تھے، کیوں کہ صفہ ایک کھلی جگہ تھی اور ہواؤں کے تھپیڑے مٹی کا طوفان لے کر آتے تھے، حتیٰ کہ پسینے کی زیادتی کی وجہ سے ان کی جلد بھی میلی اور خاک آلود رہنے لگی تھی۔ (۴۴)

اصحابِ صفہ کی خوراک

ان کی خوراک زیادہ تر کھجوروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان میں سے دو دو افراد کو ہر روز کھجوروں کی ایک متعین مقدار دیا کرتے تھے۔ کھجور پر مستقل گزارا کرنے کی وجہ سے انہیں معدے کی تکلیف رہنے لگی، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کے لیے کسی اور خوراک کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے، آپ انہیں تسلی دیتے اور صبر کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ (۴۵) بسا اوقات رسول اللہ ﷺ انہیں اپنے گھر کھانے کی دعوت دیتے، لیکن آپ بھی انہیں بہت عمدہ کھانا نہیں کھلا سکتے تھے، کیوں کہ آپ بھی اپنی ذات پر اور اپنے اہلِ خانہ پر بہت زیادہ خرچ نہ کرتے تھے۔ اکثر آپ ان کی ضیافت دودھ سے کیا کرتے اور کبھی کبھار ''جشیشہ'' کھلایا کرتے تھے (یہ روٹی کی ایک قسم تھی جو گوشت یا کھجوروں کے ساتھ ملا کر پکائی جاتی تھی)۔ ایک مرتبہ آپ نے انہیں ''حیسہ'' پیش کیا۔ یہ کھانا کھجور، آٹے اور مکھن کو ملا کر بنایا جاتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر بھنے ہوئے جو، اور اسی طرح ایک اور موقع پر ''ثرید'' بھی پیش کیا جو بھیگی ہوئی روٹی، گوشت اور یخنی پر مشتمل تھا۔ (۴۶) اگر کھانا بہت عمدہ نہیں ہوتا تھا تو رسول اللہ ﷺ ان سے معذرت کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے پکے ہوئے جو سے بھرا ہوا طباق اصحابِ صفہ کے سامنے

رکھتے ہوئے فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے، جو کھانا بھی تم دیکھ رہے ہو، فقط یہی کھانا ہے جو آج رات محمد ﷺ کے گھر میں موجود ہے''۔ (۴۷)

یہ بھی درست ہے کہ اصحابِ صفہ عمدہ کھانے سے بھی لطف اندوز ہوئے ہیں، کیوں کہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ صاحبِ ثروت صحابہ کرامؓ انہیں اپنے گھر کھانے کی دعوت دیتے تھے۔ (۴۸) ان کی زندگی بحیثیتِ مجموعی اس طور پر گزر رہی تھی کہ ان کے پاس اتنا نہیں ہوتا تھا کہ جسم اور روح کا رشتہ باقی رکھ سکیں۔ اس فاقہ کشی کی زندگی نے انہیں اتنا کمزور اور لاغر کر دیا تھا کہ وہ بسا اوقات نماز کے دوران میں بے ہوش ہو جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اکثر بدو یہ سمجھتے کہ شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ اکثر حضور ﷺ کے منبر اور حضرت عائشہؓ کے حجرے کے درمیان کمزوری کی وجہ سے گر جایا کرتے تھے۔ (۴۹) اس کے باوجود کہ ان لوگوں کو ضروریاتِ زندگی نہایت کم میسر تھیں، ان کے اندر لالچ پیدا نہیں ہوا، بلکہ ان کے آپس کے تعلقات میں برادرانہ جذبات و احساسات بہت مضبوط تھے اور وہ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کو بھی بخوبی پہچانتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب اصحابِ صفہ کھجوریں کھانے کے لیے ایک جگہ اکھٹے ہوتے تھے تو ان میں سے، اگر کوئی صاحب دو کھجوریں اکٹھی کھا لیا کرتے تو اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ ''میں نے دو کھجوریں ایک ساتھ کھائی ہیں، تم لوگ بھی اسی طرح کھاؤ''۔ یہ اس لیے کہا کرتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ خود اوروں سے زیادہ کھا لیں۔ (۵۰)

اصحابِ صفہ اپنے مختصر کھانے اور بھدے لباس میں بھی قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ انہوں نے اپنے آزادانہ اختیار سے پر تعیش زندگی یکسر مسترد کر کے اپنے آپ کو عبادت، حصولِ علم اور جہاد کے لیے ہمہ تن وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے خود کو سخت زندگی کا عادی بنا لیا تھا اور زندگی کے تمام تعیشات سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی جانب سے اصحابِ صفہ کی خاطر داری

رسول اللہ ﷺ بذات خود اصحابِ صفہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپؐ ان کی پوری خیر خبر رکھتے ، ان کے پاس روزانہ جایا کرتے اور اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی تیمارداری فرماتے تھے۔ (۵۱) آپ جب ان کے درمیان بیٹھتے تو زندگی کے شدائد پر انہیں تسلی دیتے ، مختلف معاملات میں ان کی رہنمائی فرماتے ، دینی امور کی تعلیم دیتے ، سبق آموز واقعات سناتے اور انہیں یہ ہدایت کرتے کہ وہ تلاوتِ قرآن کے ساتھ ساتھ مطالعۂ قرآن پر بھی زور دیں ، ذکر الٰہی کریں اور آخرت کو اپنی منزل تصور کریں۔ رسول اللہ ﷺ دنیاوی تعیّشات کے ترک کر دینے پر ان کی تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی بھی فرمایا کرتے تھے۔ (۵۲)

جب بھی آپ کو کہیں سے صدقہ موصول ہوتا تو آپ اس میں سے کچھ لیے بغیر جوں کا توں اصحابِ صفہ کے لیے روانہ فرما دیا کرتے تھے ، اور جب کبھی آپ کوئی تحفہ وصول کرتے تو اصحابِ صفہ کو بھی اس میں ضرور شریک کرتے تھے۔ (۵۳) آپؐ اکثر انہیں اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی نہ کسی کے حجرے میں آ کر کھانا کھانے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ (۵۴) آپؐ نے کبھی انہیں نظر انداز نہیں کیا ، بلکہ آپ کو ہمیشہ ان کا خیال رہتا تھا۔ جب آپ ﷺ کے نواسے حسنؓ پیدا ہوئے تو آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ بچے کے بالوں کے برابر چاندی وزن کرا کے اصحابِ صفہ کو صدقہ کر دیں۔ (۵۵)

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ جنگی قیدی لائے گئے۔ جب حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ درخواست کی کہ انہیں ایک باندی عنایت کر دیں جو گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹا سکے ، کیوں کہ خانہ داری کے مشقت طلب کاموں نے انہیں تھکا کر رکھ دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کی اس گزارش پر فرمایا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں دوں اور اہلِ صفہ کو بھوکا چھوڑ دوں؟'' پھر آپ نے حضرت فاطمہؓ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ میں ان تمام قیدیوں کو فروخت کر کے وہ رقم اہلِ صفہ پر خرچ کروں گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے غالباً آپ ﷺ سے کچھ رقم دینے کی درخواست بھی کی

ہوگی۔

اس سے قبل رسول اللہ ﷺ بذات خود حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے گھر یہ مشاہدہ کر چکے تھے کہ ان کے بستر کا کمبل اتنا چھوٹا تھا کہ ان کے جسم ڈھانکنے کے لیے ناکافی ہوتا تھا، پھر بھی آپؐ نے ان دونوں کو کچھ دینے کے بجائے چند دعائیں تعلیم فرمادیں اور اپنے بیٹی اور داماد کے اوپر اصحابِ صفہ ہی کو ترجیح دی۔ ان دونوں سے معذرت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ ''یہ نہیں ہوسکتا کہ تمہیں دے دوں اور اہلِ صفہ کو بھوکا چھوڑ دوں''۔(۵۶)

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کو بھی اس بات پر ابھارا کرتے تھے کہ وہ اصحابِ صفہ پر زیادہ سے زیادہ خرچ کیا کریں۔(۵۷) یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ بھی جتنا زیادہ حسنِ سلوک صفہ والوں کے ساتھ کر سکتے تھے، اس سے دریغ نہ کرتے تھے۔(۵۸) قریش کے صاحبِ ثروت مسلمان اکثر ان لوگوں کے لیے کھانا بھجوایا کرتے تھے۔(۵۹) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ اصحابِ صفہ کو اپنے صحابہ کرامؓ میں تقسیم کردیا کرتے تھے تاکہ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر جاکر کھانا تناول کرسکیں۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کے پاس دو افراد کے لیے کھانا موجود ہو، اسے چاہیے کہ ایک تیسرے شخص کو اپنے ساتھ لے جائے اور جس شخص کے پاس چار افراد کا کھانا موجود ہو، اسے چاہیے کہ وہ ایک پانچویں اور چھٹے شخص کو اپنے ہمراہ لے جائے۔(۶۰) اس طرح صحابہ کرامؓ ان میں سے بیشتر کو کھانا کھلانے کے لیے اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے اور جو لوگ بچ رہتے تھے، انہیں حضور ﷺ اپنے گھر پر دعوتِ طعام دیتے اور وہ آپ کے ساتھ مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔(۶۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ صورتِ حال ہجرت کے ابتدائی زمانے میں تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مال و دولت سے نوازا تو پھر اصحابِ صفہ کو صحابہ کرامؓ پر تقسیم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

ستر انصاری ایسے تھے جنہیں ''قراء'' کہا جاتا تھا، یعنی قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے۔ یہ اصحابِ صفہ کا خاص خیال رکھتے تھے (یہ وہی ستر صحابہؓ تھے جو بعد میں بئر معونہ کے

مقام پر شہید کر دیے گئے)۔ (۶۲) یہ لوگ راتوں کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور اس کی آیات پر غور و فکر کرتے، اور دن میں مسجد میں پانی بھر کر لاتے تھے۔ یہ لوگ لکڑیاں پھاڑ کر فروخت کیا کرتے تھے اور اس سے جو رقم حاصل ہوتی، اس سے کھانا خرید کر اصحابِ صفہ اور دوسرے غریب مسلمانوں کو کھلایا کرتے تھے۔ حضرت محمدؓ بن سلمہ اور دوسرے انصاریوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تجویز رکھی کہ ان میں سے جس کی کھجوریں بھی پک کر تیار ہوں گی، وہ کھجوروں کا ایک خوشہ اہلِ صفہ اور دوسرے غریب مسلمانوں کو صدقہ کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ تجویز پسند فرمائی اور مسجد کے دو ستونوں کے درمیان ایک رسی اس غرض سے بندھوا دی۔ اب لوگ کھجوروں کے خوشے لے کر آتے اور اس رسی کے اوپر لٹکا کر چلے جاتے۔ بعض اوقات اس رسی پر ایک وقت میں بیس بیس یا اس سے بھی زیادہ خوشے لٹکے ہوتے تھے۔

حضرت معاذؓ بن جبل کھجور کے ان خوشوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک اور روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ اپنے باغات سے کھجور کے خوشے صدقہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی فصلوں کو تمام بیماریوں سے محفوظ فرما دے گا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ (۶۳)

رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو گھٹیا قسم کی کھجوروں کا خوشہ صدقے کے طور پر لٹکانے پر سرزنش کی۔ آپ چاہتے تھے کہ صدقے میں جو چیز دی جائے، وہ اعلیٰ معیار کی ہو۔ (۶۴) سمہودی کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد نبوی میں کھجوروں کے خوشے لٹکانے کا رواج دوسری صدی ہجری کے اختتام تک جاری رہا۔ ان آیات کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئیں:

اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لیے روزی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے، لیکن جتنا رزق چاہتا ہے اندازے سے (ہر ایک کے لیے) اتارتا ہے۔ وہ اپنے بندوں (کے مصالح) کو جاننے والا ہے (اور ان کا حال) دیکھنے والا ہے" (الشوریٰ ۴۲:۲۷)۔

طبری اور ابونعیم نے عمرو بن حارث اور بعض دوسرے حضرات کی سند پر لکھا ہے کہ مندرجہ ذیل آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی، لیکن یہ ایک مکی آیت ہے، اس لیے یہ اصحابِ صفہ کے بارے میں نہیں ہوسکتی۔(٦٦)

(صدقات میں) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں۔ اللہ کی راہ میں (اور اسی وجہ سے) وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادتاً) امکان نہیں رکھتے اور ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے۔ ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے، (البتہ) تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو (کہ فقر و فاقہ سے چہرے پر اثر ضرور آ جاتا ہے) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے اور جو مال خرچ کرو گے، بے شک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے (البقرۃ ۲:۲۷۳)۔

ابن سعد، ابن کعب قرظی کی سند پر روایت کرتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں سے مراد اصحابِ صفہ (٦٧) ہیں اور طبری، مجاہد اور سُدی کی سند پر یہ نقل کرتے ہیں کہ ان لوگوں سے مراد غریب مہاجر ہیں۔ (٦٨) ''اور ان لوگوں کو نہ نکالیے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے خاص اس کی رضا مندی کا قصد رکھتے ہیں'' (الانعام ٦:٥٢)۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ آیت مکے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے یہ اصحابِ صفہ کے بارے میں نہیں ہوسکتی۔ (٦٩) طبری کی کچھ روایات بھی اسی امر کی تائید کرتی ہیں: (٧٠) ''اور آپ خود کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجیے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لیے کرتے ہیں'' (الکھف ١٨:٢٨)۔

اسی طرح یہ آیت بھی مکے میں نازل ہوئی، اس لیے یہ اصحابِ صفہ کے متعلق نہیں ہو سکتی۔

اور نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) کہ جس وقت وہ آپ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ ان کو کوئی سواری دے دیں اور آپ کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کروں تو وہ (ناکام) اس حالت میں واپس چلے جاتے

ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں (التوبۃ ۹:۹۲)۔

ابونعیم لکھتے ہیں کہ یہ اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی، (۷۱) لیکن طبری اور ابن کثیر دونوں کی نقل کردہ روایات میں ان روایات کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا جن کی رو سے یہ آیت بنو مزینہ کے سات رونے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

اصحابِ صفہ کے بارے میں لکھنے والے مورخین

ابن سعد (م ۲۳۰ھ) قدیم ترین مصنف ہیں جنہوں نے اصحابِ صفہ کے بارے میں لکھا ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ واقدی سے لیا ہے، لیکن یہ روایات ہمیں واقدی کی مغازی میں نہیں ملتیں۔ غالباً یہ روایات واقدی کی ایک اور کتاب طبقات سے لی گئی ہیں جو اب ناپید ہے۔ (۷۲) ابن سعد نے ان کے حوالے سے الطبقات الکبریٰ میں بہت کچھ لکھا ہے۔ (۷۳)

تاہم قدیم ترین مصنف جس کا میں پتا لگا سکا ہوں اور جس نے صرف اصحابِ صفہ کے حالات پر کتاب تصنیف کی ہے، وہ عبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی نیشاپوری (م ۴۱۲ھ) ہے، لیکن عبدالرحمٰن کی یہ کتاب تاریخ اھل الصفۃ (۷۴) اب ناپید ہو چکی ہے۔ غالباً یہی وہ قدیم مأخذ ہے جس سے ابونعیم نے اپنی کتاب حلیۃ الاولیاء کے ایک باب میں اصحابِ صفہ کے بارے میں مواد نقل کیا ہے۔ ابونعیم نے یہاں اس کتاب کا نام تو نقل نہیں کیا، لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کے دیگر مقامات پر اس کتاب سے روایات نقل کی ہیں۔ (۷۵)

ابونعیم کہتے ہیں کہ یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب سے لکھی گئی تھی، اور اس گروہ کے ناموں پر مشتمل تھی جو ''اہل القبلہ'' کے نام سے معروف تھے اور ''اہل الصفہ'' کے ساتھ وابستہ تھے۔ ''اہل صفہ'' کو ''اہل قبلہ'' لکھنا کچھ راویوں کے قلم کی لغزش کا نتیجہ ہے۔ (۷۶)

متأخرین میں تقی الدین سبکی (م ۷۵۶ھ) ہیں جنہوں نے اہلِ صفہ کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ہے **التحفہ فی الکلام علی اھل الصفۃ**۔ (۷۷) سمہودی ایک دوسرے مصنف ہیں جنہوں نے اصحابِ صفہ کے حالات پر ایک کتابچہ تحریر کیا۔ اس کتابچے

میں انہوں نے وہ تمام روایات جمع کر دی ہیں جو حدیث، تاریخ اور جغرافیے کی کتب اور لغات میں بکھری ہوئی تھیں۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اہلِ صفہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے جنہوں نے ایک لگن اور جذبے کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور روزے رکھے اور ایمان و یقین سے بھرپور زندگی گزاری۔ اللہ ذوالجلال والاکرام نے بجا طور پر فرمایا ہے:

ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے، (البتہ) تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے (البقرۃ ۲:۲۷۳)۔

کتنی مختلف ہے یہ مثال ان غیر اسلامی معاشروں سے جہاں غریب طبقہ ایک گروہ کی شکل میں چوری، قتل اور دیگر جرائم میں ملوث ہو کر معاشرے کے عدمِ تحفظ اور عدمِ استحکام کا باعث بنتا ہے۔ یہی بنیادی فرق ہے حضور ﷺ کی تعلیمات اور جاہلی تعلیمات میں، اور اللہ کے دیے ہوئے نظامِ زندگی اور انسان کے وضع کردہ نظامِ حیات میں۔

اگلے باب میں، ہم اس پر روشنی ڈالیں گے کہ مدینہ شہر میں اسلام نے کتنے مضبوط تعلقات اور معاہدات کی بناء ڈالی جہاں اسلامی معاشرہ اپنی بھرپور اور بہترین شکل میں سامنے آیا۔ انہی تفصیلات کی روشنی میں ہمیں واضح طور پر یہ بھی سمجھنے میں مدد ملے گی کہ ایک اسلامی معاشرے میں طبقاتی کشمکش کیوں پیدا نہیں ہوتی اور کیسے غریب اور امیر دعوتِ دین کے لیے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر کام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان جذبۂ اخوت اور امدادِ باہمی کی جو صحیح روح ہے، وہ میثاقِ مدینہ کے نفاذ میں صاف طور پر نظر آتی ہے۔

حواشی

۱۔ ابن سعد، **طبقات**، ۱:۲۵۵

۲۔ طبری، **تفسیر**، ۵:۲۹۱ (ترتیب وتدوین از محمود محمد شاکر)

۳- خلیفہ (التاریخ ۱: ۲۳) نے دیگر روایات نقل کی ہیں جن کے مطابق ۱۰، ۱۷ یا ۱۹ ماہ بعد یا دو سال بعد صفہ قائم کیا گیا۔ **صحیح بخاری** (کتاب الصلوۃ، باب التوجہ نحو القبلۃ ۱: ۱۰۴) کے بیان کے مطابق صفہ کا قیام ۱۶ یا ۱۷ ماہ بعد عمل میں آیا تھا۔

۴- سمہودی، **وفاء**، ۱: ۳۲۱۔ یاقوت، **معجم البلدان**؛ ابن منظور کی **لسان العرب** میں ''ظلۃ''، ''صفہ'' کے تحت پایا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لفظ ''صفہ'' کا استعمال محض رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں واقع ''صفہ'' تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ یہ لفظ ابتدائی زمانے میں کسی بھی مسقف جگہ کے لیے بولا جاتا تھا۔ مسجد نبوی میں ایک صفۃ النساء (عورتوں کا صفہ) موجود ہے۔ (نسائی، **سنن**، ۸: ۷۷؛ ابوداؤد، **سنن**، ۲: ۴۴۸)، اور مکہ مکرمہ میں صفۃ الزمزم بھی موجود ہے (**صحیح بخاری**، ۲: ۴۴؛ نسائی، **سنن**، ۳: ۱۳۵)۔ لوگوں کے گھروں میں جو سایہ دار جگہ پائی جاتی ہے اسے بھی ''صفہ'' کہا جاتا ہے (**صحیح بخاری**، ۱: ۲۱۵)۔

۵- ریکنڈورف، **دائرۃ المعارف الاسلامیۃ**، ص ۱۰۵

۶- **صحیح مسلم**، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۹۴

۷- ابوداؤد، **سنن**، کتاب الحروف، ۲: ۳۲۱

۸- **صحیح بخاری**، کتاب الصلوۃ، باب نوم الرجال فی المسجد؛ ابن ماجہ، **سنن**، کتاب الصید، باب الذب

۹- **مسند احمد**، ۳: ۴۸۷؛ ابونعیم، **الحلیۃ**، ۱: ۳۳۳ الف، ۳۷۴؛ السمہودی، **وفاء**، ۱: ۳۲۳؛ ''عریف'' بمعنی سردار، یا کسی قبیلے یا جماعت کا امیر (**لسان العرب** بعنوان 'عرف')۔

۱۰- ابونعیم، **الحلیۃ**، ۱: ۳۷۶

۱۱- ابن ابی حاتم، تیسرا کراسہ: ۱۰۰۰۔ مزید دیکھیے: سامی مکی العانی، **دیوان کعب بن مالک انصاری**، ص ۷۷۔ یہاں انہوں نے ان دونوں کے درمیان کسی بھی تعلق سے انکار کیا ہے، کیوں کہ کعبؓ انصاری تھے اور اہل صفہ غریب مہاجر تھے، لیکن یہ بات عین ممکن ہے کہ انہوں نے مدینے میں اپنا ذاتی گھر موجود ہونے کے باوجود غربت اور زہد کی زندگی گزارنے کو ترجیح دی ہو۔ ابن نعیم نے **الحلیۃ** (۱: ۳۵۵-۳۵۶) میں چند انصار کا تذکرہ کیا ہے جو اہل صفہ میں شامل تھے۔

۱۲- **مسند احمد**، ۶: ۳۹۱؛ ابونعیم، **الحلیۃ**، ۱: ۳۳۹؛ ابن منظور، **لسان العرب**، (وفضہ)

۱۳- ابونعیم، **الحلیۃ**، ۱: ۳۳۹، ۳۴۱

۱۴- ایضاً، ۱: ۳۴۱

۱۵- سمہودی، **وفاء**، ا:۳۲۱

۱۶- حاجی خلیفہ، **کشف الظنون** ، ا:۲۸۶؛ ابن حجر، **الاصابة**، ا:۲۰۱ (وہ اسے اصحاب الصفہ کا نام دیتے ہیں)، ۶:۵۵۰

۱۷- **صحیح بخاری**، **کتاب البیوع**؛ ابن سعد، **طبقات** ، ا:۲۵۶؛ ابن سید الناس، **عیون الاثر**، ۲:۳۱۷؛ ابن حجر، **الاصابة**، اندراج ۵۵۰۵

۱۸- ابن سید الناس، **عیون الاثر**، ۲:۳۱۷؛ ابن سعد، **طبقات**، ا:۲۵۶

۱۹- ابن سید الناس، **عیون الاثر**، ۲:۳۱۷

۲۰- ابن سعد، **طبقات** ، ا:۲۵۶؛ ابن سید الناس، **عیون الاثر**، ۲:۳۱۷؛ ابن حجر، **الاصابة**، اندراج ۴۳۰۰

۲۱- ابن ابی حاتم، **الجرح والتعدیل**، ۳:۲:۱۶۰۰

۲۲- **سنن ابی داؤد** ، **کتاب الحمّام** ، **باب النهی عن التعرّی**، ا:۳۶۳؛ **مسند احمد**، ا: ۴۷۸

۲۳- ابونعیم کہتے ہیں: ''مجھے ان کے صفے پر قیام کے بارے میں کسی 'صحیح' روایت کا علم نہیں ہے''، لیکن وہ اس سے انکار بھی نہیں کرتے کہ ان کا شمار اہل صفہ میں تھا۔ **الحلیة**، ا:۳۶۵

۲۴- **السیرة**، حدیث نمبر ۷۹؛ ابن حجر، **الاصابة** ، اندراج ۵۵۰۵

۲۵- ایضاً، اندراج ۶۹۱۳

۲۶- ایضاً، اندراج ۵۱۹۰

۲۷- ایضاً، اندراج ۴۴۶۳

۲۸- ان اصحاب کے بارے میں دیکھیے: ابونعیم، **الحلیة**، ا: بالترتیب ۳۲۳، ۳۶۷، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۷۱، ۳۵۶

۲۹- **سنن ابی داؤد**، ۲:۲۳۷؛ **سنن ابن ماجة**، ۲:۲۳۰

۳۰- ان اصحاب کے متعلق دیکھیے: **الحلیة**، ا: بالترتیب ۳۲۳، ۳۶۷، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۷۱، ۳۵۶

۳۱- ایضاً، ا:۳۷۵

۳۲- ایضاً، ا:۳۵۳، ۳۵۵

۳۳- ایضاً، ا:۳۵۲

۳۴- ایضاً، ا:۳۶۵

۳۵- ایضاً، ۱: ۳۶۷، ۳۷۰

۳۶- ابن سعد، طبقات، ۱: ۲۵۵؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۷۷؛ ابن سیدالناس، عیون الاثر، ۲: ۲۱۷

۳۷- ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۴۱

۳۸- ایضاً، ۱: ۳۷۷

۳۹- صحیح بخاری، ۱: ۱۱۴؛ ابن سعد، طبقات، ۱: ۲۵۵

۴۰- مسند احمد، ۴: ۱۲۸

۴۱- ابن منظور، لسان العرب، مادہ ''خنک''

۴۲- مسند احمد، ۳: ۴۸۷؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۷۴؛ سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۳

۴۳- الحلیۃ، ۱: ۳۴۲

۴۴- ایضاً، ۱: ۳۴۱

۴۵- مسند احمد، ۳: ۴۸۷؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۳۹-۳۷۴؛ سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۳

۴۶- صحیح بخاری، ۸: ۶۸، ۱۱۹؛ مسند احمد، ۲: ۵۱۵، ۳: ۴۹۰؛ ابن سعد، طبقات، ۱: ۲۵۶؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۷۳-۳۷۴؛ سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۳

۴۷- ابن سعد، طبقات، ۱: ۲۵۶

۴۸- صحیح بخاری، کتاب المواقیت، باب السمر مع الضیف والأهل؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۴۱

۴۹- ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۳۹-۳۷۸

۵۰- ایضاً، ۱: ۳۳۹-۳۴۰

۵۱- ایضاً، ۱: ۳۷۵

۵۲- مسند احمد ۴: ۸؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۴۰-۳۴۱؛ سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۲

۵۳- صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ۱۴؛ مسند احمد ۲: ۵۱۵؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۷۷، ۳۸۹؛ سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۲

۵۴- صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ۱۴ اور کتاب الاستیذان، باب ۱۴؛ مسند احمد ۲: ۵۱۵، ۳: ۴۲۹، ۴۹۰؛ سنن ابن ماجه، کتاب المساجد والجماعة: باب النوم فی المسجد؛ ابونعیم، الحلیۃ، ۱: ۳۳۸-۳۳۹؛ سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۲-۳۲۳

۵۵- سنن البیهقی، ۹: ۳۰۴

۵۶- مسند احمد، ۱: ۷۹، ۱۰۶

۵۷- ابونعیم، الحلیة، ۱: ۳۴۰

۵۸- ایضاً، ۱: ۳۴۰

۵۹- ایضاً، ۱: ۳۷۸

۶۰- صحیح بخاری، کتاب المواقیت، باب السمر مع الضیف والاھل

۶۱- ایضاً: ابن سعد، طبقات، ۱: ۲۵۵؛ ابونعیم، الحلیة، ۱: ۳۳۸، ۳۴۱، ۳۷۳

۶۲- صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث نمبر ۱۴۷؛ مسند احمد، ۳: ۲۷۰؛ ابن سعد، طبقات، ۳: ۵۱۴

۶۳- سمہودی، وفاء، ۱: ۳۲۴-۳۲۵

۶۴- ایضاً، ۱: ۳۲۵

۶۵- ایضاً، ۱: ۳۲۴

۶۶- تفسیر طبری، ۲۵: ۳۰؛ ابونعیم، الحلیة، ۱: ۳۳۳

۶۷- طبقات ابن سعد، ۱: ۲۵۵

۶۸- تفسیر طبری، ۱۱: ۳۷۶

۶۹- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۱۳۵

۷۰- تفسیر طبری، ۱۱: ۳۷۶

۷۱- الحلیة، ۱: ۳۷۱-۳۷۲

۷۲- اکرم العمری، بحوث فی تاریخ السنة المشرفة، ص ۵۳

۷۳- ایضاً، ص ۵۶

۷۴- حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۱: ۲۸۷، لیکن انہوں نے اسے تاریخ اھل الصفة کا نام دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رد و بدل ہو (دیکھیے: نور الدین شریبہ کا تعارف طبقات الصوفیة از سلمی، ۱: ۳۴)

۷۵- ابونعیم، الحلیة، ۳: ۲۵

۷۶- ایضاً، ۱: ۳۴۷

۷۷- ریئنڈ ورف، دائرۃ المعارف الاسلامیة، ص ۱۰۶

میثاقِ مدینہ کا اعلان

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ

رسول اللہ ﷺ نے مدینے کے مختلف الاجناس باشندوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے اور ان تعلقات پر مبنی ایک دستاویز تیار کی جو تمام تاریخی مآخذ میں محفوظ کی گئی ہے۔ اس دستاویز کا مقصد ایک تو یہ واضح کرنا تھا کہ مدینے میں رہنے والے ہر گروہ کی وفاداریاں مدینے کے ساتھ وابستہ ہوں گی، دوسرے اس کا منشاء اہل مدینہ کے حقوق اور فرائض کا تعین کرنا تھا۔ قدیم ترین مآخذ میں اس دستاویز کو "الکتاب" (کتاب) اور "الصحیفہ" (کاغذ کا ایک ورق) کا نام دیا گیا ہے۔ جدید محقق اس دستاویز کو "الدستور" (دستور) اور "الوثیقہ" (ایک دستاویز) کا نام دیتے ہیں۔

وہ مآخذ جن کے ذریعے یہ دستاویز نقل کی گئی۔

دور جدید کے محققین جب مدینے میں حضور ﷺ کی اصلاحات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس دستاویز کو اپنے مطالعے کا محور اور مرکز بناتے ہیں، (۱) لیکن اس سے قبل کہ ہم اس دستاویز پر اپنے مطالعے کی بنیاد رکھیں، ہمارے لیے اشد ضروری ہے کہ ہم اولاً اس امر کا کھوج لگائیں کہ یہ دستاویز واقعی مستند ہے یا نہیں؟ یہ امر بالخصوص اس لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک محقق کی رائے کے مطابق یہ دستاویز من گھڑت ہے۔ (۲)

اس دستاویز کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اس سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے سب سے پہلے تو ہمیں اس کی قانونی حیثیت کو علمائے حدیث کے معیارات کے مطابق جانچنا اور پرکھنا ہوگا، تاکہ ہم اس کی مضبوط یا کمزور حیثیت کو متعین کر سکیں۔ یقیناً اس دستاویز کو اس طرح سرسری نظر

سے نہیں دیکھا جا سکتا جس طرح عام طور پر دیگر تاریخی روایات کو دیکھا جاتا ہے۔ قدیم ترین مصنف جس نے اس دستور مدینہ کا متن نقل کیا ہے، وہ ابن اسحٰق (م ۱۵۱ھ) ہیں، لیکن ابن اسحٰق نے اسے بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے۔ (۳) ابن سیدالناس (۴) اور ابن کثیر (۵) دونوں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ روایت ابن اسحٰق سے نقل کی ہے، مگر وہ دونوں بھی اسے بغیر سند کے نقل کرتے ہیں۔ (۶) بیہقی نے ابن اسحٰق کی سند پر اس دستاویز کا حوالہ دیا ہے جو صرف مہاجرین اور انصار کے تعلقات سے بحث کرتی ہے اور اس میں وہ شقیں شامل نہیں ہیں جو یہود سے متعلق تھیں۔ اس وجہ سے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے یہ دستاویز اسی ذریعے سے حاصل کی ہے۔ ابن سیدالناس بیان کرتے ہیں کہ ابن ابی خیثمہ (۷) نے اس دستاویز کو اس سند پر نقل کیا ہے: ''احمد بن خباب ابوالولید نے بیان کیا کہ عیسیٰ بن یوسف نے اپنے والد سے اور اپنے دادا سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان ایک تحریری معاہدہ کیا، اور وہ پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ اس دستاویز سے ملتا جلتا ہے جو ابن اسحٰق نے نقل کی ہے، (۸) تاہم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن ابی خیثمہ کی **تاریخ** کے جس حصے میں یہ دستور نقل کیا گیا تھا، وہ حصہ اب ضائع ہو چکا ہے، کیوں کہ یہ کتاب کے ان حصوں میں موجود نہیں ہے جو ہم تک پہنچے ہیں۔ اس دستاویز کو ابوعبید قاسم بن سلام نے بھی ایک اور سند کے ساتھ اپنی **کتاب الاموال** میں نقل کیا ہے۔ ابوعبید کی سند یہ ہے: ''یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر اور عبداللہ بن صالح نے مجھ سے روایت کیا کہ اللیث بن سعد نے روایت کیا کہ عقیل بن خالد نے ابن شہاب سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا: 'میں نے سنا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ معاہدہ تحریری طور پر ضبط کرایا تھا۔۔۔'' اور پھر انہوں نے اس معاہدے کی تفصیل بیان کی۔

یہ دستاویز ابن زنجویہ نے بھی **کتاب الاموال** میں زہری کے ذریعے نقل کی ہے۔ (۹) یہ ہیں وہ تمام مآخذ جن سے اس دستاویز کا مکمل متن نقل کیا گیا ہے۔ تمام روایات بہت حد تک ملتی جلتی ہیں، سوائے اس کے کہ جملوں کی ترتیب میں معمولی سا فرق پایا جاتا ہے، یا الفاظ میں اختلاف ہے، یا جملوں کی تعداد میں معمولی سا اضافہ نظر آتا ہے۔ بہر حال یہ اختلاف

اتنے معمولی اور اتنے غیر اہم ہیں کہ دستاویز کے اصل مواد پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔

دستاویز کے مستند ہونے کی وسیع بنیاد

دور جدید کے مصنفین کی ایک بڑی تعداد نے اپنے مطالعے کی بنیاد اس دستاویز پر رکھی ہے، لیکن اس کے باوجود پروفیسر یوسف العش یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ دستاویز اختراع شدہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اپنی تمام تر شرعی اور قانونی اہمیت کے باوجود یہ دستاویز نہ تو فقہ کی کسی کتاب میں نظر آتی ہے اور نہ کسی مستند مجموعۂ حدیث ہی میں۔ ابن اسحٰق نے اسے نقل کیا ہے تو بغیر کسی سند کے، اور ابن سید الناس نے بھی اس روایت کو انہی سے نقل کیا ہے۔ آخر الذکر نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ کثیر بن عبداللہ بن عمرو المزنی نے اسے اپنے والد اور اپنے دادا سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان البستی نے ذکر کیا ہے کہ کثیر المزنی نے اپنے والد اور اپنے دادا سے ایک من گھڑت بیان نقل کیا ہے۔ اس روایت کو کسی کتاب میں شامل کرنا، یا اسے بیان کرنا جائز نہیں ہے، سوائے اس ایک مقصد کے کہ اس پر حیرت کا اظہار کیا جائے''۔ (۱۰) العش کا خیال ہے کہ ابن اسحٰق نے کثیر کی روایت پر بھروسا کیا ہے، لیکن دانستہ سند کو حذف کر دیا ہے۔ (۱۱)

پروفیسر العش نے یہ رائے اس لیے اختیار کی ہے کہ ان کے خیال میں یہ دستاویز ابن اسحٰق کے علاوہ کسی نے بھی روایت نہیں کی۔ انہیں اس کی کوئی اور سند نہیں مل سکی سوائے اس کے، جس کا حوالہ ابن سید الناس، ابن ابی خیثمہ کی روایت کے ذریعہ دیتے ہیں جو کثیر المزنی کے حوالے سے آئی ہے، لیکن ابو عبید قاسم بن سلام نے اس دستاویز کو زہری کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ یہ ایک علیحدہ سلسلۂ سند ہے جس کا کثیر المزنی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ابن اسحٰق، زہری کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے ایک تھے، اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ انہوں نے دستاویز کو زہری کے ذریعے سے نقل کیا ہو، قطع نظر اس بات سے کہ بیہقی نے اس دستاویز کے اس حصے کے لیے ابن اسحٰق کی سند پر بھروسا کیا جو مہاجرین اور انصار کے تعلقات کی توضیح کرتا ہے، اس میں وہ تمام شقیں شامل نہیں ہیں جو یہود کے متعلق تھیں۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ابن اسحٰق نے یہود سے متعلق شقیں اس ذریعے سے حاصل کی ہیں یا

کسی اور ذریعے سے۔

بیہقی کے بیان کے مطابق عثمان بن محمد بن المغیرہ بن الاخنس بن شریق کہتے ہیں:
''میں نے یہ دستاویز اور 'الصدقہ' والی دستاویز عمرؓ بن خطاب کے خاندان سے لی ہے''۔ یہ حدیث اس سند کے اعتبار سے ''ضعیف'' ہے، کیوں کہ اس سند میں ایسے لوگ شامل ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے ضعیف گردانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عثمان جو ویسے تو امانت دار ہیں، لیکن بعض اوقات گھبراہٹ میں غلطی کر جاتے ہیں، اور یونس بن بکیر ہیں جو غلطی کرنے میں مشہور ہیں اور العطار ہیں جو کمزور سمجھے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ اس روایت کو اپنی تمام تر کمزوری کے باوجود سنجیدگی سے لینا چاہیے اور اسے تسلیم بھی کیا گیا ہے۔ اس کا متن اس بنیاد کو ختم کر دیتا ہے جس پر پروفیسر العش نے اپنی رائے قائم کی ہے۔ اس دستاویز کو محض اس بناء پر من گھڑت قرار دینا ممکن نہیں ہے کہ کتبِ احادیث میں اس کا مکمل متن نقل نہیں کیا گیا۔ احادیث کی کتب میں اس کی بے شمار شقیں روایت کی گئی ہیں جو دورانِ مطالعہ میں ہمارے سامنے آئیں گی۔

یہ بات پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس دستاویز کو ایک گھڑی ہوئی روایت کے طور پر پرکھنا بڑا غیر محتاط رویہ ہوگا، تاہم اس دستاویز کو مکمل طور پر مستند ''صحیح'' کے درجے پر بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ ابن اسحٰق نے اس دستاویز کو اپنی سیرت میں بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ روایت ''ضعیف'' کے درجے میں آتی ہے۔ بیہقی نے بھی اسے ابن اسحٰق سے ایک سلسلۂ سند کے ذریعے نقل کیا ہے جس میں سعد بن منذر بھی شامل ہیں جو صرف ''مقبول'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابن ابی خیثمہ نے اسے کثیر بن عبداللہ بن عمرو المزنی کے ذریعے نقل کیا ہے جس نے اختراع شدہ مواد بیان کیا ہے۔ ابوعبید قاسم بن سلام نے اسے ایک ''منقطع'' سند کے ساتھ نقل کیا ہے (ایسی سند، جس کا سلسلہ درمیان سے منقطع ہو) جو زہری سے جا کر ملتی ہے جس کا تعلق تابعین کی جماعت سے ہے، اس لیے ان کی ''مرسل حدیث'' کو شہادت کے طور پر نہیں لیا جا سکتا۔ (''مرسل'' وہ حدیث ہے جو حضور ﷺ سے براہِ راست نقل کی گئی ہو، لیکن اس کے سلسلۂ سند سے صحابی کا نام نکال دیا گیا ہو)۔

اس دستاویز کے کچھ متون ایسے ہیں جو احادیث کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے کچھ **بخاری** اور **مسلم** میں بھی محفوظ ہیں۔ یہ متون مستند احادیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ فقہاء نے انہی متون کو شہادت کے طور پر استعمال کیا ہے اور انہی پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھی ہے۔ ان میں سے کچھ متون **مسند امام احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ** اور **جامع ترمذی** میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان متون کو کسی اور ذریعے سے روایت کیا گیا ہے جو راویوں کے اس سلسلے سے بالکل علیحدہ ہے جس کے ذریعے مکمل دستاویز سامنے آئی ہے۔ اگر یہ دستاویز پوری کی پوری اس ثبوت کے لیے ناکافی ہو جو شرعی فیصلوں کے لیے ضروری ہوتا ہے (قطع نظر ان تمام حصوں کے جو مستند کتب حدیث میں روایت کیے گئے ہیں) تو اس کے باوجود یہ دستاویز تاریخ کے مطالعے کے لیے ایک مضبوط بنیاد بن سکتی ہے، کیوں کہ اس مقصد کے لیے استناد کے اتنے اونچے معیار کی ضرورت نہیں ہوتی جتنا کہ قانونی فیصلوں کے اثبات کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ دستاویز راویوں کے لاتعداد سلسلوں سے نقل کی گئی ہے جو اس کی مزید تقویت کا باعث ہیں۔ زہری ابتدائی سیرت نگاروں میں ایک عظیم الشان مقام رکھتے ہیں۔ سیرت کی اہم ترین کتب اور تاریخی مآخذ نے رسول اللہ ﷺ کے تحریری معاہدات امن (۱۱) قلم بند کیے ہیں، اور ایک تحریری معاہدے کا بھی حوالہ دیا ہے جو مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوا تھا۔

دستاویز کا انداز (بھی) اس کے مستند ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ ''اس کے پیراگراف سیدھے سادے اور مختصر جملوں پر مشتمل ہیں جو پیچیدگی سے پاک ہیں۔ ایک بات کو کئی بار دہرایا گیا ہے اور اس میں وہ طرزِ اظہار اور الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عام تھے اور جن کا استعمال بعد میں کم سے کم ہوتا گیا، (اور یہ بات) خاص طور پر ان لوگوں کے لیے زیادہ مشکل ہو گئی جنھوں نے اس دور کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس دستاویز میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کسی فرد یا گروہ کی تائید کرتی ہو، یا مذمت کرتی ہو، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دستاویز گھڑی ہوئی نہیں ہے، بلکہ مستند ہے''۔ مزید براں رسول اللہ ﷺ کی املا کی ہوئی

دیگر دستاویزات سے اس کا انداز بہت ملتا جلتا ہے جو اس کے مستند ہونے کا مزید قوی ثبوت ہے۔

دستاویز کس تاریخ کو قلم بند ہوئی؟

اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ دستاویز دو حصوں پر مشتمل ہو، لیکن مؤرخین نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہو۔ ایک حصے کا تعلق امن معاہدے کے ساتھ ہو جو رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا اور دوسرا حصہ ان ذمہ داریوں کی وضاحت اور ان حقوق و فرائض کی تشریح کرتا ہو جو مہاجرین اور انصار کے درمیان طے پائے تھے۔

یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ یہودیوں کے ساتھ معاہدۂ امن کی دستاویز غزوۂ بدر سے پہلے لکھی گئی ہو (۱۴) اور مہاجرین اور انصار کے مابین تعلقات پر مبنی دستاویز غزوۂ بدر کے بعد قلم بند کی گئی ہو۔ متعلقہ مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مدینے تشریف لاتے ہی یہودیوں کے ساتھ امن کا معاہدہ طے پا گیا تھا۔ ابو عبید قاسم بن سلام کہتے ہیں کہ "اس دستاویز سے دو واقعات کا خاص طور پر پتا چلتا ہے: "ایک تو یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تو ابھی اسلام نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا اور دوسرے اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کو اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم نہیں ہوا تھا"۔ (۱۵) اسلام میں قوت غزوۂ بدر کے بعد پیدا ہوئی۔ بلاذری لکھتے ہیں: "کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور اس معاہدے پر مبنی ایک دستاویز بھی تیار کرائی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدے میں ایک شرط یہ رکھی تھی کہ یہودی آپ کے کسی دشمن کی معاونت نہیں کریں گے اور بیرونی حملے کی صورت میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کریں گے اور یہ کہ آپ بذات خود کسی ذمی کی طرف سے جنگ نہیں لڑیں گے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے نہ تو ایسی کوئی جنگ لڑی اور نہ کسی نے آپ کو ایسا کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش ہی کی۔ آپ نے اس وقت تک ایسی کوئی مہم (سریہ) روانہ نہیں کی جب تک اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل قرآنی آیت نازل نہیں فرمائی:

(اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے (الحج ۲۲:۳۹)۔

پہلی مہم جو آپ نے روانہ فرمائی اس کے سالار حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب تھے۔ (۱۶)

بلاذری وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہودیوں کے ساتھ کیے گئے معاہدۂ امن کی دستاویز اس وقت تحریر کی گئی تھی جب فوجی مہمات روانہ کرنے کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ بات تو معلوم اور معروف ہے کہ حضرت حمزہؓ کی سربراہی میں مہم ہجرت کے پہلے برس رمضان میں روانہ کی گئی، یعنی معرکۂ بدر سے تقریباً ایک سال قبل۔ (۱۷) ایک اور مقام پر، بنوقینقاع کے خلاف کی جانے والی فوجی کارروائی کا تذکرہ کرتے ہوئے بلاذری کہتے ہیں: ''اس غزوے کا پس منظر یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تو آپ نے مدینے میں بسنے والے تمام یہودیوں کے ساتھ امن کا ایک معاہدہ کیا اور اسے ایک دستاویز کی شکل میں مرتب کرایا، لیکن جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ بدر میں فتح یاب ہونے کے بعد کامیاب و کامران اور سلامتی کے ساتھ مدینے لوٹے تو یہودیوں نے معاندانہ روّیہ اختیار کرتے ہوئے معاہدہ توڑ دیا''۔ (۱۸) اس طرح بلاذری پورے یقین کے ساتھ یہ بات لکھتے ہیں کہ یہود کے ساتھ معاہدہ غزوۂ بدر سے پہلے طے پا چکا تھا۔

طبری کہتے ہیں: ''بدر سے واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں قیام فرمایا۔ جب آپ مدینے تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا تھا، جس میں یہ شق رکھی گئی تھی کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دیں گے، اور یہ کہ اگر مدینے پر کوئی دشمن حملہ کرے گا تو اس صورت میں یہودی رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیں گے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کے چند مشرکین کو سزائے موت دی تو یہودی آپ ﷺ کی مخالفت کے درپے ہو گئے اور انہوں نے اس معاہدے کو توڑ ڈالا''۔ (۱۹)

طبری کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہودیوں کے ساتھ معاہدۂ

امن غزوۂ بدر سے پہلے اسی وقت طے پا گیا تھا، جب رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تھے۔

ابو داؤد (۲۰) اپنی سنن میں روایت کرتے ہیں کہ کعب بن اشرف کے قتل کے بعد یہودیوں اور مشرکین کی اس بارے میں شکایت سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس بات کی دعوت دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ مرتب کر لیں جس کی بنیاد پر مستقبل کا لائحۂ عمل طے کیا جا سکے، چنانچہ ایک دستاویز تحریر کی گئی جو یہود، مشرکین، رسول اللہ ﷺ اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ کعب بن اشرف کا قتل غزوۂ بدر کے بعد ہوا، اس لیے اس واقعے کو تاریخی روایات سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ محدثین کی شرائط کے مطابق یہ روایت مؤرخین کی ان تمام روایات سے قوی تر ہے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، لیکن اگر ان روایات میں تطبیق پیدا کی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم تمام تاریخی روایات کو یکسر مسترد کر دیں، کیوں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کعب بن اشرف کے قتل کے بعد اس دستاویز کی تجدیدِ نو کرتے ہوئے اسے دوبارہ لکھا گیا ہو، تاکہ یہودیوں اور مشرکین کا احساسِ تحفظ بحال ہو جائے، کیوں کہ قتل کے اس واقعے نے انہیں خوف زدہ کر دیا تھا۔

بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے جو ابو داؤد کے سلسلۂ سند سے بالکل مختلف ہے اور زیادہ مفصل بھی: ''رسول اللہ ﷺ نے بنتِ حارث کے گھر پر کھجور کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس دستاویز کو لکھوایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ دستاویز حضرت علیؓ بن ابی طالب کے پاس رہی''۔ (۲۱)

مہاجرین اور انصار کے مابین تعلقات پر مبنی دستاویز ۲ھ میں اس معاہدے کے بعد لکھی گئی جو یہودیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ہجرت کے دوسرے برس جو واقعات پیش آئے، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے طبری لکھتے ہیں: ''کہا جاتا ہے کہ اس سال رسول اللہ ﷺ نے ایک معاہدے کا متن تحریر کرایا تھا اور یہ تحریر آپ کی تلوار کے ساتھ نتھی کر دی گئی تھی''۔ (۲۲) آپ ﷺ کی اس تلوار کا نام ذوالفقار تھا جو غزوۂ بدر میں مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ آئی تھی۔ (۲۳) یہ تحریر جو

حضورﷺ کی تلوار کے ساتھ باندھ دی گئی تھی۔ دراصل وہ دستاویز تھی جو مہاجرین اور انصار کے درمیان تیار کرائی گئی تھی، جیسا کہ ابن سعد کی روایت سے اس کا اشارہ ملتا ہے: ''عبیداللہ بن موسیٰ نے ہمیں بتایا کہ اسرائیل نے انہیں یہ بتایا کہ انہوں نے جابر سے سنا اور انہوں نے عامر سے کہ میں نے رسول اللہﷺ کی تلوار ذوالفقار کی نیام پر یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی: 'تمام مسلمان خون بہا ادا کریں گے، اسلام میں کوئی محروم اور مفلس نہیں رہے گا اور کسی کافر کے بدلے میں کوئی مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا'''۔ (۲۴) بعد ازاں یہ تلوار اس دستاویز سمیت حضرت علیؓ کے پاس رہی۔ ایک موقع پر ابو جُحیفہ (۲۵) نے حضرت علیؓ سے اس دستاویز کی بابت دریافت کیا اور ایک دوسرے موقع پر الاشتر (۲۶) نے۔ حضرت علیؓ نے ان دونوں اصحاب کو اس کا متن سنایا، علاوہ ازیں حضرت علیؓ نے اپنے ایک خطبے میں بھی اس دستاویز کے مشتملات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ (۲۷) حضرت علیؓ نے ایک بار فرمایا: ''ہم نے رسول اللہﷺ سے سنی ہوئی کوئی چیز تحریر نہیں کی، سوائے قرآن مجید کے، اور جو کچھ اس دستاویز میں ہے۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا: 'عائر نامی پہاڑ سے لے کر فلاں فلاں مقام تک مدینے کا شہر محترم ہے، جو شخص اس علاقے میں بدعت پھیلائے گا، یا کسی گناہ کا مرتکب ہوگا، یا کسی بدعتی کو پناہ دے گا تو وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا مستحق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی فرض یا نفل عبادت قبول نہ ہو گی'''۔ (۲۸)

حضرت علیؓ نے یہ تذکرہ بھی فرمایا کہ زخموں کے قصاص کے لیے جو مختلف اقسام (عمروں) کے اونٹ مطلوب ہوتے ہیں، ان کی نشان دہی بھی اس دستاویز (۲۹) میں کی گئی تھی۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: ''ایک مومن کو ایک کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ایک شخص جو کسی معاہدے کا فریق ہے، اسے بھی اس وقت تک قتل نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ معاہدہ قائم ہو''۔ (۳۰) حضرت علیؓ کے بقول دستاویز میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: ''قیدیوں کا خون بہا اور فدیہ بھی''۔ (۳۱) حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے مذکورہ دستاویز میں یہ مضمون بھی پڑھا: ''ابراہیم علیہ السلام نے مکے کو محترم قرار دیا تھا اور میں مدینے کے پورے شہر کو جو دو حرّوں کے

درمیان واقع ہے، محترم قرار دیتا ہوں۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ یہاں سے جنگلی پودے اکھاڑے، یا جنگلی جانوروں کا شکار کرے۔ اگر تم کوئی چیز گری پڑی پاؤ تو تمہیں اسے رکھنے کا حق نہیں ہے، بلکہ اس کے بارے میں اعلان کرو۔ ہم کوئی درخت نہیں کاٹیں گے، سوائے اس کے کہ کسی شخص کو اپنے اونٹ کو چارا دینا پڑے، اور لڑائی کے لیے کوئی ہتھیار یہاں نہ لایا جائے گا''۔ (۳۲)

یہاں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ بالا اقتباسات میں سے بیشتر دستاویز کے مشتملات سے ہو بہو مطابقت رکھتے ہیں۔ ان اقتباسات میں دستاویز کی تقریباً وہ تمام شقیں آ جاتی ہیں جن کا تعلق مہاجرین اور انصار کی باہمی ذمہ داریوں سے تھا، لیکن ان اقتباسات میں ایسی کوئی شق موجود نہیں ہے جو یہودیوں کے ساتھ کیے گئے معاہدۂ امن سے متعلق ہو۔ اس سے یہ بات زیادہ قابلِ یقین ہو جاتی ہے کہ معاہدے کی یہ دستاویز دو حصوں پر مشتمل ہوگی۔ جو حصہ حضور ﷺ کی تلوار مبارک کے ساتھ منسلک تھا اور بعد میں حضرت علیؓ کے قبضے میں آیا، وہ دراصل اس حصے پر مشتمل تھا جو مہاجرین اور انصار کے متعلق تھا۔

یہاں اس بات کا اضافہ کرنا بھی ضروری ہے کہ کچھ متون ایسے پائے جاتے ہیں جو مہاجرین اور انصار کے درمیان طے پانے والی اس دستاویز سے مطابقت رکھتے ہیں، لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی لکھوائی ہوئی دیگر دستاویزات کی طرف منسوب ہیں۔ مثال کے طور پر، عمرو بن حزم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو ایک خط لکھوایا تھا جس میں یہ حکم درج تھا: ''جس شخص پر یہ جرم ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا ہے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ مقتول کے ورثاء (خون بہا پر) (۳۳) راضی ہو جائیں''۔ جس وقت یہ خط روانہ کیا گیا اس وقت مذکورہ دستاویز تحریر میں آ چکی تھی۔

کچھ روایات سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ''کوئی مومن کسی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا''۔ (۳۴) ان متون کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ بعد کی تاریخوں میں اس وقت لکھے گئے، جبکہ اصل دستاویز تحریر

کی جا چکی تھی، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دستاویز کوئی خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے اور بعد میں اس دستاویز میں شامل کر دیے گئے۔ (۳۵) اس رائے کے حق میں کوئی دلیل نہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس خط میں دستاویزات کی محض شقوں کا حوالہ نہیں دیا۔ ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہونا چاہیے کہ دستاویز میں یہودیوں سے متعلق وہ شقیں موجود نہیں ہیں جن کا تعلق قلعوں سے ہے۔ اس سے یہ بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے ساتھ امن کے معاہدے کی دستاویز اس دستاویز سے الگ ہے جو قلعوں سے متعلق تھی۔ اس خیال کی تائید حضرت انسؓ بن مالک کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان اتحاد انسؓ بن مالک کے گھر پر قائم کرایا تھا۔ (۳۶) حضرت انسؓ نے اس اتحاد میں یہودیوں کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

اسی بات کی مزید تائید عمرو بن شعیب کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے والد اور اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک دستاویز مرتب کرائی تھی جس میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ انہیں خون بہا ادا کرنا ہوگا، قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہوگا اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم کرنا ہوگا۔ (۳۷) اس دستاویز میں یہودیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس حقیقت کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ بیہقی نے مہاجرین اور انصار کے متعلق شقوں کی نشان دہی کی ہے، انہوں نے وہ سند اختیار کی ہے جس کا ذکر ابن اسحٰق نے کیا ہے، لیکن وہ یہودیوں کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔ یہ شقیں جن کا ذکر بیہقی نے کیا ہے، ابن ہشام کی روایت سے جو انہوں نے ابن اسحٰق سے کی ہے، پوری مطابقت رکھتی ہیں۔

یہاں میں نے جتنی روایات کا ذکر کیا ہے، ان سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ دو مختلف قسم کے معاہدے عمل میں آئے تھے۔ پہلا معاہدہ وہ ہے جو یہودیوں کے ساتھ تعلقات کے متعلق تھا اور غزوۂ بدر سے پہلے تحریر میں آ چکا تھا، یعنی رسول اللہ ﷺ کی مدینے تشریف آوری کے فوراً بعد یہ معاہدہ عمل میں آیا تھا۔ دوسرا معاہدہ وہ ہے جو مہاجرین اور انصار کے درمیان اتحاد سے متعلق تھا اور غزوۂ بدر کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ مؤرخین نے دونوں معاہدات

کو ایک دستاویز میں مدغم کر دیا ہے۔

مہاجرین، انصار اور یہود کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی دستاویز کا متن (۳۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شق

۱۔ یہ ایک دستاویز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ہے، (ان تعلقات کو متعین کرتی ہے) جو قریش اور یثرب کے مسلمانوں کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان قائم ہوں گے، جو ان کا اتباع کریں، ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کریں۔

۲۔ وہ تمام لوگوں سے الگ ایک گروہ (امت) ہیں۔

۳۔ قریشی مہاجر اپنے موجودہ رواج کے مطابق اپنی تعداد کے اندر خون بہا ادا کریں گے اور اپنے قیدیوں کی رہائی میں حسنِ سلوک اور انصاف سے کام لیں گے جو مسلمانوں کا ایک عام طریقہ ہے۔

۴۔ بنو عوف اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جیسا کہ اب تک ادا کرتے رہے اور ہر فریق اپنے قیدیوں کی رہائی میں مہربانی اور انصاف کا معاملہ کرے گا جو مسلمانوں میں معروف ہے۔

۵۔ بنو حارث (بن خزرج) اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جیسا کہ اب تک ادا کرتے رہے اور ہر فریق اپنے قیدیوں کی رہائی انصاف اور نرمی کے اصولوں پر کرے گا۔

۶۔ بنو ساعدہ اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جیسا کہ اب تک ادا کرتے رہے اور ہر فریق اپنے قیدیوں کی رہائی کے معاملے میں اسی انصاف اور مہربانی سے کام لے گا جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

۷۔ بنو جُشم اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جس طرح اب تک

انہوں نے ادا کیا ہے اور ہر فریق قیدیوں کی رہائی نرمی اور انصاف کے مطابق کرے گا۔

۸- بنونجار اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جیسا کہ انہوں نے اب تک ادا کیا ہے، اور ہر فریق اپنے قیدیوں کی رہائی انصاف اور مہربانی کے ساتھ عمل میں لائے گا جو مسلمانوں کا ایک عام طریقہ ہے۔

۹- بنوعمرو بن عوف اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جیسا کہ اب تک انہوں نے ادا کیا ہے اور ہر فریق اپنے قیدیوں کو عدل وانصاف اور مہربانی کے ساتھ رہائی دے گا جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

۱۰- بنونبیت اپنے موجودہ رواج کے مطابق خون بہا دیں گے جیسا کہ اب تک اُنہوں نے دیا اور ہر فریق اپنے قیدیوں کی رہائی انصاف اور مہربانی کے ساتھ کرے گا جو مسلمانوں کا طریقہ ہے۔

۱۱- بنواوس اپنے موجودہ طریقے کے مطابق خون بہا ادا کریں گے جیسا کہ انہوں نے اب تک ادا کیا اور ہر فریق اپنے قیدیوں کو فدیہ پر چھوڑے گا تو مہربانی اور انصاف سے کام لے گا جو مسلمانوں میں معروف ہے۔

۱۲الف- مسلمان اپنے درمیان کسی کو قلاش نہیں چھوڑیں گے کہ ہمدردی کے ساتھ اس کا خون بہا ادا نہ کریں۔

۱۲ب- کوئی مسلمان کسی مسلمان کی جانب سے آزاد کردہ شخص کو اس کے خلاف حلیف کے طور پر اختیار نہیں کرے گا۔

۱۳- اللہ کا خوف رکھنے والے مسلمان ہر باغی کے خلاف ہوں گے اور ایسے شخص کے بھی جو مسلمانوں کے درمیان بے انصافی، گناہ، دشمنی یا بدعنوانی پھیلانے کے درپے ہو، ہر شخص اس کی مخالفت میں سرگرم عمل ہوگا، چاہے وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴- کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی خاطر کسی مسلمان کو قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مسلمان کے

خلاف کسی غیر مسلم کی مدد ہی کرے گا۔

۱۵- اللہ تعالیٰ کی حفاظت سب پر حاوی ہے۔ان میں جو سب سے کم رتبہ ہے، وہ ان کی طرف سے کسی اجنبی کو امان دے سکتا ہے۔مومن ایک دوسرے کے دوست اور محافظ ہیں،نو وارد اور اجنبی اس میں شامل نہیں ہیں۔

۱۶- یہودیوں میں سے جو ہمارا ساتھ دیں گے، ان کی مدد اور ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا، اور ان میں سے کسی شخص پر نہ تو کوئی زیادتی کی جائے گی اور نہ اس کے دشمن کی مدد ہی کی جائے گی۔

۱۷- مسلمانوں کا امن نا قابل تقسیم ہوگا۔جب مسلمان اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہوں گے تو کوئی امن قائم نہیں کیا جائے گا۔شرائط سب کے لیے عادلانہ اور مساوی ہوں گی۔

۱۸- ہر ناگہانی حملے کی صورت میں ایک سوار اپنے پیچھے ایک شخص کو ضرور لے گا۔

۱۹- مسلمان ایک دوسرے کے خون کا انتقام ضرور لیں گے جو راہِ خدا میں بہایا گیا ہوگا۔

۲۰ الف- اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والے مسلمان بہترین اور صحیح ترین طریقۂ ہدایت سے فیض یاب ہوں گے۔

۲۰ ب- کوئی مشرک قریش کے کسی فرد یا جائیداد کو اپنی نگرانی میں نہیں لے گا اور نہ کسی مسلمان کے خلاف کوئی مداخلت ہی کرے گا۔

۲۱- جس شخص پر یہ جرم ثابت ہو جائے گا کہ اس نے کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا ہے تو وہ قصاص کی ادائیگی کا پابند ہوگا، سوائے اس صورت کے، کہ [مقتول کے] قریبی اعزہ (خون بہا پر) مطمئن ہو جائیں، اور تمام مسلمان اس شخص کے خلاف ایک فرد کی طرح ہوں گے اور ان پر اس کے خلاف کارروائی کرنا لازم ہوگا۔

۲۲- کسی مسلمان کے لیے جو اس دستاویز کا پابند ہو اور اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر یقین رکھتا ہو، یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی بدکار کی مدد کرے، یا اسے پناہ دے۔اگر وہ ایسا کرے گا تو روزِ قیامت وہ اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا مستحق ہوگا، اور نہ اس کی

توبہ قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی فدیہ ہی قبول کیا جائے گا۔

۲۳- جب بھی تم کسی معاملے میں اختلاف کرو گے تو اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۴- یہودی جب تک مسلمانوں کی طرف سے لڑیں گے تو جنگ کے اخراجات میں بھی شریک ہوں گے۔

۲۵- بنوعوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی گروہ میں شامل ہیں (یہودیوں کا اپنا مذہب ہے اور مسلمانوں کا اپنا مذہب)، اسی طرح ان کے آزاد شدہ لوگ اور ان کے تمام افراد بھی سوائے ان کے جو بے انصافی اور گناہ کے مرتکب ہوں، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندانوں ہی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۲۶- بنونجار کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں۔

۲۷- بنوحارث کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں۔

۲۸- بنوساعدہ کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں۔

۲۹- بنوجُشم کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں۔

۳۰- بنواوس کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں۔

۳۱- بنوثعلبہ کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں، سوائے ان کے جو بے انصافی اور گناہ کا رویہ اختیار کریں، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندانوں ہی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۳۲- جفنہ، جو ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، انہی کی طرح ہے۔

۳۳- بنوشطیبہ کے یہودی بنوعوف کے یہودیوں کی طرح ہیں، اور نیکی ایک حفاظت ہے گناہ کے خلاف۔

۳۴- ثعلبہ کے آزاد کیے ہوئے لوگ انہی کی طرح ہوں گے۔

۳۵- یہودیوں کے قریبی دوست انہی کی طرح ہوں گے۔

۳۶ الف- ان میں سے کوئی شخص جنگ کرنے کے لیے باہر نہیں جائے گا، سوائے اس کے کہ محمد ﷺ اس کی اجازت دیں۔

۳۶ ب- لیکن اسے کسی زخم کا بدلہ لینے سے نہیں روکا جائے گا۔ جو شخص کسی کو بغیر کسی تنبیہ کے قتل کرے گا، اس نے گویا اپنے آپ کو اور اپنے گھربار کو قتل کیا، سوائے اس صورت کے کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو، کیوں کہ یہ صورت اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول ہے۔

۳۷ الف- یہودی اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک اس شخص کے خلاف دوسرے کی مدد کرے گا جو اس دستاویز سے وابستہ لوگوں پر حملہ کرتا ہے، انہیں باہمی مشاورت سے کام لینا ہوگا اور نیکی ایک تحفظ ہے گناہ کے خلاف۔

۳۷ ب- کوئی شخص اپنے حلیف کی بداعمالیوں کا ذمہ دار نہیں ہوگا، مظلوم کی مدد لازم ہوگی۔

۳۸- جب تک جنگ جاری رہے گی، مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی ادائیگی کرنا ہوگی۔

۳۹- اس دستاویز کے لوگوں کے لیے یثرب ایک مقدس اور محترم مقام ہوگا۔

۴۰- ایک اجنبی جو زیر امان ہوگا، وہ اپنے میزبان ہی کی طرح ہوگا، نہ تو کوئی نقصان پہنچائے گا اور نہ کوئی جرم کرے گا۔

۴۱- کسی خاتون کو اس کے خاندان کی رضامندی کے ساتھ ہی امان دی جائے گی۔

۴۲- اگر کوئی ایسا جھگڑا یا اختلاف رونما ہو جس سے فساد پھیلنے کا ڈر ہو تو اس معاملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس دستاویز میں اللہ تعالیٰ کو وہ چیز قبول ہے جو نیکی اور بھلائی کے زیادہ قریب ہے۔

۴۳- قریش اور ان کی مدد کرنے والوں کو امان نہ دی جائے گی۔

۴۴- معاہدہ کرنے والے تمام فریق یثرب پر حملہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہوں گے۔

۴۵ الف- اگر انہیں امن قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی دعوت دی جائے تو انہیں ایسا کرنا چاہیے، اور اگر وہ اسی قسم کا مطالبہ مسلمانوں سے کریں تو اسے ضرور پورا کیا جانا چاہیے، سوائے اس صورت کے کہ وہ اپنے دین کی خاطر کسی مبارزت میں مشغول ہوں۔

۴۵ ب- ہر شخص اپنا حصہ اس گروہ سے لے گا جس سے اس کا تعلق ہے۔

۴۶- بنواوس کے یہودی، ان کے آزاد کردہ لوگ اور وہ خود اس دستاویز کے لوگوں کے ساتھ ان ہی جیسی حیثیت رکھیں گے اور اس دستاویز کے لوگوں سے انہیں ویسی ہی وفاداری ملے گی۔ نیکی گناہ کے خلاف ایک تحفظ ہے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دستاویز سے راضی ہے۔

۴۷- یہ دستاویز ظالم اور گنہگار کو تحفظ نہیں دے گی۔ جو شخص لڑنے کے لیے جائے گا، وہ محفوظ ہے اور جو شخص شہر میں رہ کر گھر میں قیام کرتا ہے، وہ بھی محفوظ ہے، تاوقتیکہ ان میں سے کوئی ظلم اور گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نیک اور متّقی کا نگہبان ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انہیں امن عطا کرے)۔

دستاویز کا تجزیہ

ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس دستاویز کے دراصل دو حصے تھے، لہٰذا دستاویز کا تجزیہ یا اس پر بحث اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ دستاویز کے اس مواد میں جو یہودیوں کے معاملات سے متعلق ہے اور اس مواد میں جو مسلمانوں کو منظم کر کے ان کے حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے، باہم تمیز کی جائے۔

یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دستاویز کی ان شقوں پر پہلے بحث کریں جو یہودیوں سے متعلق ہیں، کیوں کہ تاریخی ترتیب میں وہ پہلے آتی ہیں، اگرچہ دستاویز کی شقوں کی ترتیب کے مطابق ان کا نمبر بعد میں آتا ہے اور مہاجرین اور انصار کے متعلق شقیں پہلے آتی ہیں۔

یہود کے ساتھ معاہدۂ امن کی دستاویز

دستاویز کی شق ۲۴ سے شق ۴۷ تک کا تعلق یہودیوں کے ساتھ معاہدۂ امن سے ہے۔ یہ ترتیب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دونوں دستاویزات کی شقیں باہم خلط ملط نہیں۔ ہر دستاویز کی شقیں ایک ترتیب کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی پیش کی گئی ہیں، تاہم شق ۱۶ جس کا تعلق یہودیوں سے ہے، اس دستاویز میں شامل کر دی گئی ہے جو مہاجرین اور انصار سے متعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ مسلمان اپنے حلیفوں، یعنی یہودیوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ روا رکھیں گے۔ اس پس منظر میں کہ اس شق کو یہودیوں کے ساتھ معاہدۂ امن کی دستاویز میں رکھنا کوئی خاص ضروری نہیں تھا۔

شق ۲۴ سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے آپ کو اس کا پابند کیا تھا کہ وہ مدینے کے دفاع کی صورت میں جنگی اخراجات میں شریک رہیں گے اور یہ کہ یہودی اس وقت تک دفاعی اخراجات میں شریک رہیں گے جب تک مسلمان حالت جنگ میں ہوں گے۔ ابو عبید قاسم بن سلام کی رائے یہ ہے کہ یہودیوں کی مالی معاونت محض دفاعی جنگوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ ان کے خیال میں یہودی مسلمانوں کے شانہ بشانہ عسکری مہمات میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: ''ہمارا خیال یہ ہے کہ یہودی مسلمانوں کے ساتھ جنگی مہمات پر جایا کرتے تھے اور اپنی اس شرکت کی بناء پر انہیں مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔ اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو وہ مسلمانوں کے مال غنیمت میں کسی حصے کے حقدار نہ ہوتے''۔ (۳۹) ابو عبید قاسم بن سلام نے یہ بھی بیان کیا ہے: ''عبدالرحمٰن بن مہدی نے ہم سے سفیان کے ذریعے بیان کیا، سفیان نے یزید بن یزید بن جابر کے ذریعے اور انہوں نے زہری سے، انہوں نے کہا کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کی ہم راہی میں مہمات پر جایا کرتے تھے اور انہیں غنیمت میں سے حصہ دیا جاتا تھا''، (۴۰) تاہم یہ زہری کی ایک ''مرسل'' روایت ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر احادیث اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مہمات میں حصہ لیا۔ (یہ ان احادیث کے علاوہ ہیں جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے):

۱- ''رسول اللہ ﷺ نے بنو قینقاع کے یہودیوں سے (جنگ میں) مدد طلب کی''۔اس حدیث کو حسن بن عمارہ نے روایت کیا، ابو یوسف (۴۱) اور بیہقی نے اس کی تخریج کی ہے۔بیہقی بیان کرتے ہیں کہ حسن بن عمارۃ ''متروک'' ہیں، (۴۲) اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ اس پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ وہ ''ضعیف'' ہیں، تاہم وہ علماء جو اپنی تنقید میں حد درجہ محتاط ہیں، ان میں سے زیادہ تر حسن بن عمارہ کو اس حد تک ''ضعیف'' قرار دیتے ہیں کہ سہیلی نے اس امر پر اجماع کا ذکر کیا ہے۔ (۴۳)

۲- ''رسول اللہ ﷺ نے کچھ یہودیوں کو جو آپ کے ساتھ قتال میں شریک تھے، غنیمت کا حصہ عطا فرمایا''۔ترمذی (۴۴) نے اس حدیث کو زہری کے حوالے سے بطور ''مرسل'' نقل کیا ہے، ان کے نزدیک اس کا درجہ ''حسن غریب'' کا ہے۔ترمذی یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ زہری کی ''مرسل'' حدیث قابل اعتماد نہیں ہے۔

۳- ''رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے ساتھ مہمات پر جایا کرتے تھے''۔(۴۵) یہ زہری کی ''مرسل'' حدیث ہے اور اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔

۴- ''رسول اللہ ﷺ کچھ یہودیوں کے ساتھ ایک مہم پر تشریف لے گئے''۔اس حدیث کو بیہقی (۴۶) نے روایت کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ ''منقطع'' حدیث ہے۔یہ بھی زہری کی ایک ''مرسل'' حدیث ہے۔

۵- ''رسول اللہ ﷺ مدینے کے دس یہودیوں کے ساتھ باہر نکلے اور انہوں نے خیبر پر حملہ کیا''۔ واقدی (۴۷) اس حدیث کے راوی ہیں، لیکن وہ ''ضعیف'' ہیں۔بیہقی (۴۸) اور زیلعی (۴۹) نے اسے ان سے روایت کیا ہے۔

۶- ''کچھ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کچھ غزوات میں حصہ لیا اور آپ نے انہیں اسی طرح مالِ غنیمت میں حصہ دیا جس طرح مسلمانوں کو دیا''۔خطیب بغدادی (۵۰) نے اسے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے، لیکن اس کی سند ''ضعیف'' ہے اور اس کے کچھ راوی درمیان سے غائب ہیں۔

پس یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام احادیث جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شرکت کی تھی، کمزور ہیں۔

کچھ ایسی احادیث بھی روایت کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں حصہ لینے سے روک دیا تھا۔ وہ احادیث یہ ہیں:

۱- ابوعبداللہ الحاکم (۵۱) نے ابوحمید الساعدی سے ایک حدیث روایت کی ہے، انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ ثنیۃ الوداع سے بھی آگے تشریف لے گئے تھے کہ آپ کو ایک گروہ ملا جو جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار تھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ ان لوگوں کا تعلق بنوقینقاع سے ہے اور یہ عبداللہ بن سلام کے لوگ ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: 'کیا یہ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں؟'، آپؐ نے فرمایا: ان لوگوں سے کہو کہ واپس چلے جائیں کہ ہمیں مشرکین کی مدد کی ضرورت نہیں ہے''۔

حاکم نے اس روایت کو ایک اور حدیث کی تائید کے طور پر پیش کیا ہے جس میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ''ہم مشرکوں کے مقابلے میں مشرکوں سے مدد طلب نہیں کرتے''۔ حاکم کہتے ہیں: ''یہ حدیث سند کے اعتبار سے 'صحیح' ہے، لیکن انہوں (بخاری اور مسلم) نے اسے روایت نہیں کیا''۔ اس حدیث کو غزوۂ احد کے حوالے سے روایت کیا گیا تھا، لیکن حاکم کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ یہ کسی ایک غزوے کے متعلق ہے، بغیر اس تخصیص کے کہ وہ کون سا غزوہ تھا۔ (۵۲) اس حدیث کو غزوۂ احد کے ساتھ مخصوص کرنا یقیناً غلط ہوگا، کیوں کہ بنوقینقاع غزوۂ احد سے ایک سال قبل جلا وطن کر دیے گئے تھے۔ بیہقی نے بھی اس حدیث کو حاکم کے ذریعہ ابوحمید الساعدی سے نقل کیا ہے۔ (۵۳)

واقدی اور ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے حلیف تھے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکوں کے خلاف مشرکوں سے معاونت مت طلب کرو''۔ (۵۴)

۲- ابن اسحٰق، (۵۵) امام سحنون (۵۶) اور ابن قیم (۵۷) نے زہری کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ احد کے دن انصار نے عرض کیا: ''ہم اپنے یہودی حلیفوں سے مدد کیوں نہیں طلب

کر لیتے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیں ان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے''۔

پہلی حدیث دوسری کسی حدیث کے مقابلے میں سند کے اعتبار سے زیادہ مستند ہے، اگرچہ اس میں سعد بن منذر شامل ہیں جو ابن حجر کے مطابق ایک ''مقبول'' راوی ہیں۔ یہ رائے زیادہ قرین قیاس ہے، کیوں کہ دستاویز میں جنگی اقدامات میں یہودیوں کی شرکت کا حوالہ موجود ہے، تاہم ان کی یہ شرکت محض ان جنگوں تک محدود ہے جو مدینے کے دفاع کے لیے لڑی جائیں۔ شق ۴۴ میں یہ وضاحت موجود ہے، ''معاہدے میں شامل تمام فریق یثرب پر حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند ہوں گے''۔

لیکن ایسا کیوں ہوا کہ کچھ یہودی مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے شہر سے باہر گئے، جیسا کہ حاکم نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت دراصل ہماری توجہ اس اتحاد کی طرف مبذول کراتی ہے جو بعثتِ اسلام سے قبل اوس، خزرج اور یہود کے درمیان موجود تھا۔ یہودی غالباً یہ چاہتے تھے کہ ماضی کے اس اتحاد کو مستحکم کریں اور اپنے پرانے حلیفوں کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط کریں، اور اس اتحاد کے ذریعے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیں، ان کی اخلاقی قوت کو کمزور کر دیں اور ان کے درمیان منافقت کا بیج بو دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا اور ان سے اس وقت تک کسی بھی قسم کی مدد لینے سے انکار کر دیا جب تک وہ کفر پر قائم ہیں۔ انصار نے احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے جو بات کہی، اس سے بھی یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اوس، خزرج اور یہودیوں میں اپنے اس قدیم اتحاد کا اثر ابھی موجود تھا۔ انصار نے کہا تھا کہ ''ہم اپنے یہودی حلیفوں سے مدد کیوں نہیں طلب کرتے''۔ اس بات کی تصدیق عبداللہ بن ابی بن سلول کی مداخلت سے بھی ہو جاتی ہے جو منافقوں کا سردار تھا۔ اس کی یہ مداخلت بنوقینقاع کی پشت پناہی کے لیے تھی جو اس کے قبیلے، یعنی خزرج کے حلیف تھے۔ اس بات کی تصدیق اس کوشش سے بھی ہوتی ہے جو اوس کے کچھ لوگوں نے اپنے حلیف بنوقریظہ کو موت سے بچانے کے لیے کی، حالانکہ وہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ قبول کر چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کو قاضی مقرر کیا تھا اور انہوں نے بنوقریظہ کے ان یہودیوں کو

سزائے موت دے دی تھی۔ ایسا کر کے حضرت سعدؓ نے اس اتحاد کو بالکل اسی طرح ختم کر دیا تھا جس طرح حضرت عبادہؓ بن صامت (خزرج کی ایک شاخ بنوعوف سے تعلق رکھتے تھے) نے ان سے پہلے اس وقت کیا تھا، جب بنوقینقاع نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کی تھی۔

دستاویز کی شقیں ۲۵-۳۵ اوس اور خزرج کے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات کو متعین کرتی ہیں جو یہودی تھے۔ ان شقوں میں ان لوگوں کی قبائلی اور عربی شناخت کے حوالے سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اتحاد کی تصدیق کی گئی ہے: ''بنوعوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک گروہ ہیں''، لیکن کتاب الاموال کی عبارت ہے: ''امة من المؤمنین (مومنوں کا ایک گروہ)''۔ اسی بناء پر ابوعبید کہتے ہیں: ''ان کا اشارہ مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف یہودیوں کی مدد کی طرف ہے، یہ ایک شرط تھی جو یہودیوں پر عائد کی گئی تھی''، لیکن یہودیوں کو مسلمانوں کے دین (یعنی اسلام) سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسی حقیقت کو واضح نہیں فرما دیا تھا جب آپ نے فرمایا تھا کہ ''یہودیوں کا اپنا مذہب ہے اور مسلمانوں کا اپنا''۔ (۵۸) ابن اسحٰق نے ''مع المومنین (مسلمانوں کے ساتھ)'' کے الفاظ نقل کیے ہیں جو زیادہ قابل اعتماد ہیں، غالباً کتاب الاموال میں یہ جملہ تبدیل ہو گیا ہے۔

شق ۲۵ یہودیوں کو اپنی عبادت کی آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور جرائم کی ذمہ داری کو صرف اسی فرد تک محدود کرتی ہے جس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے (سوائے ان لوگوں کے جو ظلم اور گناہ کا ارتکاب کریں، کیوں کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان ہی کو نقصان پہنچاتے ہیں)۔ مجرم کو سزا ملے گی اور اگر وہ اس قبیلے کا فرد ہے جو اس معاہدے میں شریک ہے تو ''یہ معاہدہ ظالم اور گنہگار کو تحفظ نہیں دے گا''۔

شق ۴۵ یہودیوں کو اس بات کی ممانعت کرتی ہے کہ وہ قریش کی مدد کریں یا ان کو تحفظ دیں۔ رسول اللہ ﷺ قریش کے تجارتی قافلے کا راستہ روکنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے جو شام جاتے ہوئے مدینے کی مغربی سمت سے گزرتا تھا، اس لیے یہ وعدہ لینا ضروری تھا، تاکہ یہودی قریش کے تجارتی قافلے کو تحفظ دینے کی کوشش نہ کریں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی

نزاع نہ پیدا ہونے پائے۔ شق ۳۶-الف یہودیوں کو مدینہ چھوڑنے سے روکتی ہے، تاوقتیکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت نہ لے لیں۔ یہودیوں کی نقل وحرکت پر پابندی اس بناء پر لگائی گئی ہوگی کہ وہ کسی جنگی سرگرمی میں حصہ نہ لیں اور بیرونِ مدینہ کسی قبائلی جنگ میں شریک ہو کر شہر کے تحفظ اور اس کی اقتصادیات پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔ شق ۴۲ کی رو سے یہودیوں نے قانون سازی کے لیے ایک ایسی برتر شخصیت کے اختیار کو تسلیم کیا جس کی عزت ووقعت یہودیوں سمیت مدینے کے تمام شہریوں میں مسلّم تھی۔ یہودی اس کے پابند نہیں تھے کہ ہر معاملے میں شریعت اسلامی کی طرف رجوع کریں، بلکہ محض اس معاملے یا تنازع میں رجوع کے پابند تھے جو ان کے اور مسلمانوں کے مابین ہوتا۔ اپنے تمام ذاتی معاملات میں وہ تورات سے رہنمائی لیتے تھے اور ان کے ربّی ان کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو رسول اللہ ﷺ کو اپنے معاملات میں قاضی مقرر کر سکتے تھے۔ قرآنی آیت کی رو سے رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ آپؐ اگر چاہیں تو ان کے معاملات میں قاضی بننا قبول کریں اور اگر چاہیں تو انہیں ان کے علماء (ربّیون) کے پاس واپس بھیج دیں: ''تو اگر یہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو خواہ آپ ان میں فیصلہ کر دیجیے یا ان کو ٹال دیجیے اور اگر آپ ان کو ٹال ہی دیں تو ان کی مجال نہیں کہ آپ کو ذرا بھی ضرر پہنچا سکیں اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان کے مابین عدل کے مطابق فیصلہ کیجیے۔ بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے'' (المائدہ،۵: ۴۲)۔(۵۹)

بلاشبہ، یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کو بعد میں اپنا قاضی بنا لیا، مگر یہ وہ زمانہ تھا جب وہ خود کمزور پڑ چکے تھے اور سورۃ المائدہ بھی اسی دور میں نازل ہوئی تھی۔

شق ۴۶ میں معاہدے کو وسعت دی گئی ہے اور مسلمانوں اور یہودیوں کے تمام حلیفوں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس شق کی رو سے ہر فریق اس بات کا پابند تھا کہ وہ دوسرے فریقوں کے حلیفوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے، لیکن مسلمانوں نے اس معاملے میں قریش کو مستثنیٰ قرار دیا تھا، کیوں کہ وہ ان کے خلاف حالتِ جنگ میں تھے۔

شق ۳۹ کی رو سے مدینے کے علاقے کو جنگ سے محفوظ پناہ گاہ قرار دیا گیا

ہے: ''اس دستاویز کے لوگوں کے لیے یثرب ایک مقدس اور محترم مقام ہوگا''، یعنی یثرب کے تقدس کو پامال نہیں کیا جائے گا، یہاں جانوروں کا شکار نہیں کیا جائے گا اور یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں گے۔ مدینہ ایک مقدس مقام ہے جو مشرقی حرہ سے مغربی حرہ تک اور شمال میں جبل ثور سے لے کر جنوب میں جبل عیر تک مقدس گردانا جائے گا۔ وادی العقیق بھی اس میں شامل ہے۔ (۶۰) اس شق کے ذریعے مدینہ شہر کے اندرونی تحفظ کو یقینی بنایا گیا اور ہر قسم کی داخلی جنگ کی روک تھام کی گئی۔

مہاجرین اور انصار کے مابین معاہدے کی دستاویز

مہاجرین اور انصار کے مابین جو دستاویز لکھی گئی، اس کے آغاز میں معاہدہ کرنے والے فریقوں کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''قریش اور یثرب کے مسلمان اور مومن اور وہ تمام لوگ جنہوں نے ان کی پیروی کی، ان کے ساتھ مل گئے اور ان کے ساتھ جدوجہد کی''۔ مسلم اور مومن کے درمیان فرق صاف ظاہر ہے، سب جانتے ہیں کہ مومن وہ شخص ہے جو ایمان لاتا ہے اور اپنے ایمان کی تصدیق اپنی زبان سے کرتا ہے اور دل سے اس پر یقین رکھتا ہے۔ مسلمان وہ ہے جو شریعتِ اسلامی کی پابندی کرتا ہے اور فرض عبادت بجا لاتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ یثرب میں اس وقت زیادہ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئے، جب غزوۂ بدر کے بعد منافقوں کا ظہور ہوا۔ مہاجروں میں کوئی مسلمان ایسا نہیں تھا جو مومن نہ ہو، یعنی دل سے نہ مانتا ہو۔

شق ۲ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ''تمام انسانوں سے الگ وہ ایک گروہ ہوں گے''، ایک ایسا گروہ جس کے تمام افراد خون کے رشتے کے بجائے ایمان کے رشتے میں منسلک ہوں گے، تاکہ وہ اپنے احساسات، خیالات، مقاصد اور نصب العین میں متفق اور متحد رہیں۔ ان کی وفاداری اپنے قبیلے کے ساتھ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگی۔ ان کے فیصلے رسم و رواج کے مطابق نہیں، بلکہ شریعت کے مطابق کیے جائیں گے۔ ان تمام معاملات میں وہ دنیا کے تمام لوگوں سے مختلف ہوں گے (''تمام انسانوں سے الگ'')۔ یہ رشتے صرف مسلمانوں تک ہی محدود ہوں گے اور ان میں کوئی اور، جیسے یہودی اور ان کے حلیف شامل نہیں ہوسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دینی گروہ کو اس لیے ممتاز کیا گیا تھا کہ اس کی یک جہتی اور دینی حمیت میں اضافہ ہو۔ اس چیز کو زیادہ واضح کرنے کے لیے قبلہ تبدیل کیا گیا۔ ۱۶ یا ۱۷ ماہ تک (۶۱) بیت المقدس (یروشلم) مسلمانوں کا قبلہ تھا، اس کی جگہ مسلمانوں کا رخ خانۂ کعبہ کی طرف موڑ دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے متبعین کا امتیاز برقرار رکھنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار فرماتے رہے اور ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی فرماتے رہے کہ آپ کا مقصد مسلمانوں کو یہودیوں سے الگ تھلگ رکھنا ہے۔ مثال کے طور پر، یہودی جوتے پہن کر نماز نہیں پڑھتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو جوتے پہن کر نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہودی اپنے سفید بالوں کو نہیں رنگتے تھے، لیکن مسلمانوں نے اپنے بال رنگنا شروع کر دیے۔ وہ اس مقصد کے لیے مہندی کا استعمال کرتے تھے، اور ایک جڑی بوٹی سے بھی اپنے بالوں کو کالا کرتے تھے۔ اس جڑی بوٹی کو "کتم" کہا جاتا تھا۔ یہودی عاشورے (دس محرم) کے دن روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس دن روزہ رکھا۔ اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں حضور ﷺ کا ارادہ تھا کہ آپ ۹ محرم کو بھی روزہ رکھیں گے تا کہ یہودیوں سے مختلف ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ اصول مقرر فرمایا تھا کہ مسلمان غیر مسلموں سے مختلف نظر آئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص جس کسی کی نقل کرے گا، وہ انہی میں سے ہوگا"۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ "یہودیوں کی نقل مت کرو"۔ اس موضوع پر بے شمار احادیث ہیں جن کا مفہوم یہی ہے کہ مسلمان غیر مسلموں سے مختلف اور برتر حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہم دوسروں کی نقل کرتے ہیں تو اس سے ہماری عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور ہمیں جو برتری غیر مسلموں پر حاصل ہے، اسے بھی ٹھیس لگتی ہے۔ (۶۲) یہ امتیاز اور برتری مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کسی رکاوٹ کا سبب نہیں بنتی، بلکہ اسلامی معاشرہ دنیا کے ہر انسان کے لیے کھلا ہے اور اپنے اندر بہت زیادہ وسعت لیے ہوئے ہے۔ کوئی بھی شخص اسلام کے نظریۂ حیات کو قبول کر کے اس کے دائرے میں شامل ہو سکتا ہے۔

۳ تا ۱۱ شقیں قبائل اور برادریوں سے متعلق ہیں۔ مہاجرین کو اپنی قلتِ تعداد کی وجہ سے ایک گروہ تصور کیا گیا ہے، لیکن انصار کا ذکر قبائل کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ قبائل کا ذکر

کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قبائلی تعلق کو اہمیت دی گئی ہے، یا اسے لوگوں کے مابین مضبوط ترین رشتہ سمجھا گیا ہے، یا قبائلی بنیاد پر اتحاد اور یک جہتی کو تازہ کیا گیا ہے۔ اسلام میں اس تصور کی قطعی طور پر ممانعت کی گئی ہے: ''جو شخص عصبیت کی تائید وحمایت کرے گا، وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ اسلام نے قبائلی تعلق سے صرف اس حد تک فائدہ اٹھایا ہے کہ اس کی مدد سے معاشرتی تحفظ کا ایک نظام قائم کیا جائے۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو متحد اور مجتمع رکھنے کے لیے ایمان کو مضبوط ترین بنیاد قرار دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے تمام دیگر انسانی تعلقات کو بھی تسلیم کیا ہے، اور انہیں ایمان سے نچلے درجے میں جگہ دی ہے۔ یہ تعلقات ایک نظامِ تحفظ قائم کرنے میں معاشرے کے مدد اور معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسلام نے جن رشتوں کو تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں:

- ایک خاندان کے افراد کے درمیان مخصوص رشتے: ماں باپ، اولاد، اور ایک برادری کے تمام ارکان کے حقوق وفرائض، جن میں ان سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایک دوسرے کا فدیہ ادا کریں، جنگی قیدیوں کو رہا کرائیں اور اپنے درمیان کسی بھی مسکین اور محتاج کی مشترکہ مدد کریں۔
- ایک علاقے کے مکینوں کے درمیان خصوصی تعلقات: (جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے) ''جبریل علیہ السلام مجھے میرے ہمسائے کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ غالباً وہ اس کو وراثت میں بھی شریک کریں گے''۔
- ایک گاؤں کے رہنے والوں کے درمیان خصوصی تعلقات: ''اگر کسی علاقے میں ایک شخص بھوکا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت اس علاقے کے لوگوں کے اوپر سے اٹھالی جاتی ہے''۔
- ایک شہر میں مقیم افراد کے مابین خصوصی تعلقات: ''کسی شہر کے لوگوں کی زکوٰۃ اس وقت تک شہر سے باہر نہیں جانا چاہیے، جب تک اس شہر کے لوگوں کی تمام ضروریات پوری نہ ہو جائیں''۔

اس طرح اسلام نے ہر معاشرتی اکائی کے اوپر یہ ذمہ داری عائد کر دی کہ وہ اپنے سماجی تحفظ کا اہتمام خود کرے۔ تحفظ کے اس نظام کے ذریعے اسلام نے معاشرتی ذمہ داریوں

کے ایک بہت بڑے خلا کو پر کر دیا۔ آخر میں اسلام نے ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ اب وہ اس باقی ماندہ خلا کو پر کرے، جو فرد کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا نظام قائم ہونے سے ریاست کے کندھوں سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر جاتا ہے جو آج کل جدید ریاستوں میں ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔

قبائلی تعلقات کو تسلیم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان تعلقات کے ذریعے سماجی تحفظ کا ایک نظام قائم کیا جائے۔ اس سے نہ تو قبائلی یک جہتی مقصود تھی اور نہ کسی قسم کے ظلم وزیادتی میں تعاون پیش نظر تھا، بلکہ اسلام نے قبائلی تعلقات کے دھارے کو ایک نیا رخ دیا اور اس سے ریاست کے عظیم تر مقاصد کے حصول میں پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

سماجی تحفظ کے اس نظام نے قبیلے کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے ارکان کی مدد کرے۔ اگر قبیلے کے کسی فرد نے حادثاتی طور پر کسی کو قتل کر دیا تو قبیلے کے تمام افراد کی یہ مشترکہ ذمہ داری تھی کہ وہ خون بہا ادا کریں۔ یہ دستور زمانۂ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا اور اس دستاویز میں باہمی تعاون کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا، اس کے ذریعے اس قدیم دستور پر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی: ''اپنے مروجہ دستور کے مطابق وہ خون بہا ادا کریں گے، جیسا کہ اب تک ادا کرتے رہے ہیں''۔ یہ شق خون بہا کی ادائیگی کے بارے میں ان کے رواج کے مطابق ہے۔ (۶۳) اسی طرح قبیلے کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اگر اس کا کوئی فرد جنگی قیدی بنا لیا جائے تو وہ اس کے لیے فدیہ کی رقم ادا کرے: ''وہ اپنے قیدیوں کو نرمی اور مہربانی کے ساتھ رہا کرائیں گے'' (شق ۳)۔ اس دستاویز میں اجتماعی ذمہ داری پر زور دیا گیا، اور تمام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ مدینے کے معاشرے میں عدل اور امن قائم کریں۔ یہ بات اس وجہ سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پولیس جیسی کوئی ایسی تنظیم قائم نہیں کی تھی جو قانون شکنی کرنے والوں کا تعاقب کرے اور انہیں سزا دے۔

جرائم کی سزائیں تو اللہ تعالیٰ کے دربار سے منظور شدہ ہیں۔ ان سزاؤں کو نافذ کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ اس سے قوانین کو تقدس اور استحکام حاصل ہوتا ہے اور یہ امکان بھی

باقی نہیں رہتا کہ لوگ ان قوانین کو للکارنے یا توڑنے کی جرأت کریں گے، جیسا کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے ساتھ ہوتا ہے۔ دستاویز میں مسلمانوں کے کردار پر جو زور دیا گیا ہے، وہ دستاویز کی بالترتیب شق ۱۳ اور ۲۱ سے بخوبی واضح ہے۔ شق ۱۳ کے مطابق: ''وہ مسلمان جو خدا کا خوف رکھتے ہیں، باغی کے خلاف ہوں گے اور اس شخص کے بھی جو ظلم، گناہ اور دشمنی کی اشاعت کرے اور مسلمانوں کے درمیان انتشار کا باعث بنے، ہر شخص اس کے خلاف کمر بستہ ہوگا، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو''۔ اس شق کے ذریعے مسلمانوں پر یہ اعتماد کیا گیا ہے کہ وہ سرکشوں، ظالموں، مجرموں اور رشوت خوروں کا قلع قمع کریں گے۔ ''ظلم کی اشاعت کرنے'' سے مراد یہ ہے کہ کسی کا ایسی چیز کا مطالبہ کرنا جسے اس کا حق حاصل نہ ہو۔ (۶۴) اللہ کا خوف رکھنے والے مسلمانوں (متقین) کو خاص طور پر اس لیے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ نفاذ شریعت کے معاملے میں وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ جواب دہ ہوں گے، کیوں کہ اولاً ان کا ایمان زیادہ کامل ہے، اور ثانیاً ہوسکتا ہے کہ کمزور ایمان والے گناہ کا ارتکاب کر کے مقررہ حد پار کر جائیں تو انہیں ایسا کرنے سے روکا جا سکے۔ (۶۵)

شق ۲۱ کے مطابق: ''جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے گا وہ بدلہ دینے کا پابند ہو گا''۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معقول سبب کے بغیر قتل کرتا ہے تو قصاص میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، سوائے اس صورت کے کہ مقتول کا خاندان ''قصاص'' کے بجائے خون بہا کی رقم (دیت) لینے پر آمادہ ہو، یا قاتل کو معاف کر دے۔ (۶۶) چاہے مقتول کا خاندان ''قصاص'' لینا پسند کرے، یا ''دیت''، بہر صورت تمام مسلمانوں اور قاتل کے افرادِ خاندان کی یہ ذمہ داری ہے کہ قاتل کے بارے میں جو فیصلہ بھی کیا گیا ہے، اس پر عمل درآمد میں بھرپور تعاون کریں۔ کوئی شخص قاتل کو کسی قسم کا تحفظ فراہم نہ کرے، چاہے وہ قاتل کا کتنا ہی قریبی عزیز اور دوست کیوں نہ ہو۔ ''کسی مومن کے لیے، جو اس دستاویز کا پابند ہے اور اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر یقین رکھتا ہے، یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مجرم کی مدد کرے، یا اسے پناہ دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کا غصہ اور اس کی لعنت اس پر نازل ہوگی اور اس سے کوئی بدلہ یا معافی

قبول نہیں کی جائے گی''۔ مجرم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کو پامال کرے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مجرم کو سزا سے بچانے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی مجرم کو پناہ دے گا تو پناہ دینے والے پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی، اللہ اس شخص کی توبہ قبول نہیں کرے گا جس نے مجرم کی مدد کی اور نہ اس سے کسی قسم کا فدیہ ہی قبول کیا جائے گا۔ (۶۷)

مسلمانوں کے درمیان سماجی تحفظ کا جو یہ نظام قائم کیا گیا، اس کا مسلمانوں سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ''مفرح''، (یعنی جو بہت زیادہ مقروض ہے) کی مدد کریں۔ (۶۸) اگر وہ جنگی قیدی ہے تو انہیں فدیے کی شکل میں اس کی مدد کرنا چاہیے۔ اگر اس نے حادثاتی طور پر کسی کو قتل کر دیا ہے تو انہیں اس کی طرف سے خون بہا کی رقم ادا کرنا چاہیے جیسا کہ شق ۱۲ میں واضح کیا گیا ہے۔ ابن سعد یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ''مفرح''، یعنی ضرورت مند وہ افراد ہیں جو لوگوں کے درمیان رہتے ہیں، مگر ان کا کوئی سرپرست (مولیٰ) نہیں ہے۔ (۶۹) یہ بات تو واضح ہے کہ مدد خواہ خون بہا کے سلسلے میں ہو، یا کسی اور معاملے میں، بہر حال اس کا دارومدار صاحبِ معاملہ کے خصوصی تعلقات (ولاء) پر ہوگا۔ اگر کوئی شخص ایسا ہے جس کا کوئی قبیلہ یا سرپرست نہیں ہے تو تمام مسلمان اس کے سرپرست قرار پائیں گے اور اس کی مدد کرنے کے پابند ہوں گے۔ اگر اس سے کوئی جرم سرزد ہوگیا ہے تو اس کی طرف سے بیت المال سے رقم ادا کی جائے گی، کیوں کہ اس کا کوئی قبیلہ نہیں ہے جو اس کی مدد کر سکے۔ (۷۰)

شق ۱۲-ب اتحاد کے اصول کی توثیق کرتی ہے، لیکن یہ اصول صاحب معاملہ کے حقوق سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا جو ایک آقا کو اپنے آزاد کردہ غلام پر حاصل ہوتے ہیں۔ کسی شخص کو ان غلاموں کے ساتھ اس وقت تک اتحاد کرنے کی اجازت نہیں ہے، جب تک ان کے سابق آقاؤں سے اس کی اجازت نہ لے لی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے قدیم حلیفانہ تعلقات اور اتحادوں کو برقرار رکھا ہے، لیکن کوئی نیا اتحاد قائم کرنے سے روکا ہے۔ اس حدیث کا مضمون یہ ہے: ''جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جاہلیت میں جتنے بھی

حلیفانہ تعلقات قائم کیے گئے تھے، اسلام انہیں مستحکم کرے گا، لیکن اسلام کے اندر کسی نئے اتحاد کی گنجائش نہیں ہے"۔(۷۱)

شق ۱۴ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں سے برتر ہیں۔ "مسلمان کسی غیر مسلم کے بدلے میں کسی مسلمان کو قتل نہ کرے گا، اور نہ وہ کسی مسلمان کے مقابلے میں کسی غیر مسلم کی مدد ہی کرے گا"۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلم کا خون مسلمان کے برابر نہیں ہے۔ اس سے مسلمانوں کے آپس میں قریبی تعلقات اور دوستی کی تائید ہوتی ہے اور اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ گہرے تعلقات اور دوستیاں قائم کریں۔

شق ۱۷ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ "مسلمانوں کا امن ناقابل تقسیم ہے۔ جب مسلمان راہ خدا میں لڑ رہے ہوں تو ان سے علیحدہ ہو کر کوئی امن قائم نہیں کیا جا سکتا۔ امن کی شرائط تمام لوگوں کے لیے عادلانہ اور مساوی ہونا چاہییں"۔ اعلانِ جنگ اور قیامِ امن کی ذمہ داری رسول اللہ ﷺ پر عائد ہوتی ہے، عام مسلمانوں پر نہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ جنگ کا اعلان کر دیں گے تو تمام مسلمان دشمن کے ساتھ حالت جنگ میں ہوں گے اور ان میں سے کسی کو بھی دشمن کے ساتھ امن قائم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر مسلمان اس حکمت عملی کا پابند ہے جو تمام مسلمانوں نے اختیار کی ہے۔(۷۲) جنگ کا بوجھ کسی ایک قبیلے پر نہ ڈالا جائے گا، "جہاد" تمام مسلمانوں پر فرض ہے، وہ سب باری باری اس میں حصہ لیں گے۔(۷۳) "ہر حملے کے موقع پر ایک سوار اپنے پیچھے دوسرے کو بٹھائے گا" (شق ۱۸)۔

شق ۱۵ امان (جوار) کے متعلق ان اصولوں کی تصدیق کرتی ہے جو جاہلیت میں رائج تھے اور ہر مسلمان کو امان دینے کا حق دیتی ہے۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہو گی کہ وہ اپنی عطا کردہ امان کی خلاف ورزی کرے۔ اس شق کے ذریعے مسلمانوں کی جگری دوستی کو مسلمانوں ہی تک محدود رکھا گیا ہے، کیوں کہ جگری دوستی کے ساتھ محبت اور تعاون وابستہ ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کو کسی غیر مسلم کا جگری دوست نہ ہونا چاہیے۔ "مومن ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ ہیں"۔

اے ایمان والو! تم یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بنانا۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا، بے شک وہ انہی میں سے ہو گا'' (المائدہ ۵:۵۱)۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ کفار کو (ظاہراً یا باطناً) دوست نہ بنائیں۔۔۔(آل عمران ۳:۲۸)

لیکن شق ۲۱ کے ذریعے اوس اور خزرج کے مشرکین کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ قریش اور ان کے تجارتی قافلے کو امان دینے کی کوشش کریں، یا مسلمانوں کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کریں کہ وہ قریش کا تجارتی قافلہ نہ روکنے پائیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ قریش کے تجارتی قافلے کو راستے میں روکنے کی حکمت عملی اختیار کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ یقیناً اوس اور خزرج کے مسلمانوں کی، جو اپنے اپنے قبائل میں اکثریت رکھتے تھے، ذمہ داری تھی کہ یہ فیصلہ اپنے قبائل کے مشرکین پر نافذ کریں۔ یہودی یہ ذمہ داری، پہلے ہی اس وقت اٹھا چکے تھے جب ان کے ساتھ امن کا معاہدہ طے پایا تھا۔ اس شق کے اعادے سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ یہ دستاویز دراصل دو حصوں پر مشتمل ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان ہونے والے اتحاد کی یہ دستاویز یہودیوں کے ساتھ مہربانی اور انصاف کے ساتھ پیش آنے کا ذکر کرے، کیوں کہ یہودی مسلمانوں کے حلیف تھے۔ دستاویز میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ مسلمان نہ تو ایک دوسرے کو یہودیوں کے خلاف بھڑکائیں گے اور نہ یہودیوں کو کوئی نقصان ہی پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس حقیقت کے باوجود شاملِ دستاویز کی گئیں کہ جب یہ دفعات قلم بند کی جا رہی تھیں تو یہودی اس موقع پر وہاں موجود نہیں تھے۔ اس مثال سے اسلام کے اصولِ سیاست میں اخلاق کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں کسی دھوکے، فریب اور پسِ پشت دشمنی کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے (شق ۱۶)۔

دستاویز کے اختتام پر شق ۲۳ اس امر پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ مدینے کے مسلمانوں کے درمیان کسی بھی قسم کا اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں صرف اور صرف رسول

اللہ ﷺ ہی کی ذاتِ اقدس کی طرف رجوع کیا جا سکے گا: "جب بھی تمہارے درمیان کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کی طرف رجوع کرو"۔

حواشی

۱۔ دستور کے متعلق درج ذیل تحریریں سامنے آئی ہیں:

- ڈاکٹر صالح احمد العلی کا مقالہ، تنظیمات الرسول الاداریة فی المدینة
- ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری کی کتاب، النظم الاسلامیة
- Sarjeant, The Constitution of Madina, Islamic Quarterly, Vol. VIII(1964): 3-16

اس موضوع پر اور لوگوں نے بھی قلم اٹھایا ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے مجموعة الوثائق السیاسیة میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ یہ پروفیسر یوسف العش کی رائے ہے جو انہوں نے الدولة العربیة و سقوطها کے ایک حاشیے میں دی ہے۔ اصل کتاب ولہاوزن کی تصنیف ہے اور العش نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ص ۲۰، حاشیہ ۴

۳۔ ابن ہشام، السیرة، ۱:۵۰۱-۵۰۴

۴۔ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۱۹۷-۱۹۸

۵۔ ابن کثیر، البدایة، ۳:۲۲۴-۲۲۶

۶۔ السنن الکبری، کتاب الدیت، ۸:۱۰۶

۷۔ یہ الحافظ الحجۃ الامام احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب النسائی (م ۲۷۹ھ) ہیں۔ ان کی اس تاریخ کی تیسری جلد ہم تک پہنچی ہے۔ دیکھیے: اکرم العمری، بحوث فی تاریخ السنن المشرفة، ص ۸۷-۹۰

۸۔ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱:۱۹۸

۹۔ حمید بن زنجویہ (م ۲۴۷ھ) نے اسے عبداللہ بن صالح سے ایسی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے جو ابو عبید کی اسنادِ روایت سے ملتی جلتی ہے (دیکھیے: کتاب الاموال، مؤلفہ ابن زنجویہ، نظر ثانی از ڈاکٹر شاکر ذیب فیاض، حاشیہ ۷۵۰)۔

۱۰- ابن حبان کی عبارت کے لیے دیکھیے: تهذیب التهذیب، ۸: ۴۲۲

۱۱- یوسف العش، الدولة العربية و سقوطها، ص ۲۰، حاشیہ ۹

۱۲- بلاذری، انساب، ۱: ۲۸۱، ۳۰۸؛ طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۴۷۹؛ مقدسی، کتاب البدء والتاریخ، ۴: ۱۷۹؛ ابن حزم، جوامع السیرۃ، ۹۵؛ مقریزی، امتاع الاسماع، ۱: ۴۹

ابن کثیر (البدایۃ، ۴: ۱۰۳-۱۰۴) موسیٰ بن عقبہ سے نقل کرتے ہیں۔ ان کی روایت یہ ہے کہ بنو قریظہ نے اس کاغذ کو چاک کر دیا تھا جس پر معاہدہ لکھا گیا تھا۔ اس روایت کو بغیر اسناد کے نقل کیا گیا ہے، لیکن جب تمام روایات کو یکجا کیا جائے تو وہ ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں اور اس روایت کو حسن لغیرہ کے مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔

۱۳- ڈاکٹر صالح العلی، تنظیمات الرسول الاداریة فی المدینة، ص ۴-۵۔ اختلافِ اسالیب کے لیے رجوع کیجیے: مجموعة الوثائق السیاسیة

۱۴- ڈاکٹر صالح العلی کا خیال ہے کہ یہ دستاویز غزوۂ بدر کے بعد بھی لکھی گئی تھی۔ تنظیمات الرسول الاداریة فی المدینة، ص ۶

۱۵- الاموال، نمبر ۵۱۸

۱۶- بلاذری، انساب، ۱: ۲۸۶

۱۷- دیکھیے: طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۴۰۲۔ واقدی سے مروی ہے۔ ابن اسحٰق یہ رائے رکھتے ہیں کہ سریۂ عبیدہ بن حارث، سریۂ حمزہ سے پہلے پیش آیا تھا۔ وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں سرایا تقریباً ایک ہی زمانے میں پیش آئے اور یہ ربیع الاول ۲ھ کا زمانہ ہے۔ طبری اور ابن اسحٰق دونوں اصحاب اس امر پر متفق ہیں کہ اولین سرایا جو شہر سے باہر بھیجے گئے تھے، وہ غزوۂ بدر سے پہلے کے تھے۔ اس تحقیق کا یہی اہم نکتہ ہے (دیکھیے: ابن ہشام، سیرۃ، ۱: ۵۹۵)۔

۱۸- بلاذری، انساب، ۱: ۳۰۸

۱۹- حاکم، المستدرک، ۲: ۴۸۳، کتاب التفسیر

۲۰- عبدالرزاق، المصنف، ۵: ۳۵۷

۲۱- بیہقی، دلائل النبوۃ، ۳: ۴۴۶-۴۵۰؛ ابونعیم، دلائل النبوۃ، ۳: ۱۷۶-۱۷۷

۲۲- ابن ہشام، السیرۃ، ۲: ۶۸۳؛ بخاری، صحیح، ۳: ۱۱

۲۳- واقدی، المغازی، ۱: ۳۶۳؛ ابن سعد، طبقات، ۳: ۵۷

۲۴- السیرۃ، ۳: ۶۸۳

۲۵- بخاری، صحیح، ۹: ۱۴؛ ترمذی، صحیح، ۶: ۱۸۲؛ ابن ماجہ، سنن، ۲: ۸۸۷؛ احمد، المسند، ۱: ۷۹

۲۶- احمد، المسند، ۱: ۱۱۹، ۱۲۲

۲۷- بخاری، صحیح، ۱: ۲۹۶

۲۸- بخاری، صحیح، ۲: ۲۹۶؛ ابن ماجہ، سنن، ۲: ۸۸۷

۳۰- احمد، المسند، ۱: ۱۹

احمد نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے والد سے اور اپنے دادا سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ دیا کہ کسی کافر کے قصاص میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کرنا چاہیے (مسند، ۲: ۱۸۷)۔ اس حدیث کے دیگر سلسلہ ہائے اسناد کے لیے دیکھیے: ابن ماجہ، سنن، ۲: ۸۸۷؛ بخاری، صحیح، ۹: ۱۴، ۱۶ اور صحیح ترمذی، شرح ابن العربی، ۶: ۱۸۲

۳۱- بخاری، صحیح، ۹: ۱۴؛ احمد، مسند، ۱: ۷۹، مزید دیکھیے: شوکانی، نیل الاوطار، ۷: ۱۰

۳۲- احمد، المسند، ۱: ۱۱۹۔ مزید دیکھیے: ۴: ۲۷ مزید براں صحیح مسلم مع شرح نووی (۹: ۱۳۶) میں جابر کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں مدینے کے دونوں پہاڑوں کے درمیانی علاقے کو حرم قرار دیتا ہوں، کوئی شخص نہ تو اس علاقے کی کوئی جھاڑی کاٹے گا اور نہ یہاں جنگلی جانوروں کا شکار ہی کرے گا---'' اموی دور کے آغاز تک، لوگوں کے پاس ایک دستاویز موجود تھی جو کھال پر تحریر شدہ تھی اور اس دستاویز میں رسول اللہ ﷺ نے مدینے کی حرمت بیان فرمائی تھی (احمد، المسند، ۴: ۲۷؛ خطیب بغدادی، تقیید العلم، ص ۷۲)

۳۳- شوکانی، نیل الاوطار، ۷: ۶۱۔ مزید دیکھیے: محمد حمید اللہ، مجموعة الوثائق السیاسیة، ص ۱۸۶، جس میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ یہ اقتباس رسول اللہ ﷺ کے اس نامۂ مبارک سے لیا گیا تھا جو آپ ﷺ نے عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت تحریر فرمایا تھا۔

۳۴- شوکانی، نیل الاوطار، ۷: ۱۰

۳۵- یہ سارجنٹ کا خیال ہے جو انہوں نے اپنے مقالے The Constitution of Madinah میں پیش کیا ہے۔

۳۶- ابن کثیر، البدایة، ۳: ۲۲۴۔ ان کا کہنا ہے کہ امام احمد، بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے۔

۳۷- احمد، المسند، ۱: ۲۷۱، ۲: ۲۰۴۔ ابن کثیر (احمد سے روایت کرتے ہیں)، البدایة، ۲: ۲۲۴

۳۸- مجموعة الوثائق السياسية ،ص ۴۱-۴۷

۳۹- ابوعبید، الاموال،ص ۲۹۶

۴۰- ایضاً

۴۱- ابو یوسف، الرد علی سیر الاوزاعی،ص ۴۰

۴۲- بیہقی ، سنن،۹:۵۳

۴۳- ابن حجر،تہذیب،۲:۳۰۴-۳۰۸

۴۴- ترمذی،سنن، ۷:۴۹

۴۵- زیلعی ،نصب الرایۃ،۳:۴۲۲

۴۶- بیہقی ، سنن،۹:۵۳

۴۷- واقدی، کتاب المغازی ،۲:۲۸۴

۴۸- بیہقی ، سنن،۹:۵۳۔ان کا بیان ہے کہ یہ ''منقطع'' ہے اوراس کی سند''ضعیف'' ہے۔

۴۹- الزیلعی ، نصب الرایۃ،۳:۴۲۲

۵۰- تاریخ بغداد، ۴:۱۶۰۔خطیب بغدادی کا قول ہے کہ'' حسن بن علی بن عبداللہ المقری نے مجھے مطلع کیا کہ احمد بن فرج الورّاق نے روایت کیا کہ ابوبکر احمد بن (الرزین) نے روایت کیا کہ (الرزین) نے کہا کہ'' رزق اللہ بن موسیٰ کے سامنے یہ پڑھا گیا تو میں سن رہا تھا کہ 'سفیان بن عیینہ نے یزید بن یزید بن جابر سے اورانہوں نے ابوہریرہ سے روایت کیا''۔ یہ بات بخوبی واضح ہے کہ یزید بن یزید بن جابر کی ابوہریرہؓ سے ملاقات نہ ہوسکی ہوگی،کیوں کہ یزید کی پیدائش ۷۷ھ کی ہے اورابوہریرہؓ ۵۷ھ میں وفات پا گئے تھے۔

۵۱- حاکم، المستدرک علی الصحیحین،۲:۱۲۲

۵۲- زیلعی ، نصب الرایۃ،۳:۴۲۳

۵۳- بیہقی ، سنن،۹:۴۷

۵۴- واقدی، کتاب المغازی ،۱:۲۱۵-۲۱۶؛ابن سعد،طبقات،۲:۲۷

۵۵- ابن ہشام، السیرۃ،۲:۶۴

۵۶- مالک بن انس،المدونۃ الکبریٰ،۳:۴۰

۵۷- ابن ہشام، السیرۃ،۲:۶۴

۵۸- ابوعبید،الاموال،ص ۲۹۶

۵۹- مزید دیکھیے: عزۃ دروزہ، سیرت الرسول، ۲: ۱۴۸

۶۰- محمد حمید اللہ، مجموعة الوثائق السياسية، ص ۴۴۱-۴۴۲

۶۱- خلیفہ، تاریخ، ۳۲-۴۲؛ ابن ہشام، السيرة، ۱: ۵۵۰

۶۲- ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقيم میں اس مفہوم کا واضح تصور پیش کیا ہے۔

۶۳- ابوعبید، الاموال، ص ۲۹۶؛ ابن اثیر، النهاية فى غريب الحديث و الاثر، ۳: ۲۷۹۔ مزید دیکھیے: قسطلانی کی المواهب اللدنية پر زرقانی المالکی کی شرح ۴: ۱۶۸؛ ابن منظور، لسان العرب، بعنوان ''عقل''

۶۴- ابن اثیر، النهاية فى غريب الحديث و الاثر، ۲: ۱۱۷؛ زرقانی، شرح المواهب اللدنية، ۴: ۱۶۸؛ ابن منظور، لسان العرب، بعنوان وَسَع

۶۵- زرقانی، شرح المواهب اللدنية، ۴: ۱۶۸

۶۶- ابن اثیر، النهاية فى غريب الحديث والاثر، ۳: ۴۲۴؛ زرقانی، شرح المواهب اللدنية، ۴: ۱۶۸-۱۶۹؛ شوکانی، نيل الاوطار، ۸: ۶۱

۶۷- ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۲۹۶

۶۸- ابن ہشام، السيرة، ۱: ۵۰۲؛ ابوعبید، کتاب الاموال، ص ۲۹۴؛ ابن اثیر، النهاية فى غريب الحديث والاثر، ۳: ۴۲۴؛ ابن منظور، لسان العرب بعنوان ''فرح''

۶۹- ابن سعد، طبقات، ۱: ۴۸۶

۷۰- ابن منظور، لسان العرب، بعنوان ''فرح''

۷۱- احمد نے المسند میں روایت کیا، ۱: ۱۸۰، ۲: ۲۱۵؛ اس کے علاوہ ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''یہ حسن اور صحیح حدیث ہے''۔ دیکھیے: ترمذی، سنن، جیسا کہ ابن عربی مالکی نے تشریح کی ہے، ۷: ۸۳

۷۲- زرقانی، شرح المواهب اللدنية، ۴: ۱۶۸

۷۳- ابن اثیر، النهاية فى غريب الحديث والاثر ۳: ۲۶۷؛ زرقانی، شرح مواهب، ۴: ۱۶۸؛ ابن منظور، لسان العرب، بعنوان ''عقب''

یہودیوں کی عہد شکنی اور مدینے سے ان کا اخراج

رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، اس پر نہ صرف انہوں نے عمل درآمد نہیں کیا، بلکہ زیادہ عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ انہوں نے معاہدہ توڑ ڈالا۔ معاہدے کی رو سے ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، یہودیوں نے انہیں نظر انداز ہی نہیں کیا، بلکہ جارحانہ رویہ اختیار کیا جو مدینے سے ان کے اخراج کا سبب بنا۔ اب ہم اس صورتِ حال کا تجزیہ کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ وہ کون سی بلا واسطہ اور بالواسطہ وجوہ تھیں، جو ان کی عہد شکنی اور اخراج کا سبب بنیں۔

بنو قینقاع کی جلاوطنی (۱)

اس واقعہ کی تاریخ کے حوالے سے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر کے بعد پیش آیا۔ زہری کے نزدیک، شوال ۲ھ کی کسی تاریخ کو یہ واقعہ پیش آیا۔ واقدی نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ شوال کے وسط میں ہفتے کے روز یہ مہم پیش آئی۔ (۲)

اس مہم کے اسباب

مدینے سے بنو قینقاع کے نکالے جانے کے سبب اور پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ بدر میں مسلمانوں کی فتح اور کامرانی کے بعد بنو قینقاع نے اپنے شدید غم اور غصے کا اس حد تک اظہار کیا کہ ان کے یہ حاسدانہ جذبات واحساسات کھلی جارحیت میں تبدیل ہوگئے۔

مدینے سے ان کے نکالے جانے میں جو نفسیاتی پس منظر کارفرما تھا، اسے بہتر طور پر

سمجھنے کے لیے چند واقعات کو بطورِ خاص سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو ایک مقام پر جمع کر کے انہیں کچھ خیر خواہانہ نصیحتیں کرنے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے بنو قینقاع کے بازار کا انتخاب کیا۔ یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: ''اے قومِ یہود! اسلام قبول کر لو، اس سے قبل کہ تم پر بھی وہی آفت آئے جو قریش پر آئی''۔ انہوں نے جواب دیا: ''اے محمد ﷺ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیں اپنا آدمی سمجھتے ہو۔ تم اس وجہ سے کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہونا کہ تم نے قریش کی اس فوج پر قابو پا لیا جسے جنگ کا کوئی علم نہیں تھا، اور تم نے ان کا بہترین ساز و سامان ہتھیا لیا۔ خدا کی قسم! جب ہم تم سے جنگ لڑیں گے تو تمہیں پتا چلے گا کہ اصل مردِ میدان تو ہم لوگ ہیں، ہم جیسے لوگوں سے تمہارا کبھی واسطہ نہیں پڑا''۔ یہودیوں کے اس جواب سے صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کو جنگ کرنے کے لیے للکارا، بلکہ دھمکی بھی دی، حالانکہ وہ معاہدے کی شرائط کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی سرداری قبول کر چکے تھے۔ یہ روایت ابن اسحٰق کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔(۳) ابن حجر کا کہنا ہے کہ یہ روایت ''حسن'' ہے،(۴) لیکن اس کی سند میں محمد بن محمد شامل ہیں جو حضرت زیدؓ بن ثابت کے آزاد کردہ غلام ہیں اور بقول ابن حجر، وہ ''مجہول'' ہیں۔(۵)

اگر ابن حجر کی یہ رائے قبول بھی کر لی جائے کہ یہ روایت ''حسن'' ہے، پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بنو قینقاع کے اخراج کا واحد سبب یہ تھا کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے جائز تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ پر امن طور پر رہیں اور رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی یہودی کے لیے یہ شرط عائد نہیں کی تھی کہ مدینے میں قیام کرنے کے لیے اسے اسلام قبول کرنا پڑے گا، بلکہ اس کے برعکس معاہدے کی جو دستاویز(۶) تیار کی گئی تھی، اس میں یہودیوں کی مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ ان کے اخراج کا اصل سبب دراصل وہ جارحیت تھی جس کا انہوں نے کھلے عام مظاہرہ کیا، اور جس کی وجہ سے مدینہ شہر کے اندرونی امن و امان میں ایک خلل پیدا ہوا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان خاتون، بنو قینقاع کے

بازار میں گئی۔ وہ ایک دکان میں بیٹھی تھی کہ بنوقینقاع کے ایک فرد نے اس کے لباس کا کنارہ کسی چیز سے اس طرح باندھ دیا کہ جب وہ اٹھی تو اس کا لباس اس کے جسم سے اتر گیا اور اس نے ایک چیخ ماری۔ ایک مسلمان دوڑا ہوا آیا اور اس نے اس یہودی کو قتل کر دیا جس نے یہ حرکت کی تھی۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اس مسلمان پر حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ مقتول مسلمان کے اہل خانہ نے دہائی دی اور تمام مسلمانوں کو یہودیوں کے خلاف مدد کے لیے پکارا، مسلمان غصے میں آ گئے اور ان کے اور بنوقینقاع کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہوگئی۔ یہ ایک ''ضعیف'' روایت ہے، کیوں کہ اس کا سلسلۂ سند ابن ہشام اور عبداللہ بن جعفر مخرمی کے درمیان ٹوٹا ہوا ہے اور ایک کم درجے کے تابعی ابوعون پر ختم ہوتا ہے، جن کا (حدیث میں) مقام نامعلوم ہے، مگر اس روایت کو تاریخی حیثیت سے قابل التفات گردانا جا سکتا ہے اور سیرت کے متعدد مآخذ نے اس روایت کو اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ (۷) اس روایت میں بہت سے واقعات بیان کیے گئے ہیں جن کا سلسلہ بنوقینقاع کے اخراج تک جا پہنچتا ہے۔ ان کے اخراج کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کھلم کھلا جارحیت پر اتر آئے تھے اور انہوں نے امن عامہ پر کاری ضرب لگائی تھی، اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کو پورا یقین ہو گیا کہ یہودیوں کے ساتھ امن سے رہنا ممکن نہیں ہے۔

محاصرہ

بنوقینقاع کے اخراج کی روایت ''صحیح'' ہے۔ (۸) ابن اسحٰق نے (عاصم بن عمر بن قتادہ کی روایت میں) اور واقدی نے (بغیر کسی سند کے) اس محاصرے کی تفصیلات نقل کی ہیں جو مسلمانوں نے بنوقینقاع کا کیا تھا۔ مورخین اور سیرت نگاروں نے بھی انہی کے ذریعے یہ واقعہ نقل کیا ہے، حالانکہ ''حدیث'' کے نقطۂ نگاہ سے یہ تفصیلات ''صحیح'' ثابت نہیں ہوتیں، لیکن محاصرے کی تفصیلات کا تعلق اسی مواد سے ہے جسے محدثین نے نقل کرنے کی اجازت دی ہے اور تاریخی تنقید کے منہج کے مطابق اس مواد پر بھروسا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس منہج میں سند کا ''صحیح'' ہونا شرط نہیں۔ تاریخی مطالعے کے طور پر ان روایات پر بھروسا کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر یہ روایات

اسلامی عقائد اور شریعت کے کسی پہلو سے متعلق ہوں تو انہیں اس وقت تک بطور ثبوت تسلیم نہیں کیا جا سکتا، جب تک وہ ''صحیح'' یا ''حسن'' نہ ہوں۔

بنو قینقاع کے محاصرے کے متعلق جو روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان سے ہمیں یہ معلومات ملتی ہیں کہ بنو قینقاع کے یہودی عبداللہ بن ابی بن سلول کے حلیف تھے، وہ یہودیوں کے سب سے بہادر لوگ تھے اور پیشے کے لحاظ سے سنار تھے۔ جب انہوں نے کھلی جارحیت اور نفرت کا مظاہرہ کیا تو رسول اللہ ﷺ کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ وہ آپ کے ساتھ غداری کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابولبابہؓ بن عبدالمنذر کو مدینے کی حاکمیت سپرد کی اور حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو سفید علم لے کر چلنے پر مامور کیا اور ۱۵ روز تک بنو قینقاع کا محاصرہ کیے رکھا۔ آپ کا یہ محاصرہ ذوالقعدہ کے آغاز تک جاری رہا۔ پھر آپ نے ان کے خلاف اس محاصرے کو مزید سخت کر دیا، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ قبول کرنے پر تیار ہو گئے کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ رکھیں گے اور اپنی دولت رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ بنو قینقاع کے تمام یہودیوں کی مشکیں کس دی جائیں۔ ان کے حلیف عبداللہ بن ابی بن سلول نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ میں بات کی: ''چار سو غیر مسلح اور تین سو مسلح افراد نے سرخ اور کالے (یعنی ہر ایک) سے میری حفاظت کی اور تم ان سب کو ایک ہی دن میں مارنا چاہتے ہو!''۔ رسول اللہ ﷺ نے متانت سے جواب دیا: ''یہ لوگ تمہارے ہیں''، (۹) پھر آپؐ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ ان سب کو مدینے سے باہر نکال دو۔ حضرت عبادہؓ بن صامت کو اس حکم پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہودی وہاں سے نکل کر اذرعات چلے گئے۔ ان کے چھوڑے ہوئے مال کو قبضے میں لینے کی ذمہ داری حضرت محمدؓ بن مسلمہ انصاری کے سپرد کی گئی۔ بعد ازاں یہ مال تمام صحابہؓ کے درمیان غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیا گیا اور اس کا پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کے حصے میں آیا۔ (۱۰) بنو قینقاع کے اخراج کے متعلق قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں:

آپ ان کفر کرنے والوں سے فرما دیجیے کہ عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے)

مغلوب کیے جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور وہ (جہنم) ہے برا ٹھکانا۔ بے شک تمہارے لیے برا نمونہ ہے دو گروہوں (کے واقعے) میں جو باہم ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے، ایک گروہ تو اللہ کی راہ میں لڑتا تھا (یعنی مسلمان) اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے (آل عمران ۳:۱۲-۱۳)۔

کچھ مفسرینِ قرآن کی رائے یہ ہے کہ بنو قینقاع کے یہودیوں کے ساتھ عبداللہ بن ابی بن سلول کی گہری دوستی کے متعلق قرآن کریم کی درج ذیل آیت نازل ہوئی:

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بنانا۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا، بے شک وہ انہی میں سے ہو گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سمجھ نہیں دیتا ان لوگوں کو جو اپنا نقصان کر رہے ہیں (المائدہ ۵:۵۱)۔

اسی موقع پر حضرت عبادہؓ بن صامت نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنے یہودی حلیفوں سے مکمل برأت کا اعلان کرتے ہوئے کہا: ''یا رسول اللہ! بہت سے یہودیوں کے ساتھ میرے گہرے دوستانہ مراسم ہیں، لیکن میں آج یہودیوں کی دوستی سے کنارہ کش ہوتا ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں گہری دوستی کے لیے صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کا انتخاب کرتا ہوں''۔

یہاں ہمیں عبداللہ بن ابی اور حضرت عبادہؓ بن صامت کی شخصیتوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ عبداللہ بن ابی کا دل نفاق سے بھرا ہوا تھا اور حضرت عبادہؓ بن صامت جن کی شخصیت رسول اللہ ﷺ کی تربیت سے نکھر چکی تھی، انہوں نے اپنے دل سے جاہلی تعصّبات اور ذاتی مفادات کے تمام داغ مٹا دیے تھے۔ انہوں نے اسلام کے مفاد کو اپنے ذاتی منافع پر ترجیح دی اور فرض شناسی اور ایمان داری کی ایک زندۂ جاوید مثال قائم کر گئے۔

کعب بن اشرف کا قتل

علمائے اسلام کی اکثریت اس خیال کی حامل ہے کہ کعب بن اشرف کا قتل بدر کے

بعد اور بنونضیر کے خلاف مہم جوئی سے پہلے ہوا۔ واقدی نے اس واقعے کی ٹھیک تاریخ متعین کی ہے۔ اس کے مطابق یہ واقعہ ۱۴ ربیع الاوّل ۳ ھ، کو یعنی ہجرت کے پچیسویں ماہ کے آغاز میں پیش آیا۔ (۱۱) کعب بن اشرف کا باپ عرب تھا اور اس کا تعلق قبیلہ طے سے تھا اور اس کی ماں عقیلہ بنت ابی حقیق بنونضیر سے تھی۔ اشرف کے باپ نے قبیلہ طے سے معاہدہ کیا تھا اور ان کی ایک خاتون سے شادی کی تھی۔ کعب ایک شاعر تھا اور اس نے اسلام کے ساتھ اپنی دشمنی کا برملا اعلان کر دیا تھا۔ (۱۲) بدر کے معرکے میں مسلمانوں کی شاندار کامیابی کی وجہ سے کعب بن اشرف سخت طیش میں آ گیا اور غصے سے بے قابو ہو کر مکے جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہجو یہ اشعار کہہ کر کفار کو آپؐ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ (۱۳) اس نے معرکۂ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین کے نوحے اور ماتمی اشعار گا گا کر کفار کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ اس کے بعد وہ مدینے واپس آیا اور اپنے اشعار میں مسلمان خواتین پر کیچڑ اچھالنے لگا۔ (۱۴) ان تمام اسباب کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے کعب بن اشرف کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ بخاری نے اس کے قتل کے بارے میں ایک مفصل روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: ''محمدؓ بن مسلمہ انصاری نے رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کو بجا لانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ پیش کش قبول فرمالی۔ بعد ازاں محمدؓ بن مسلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس امر کی اجازت طلب کی کہ آیا وہ کعب بن اشرف کے ساتھ کوئی چال چل سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اس کی اجازت مرحمت فرما دی، کیوں کہ اس نے مسلمانوں کے خلاف عملاً اعلانِ جنگ کر رکھا تھا۔ اس صورت حال میں ہر مسلمان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ سزا کا خوف کیے بغیر دشمن کو قتل کر دے، چنانچہ محمدؓ بن مسلمہ کعب کے پاس گئے اور اس سے کچھ کھجوریں ادھار مانگیں اور یہ غرض ظاہر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے کچھ کھجوروں کا مطالبہ کیا ہے جس وجہ سے انہیں ہر حال میں کھجوریں مہیا کرنا ہیں۔ کعب نے محمدؓ بن مسلمہ سے ان کے خاندان کی کچھ خواتین اور بچوں کو بطور ضمانت رکھنے کا مطالبہ کیا، لیکن محمدؓ بن مسلمہ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ یہ بات ان دونوں کے لیے باعثِ شرم و غیرت ہوگی، بلکہ اس کے بجائے وہ ضمانت کے

طور پر اپنا ایک ہتھیار دینے کو تیار ہیں۔کعب بن اشرف رضا مند ہو گیا۔ رات کے وقت محمدؓ بن مسلمہ اپنے ایک ساتھی کو لے کر کعب کے گھر گئے۔ ساتھی کا نام ابو نائلہ تھا اور وہ کعب کے دودھ شریک (رضاعی) بھائی تھے۔ ان کے ساتھ تین ساتھی اور تھے۔ان لوگوں نے کعب کو آواز دی۔اس نے دروازہ کھولا اور ان کو اندر لے چلا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت وہ لوگ یہ ظاہر کرتے ہوئے اس کے سر پر جھک گئے، گویا وہ کعب کے بالوں میں لگی ہوئی خوشبو سونگھ رہے ہیں، اور یکا یک اس پر حملہ کر دیا۔حملہ اتنا اچانک اور اتنا شدید تھا کہ ان میں سے ایک شخص تو اپنے ہی ساتھی کی تلوار سے زخمی ہو گیا''۔(۱۵) یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کعب کے قتل کی پرزور شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان پر واضح کیا کہ کعب بن اشرف کھلی جارحیت اور بہتان تراشی پر اترا ہوا تھا جو اس کے قتل کا سبب بنی۔اس واقعے کے بعد یہودی اور بقیہ کفار سخت خوفزدہ ہو گئے اور انہیں اپنی فکر لاحق ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس بات کی دعوت دی کہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیں، اس کے بعد ایک دستاویز تحریر کر لی گئی۔ یہ ابو داؤد کی روایت ہے جو تاریخی ثبوت کی حیثیت سے ایک فیصلہ کن مقام رکھتی ہے اور دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔(۱۶) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دستاویز اسی معاہدے کی تجدیدِ نو کے طور پر لکھی گئی تھی جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان بدر سے پہلے طے پایا تھا اور کعب بن اشرف کے قتل کی وجہ سے یہودیوں کے خدشات میں اضافہ ہو گیا تھا۔

کعب بن اشرف کے قتل کے اقدام کو نظر بہ ظاہر عہد شکنی کا نام دیا جا سکتا ہے، لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو تحریر کی رو سے کعب بن اشرف اسی طرح معاہدے کا ایک فریق تھا جس طرح بنو نضیر اور دوسرے لوگ فریق تھے۔کعب بن اشرف نے معاہدے کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہجویہ اشعار کہے، جبکہ آپ ریاست کے سربراہ تھے اور مسلمانوں کے دشمنوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے مقتولینِ بدر کے مرثیے لکھ کر مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ نہ صرف یہ، بلکہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اس لیے اس کا خون بلا خوف و خطر بہایا جا سکتا تھا۔ جہاں تک اس حقیقت کا تعلق

ہے کہ اس نے جن لوگوں پر اعتماد کیا، انہوں نے اسے ایک چال کے ذریعے قتل کر دیا تو اس طرح ان لوگوں کا قتل جائز ہے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم (۱۷) سے یہ کام انجام پایا، تاہم رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنونضیر کو کعب بن اشرف کے جرائم پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ اس کی غداری کی یہی سزا کافی تھی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کے ساتھ اپنے معاہدے کی تجدید کی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب کے قتل کا واقعہ یہودیوں کے دماغ پر اس حد تک مسلط رہا کہ انہوں نے اسلام کے خلاف اپنی گھناؤنی سازشیں جاری رکھیں، حالانکہ وہ معاہدے کی تجدید نو کر چکے تھے۔ مندرجہ ذیل واقعات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے کسی حسنِ نیت سے معاہدے کی تجدید نہیں کی تھی، بلکہ خوف نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

بنونضیر کی جلاوطنی

یہ مہم کس تاریخ کو پیش آئی؟

اس بارے میں دو روایات ہیں اور دونوں ہی "صحیح" سند کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات کے مطابق بنونضیر کے خلاف مہم غزوۂ بدر کے بعد پیش آئی تھی۔

پہلی روایت زہری کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ "عبداللہ بن عبدالرحمن بن کعب بن مالک نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی کے حوالے سے یہ خبر دی"۔ (۱۸)

دوسری روایت عروہ نے حضرت عائشہؓ (۱۹) کے حوالے سے نقل کی ہے، اگرچہ بیہقی کا کہنا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا خاص طور پر نام نہیں لیا گیا، لیکن ذہبی کہتے ہیں حضرت عائشہؓ کا نام لیا گیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کسی قابل اعتماد مصنف نے ان کے نام کا اضافہ کیا ہے اور یہ بات قابل قبول ہے۔ بیہقی واحد مصنف ہیں جو اس روایت کے "مرسل" ہونے کی وجوہ بیان کرتے ہیں۔ عروہ کی "مرسل" روایت کے مطابق یہ مہم غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آئی۔ (۲۰)

بیہقی نے عروہ سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس مہم کا زمانہ محرم ۳ھ کا ہے۔ اس سے پہلی روایت کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ غزوۂ بدر ۱۷ رمضان ۲ھ کو

پیش آیا تھا۔موسیٰ بن عقبہ نے بھی یہی معلومات فراہم کی ہیں۔(۲۱) عروہ کا تعلق دوسری نسل کے مسلمانوں سے ہے، یعنی وہ ایک بلند درجہ رکھنے والے تابعی ہیں اور موسیٰ کی حیثیت ایک کم درجے کے تابعی کی ہے۔ سند کا سلسلہ جو ان دونوں اصحاب تک جاتا ہے، اس میں کچھ ایسے لوگ شامل ہیں جن کے حالات مجھے نہیں مل سکے، ورنہ اس روایت کا درجہ "حسن" ہوتا۔

ابن اسحٰق کی روایت یہ ہے کہ بنونضیر کے خلاف مہم ۴ھ کو پیش آئی۔(۲۲) واقدی اور ابن سعد نے کسی سند کے بغیر یہ بیان کیا ہے کہ یہ مہم ہجرت کے ۳۷ ماہ بعد ربیع الاوّل کے مہینے میں پیش آئی۔(۲۳) ابن ہشام ان دونوں اصحاب کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ربیع الاوّل میں ہوا۔(۲۴) متعدد سیرت نگاروں نے اس مہم کی تاریخ کے تعین میں ابن اسحٰق کی پیروی کی ہے۔ ابن قیم پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ زہری نے ٹھوکر کھائی ہے، یا انہیں مغالطہ ہوا ہے جب انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا۔ ابن قیم کو اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ احد کے بعد کا ہے اور ان کی یہ رائے اصحابِ سیر و مغازی کی اکثریت کے ساتھ ملتی ہے۔(۲۵) ابن حجر کا خیال ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کعب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد ہے جو ابن اسحٰق نے اس حدیث کی صحت کے نقطۂ نظر سے کہا ہے، لیکن ان کی یہ رائے بھی ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بنونضیر کے اخراج کا سبب بنو عامر کے ان دو اشخاص کے خون بہا کی رقم وصول کرنے سے متعلق ہے جو حادثاتی طور پر قتل ہو گئے تھے، تو پھر ہمیں ابن اسحٰق کی رائے کو قبول کر لینا چاہیے، کیوں کہ مصنفین اس امر پر متفق ہیں کہ بئر معونہ کا واقعہ غزوۂ احد کے بعد پیش آیا تھا۔(۲۶)

اس مہم کی تاریخ کے بارے میں دیگر بیانات قرآن کریم کی درج ذیل آیت کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں:

> اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے جبکہ ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی کرے، سو اللہ تعالیٰ نے ان کا قابو، تم پر نہ چلنے دیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اہل ایمان کو حق تعالیٰ ہی پر اعتماد رکھنا چاہیے (المائدہ ۵:۱۱)۔

روایات کے مطابق قرآن کریم کی یہ آیت بنونضیر کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کیا ہی چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کی حفاظت فرمائی۔ اس بیان میں کچھ کمزوری ہے، لیکن جب اسے دوسرے بیانات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام بیانات ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں، اس لیے اس بیان کو ایک قوی شہادت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ (۲۷) ان تاریخی واقعات سے ابن اسحٰق کے خیال کی تائید ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں اس سوال کا کوئی حتمی جواب نہیں مل سکا کہ بنونضیر کے خلاف مہم جوئی کب پیش آئی؟ ابن حجر نے بھی اس معاملے میں کوئی حتمی رائے نہیں دی، باوجودیکہ انہوں نے تمام روایات پر غور وخوض کر کے یہ فیصلہ دیا تھا کہ کون سی روایت سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ابن اسحٰق کی روایت کو قابل قبول گردانا جا سکتا ہے، بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ بنونضیر کے خلاف مہم کا واقعہ بنو عامر کے دو افراد کے قتل کے ساتھ مربوط ہے۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ بے شمار روایات اپنی کمزوری کے باوجود ابن اسحٰق ہی کے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس معاملے میں ابن حجر نے حتمی رائے کیوں نہیں دی۔

مہم کے اسباب ومحرکات

مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ اس مہم کے اسباب تین تھے:

پہلا سبب تو یہ ہے کہ بنونضیر نے غزوۂ بدر کے بعد رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی، بلکہ اس قسم کی کوشش دو مرتبہ کی گئی۔ پہلی کوشش اس وقت کی گئی جب قریش نے بنونضیر کو وہ پیغام بھیجا جس میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے لڑائی نہ کی تو قریش بنونضیر پر جنگ مسلط کر دیں گے۔ بنونضیر نے قریش کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غداری کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا جس میں آپؐ کو یہ دعوت دی گئی تھی کہ آپ اپنے تیس صحابہؓ کے ساتھ آ کر یہودیوں سے ملاقات کریں۔ انہوں نے اپنے اس پیغام میں یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے علماء کی اتنی ہی تعداد کو لے

کر مدینے کے ایک مرکزی مقام پر جمع ہوں گے، جہاں وہ رسول اللہ ﷺ کی بات سنیں گے اور اگر ان کے علماء نے آپؐ کی بات کا یقین کر لیا تو پھر تمام یہودی اسلام قبول کر لیں گے۔ جب مقررہ مقام پر فریقین کا اجتماع ہوا تو یہودیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے تین اصحاب کے ساتھ ان کے تین علماء سے ملاقات کریں۔ اگر آپؐ انہیں اسلام کی حقانیت پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بنو نضیر کا پورا قبیلہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے گا۔ یہودیوں کے وہ تینوں علماء اپنے ساتھ خنجر لیے ہوئے تھے۔ ایک یہودی خاتون نے اپنے بھائی کو جو مسلمان تھا، ان کے اس گھناؤنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ اس مسلمان نے فوراً رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دی اور آپؐ ان سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے لوٹ گئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ اس وقت تک کیے رکھا جب تک وہ مدینے سے نکل جانے پر رضا مند نہ ہو گئے۔ ان پر یہ شرط عائد کی گئی کہ وہ ہتھیاروں کے علاوہ وہ تمام سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں جو اونٹوں پر لاد کر لے جایا جا سکتا ہو، چنانچہ وہ اپنے گھروں کے دروازے تک اکھاڑ کر لے گئے۔ اس روایت کی سند میں جو راوی شامل ہیں، وہ قابل اعتماد ہیں، اگرچہ صحابی کا نام معلوم نہیں، تاہم اس سے سند کی قوت متاثر نہیں ہوتی (کیوں کہ المصنف عبدالرزاق کی اس روایت کے تمام راوی قابل اعتماد ہیں)۔ (۲۸)

دوسری کوشش جو رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کے سلسلے میں یہودیوں نے کی، اسے ابن اسحٰق نے روایت کیا ہے اور سیرت نگاروں کی اکثریت نے ان کی پیروی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ آپؐ نے ان سے ایک قبیلے کے دو افراد کا خون بہا ادا کرنے کے سلسلے میں مدد طلب کی، کیوں کہ وہ قبیلہ معاہدے کا ایک فریق تھا اور ان دو افراد کو عمرو بن امیۃ الضمری نے الرجع کے واقعے کے بعد غلطی سے قتل کر دیا تھا۔ جب آپؐ بنو نضیر کے علاقے میں پہنچے تو آپؐ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہودی آپؐ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرا کر آپ کو شہید کرنے ہی والے تھے کہ وحی الٰہی نے آپ کو متنبہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ فوری طور پر وہاں سے واپس ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے ان کے محاصرے کا حکم جاری فرما دیا۔ یہ محاصرہ چھ روز جاری رہا، پھر وہ اس شرط پر امن کا ایک معاہدہ کرنے پر رضا مند ہو گئے

کہ وہ اپنے ساتھ وہ تمام ساز وسامان لے جائیں گے جو اونٹوں کے ذریعے لے جایا جا سکتا ہے۔(۲۹) اس روایت کا سلسلۂ سند یزید بن رومان پر ختم ہوتا ہے جو ایک کم درجے کے تابعی ہیں، لیکن اس روایت کو اس لیے قوی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے ملتی جلتی دیگر روایات بھی موجود ہیں۔موسیٰ بن عقبہ کی مغازی میں عروہ بن زبیر کی روایت بھی اس کی تائید میں ہے۔(۳۰) موسیٰ بن عقبہ، مغازی کے مصنفین میں سے ایک ہیں، انہوں نے ابن اسحٰق کی روایت پر اتنا اضافہ کیا ہے: ''بنونضیر نے قریش کے ساتھ مل کر سازش کی تھی، انہیں رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر بھڑکایا تھا اور انہیں مسلمانوں کے کمزور مقامات سے آگاہ کیا تھا''۔(۳۱)

اس حقیقت کے باوجود کہ عبدالرزاق کی روایت ابن اسحٰق کی روایت کے مقابلے میں سند کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے، سیرت نگاروں نے مؤخرالذکر ہی کو ترجیح دی ہے۔دونوں روایات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے بنونضیر کا جو محاصرہ کیا، اس کا سبب یہ تھا کہ بنونضیر نے غداری کا ارتکاب کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی تھی۔موسیٰ بن عقبہ کے ہاں یہ ذکر نہیں ملتا کہ یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ، اشتعال انگیزی اور قریش کو خبریں پہنچانے کے اقدامات کب کیے۔یہ بات تو مسلّم ہے کہ انہوں نے غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے پر اکسایا جس کے نتیجے میں جنگ احد واقع ہوئی، انہوں نے ہی ابوسفیان کی مدد کر کے اس سے مدینے کے نواحی علاقے پر حملہ کرایا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے احد کے بعد ابوسفیان کا تعاقب کیا۔مسلمانوں کی یہ مہم غزوۃ السویق کے نام سے معروف ہے۔اس کے علاوہ کعب بن اشرف النضری نے اپنے اشعار کے ذریعے قریش کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کا اشتعال دلایا۔موسیٰ بن عقبہ نے اپنی روایت میں ان تمام واقعات کا حوالہ دیا ہے جس سے ان کا مقصد غالباً یہ نشان دہی کرنا ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات میں سخت ابتری پیدا ہو چکی تھی، پھر جب انہوں نے غداری کا ارتکاب کیا تو ان تعلقات کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا۔ان کے محاصرے کا یہ ایک ظاہری سبب تھا، لیکن اس سے بیشتر وہ متعدد جارحانہ اقدامات کا ارتکاب کر چکے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بنونضیر کو جلاوطنی کی تنبیہ

مطالعۂ حدیث کے نقطۂ نظر سے کوئی روایت ایسی نہیں ہے جو "صحیح" ہو اور جس میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بنونضیر کو شہر بدری کی تنبیہ کا حوالہ دیا گیا ہو، تاہم ان کی شہر بدری ایک "صحیح" حدیث سے ثابت ہے جسے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے روایت کیا ہے۔(۳۲) واقدی اور ابن سعد نے کسی سند کے بغیر اس تنبیہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کو اس بات سے خبردار کیا کہ وہ دس دن کے اندر اندر مدینہ چھوڑ دیں، ورنہ ان کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔ وہ مدینہ چھوڑنے پر تیار ہو گئے، لیکن عبداللہ بن ابی بن سلول نے انہیں اس بات پر اکسایا کہ وہ مدینے ہی میں رہ کر بغاوت کریں اور اس نے انہیں اپنی بھرپور مدد کا بھی یقین دلایا، چنانچہ بنونضیر نے بغاوت کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔(۳۳) دو روایات ایسی ہیں جن کی اسناد کا سلسلہ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ پر ختم ہوتا ہے، ان اسناد میں کچھ راوی ایسے ہیں جن کے حالات کا ہم پتا نہیں لگا سکے، ان دونوں روایات میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بنونضیر کو کی جانے والی اس تنبیہ کا ذکر موجود ہے کہ انہیں مدینہ بدر کر دیا جائے گا۔ (۳۴) سیرت کی متعدد کتب میں اس تنبیہ کا ذکر بغیر کسی سند کے کیا گیا ہے۔(۳۵) اس حقیقت کے باوجود کہ (بنونضیر کی طرف داری میں) منافقین کے رویے کا ذکر صرف "کمزور" احادیث میں کیا گیا ہے جنہیں کسی مضبوط دلیل کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کے منافقانہ رویے کو ان "صحیح" روایتوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے جو بنونضیر کے بارے میں ملتی ہیں۔

بنونضیر کا محاصرہ اور ان کی جلاوطنی کا معاہدہ

اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ اس روایت کو "صحیح" مانا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کا محاصرہ کیا اور ان سے فرمایا: "میں تمہاری حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا، تاوقتیکہ تم میرے ساتھ ایک معاہدہ نہ کر لو، اور پھر اس معاہدے پر قائم رہنے کا وعدہ بھی کرو"۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ مسلمانوں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں تمام دن بنونضیر کے ساتھ جنگ کی۔ اگلے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنونضیر کی جانب سے ہٹ کر چند گھڑ سواروں کے ہمراہ بنوقریظہ کے پاس آئے۔ آپؐ نے بنوقریظہ کو اپنے ساتھ معاہدہ کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور پھر آپؐ ان کے ہاں سے چلے آئے۔ اگلے روز آپؐ چند سپاہیوں کو لے کر بنونضیر کی طرف آئے اور ان سے جنگ کی، حتیٰ کہ وہ اس شرط پر مدینے سے نکلنے پر رضامند ہو گئے کہ وہ ہتھیاروں کو چھوڑ کر اپنے ساتھ وہ تمام سامان لے جاسکتے ہیں جو اونٹوں پر لادا جاسکتا ہو۔ بنونضیر نے ایسا ہی کیا اور اونٹوں پر جتنا اسباب بھی لاد سکتے تھے، لاد کر لے گئے، حتیٰ کہ اپنے گھروں کے دروازے بھی اکھاڑ کر لے گئے۔ انہوں نے اپنے گھروں کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا اور گھروں کے اندر جتنی بہترین لکڑی لگی ہوئی تھی، سب اکھاڑ کر لے گئے۔ (۳۷) قرآن (۳۸) اور حدیث (۳۹) سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ محاصرہ میں ان کے کچھ کھجور کے درخت جلائے تھے اور کچھ کٹوا دیے تھے۔

جلاوطنی کا معاہدہ ہو جانے کے ساتھ ہی یہ بات مزید پکی ہو گئی کہ اب یہودیوں کو قتل نہ کیا جائے گا، انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا جائے گا اور انہیں اس بات کی اجازت حاصل ہو گی کہ وہ ہتھیاروں کو چھوڑ کر اپنا جتنا بھی مال اور اسباب اونٹوں پر لاد کر لے جاسکتے ہیں، لے جائیں، وہ اپنے تمام ہتھیار مسلمانوں کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ بعض ''صحیح'' روایات کے مطابق یہودیوں کو شام (۴۰) کی طرف جلاوطن کر دیا گیا، جبکہ ابن سعد کی روایت (۴۱) یہ ہے کہ وہ خیبر کی طرف جا کر آباد ہو گئے۔ ہم ان دونوں روایات کے مابین اس طرح ہم آہنگی اور تطابق پیدا کر سکتے ہیں کہ ان کے زعماء حیی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع اور اسی طرح کے دوسرے لوگ خیبر جا کر آباد ہو گئے ہوں گے اور عام لوگ شام کی طرف چلے گئے ہوں گے۔ ابن سعد کی روایت کمزور ہے اور بلا سند ہے، لیکن بعد کے واقعات سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے، اور یہ واقعات، مثلاً غزوۂ خیبر میں یہود کے ساتھ لڑائی، کنانہ کا قتل، حضرت صفیہؓ کا قیدی بن کر آنا، اور سلام بن ابی الحقیق کے بارے میں رپورٹ وغیرہ واقعات قوی روایات میں بیان

کیے گئے ہیں، لیکن ان کے کچھ لوگ خیبر جا کر آباد ہو گئے۔ ابن اسحٰق کی یہی رائے ہے۔(۴۲) بنونضیر کے دو افراد مسلمان ہو گئے تھے، اس لیے انہوں نے اپنا قبضہ باقی رکھا۔ یہ دو افراد یامین بن عمر بن کعب اور ابوسعد بن وہب تھے۔(۴۳) قرآن کریم کے مطابق بنونضیر کا مال اور ان کے کھجور کے درخت خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ کے لیے تھے۔(۴۴) ہر سال آپؐ اس کی آمدنی کا کچھ حصہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کی چھوڑی ہوئی زمینیں مہاجروں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ انصار میں سے صرف دو افراد کو ان زمینوں میں سے حصہ دیا گیا، کیوں کہ یہ دو افراد بہت غریب تھے۔ یہ دونوں، حضرت سہلؓ بن حنیف اور حضرت ابودجانہؓ سماک بن خرشہ(۴۵) تھے۔

بنونضیر کی جلاوطنی سے مدینے میں منافقوں اور یہودیوں کی ساری طاقت زمین بوس ہوگئی۔ بنونضیر کے محاصرے کے دوران میں بنوقریظہ نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے معاہدے کی تجدید نو بھی کر لی اور اس معاہدے پر عمل پیرا رہنے پر بھی آمادگی ظاہر کی، لیکن ان کی یہ آمادگی جنگِ خندق تک ہی برقرار رہی۔ دوسری طرف منافقوں نے بنونضیر کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہوئے ان کی کوئی مدد نہ کی۔ اب یہودیوں نے یہ محسوس کر لیا کہ منافقوں پر بھروسا کرنا بے کار اور عبث ہے۔

بنونضیر سے نجات پانے اور ان کی چھوڑی ہوئی زمینوں سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے مدینے میں اسلام نے مزید قوت پکڑ لی۔ یہ زمینیں مہاجروں میں تقسیم کر دی گئیں جن کا اس وقت تک انحصار انصار کی زمینوں اور مکانات پر تھا۔

بنونضیر کا مشرکین کو اشتعال دلانا

وقت کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف بنونضیر کی نفرت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اسی نفرت اور دشمنی نے انہیں اس پر مجبور کیا کہ وہ قریش اور دیگر قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر مدینے پر حملہ کرنے پر اکسائیں۔ آخر کار ان کی یہ جارحانہ کوششیں جنگ خندق پر منتج ہوئیں۔ اس بارے میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں جو اس بناء پر کمزور ہیں کہ ''مرسل'' ہیں، یا ''منقطع'' ہیں،

یا ان کے سلسلۂ سند کا کوئی ایک راوی ''مجہول'' ہے۔

لیکن جب ان تمام روایات کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو یہ ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں اور انہیں شہادت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ان روایات کا سلسلہ جن اصحاب پر منتہی ہوتا ہے،ان کے نام یہ ہیں: عروہ بن زبیر، عاصم بن عمر بن قتادہ، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، سعید بن مسیّب اور موسیٰ بن عقبہ۔ ان میں سے کچھ روایات میں بنو نضیر کے ان افراد کے نام بھی دیے گئے ہیں جو اس اشتعال انگیزی میں پیش پیش تھے اور ابن اسحٰق نے ان میں سے چند ناموں کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں: سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ابی الحقیق النضری اور حُیی بن اخطب النضری۔

بنو قریظہ کی بدعہدی اور سزا

یہ مہم کس تاریخ کو پیش آئی؟

قتادہ، عروہ بن زبیر، ابن اسحٰق اور عبدالرزاق کی آراء کے مطابق غزوۂ خندق کا واقعہ شوال ۵ھ میں پیش آیا اور بنو قریظہ کے خلاف عملی اقدام اس غزوے کے بعد، یعنی ۵ھ (۴۹) میں ذوالقعدہ کے اختتام اور ذوالحجہ کے اوائل میں اٹھایا گیا۔امام مالک اور موسیٰ بن عقبہ کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ خندق ہجرت کے چوتھے برس شوال کے مہینے میں پیش آیا۔ابن حزم نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ان تینوں اصحاب نے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی ایک حدیث کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے جس کے مطابق حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا کہنا ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر جب کہ وہ ۱۵ برس کے تھے، رسول اللہ ﷺ نے انہیں لڑنے کی اجازت نہیں دی (۵۰)۔بیہقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں آراء میں ہم آہنگی ممکن ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ''درحقیقت ان دونوں آراء میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ غزوۂ خندق کا واقعہ ہجرت کے چار سال مکمل ہونے کے بعد اور پانچواں سال مکمل ہونے سے پہلے پیش آیا۔زہری کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ خندق غزوۂ احد کے دو سال بعد پیش آیا، لیکن اس حقیقت پر سب کا اتفاق ہے کہ غزوۂ احد ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں واقع ہوا، لیکن وہ لوگ اس سے مستثنٰی ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ ہجرت کے بعد محرم کا مہینہ شروع ہوا، اور وہ ان باقی ماندہ مہینوں کو قابل توجہ نہیں

گردانتے جو ہجرت کے سال ربیع الاوّل کے بعد آئے۔ بیہقی اسی رائے کے حامل ہیں۔ یعقوب بن سفیان الفسوی کی تحقیق یہ ہے کہ جنگِ بدر ہجرت کے پہلے سال پیش آئی۔ اُحد دوسرے سال، بدر الموعد تیسرے سال شعبان میں اور خندق چوتھے سال شوال میں واقع ہوئی۔ یہ رائے جمہور علماء کی رائے کے ساتھ متعارض ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس سال ہجرت عمل میں آئی، اسی سال محرم کے مہینے سے ہجری سال کا آغاز ہو گا، جبکہ مالک کے مطابق سال ربیع الاوّل کے مہینے سے شروع ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں تین آراء پائی جاتی ہیں، لیکن اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جنگ اُحد ہجرت کے تیسرے سال ہوئی، اور جنگ خندق ہجرت کے پانچویں سال شوال میں پیش آئی اور یہی رائے مستند ہے۔

کچھ فقہاء نے جن میں بیہقی بھی شامل ہیں، ابن عمرؓ کی حدیث کی اس طرح تشریح کی ہے کہ جنگِ اُحد کے موقع پر انہوں نے اپنی عمر کے ۱۴ سال مکمل کیے تھے جب کہ جنگ خندق کے موقع پر وہ اپنی عمر کے ۱۵ سال مکمل کر کے سولھویں میں داخل ہوئے تھے۔ یہ تشریح معقول نظر آتی ہے، کیوں کہ جب جنگِ احد ختم ہوئی تو فریقین نے یہ طے کیا کہ وہ آئندہ برس بدر کے مقام پر ایک اور جنگ کے لیے دوبارہ اکٹھے ہوں گے (بدر الموعد)، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بیہقی کہتے ہیں: ''یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ وہ دو ماہ بعد مدینے کا محاصرہ کرنے کے لیے آئے تھے''۔ (۵۱)

مہم کا سبب

اس مہم کا سبب یہ تھا کہ بنو قریظہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، انہوں نے اسے توڑ ڈالا۔ یہ بات متعدد روایات سے ثابت ہوتی ہے جنہیں اگر ملا کر دیکھا جائے تو اس بات کا قوی ثبوت مل جاتا ہے۔ حُیی بن اخطب النضری (۵۲) نے بنو قریظہ کو اس عہد شکنی پر اکسایا اور اس موقع پر اکسایا جب مسلمان ایک مشکل اور نامساعد مرحلے سے گزر رہے تھے۔ مختلف قبائل کے دس ہزار جنگجو مسلمانوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ ایک قوی روایت کے ذریعے

اس بات کا پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیرؓ بن عوام (۵۳) کو اس مقصد کے لیے روانہ کیا کہ وہ بنوقریظہ پر نظر رکھیں۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرات سعدؓ بن معاذ، سعدؓ بن عبادہ، عبداللہؓ بن رواحہ اور خواتؓ بن جبیر کو یہ جائزہ (۵۴) لینے کے لیے روانہ کیا کہ آیا بنوقریظہ کی بدعہدی کی افواہیں درست ہیں یا غلط۔ ان چاروں اصحاب نے واپس آ کر جب اس امر کی تصدیق کی کہ یہ افواہیں حقیقت پر مبنی ہیں تو مسلمانوں کو سن کر بہت افسوس ہوا۔

ابن اسحٰق نے بنوقریظہ کی غداری اور معاہدہ شکنی کے بارے میں ایک مفصل روایت بلا سند نقل کی ہے۔ بہت سے دوسرے سیرت نگاروں نے بھی اس روایت کو بغیر سند کے نقل کیا ہے۔ (۵۵)

موسیٰ بن عقبہ بھی بلا اسناد لکھتے ہیں کہ بنوقریظہ نے حُیی بن اخطب کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ قبیلہ قریش اور قبیلہ غطفان کے شرفاء میں سے ۹۰ لوگوں کو یرغمال بنالیں تاکہ قریش اس وقت تک مدینے سے واپس جانے کا خیال دل میں نہ لائیں جب تک مسلمانوں کو تباہ نہ کر دیں۔ حُیی نے اس تجویز سے اتفاق کیا، چنانچہ انہوں نے معاہدہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔ (۵۶)

جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ خندق سے لوٹے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ بنوقریظہ سے جنگ کریں (۵۷)، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو یہ حکم دیا کہ وہ سیدھے بنوقریظہ کے پاس جائیں اور انہیں اس پر مطلع کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا ہے تاکہ وہ ان کے قلعوں کو متزلزل کر دیں اور ان کے دلوں میں خوف بٹھا دیں۔ (۵۸) آپؐ نے اپنے اصحابؓ کو بھیجتے ہوئے یہ بھی تاکید کی کہ وہ اس وقت تک نمازِ عصر ادا نہ کریں جب تک بنوقریظہ کے علاقے میں داخل نہ ہو جائیں (**بخاری** (۵۹)، البتہ **مسلم** (۶۰) کے مطابق یہ ظہر کی نماز کے بارے میں فرمایا تھا)۔ صحابہ کرامؓ میں سے کچھ ایسے تھے جو ابھی تک راستے میں تھے اور بنوقریظہ تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے نماز ادا کر لی اور کچھ نے مؤخر کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے کسی کو سرزنش نہ کی، کیونکہ آپؐ جانتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک نے آپؐ کے مدعا کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی

ہے۔ابن اسحٰق نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے نمازِ عصر کو مؤخر کیا تھا، انہوں نے نماز عشاء کے بعد اسے ادا کیا۔(۶۱)

فقہائے کرام نے بخاری اور مسلم کی روایات میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ غالباً کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کا حکم آنے سے پہلے ہی ظہر کی نماز پڑھ چکے ہوں گے، جبکہ کچھ لوگوں نے ابھی اپنی نماز ادا نہ کی ہوگی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جنہوں نے ابھی نماز ادا نہیں کی، یہ حکم دیا کہ وہ اپنی ظہر کی نماز کو مؤخر کریں اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظہر کی نماز ادا کر لی تھی، یہ حکم دیا کہ وہ اپنی عصر کی نماز مؤخر کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو علیحدہ جماعتیں روانہ کی گئی ہوں، ایک جماعت کو یہ تاکید کی گئی ہو کہ وہ ظہر کی نماز ادا نہ کریں اور دوسری جماعت کو یہ حکم ہوا ہو کہ وہ عصر کی نماز نہ پڑھیں۔(۶۲)

رسول اللہ ﷺ بنو قریظہ کی طرف تشریف لے گئے اور اپنی عدم موجودگی میں عبداللہؓ بن ام مکتوم (۶۳) کو مدینے کا قائم مقام سربراہ مقرر کیا۔اگر چہ اس روایت کا ''صحیح'' ہونا ثابت نہیں ہے، تاہم اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

بہت سی ''مرسل'' روایات (آثار)، جو ایک دوسری کو تقویت دے کر ''حسن لغیرہ'' کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں، کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بر سر لشکر علم بردار بنا کر بھیجا گیا تھا۔(۶۴)

روایات میں اختلاف ہے کہ بنو قریظہ کا محاصرہ کتنے دن رہا؟ مختلف روایات کے مطابق محاصرہ ایک ماہ، (۶۵) ۲۵ روز (۶۶)، ۱۵ روز (۶۷) یا ۱۰ اور ۱۸ روز (۶۸) کے درمیان کسی مدت تک رہا، تاہم مضبوط ترین شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ محاصرہ ۲۵ روز جاری رہا۔اصحابِ مغازی کی اکثریت ابن اسحٰق کی پیروی میں اسی خیال کی تائید کرتی ہے۔(۶۹)

محاصرے کی کامیابی اور بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ

جب مسلمانوں نے بنو قریظہ کا محاصرہ سخت کر لیا اور بنو قریظہ کے لیے یہ ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے ارادہ کیا کہ ہتھیار ڈال دیں اور رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں، اسے قبول کر لیں۔انہوں نے اس سلسلے میں حضرت ابولبابہؓ بن عبدالمنذر سے

مشورہ کیا۔ حضرت ابولبابہؓ حضورﷺ کے صحابی تھے، اور بنو قریظہ کے ساتھ ان کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ حضرت ابولبابہؓ نے بنو قریظہ کو یہ اشارہ دیا کہ اگر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تو پھر انہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ بعد میں حضرت ابولبابہؓ کو اپنی اس بات کا بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سزا کے طور پر مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور اس وقت تک نہیں کھولا جب تک ان کی توبہ قبول نہیں ہوگئی۔ (۷۰)

بنو قریظہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ حضرت سعدؓ بن معاذ کا فیصلہ قبول کر لیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے قبیلے اوس کے ساتھ بنو قریظہ کا اتحاد ہے، اس لیے وہ ان کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں گے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ کو ان کے پاس اٹھا کر لایا گیا، جنگِ خندق میں ان کے ہاتھ میں تیر لگ جانے سے وہ زخمی ہو گئے تھے اور صاحب فراش تھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی دولت تقسیم کر دی جائے۔ رسول اللہﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے اس فیصلے کی تصدیق کی اور فرمایا: ''تم نے وہی فیصلہ کیا ہے جو اللہ کا فیصلہ ہے''۔ (۷۱) اس اقدام کے ذریعے حضرت سعدؓ اس معاہدے سے دستبردار ہو گئے جو انہوں نے بنو قریظہ کے ساتھ کیا تھا۔ حضرت سعدؓ کے اس فیصلے سے قبیلہ اوس میں کوئی بے چینی پیدا نہ ہوئی، حالانکہ ان کے بنو قریظہ کے ساتھ حلیفانہ تعلقات تھے اور وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ ان کی جانب سے اس فیصلے کو بہ سہولت مان لینے کا ایک سبب یہ تھا کہ یہ ان کے لیڈر حضرت سعدؓ کا فیصلہ تھا جو انہوں نے بنو قریظہ کے بارے میں کیا تھا۔ جن لڑنے والوں کو قتل کیا گیا، ان کی تعداد ۴۰۰ تھی۔ (۷۲) تین افراد کو اس سزا سے بری کیا گیا، کیوں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (۷۳) اور ان کی دولت بھی ان کے پاس ہی رہی۔ ان کے علاوہ تین افراد ایسے تھے جنہیں چند صحابہ کرامؓ نے اس بناء پر امان دے دی تھی کہ انہوں نے محاصرے کے دوران میں معاہدے سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ ان تینوں کو بھی سزا سے خارج کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں متعدد روایات پائی جاتی ہیں، لیکن انہیں کسی مضبوط شہادت کے طور پر نہیں لیا جا

سکتا۔قیدیوں کو بنت حارث کے مکان میں محبوس رکھا گیا (۷۴) اور مدینے کے بازار میں انہیں سزائے موت دی گئی جہاں خندقیں کھودی گئی تھیں۔ان قیدیوں کو جتھوں کی شکل میں قتل کر کے خندقوں میں پھینک دیا گیا۔(۷۵) بنوقریظہ کی صرف ایک خاتون تھی جس کو مردوں کے ساتھ قتل کیا گیا،(۷۶) کیوں کہ اس نے ایک صحابی حضرت خالدؓ بن سوید کو اس طرح شہید کیا تھا کہ ان کے اوپر چکی کا پاٹ گرا دیا تھا۔

بنوقریظہ کے ان تمام لڑکوں کو رہا کر دیا گیا جو نابالغ تھے۔(۷۷) جب ان تمام مردوں کو سزائے موت دے دی گئی جو لڑنے والوں کی فہرست میں شامل تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی دولت تقسیم کی اور ان کی خواتین کو مسلمانوں کی تحویل میں دے دیا۔(۷۸) کتبِ مغازی میں قدرے تفصیل پائی جاتی ہے کہ یہ تقسیم کس طرح عمل میں آئی تھی، لیکن ان روایات کو کسی قوی شہادت کے طور پر نہیں لیا جا سکتا۔

ابن اسحٰق، ابن سعد اور متعدد دیگر مصنفین کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک قیدی خاتون ریحانہ بنت عمرو بن خنافہ کو اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ واقدی اور اس کی اتباع کرنے والوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان خاتون سے شادی کی تھی، لیکن پہلی رائے زیادہ قرین قیاس ہے۔

عہد حاضر کے کچھ مؤرخین کا رجحان یہ ہے کہ بنوقریظہ کو دی جانے والی سزا کے متعلق جتنی روایات آتی ہیں، ان کا یا تو انکار کیا جائے یا انہیں کمزور قرار دیا جائے۔(۷۹) ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان روایات کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس سے انسانی جذبات مجروح ہوتے ہیں اور صیہونی پروپیگنڈے کو تقویت ملتی ہے، لیکن معاملہ قطعاً ایسا نہیں ہے۔ اسلام کے مستند ترین مآخذ سے یہ ثابت ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ بنوقریظہ کو سخت سزائیں محض اس لیے دی گئیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے بدترین غداری کا ثبوت دیا تھا، مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کے مرتکب ہوئے تھے اور معاہدے کو پامال کیا تھا، جب کہ اس معاہدے کی رو سے جو فریقین کے درمیان طے پایا تھا، انہیں مدینے کے دفاع میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی قومیں اپنے

باغیوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتی ہیں جو غداری کر کے دشمن سے جا ملتے ہیں۔

بنو قریظہ کو جو سزا دی گئی، وہ ان کے جرم کے عین مناسب تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہ دھمکی دی تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے گا، اور ان کی دولت پر قبضہ کر کے ان کی خواتین کو قیدی بنا لیا جائے گا، اس لیے یہ سزا ان کے بالکل مناسبِ حال تھی، چنانچہ مستند روایات سے انکار اور تاریخی حقائق سے روگردانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حواشی

۱- میں نے اس موضوع پر جمع شدہ روایات میں سے مفید ترین مواد تلاش کیا اور اس میں سے ''صحیح'' کا انتخاب کر کے اسے ایک مقالے میں شامل کرایا جو میری نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ مقالے کا عنوان تھا: مرويات يهود المدينة اور اس کے مصنف ہیں شیخ اکرم حسین علی۔ یہ مقالہ جامعہ اسلامیہ- مدینہ منورہ میں ایم- اے کی سند کے لیے پیش کیا گیا۔ تیز دیکھیے طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۴۷۹-۴۸۰؛ واقدی، المغازی، ۱: ۱۷۶؛ ابن سعد، طبقات ۲: ۲۸-۲۹

۲- طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۴۷۹-۴۸۰؛ واقدی، مغازی، ۱: ۱۷۶؛ ابن سعد، طبقات، ۲: ۲۸-۲۹

۳- ابن ہشام، سیرۃ، ۳۹۴؛ ابوداؤد، السنن، ۳: ۴۰۲-۴۰۳

۴- فتح الباری، ۷: ۳۳۲

۵- التقریب، ۳: ۲۰۵

۶- دیکھیے: مقالہ بعنوان Announcement of the Constitution

۷- ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۵۶۱؛ واقدی، مغازی، ۱: ۱۷۶-۱۷۷؛ ابن کثیر، البدایۃ، ۴: ۳-۴؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۱: ۲۹۵

۸- بخاری، صحیح، ۳: ۱۱

۹- عبداللہ بن ابی کے الفاظ ابن اسحٰق نے عاصم بن عمر کے حوالے سے روایت کیے ہیں اور ان پر سند ختم ہو جاتی ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۵۶۲-۵۶۳)۔

عاصم کا تعلق نچلے درجے کے تابعین سے ہے۔ محدثین کے معیار کے مطابق یہ روایت ''ضعیف'' ہے، لیکن اس کی نوعیت ایک ''خبر'' کی ہے جسے نقل کرنے کی اجازت ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ

سے نمایاں ہے کہ اس میں بنو قینقاع کے لڑنے والوں کی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۰- واقدی، مغازی، ۱: ۱۷۶-۱۷۷؛ ابن سعد، طبقات، ۲: ۲۹

۱۱- واقدی، مغازی، ۱: ۱۸۴

۱۲- دیکھیے: ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۵۶۴؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۳۳۷

۱۳- ابوداؤد، سنن، ۳: ۴۰۲

۱۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۵۶۴-۵۶۵۔ اس کی ایک سند کمزور ہے جس کا سلسلہ ایک نچلے درجے کے تابعی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، لیکن جو کچھ ہم نے نقل کیا ہے، وہ درست مانا گیا ہے اور اس کی تائید بہت سی صحیح روایات سے ہوتی ہے۔

۱۵- بخاری، صحیح، ۵: ۵۲-۶۲

۱۶- ابو داؤد، سنن، ۳: ۴۰۲؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۲: ۴۶۲-۴۶۴؛ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶: ۱۹۵-۱۹۶؛ مزید دیکھیے: ابن اسحٰق، سیرۃ، ۱۹۹-۲۰۰، ایک حسن سند کے ساتھ

۱۷- دیکھیے: طحاوی، مشکل الآثار، ۱: ۷۸-۷۹

۱۸- عبدالرزاق، المصنف، ۵: ۳۵۷؛ ابو داؤد، سنن، ۲: ۱۳۹-۱۴۰؛ کتاب الخراج والفئی والأمارۃ

۱۹- حاکم، المستدرک، ۲: ۴۸۳، کتاب التفسیر

۲۰- عبدالرزاق، المصنف، ۵: ۳۵۷

۲۱- بیہقی، دلائل النبوۃ، ۳: ۴۴۶-۴۵۰؛ ابونعیم، دلائل النبوۃ، ۳: ۱۷۶-۱۷۷

۲۲- ابن ہشام، سیرۃ؛ بخاری، صحیح، ۳: ۱۱، ابن اسحٰق سے معلق

۲۳- واقدی، مغازی، ۱: ۳۶۳؛ ابن سعد، طبقات ۳: ۵۷

۲۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۶۸۳

۲۵- ابن قیم، زاد المعاد، ۲: ۱۱۰

۲۶- فتح الباری، ۶: ۳۸۸-۳۸۹

۲۷- دیکھیے: طبری کی اسناد (تاریخ الرسل، ۶: ۱۴۶-۱۴۷)۔ ان میں سے چند ایک وہ ہیں جن کا سلسلہ یزید بن رومان پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، کچھ وہ ہیں جن میں محمد بن حمید رازی اور سلمہ بن فضل ابرشی شامل ہیں اور ان میں محمد بن حمید رازی کمزور ہیں۔ بیہقی، دلائل النبوۃ (۳: ۴۴۶-۴۴۸) میں دو اسناد ایسی شامل ہیں جو عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ تک جاتی ہیں (اور ان دونوں حضرات

پر ان دونوں اسناد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے)؛ ابن کثیر، تفسیر، ۳۱:۳، ابن اسحٰق، مجاہد اور عکرمہ سے منقول۔

۲۸- عبدالرزاق، المصنف، ۵:۳۵۹-۳۶۰؛ مزید دیکھیے: ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۳۱؛ ابوداؤد، سنن، ۲:۱۳۹-۱۴۰، کتاب الخراج والفئی و الامارۃ

۲۹- ابن اسحٰق، سیرۃ، ۳:۱۹۱

۳۰- ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۳۱

۳۱- ایضاً، ۷:۳۳۲

۳۲- بخاری، صحیح، ۳:۱۱؛ مسلم، صحیح، ۵:۱۵۹

۳۳- واقدی، مغازی، ۱:۳۶۳-۳۷۰، لیکن واقدی ''متروک'' ہیں۔ ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۶۸۲ بغیر سند کے؛ ابن سعد، طبقات، ۳:۵۷-۵۸ بغیر سند کے؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۳:۴۴۶-۴۵۰۔ دو اسناد کے ساتھ جن میں چار ایسے اصحاب شامل ہیں جو ''مجہول'' ہیں۔

۳۴- بیہقی، دلائل النبوۃ، ۳:۴۴۶-۴۴۸؛ ابونعیم، دلائل النبوۃ، ۳:۶۷ا-۱۷۷۔ ان کی اسناد میں ابوجعفر محمد بن عبداللہ بغدادی، ابوعلاثہ محمد بن عمرو بن خالد، محمد بن عبداللہ بن عتاب اور قاسم بن عبداللہ بن مغیرہ شامل ہیں۔ مجھے ان لوگوں کے حالات نہیں مل سکے، لیکن دو اسناد میں جو دیگر اصحاب شامل ہیں، وہ قابل اعتماد (ثقہ) ہیں۔

۳۵- طبری، تاریخ الرسل، ۳:۳۳۴-۳۳۵؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۳:۴۸؛ ابن کثیر، البدایۃ، ۳:۴۵ اور دیگر

۳۶- ابن سید الناس، عیون الاثر ۲:۴۹؛ ابن کثیر، تفسیر، ۴:۳۳۰؛ سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول، ص ۲۱۴

۳۷- عبدالرزاق، المصنف، ۵:۳۵۸-۳۶۱؛ ابوداؤد، سنن، ۳:۴۰۴-۴۰۷؛ بیہقی، دلائل النبوۃ ۳:۴۴۶-۴۴۸؛ مزید دیکھیے: ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۳۱

۳۸- (الحشر ۵۹:۵؛ ''جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا درخت یا رہنے دیا کھڑا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے'')۔

۳۹- بخاری، صحیح، ۳:۱۱، ۱۴۳؛ ابو داؤد، سنن، ۳:۳۶؛ ترمذی، سنن (مع شرح تحفۃ الاحوذی) ۵:۱۵۷-۱۵۸؛ ابن ماجہ، سنن، ۲:۹۴۸-۹۴۹

۴۰- عبدالرزاق، مصنف، ۵:۳۵۸-۳۶۱

۴۱- ابن سعد، طبقات، ۳: ۵۸

۴۲- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۶۸۳، بغیر سند کے؛ اس کی تائید اس بیان سے ہوتی ہے جو بیہقی کی دلائل النبوۃ میں ملتا ہے (۳: ۴۴۶-۴۴۹)، ایک ایسی سند کے ساتھ جس کا سلسلہ عروہ اور موسیٰ بن عقبہ کے ساتھ جا کر ملتا ہے۔ دو اسناد میں جن اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے حالات مجھے نہیں مل سکے۔

۴۳- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۶۸۳، ایک ایسی سند کے ساتھ جس کا سلسلہ عبداللہ بن ابوبکر سے جا کر ملتا ہے۔

۴۴- ''اور جو مال کہ لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے، سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے'' (الحشر ۵۹: ۶)۔

سورۃ الحشر بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی (صحیح بخاری، ۳: ۱۳۱؛ صحیح مسلم، ۸: ۳۴۵)

۴۵- عبدالرزاق، مصنف، ۵: ۳۵۸-۳۶۱؛ ابوداؤد، سنن، ۳: ۴۰۴-۴۰۷۔ مزید دیکھیے: ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۳۳۱؛ ابن ہشام، سیرۃ ۳: ۶۸۳-۶۸۴

۴۶- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۰۰-۷۰۱؛ عبدالرزاق، المصنف، ۵: ۳۶۸-۳۷۳؛ ابن سعد، طبقات، ۳: ۶۵-۶۶، ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۴۱۲-۴۱۴

۴۷- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۰۰-۷۰۱

۴۸- ابن سعد، طبقات، ۳: ۷۴؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۱۵؛ طبری، تاریخ الرسل، ۳: ۵۹۳؛ ابن سیدالناس، عیون الاثر، ۳: ۶۸

۴۹- عبدالرزاق، المصنف، ۵: ۳۶۷؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۶۹۹؛ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶: ۱۴۳۔ انہوں نے اسے طبرانی کے ساتھ منسوب کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس سند میں افراد ثقہ ہیں۔

۵۰- بخاری، صحیح، ۳: ۳۳۳، ۳۷، مزید دیکھیے مالک کی رائے

۵۱- ابن کثیر، البدایۃ، ۴: ۹۳-۹۴؛ السیرۃ النبویۃ ۳: ۱۸۰-۱۸۱؛ ابن قیم، زاد المعاد، ۳۸۸-۳۸۹؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۳۹۳

۵۲- عبدالرزاق نے اسے سعید بن المسیب کی ''مراسیل'' سے روایت کیا جو صحیح ترین ''مراسیل''

ہے۔ اگر دیگر روایات اس روایت کی تائید کرتی ہوں تو اس روایت کو شہادت کے طور پر لیا جا سکتا ہے (المصنف، ۵: ۳۶۸-۳۷۳)۔ ابو نعیم بھی سعید کی ''مراسیل'' سے روایت کرتے ہیں (ابو نعیم، دلائل النبوۃ، ۳: ۱۸۳)

۵۳- بخاری، صحیح، ۳: ۳۰۶؛ مسلم، صحیح، ۷: ۱۳۸

۵۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۰۶ بغیر سند

۵۵- واقدی، مغازی، ۳: ۴۵۴-۴۵۹؛ طبری، تاریخ الرسل ۳: ۵۷۰-۵۷۳؛ ابن حزم، جوامع السیرۃ، ۱۸۷-۱۸۸؛ ابن عبدالبر، الدرر، ۳: ۱۸۱؛ ابن سید الناس، عیون الاثر، ۳: ۵۹-۶۰؛ ابن کثیر، البدایۃ، ۳: ۱۰۳-۱۰۴

۵۶- ابن کثیر، البدایۃ، ۳: ۱۰۳-۱۰۴

۵۷- بخاری، صحیح، ۳: ۲۴؛ احمد، مسند، ۶: ۵۶، ۱۳۱، ۲۸۰

۵۸- بخاری، صحیح، ۳: ۲۴، ۱۴۴

۵۹- ایضاً، ۳: ۲۴

۶۰- مسلم، صحیح، ۵: ۱۶۳

۶۱- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۱۶-۷۱۷؛ معبد بن کعب بن مالک کی ''مراسیل'' میں سے جو ''مقبول'' ہے۔

۶۲- ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۴۰۸-۴۰۹

۶۳- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۱۶؛ ابن سعد، طبقات، ۳: ۷۴ (دونوں اسناد کے بغیر)

۶۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۷۱۶-۷۱۷؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۴۱۳

۶۵- طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۵۸۳۔ راوی کا کہنا ہے کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک ماہ کا عرصہ تھا یا ۲۵ روز کا۔

۶۶- ساعاتی، الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد، ۲۱: ۸۱-۸۳۔ تمام راوی قابل اعتماد ہیں۔

۶۷- ابن سعد، طبقات، ۳: ۷۴، بغیر سند کے

۶۸- ابن کثیر، البدایۃ، ۴: ۱۱۸-۱۱۹؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۴۱۳، موسیٰ بن عقبہ زہری سے روایت کرتے ہیں۔ روایت مرسل ہے۔

۶۹- طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۵۸۳؛ ابن حزم، جوامع السیرۃ، ۱۹۳؛ ابن عبدالبر، الدرر، ۱۸۹؛

ابن سید الناس، عیون الاثر، ۲: ۶۹

۷۰- ساعاتی، فتح الربانی، ۲۱: ۸۱-۸۳، حسن سند کے ساتھ

۷۱- بخاری، صحیح، ۲: ۱۲۰، ۳: ۲۴-۲۵؛ مسلم، صحیح، ۵: ۱۶۰-۱۶۱

۷۲- احمد، مسند، ۳: ۳۵۰، حسن سند کے ساتھ۔ ابن حجر (فتح الباری، ۷: ۱۴) نے ان کی تعداد میں اختلاف کا ذکر کیا ہے جو ۴۰۰ سے لے کر ۹۰۰ تک پایا جاتا ہے اور مختلف روایات کو یہ کہہ کر ہم آہنگ کیا ہے کہ اضافۂ تعداد میں بنوقریظہ کے غلام، آزاد اور دیگر افراد شامل ہیں۔

۷۳- بخاری، صحیح، ۳: ۱۱؛ مسلم، صحیح، ۵: ۱۵۹۔ وہ تین افراد جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: ثعلبہ بن سعیہ، اسید بن سعیہ اور اسد بن عبید۔

۷۴- یہ ابن اسحٰق کی روایت ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۲۱)۔ عروہ ذکر کرتے ہیں کہ یہ اسامہ بن زید کا گھر تھا۔ دونوں روایات کو یوں ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے کہ قیدیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں دو مکانوں میں رکھا گیا تھا۔

۷۵- احمد، مسند، ۳: ۳۵۱؛ ترمذی، سنن، ۴: ۱۴۴-۱۴۵

۷۶- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۲۲؛ احمد، مسند، ۶: ۲۷۷؛ ابوداؤد، سنن، ۲: ۱۵۰ (اس کی سند "حسن لذاتہ" ہے)۔

۷۷- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۲۴؛ ابن سعد، طبقات، ۲: ۷۶-۷۷

۷۸- بخاری، صحیح، ۳: ۱۱؛ مسلم، صحیح، ۵: ۱۵۹

۷۹- دیکھیے: عالمی سیرت کانفرنس۔ قطر کے مقالات میں ڈاکٹر ولید عرفان کا مقالہ

خیبر(۱) اور حجاز کے باقی ماندہ یہودی قلعوں کی فتح

خیبر ایک نخلستانی علاقہ ہے جو مدینے کے شمال میں (۲) تقریباً ۱۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جو سطح سمندر سے ۸۵۰ میٹر کی بلندی پر ہے۔ حرہ بنوسلیم کے بعد یہ جزیرہ نمائے عرب کا دوسرا بڑا حرہ ہے۔(۳) خیبر ایک زرخیز علاقہ ہے جہاں پانی کی کثرت ہے اور کھجور کے درختوں کی بہتات ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی پیداوار میں گیہوں اور پھل شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خیبر کو اس کی زرخیزی، اس کے ناقابل تسخیر استحکام اور اس کے مویشیوں کے باعث حجاز کا باغ کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک بازار تھا جسے ''سوق النطاۃ'' کہا جاتا تھا۔ یہ بازار قبیلہ غطفان کی نگرانی میں تھا جو خیبر کو اپنے علاقے کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ (۴)

اس علاقے کی اقتصادی حیثیت کی بناء پر بہت سے تاجروں اور دستکاروں کی یہاں بود و باش تھی اور زرمبادلہ کا لین دین زوروں پر رہتا تھا۔

فتح سے پہلے خیبر کی آبادی عربوں اور یہودیوں پر مشتمل ایک ملی جلی آبادی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینے سے یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد یہاں یہودیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ (۵)

خیبر کے یہودیوں نے اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ کسی دشمنی کا مظاہرہ نہ کیا تھا، جب تک بنونضیر کے سرکردہ افراد وہاں جا کر آباد نہیں ہوئے تھے۔ بنونضیر کے ان سرداروں کو اپنی جلاوطنی کا دکھ تھا۔ جلاوطنی کی وجہ سے ان کی طاقت میں کوئی کمزوری نہ آئی تھی، کیوں کہ مدینے سے وہ اس حال میں نکلے تھے کہ نہ صرف ان کے بیوی بچے ہمراہ تھے، بلکہ مال و دولت کی بھی ان

کے پاس فراوانی تھی اور فخر وغرور اور خود پسندی کے طور پر گانے والوں کی ایک جماعت ان کے آگے ڈھول پیٹتی ہوئی جا رہی تھا۔ اُس زمانے میں یہ ایسا مظاہرہ تھا جو اس سے پہلے کسی بھی قوم میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔(۶)

بنونضیر کے نمایاں ترین سردار جو خیبر میں آباد ہوئے، وہ سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب تھے۔ جب یہ لوگ خیبر آ کر آباد ہوئے تو لوگوں نے ان کی سرداری قبول کر لی۔(۷)

ان تین افراد کی سرداری کا تسلیم کیا جانا، اس بات کے لیے کافی تھا کہ خیبر کے یہودیوں کو انتقام کے نام پر مسلمانوں کے خلاف تصادم میں گھسیٹ لیا جائے۔ مسلمانوں کے خلاف دلی نفرت اور مدینے واپسی کی شدید خواہش انہیں اس تصادم پر اکسا رہی تھی۔

خیبر کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف پہلا قدم غزوۂ خندق کے موقع پر اٹھایا، جب انہوں نے بنونضیر کے سرداروں کی رہنمائی میں مسلمانوں کے خلاف قبیلۂ قریش اور عرب بدوؤں کو مشتعل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، اور اس مقصد کے لیے اپنی ذاتی رقم بھی خرچ کی۔ اس کے بعد وہ بنوقریظہ کو مسلمانوں سے غداری کرنے اور ان کے دشمنوں کے ساتھ تعاون پر قائل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔(۸)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت فرمائی، وہ نہ صرف مدینے کا دفاع کرنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ دشمن قبائل کو منہ کی کھانا پڑی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ محسوس فرمایا کہ اب خیبر کی صورتِ حال سے نمٹنا بے حد ضروری ہو گیا ہے، کیوں کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے شدید خطرے کا باعث تھی۔

ابن اسحٰق ایک ایسی سند کے حوالے سے روایت کرتے ہیں جس کا ایک راوی مجہول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے نام ایک خط روانہ فرمایا۔ اس خط میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی تھی، اور یہ یاد دلایا گیا تھا کہ ان کے اپنے صحیفوں میں بھی رسول اللہ ﷺ کی آمد کی خبر دی گئی ہے۔(۹) اس خط کے جواب میں نہ تو یہودیوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا، اور نہ

اس پر کوئی معذرت ہی کی کہ انہوں نے مسلمانوں کے دشمنوں کو ان کے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے فوری طور پر ان سرداروں کی سرکوبی کا فیصلہ فرمایا جنھوں نے آپ کے خلاف اشتعال انگیزی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ان سرداروں میں سلام بن ابی الحقیق بھی شامل تھا۔رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن عتیک اور چند دیگر انصار کو اس مقصد کے لیے روانہ فرمایا جنھوں نے اسے قتل کر دیا۔

امام بخاریؒ نے اس قتل کی تفصیل نقل کی ہے: ''سلام بن ابی الحقیق کی رہائش ایک قلعے میں تھی اور قلعے کے چاروں طرف حفاظتی فوج متعین تھی، لیکن حضرت عبداللہؓ بن عتیک نے اپنی خوش تدبیری سے اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کر لیا اور اس یہودی سردار کو اس کی خواب گاہ میں جا کر قتل کیا''۔(۱۰) اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عتیک ایک جرأت مند انسان تھے اور عقیدے کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار اور شائق رہتے تھے۔

لیکن مسلمانوں کے سروں پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا، اسے دور کرنے کے لیے محض چند سرداروں کا صفحۂ ہستی سے ختم کر دینا کافی نہیں تھا۔مسلمانوں اور قریش کے درمیان ۶ھ میں جو معاہدۂ حدیبیہ عمل میں آیا تھا، اس نے مسلمانوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ خیبر کو فتح کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔متعدد مفسرین کرام اس رائے سے متفق ہیں کہ **سورۃ الفتح** میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ خیبر کو فتح کریں گے اور اس کا مالِ غنیمت انہیں حاصل ہوگا۔**سورۃ الفتح** اس وقت نازل ہوئی تھی جب مسلمان حدیبیہ سے لوٹ رہے تھے۔

> بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا، جبکہ یہ لوگ آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا اللہ کو بھی معلوم تھا، پس اللہ تعالیٰ نے ان میں اطمینان پیدا کر دیا اور ان کو لگے ہاتھ فتح دے دی اور (اس فتح میں) بہت سی غنیمتیں بھی (دیں) جن کو یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست بڑا حکمت والا ہے۔اللہ تعالیٰ نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لو گے۔سو سر دست تم کو یہ دے دی ہے اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، اور تاکہ

(یہ واقعہ) اہل ایمان کے لیے ایک نمونہ ہو جائے اور تا کہ تم کو ایک سیدھی سڑک پر ڈال دے اور ایک فتح اور بھی ہے جو تمہارے قابو میں نہیں آئی۔ خدا تعالیٰ اس کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (الفتح ۴۸: ۱۸-۲۱)۔

خیبر کی مہم کب پیش آئی؟

ابن اسحٰق کا خیال ہے کہ یہ مہم محرم ۷ھ کو پیش آئی۔ واقدی کی رائے میں یہ واقعہ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد ہجرت کے ساتویں برس صفر یا ربیع الاوّل کے مہینے میں پیش آیا۔ صلح حدیبیہ ہجرت کے چھٹے سال ذوالحجہ (۱۱) میں ہوئی تھی۔ زہری اور امام مالک نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ مہم ہجرت کے چھٹے سال محرم میں پیش آئی (۱۲)۔ مؤرخین نے اس مہم کی تاریخ کا تعین کرنے میں انہی قدیم مصنفین کی آراء کو اختیار کیا ہے، اس لیے ان کی آراء میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ ابن اسحٰق اور واقدی کی آراء میں کوئی بہت زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا، محض تین ماہ سے بھی کم کا فرق ہے۔ ان اصحاب کے درمیان، نیز زہری اور امام مالک کے درمیان اختلاف رائے اس بناء پر ہے کہ یہ تمام لوگ اس امر پر بھی متفق نہیں کہ ہجری سال کے آغاز کا تعین کب سے ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے ربیع الاوّل سے پہلے آئے ہوئے مہینوں کو بھی ہجری سال میں شامل کیا (ہجرت ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی تھی)، اس لیے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں رونما ہونے والے واقعات پر ایک سال کا مزید اضافہ کر دیا، لیکن کچھ دوسرے مصنفین نے ان مہینوں کو نظر انداز کر دیا اور ربیع الاوّل کے مہینے ہی سے ہجری سال کے آغاز کا تعین کیا، اس لیے انہوں نے تمام واقعات کی تاریخوں سے ایک سال منہا کر دیا۔ ابن حجر نے واقدی کی رائے پر ابن اسحٰق کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ (۱۳)

خیبر کا سفر

مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سربراہی میں خیبر کی طرف روانہ ہوئے تو شدتِ جوش کے عالم میں بلند آواز سے تکبیر و تہلیل کہہ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اپنی آوازیں

پست کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''تم ایک ایسی ہستی کو پکار رہے ہو جو انتہائی قریب ہے، تمہارے ساتھ ہے اور سب کچھ سنتی ہے''۔(۱۴) اس واقعہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مسلم افواج کس جذبے سے سرشار تھیں۔ ایمان کی طاقت نے انہیں متحرک اور فعّال اور ان کے عزائم کو بلند کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ ایک ایسی مہم کے لیے رواں دواں تھے، جس میں ان کا مقابلہ ان لوگوں سے تھا جن کے پاس مضبوط قلعے تھے، وہ کیل کانٹے سے لیس تھے، اور ان کے پاس سامانِ رسد کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن ان میں سے کوئی چیز مسلمانوں کے عظیم الشان نصب العین کے حصول میں رکاوٹ نہ بن سکی۔

واقدی واحد مصنف ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے سفرِ خیبر کے راستوں کی مکمل تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ واقعاتِ سیرت سے متعلق راستوں کے بیان اور مقامات کے تعین میں واقدی کا ایک نمایاں مقام ہے، وہ خود ان راستوں پر جایا کرتے اور ان کے متعلق تحقیقات کیا کرتے تھے۔ انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینے سے نکلے اور ثنیۃ الوداع ، زغابہ، نقمیٰ ، المستناح ، الوطیح ،عصر، صہباء اور الخراصہ کے راستوں سے ہوتے ہوئے روانہ ہوئے ، پھر آپ الشق اور النطاہ کے درمیانی علاقے سے گزرے۔ وہاں سے آپؐ المنزلہ اور الرجیع کے راستے پر ہوتے ہوئے خیبر پہنچے۔(۱۵) الرجیع کا علاقہ خیبر کے شمال مشرقی سمت میں واقع ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس راستے کا انتخاب کر کے رسول اللہ ﷺ خیبر کے علاقے کو شام اور غطفان میں اس کے حلیفوں سے کاٹنا چاہتے تھے۔

فتح خیبر کا بیان

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے النطاہ کو فتح کیا اور یہاں کے دو قلعے جن کے نام ناعم اور صعب تھے، مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے الشق کو فتح کیا اور یہاں کے دو قلعے ابی اور نزار مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ النطاہ اور الشق خیبر کے شمال مشرق میں واقع ہیں۔ اس کے بعد آپ نے الکتیبہ کو فتح کیا اور اس کا قلعہ منیع (القموص) مسلمانوں کے زیرِ نگین آ گیا۔ یہ ابن ابی الحقیق کا قلعہ تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے الوطیح اور السلالم کے علاقے فتح کر کے وہاں کے قلعوں کو اپنے قبضے میں لیا۔ واقدی کے بیان کے مطابق یہ وہ

سلسلہ وار فتوحات ہیں جو خیبر کے نواحی علاقوں میں پیش آئیں۔(۱۶) واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے ابن اسحٰق کا بیان قدرے مختلف ہے۔وہ واقدی کے اس بیان سے تو متفق ہیں کہ فتوحات کا سلسلہ النطاہ کے علاقے سے شروع ہوا، جہاں ناعم نامی قلعہ فتح کیا گیا،لیکن وہ واقدی کی اس معاملے میں تردید کرتے ہیں کہ وہ القموص کی فتح کو صعب کی فتح سے پہلے قرار دیتے ہیں۔(۱۷)

مستند احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ طلوع شمس سے پہلے خیبر پہنچ گئے تھے اور آپؐ نے فجر کی نماز خیبر کے نواح میں ادا کی۔ پھر آپؐ نے سورج نکلنے سے پہلے ہی خیبر پر حملہ کیا۔ یہودی کسان جو علی الصباح اپنے مویشیوں، کھرپوں اور ٹوکریوں کے ساتھ اپنے کھیتوں پر گئے تھے،مسلم فوج کو اچانک اپنے قریب دیکھ کر حیرت سے چلا اٹھے: ''محمد اور اس کی فوج!'' رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''اللہ اکبر! خیبر برباد ہو گیا ہے، جب ہم ان لوگوں کے کھلے میدانوں میں اتر آئے ہیں تو ان لوگوں کی صبح بری ہو گی جنہیں متنبہ کیا گیا تھا، (مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی)''۔(۱۸)

یہودیوں نے اپنے قلعوں میں پناہ لے لی اور مسلمانوں نے الناعم نامی قلعے کا محاصرہ کر لیا۔قبیلہ غطفان کے لوگ فوری طور پر خیبر کے یہودیوں کی مدد کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے، کیوں کہ وہ ان کے حلیف تھے،تاہم انہوں نے اس خوف سے لڑائی میں حصہ نہیں لیا کہ ایسا نہ ہو کہ مسلمان ان کے گھروں پر حملہ کر دیں۔ واقدی کا بیان ہے کہ غطفانی خیبر کے قلعوں تک پہنچ گئے تھے،لیکن ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ وہ خیبر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے گھروں کو واپس ہو گئے تھے۔ واقدی وہ واحد مصنف ہیں جن کا بیان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ غطفان کے لوگوں کو یہ پیش کش کی تھی کہ اگر وہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں تو انہیں خیبر کی زمینوں سے کھجوروں کی ایک فصل دی جائے گی،لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ روایت قابل اعتماد نہیں ہے،کیوں کہ واقدی کی حیثیت کمزور ہے اور وہ واحد مصنف ہیں جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے۔(۱۹)

قلعہ ناعم کے محاصرے کے پہلے دو روز تک مسلم افواج کا علم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے

ہاتھ میں تھا،لیکن ان کے ہاتھوں قلعے پر قبضہ نہ ہو سکا اور مسلمانوں پر سخت اضمحلال اور مایوسی طاری ہونے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے خطاب فرمایا: ''کل میں یہ علم ایک ایسے شخص کو سپرد کروں گا جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں، اور وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، وہ اس وقت تک واپس نہیں پلٹے گا، جب تک یہ قلعہ اس کے ہاتھ پر فتح نہیں ہو جاتا''۔ یہ خطاب سن کر مسلمانوں کے حوصلے دوبارہ بلند ہو گئے۔ اگلی صبح نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو طلب فرمایا اور علم کے سپرد کر دیا۔ تیسرے روز حضرت علیؓ نے مسلم افواج کا علم بلند کیا اور انہیں فتح نصیب ہوئی۔(۲۰) ایک اور روایت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت علیؓ سے پہلے اسلامی فوج کے علم بردار حضرت ابوبکر صدیقؓ نہیں، بلکہ حضرت عمرؓ بن خطاب تھے، لیکن یہ روایت اس لیے کمزور ہے کہ اس میں میمون البصری پر اعتماد کیا گیا ہے اور وہ ''ضعیف'' ہیں۔(۲۱) ایک اور روایت سے پتہ چلتا ہے کہ محاصرے کے تیسرے روز حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے باری باری علم بلند کیا، لیکن یہ بھی ایک کمزور روایت ہے، کیوں کہ اس کے راوی بریدہ بن سفیان کمزور ہیں۔(۲۲)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ خیبر کے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دیں اور انہیں اس بات سے آگاہ کریں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے کیا حقوق ہیں۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی اسلام کی توفیق عطا فرما دے تو یہ نعمت تمہارے لیے بیش قیمت اونٹوں سے کہیں زیادہ ہے''۔(۲۳) آپؐ کے اس فرمان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو خیبر کے مالِ غنیمت سے دلچسپی نہیں تھی، بلکہ آپ کی تمام تر جدوجہد اسلام کا پیغام عام کرنے اور اس کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کرنے کی خاطر تھی۔

جب حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا: ''یا رسول اللہ! میں کس بنیاد پر ان لوگوں سے جنگ کروں؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''اس وقت تک ان لوگوں سے جنگ کرو، جب تک یہ نہ کہیں کہ 'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'، اگر وہ یہ تسلیم کر لیں تو ان کا خون اور ان کا مال تم سے محفوظ ہو جائے گا سوائے اس کے جو واجب الادا ہے (جیسے

زکوٰۃ وغیرہ)، اور اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں سے بخوبی واقف ہے''۔(۲۴)

قلعہ ناعم کے محاصرے کے دوران میں حضرت محمودؓ بن مسلمہ انصاری اس طرح شہید ہوئے کہ مرحب یہودی نے قلعے کی بلندی سے ایک چٹان ان کے اوپر گرادی۔(۲۵) حضرت علیؓ مرحب کے مقابل آئے اور اسے قتل کر دیا۔(۲۶) مرحب یہودیوں کے نمایاں ترین افراد میں سے ایک تھا، چنانچہ اس کی موت سے یہودیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔

بہت سی روایات سے پتا چلتا ہے کہ کسی یہودی نے حضرت علیؓ کی ڈھال پر ضرب لگائی اور ڈھال گر گئی تو حضرت علیؓ قلعہ ناعم کا ایک دروازہ ڈھال کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے، لیکن ان روایات میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔(۲۷) ان روایات کو مسترد کرنے سے حضرت علیؓ کی بہادری اور شجاعت کا انکار لازم نہیں آتا، کیوں کہ ان کے علاوہ بے شمار ایسی روایات موجود ہیں جو کسی شک وشبہ کے بغیر حضرت علیؓ کی ان صفات عالیہ کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہیں۔

قلعہ ناعم کے فتح ہونے میں دس روز لگے۔(۲۸) اس کے بعد مسلم افواج صعب بن معاذ نامی قلعے کی طرف بڑھیں جو النطاہ کے علاقے میں واقع تھا اور وہاں ۵۰۰ سپاہی خوراک اور اسلحے کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ مسلمان خوراک کی کمی کا شکار تھے۔ حضرت حبابؓ بن منذر نے قلعے کی فتح تک علم بلند کیے رکھا اور حسنِ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت دلیری کے ساتھ یہودیوں سے لڑے۔ یہ قلعہ فتح کرنے میں تین دن لگے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے الزبیر نامی قلعے کو فتح کیا جو النطاہ کا آخری قلعہ تھا۔ ناعم، صعب اور یہودیوں کے دیگر قلعے جو مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو چکے تھے، ان تمام مقامات سے یہودی پناہ گزین قلعۃ الزبیر میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ یہ ایک بلند اور ناقابل تسخیر قلعہ تھا۔ مسلمانوں نے پانی کی رسد منقطع کر دی اور یہودیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ قلعے سے باہر آ کر جنگ کریں۔ اس محاصرے کے دوران میں دس یہودی قتل ہوئے اور تین روز کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔ النطاہ کے لوگوں سے نمٹنے کے بعد جو یہودیوں کی مضبوط ترین جمعیت تھی، مسلمان رجیع سے منزلہ کی طرف روانہ ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ النطاہ کے لوگوں کو شکست فاش دینے اور ان کی خوراک

اور ساز و سامان پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کی قوت مزید مستحکم ہوگئی تھی اور خیبر کی باقی ماندہ یہودی آبادی کو النطاہ کے زوال اور شکست فاش نے چوکنا کر دیا تھا۔

اب مسلمان الشق کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس علاقے میں بے شمار قلعے موجود تھے جن میں ابی اور نزار نامی قلعے بھی شامل تھے۔ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کا آغاز ابی سے کیا۔ کچھ یہودی جنگجو تو قلعے کے سامنے پہلے ہی حملے میں مارے گئے۔ اس کے بعد مسلمان ایک طوفان کی طرح قلعے میں داخل ہوئے اور ان کی خوراک اور بقیہ ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ یہودی فوج کا کچھ حصہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا جس نے نزار کے قلعے میں ناکہ بند ہو کر مسلمانوں پر تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی، لیکن مسلمانوں کی طاقت کے بالمقابل ان کی قوتِ مدافعت جلد ہی دم توڑ گئی اور مسلمانوں نے قلعہ فتح کر لیا۔ الشق کی باقی ماندہ آبادی اپنے قلعوں سے نکل کر کتیبہ کے علاقے کی طرف فرار ہوگئی جو خیبر کے جنوب مغرب میں واقع تھا اور یہ لوگ القموص المنیع نامی قلعے میں ناکہ بند ہوگئے۔ کچھ شکست خوردہ لوگ الوطیح اور السلالم کے قلعوں میں جا کر وہاں کے لوگوں کے ساتھ قلعہ بند ہوگئے۔ مسلمانوں نے چودہ روز تک ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ آخر کار انہوں نے جنگ سے گریز کرتے ہوئے امن کا مطالبہ کر دیا۔ نزار وہ آخری قلعہ تھا جہاں جنگ ہوئی۔ اس کے بعد یہودی طاقت نے دم توڑ دیا اور یہودیوں نے اپنے قلعوں میں محصور ہو جانے پر ہی اکتفاء کیا، اور ہر مرتبہ ان کی محصوری کا اختتام ان کے مطالبۂ امن پر ہوا۔

الصعب اور الزبیر نامی قلعوں اور الشق اور الکتیبہ نامی علاقوں کی فتوحات کی تمام تفصیلات کی بنیاد واقدی کے بیان پر ہے۔ (۲۹) وہ واحد مصنف ہیں جو ان تمام علاقوں کی فتوحات کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مؤرخ ہیں جن کے پاس معلومات کا ذخیرہ ہے، مگر محدثین کی نظر میں ان کی حیثیت کمزور ہے، تاہم ان کی روایت کا تعلق اس قسم سے ہے جو قابل قبول ہے۔

فتح خیبر کے متعلق ابن اسحٰق کی روایات کو جب خیبر کے قلعوں کے محل وقوع کی روشنی

میں پرکھا جائے تو ان میں صحت کی کمی اور ایک الجھاؤ نظر آتا ہے۔

ایک مستند روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے لوگوں سے جنگ کی، پھر ان کے خطۂ زمین اور کھجور کے درختوں کا محاصرہ کیا اور انہیں ان کے قلعوں میں واپس جانے پر مجبور کیا۔ وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ سونا، چاندی، ہتھیار اور اسلحہ رسول اللہ ﷺ کی ملکیت ہوں گے اور وہ خود اتنا ہی مال و اسباب لے سکیں گے جتنا ان کی سواریاں لے جا سکتی ہیں۔ انہوں نے یہ شرط بھی قبول کی کہ وہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ اگر انہوں نے کوئی چیز چھپانے کی کوشش کی تو پھر ان کے ساتھ کوئی معاہدہ باقی نہیں رہے گا اور نہ ان کی حفاظت کا ذمہ ہی باقی رہے گا۔ انہوں نے کچھ مشک چھپایا جو دراصل حیی بن اخطب کا تھا۔ حیی بن اخطب جنگِ خیبر سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا اور یہ مشک وہ اس وقت اپنے ساتھ لایا تھا جب بنونضیر کو مدینے سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ سعیہ (۳۰) سے پوچھا گیا: ''حیی بن اخطب کا مشک کہاں ہے''؟ اس نے جواب دیا کہ '' وہ مشک جنگ اور دیگر اخراجات میں کام آ گیا''، لیکن اس کے بعد مسلمانوں نے وہ مشک ڈھونڈ نکالا اور ابن ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ (۳۱)

ابن اسحٰق نے کسی سند کے بغیر یہ لکھا ہے کہ جس شخص نے یہ خزانہ چھپایا تھا اور اس سے اس بارے میں جواب طلبی کی گئی تھی، وہ کنانہ بن ربیع تھا۔ (۳۲) ابن سعد نے کنانہ اور اس کے بھائی ربیع (۳۳) کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد کی سند میں محمد بن عبدالرحمٰن بن لیلیٰ بھی شامل ہے جو ''صدوق'' ہے، مگر انتہائی کمزور حافظے کا مالک ہے۔ (۳۴)

یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ القموص نامی قلعے کے یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے امن کی درخواست کی، لیکن بعد میں انہوں نے یہ معاہدہ توڑ دیا، اس لیے آپؐ نے ان کا مال و اسباب لے لیا۔ النطاہ، الشق اور القموص کی شکست کے بعد، الوطیح اور السلالم کے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی مدافعت بے کار اور بے نتیجہ رہے گی، چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان سے تعرض نہ کیا جائے اور انہیں وہاں سے نکل جانے کی اجازت دے دی

جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔(۳۵)

خیبر کا باقی ماندہ علاقہ بھی مسلمانوں کے زیرنگیں آ گیا۔ خیبر کے شمال میں واقع فدک کے لوگوں نے بھی امن طلب کرنے میں عجلت سے کام لیا اور یہ درخواست بھی کی کہ انہیں وہاں سے بحفاظت چلے جانے کا موقع دیا جائے اور وہ اس کے بدلے میں اپنی کل دولت دینے کو تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمالی۔(۳۶) فدک کا علاقہ خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ کے حصے میں آیا، کیوں کہ آپؐ نے اس علاقے کے لیے کوئی مہم جوئی نہیں کی تھی اور کسی قسم کا کوئی فوجی دستہ استعمال نہیں کیا تھا، نہ گھوڑوں کا اور نہ اونٹوں کا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے وادی القریٰ کا محاصرہ کیا، یہ چند دیہات پر مشتمل ایک بستی تھی جو خیبر اور تیماء کے درمیان چند روز کی مسافت پر واقع تھی۔(۳۷) اس بستی نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے اور مسلمانوں کو ان کے ہاں سے کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا، لیکن مسلمانوں نے وہ خطۂ زمین اور کھجور کے درخت یہودیوں ہی کے پاس رہنے دیے اور ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو خیبر والوں سے کیا تھا۔ تیماء میں بھی اس قسم کا ایک معاہدۂ امن طے پایا جیسا خیبر اور وادی القریٰ میں طے پایا تھا۔(۳۸)

اسی طرح باقی ماندہ یہودی قلعے بھی مسلمانوں کے زیرنگین آ گئے۔ ابن اسحٰق نے ''منقطع'' سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ الوطیح، السلالم اور فدک کے لوگوں نے معاہدۂ امن کی درخواست کی تھی، لیکن فقہی معیارات کے مطابق یہ کوئی قوی شہادت نہیں ہے، البتہ اس بیان کو ایک تاریخی واقعے کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس کے راوی عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم مغازی کے بارے میں معلومات نقل کرنے میں معروف ہیں۔

جنگ خیبر میں قتل ہونے والے یہودی مردوں کی تعداد ۹۳ تھی،(۳۹) ان مقتولین کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ انہی قیدیوں میں صفیہؓ بنت حیی بن اخطب بھی شامل تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کر کے ان سے عقدِ نکاح فرمایا۔(۴۰)

ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق مسلمان شہداء کی تعداد ۲۰ تھی۔(۴۱) واقدی کا کہنا ہے

کہ اس معرکے میں ۱۵ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہود کا قلع قمع کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ نصرتِ خداوندی شامل تھی۔ یہودیوں نے اپنے مضبوط ترین قلعوں میں بیٹھ کر جنگ کی، اس کے باوجود ان کے مقتولین کی تعداد مسلمان شہداء کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے جو کھلے میدان میں کھڑے ہو کر لڑے۔ ایک ''صحیح'' روایت یہ ہے کہ ایک یہودی خاتون نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی اور بھیڑ کا بھنا ہوا زہر آلود گوشت لا کر سامنے رکھا۔ خاتون کو یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ شانے کا گوشت زیادہ رغبت سے کھاتے ہیں، اس لیے اس نے گوشت کے اس ٹکڑے پر زہر زیادہ لگایا۔ جونہی رسول اللہ ﷺ نے تھوڑا سا گوشت چکھا، آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس پر زہر لگایا گیا ہے، اس لیے آپ نے اسے کھانے سے گریز کیا۔ یہودی عورت سے باز پرس کی گئی تو اس نے اپنا جرم تسلیم کر لیا، لیکن اسے معاف کر دیا گیا (۴۲) مگر جب آپؐ کے ایک صحابی حضرت بشرؓ بن معرور اسی گوشت کا ایک ٹکڑا کھانے کی وجہ سے انتقال کر گئے تو اس وقت اس عورت کو موت کی سزا دی گئی۔ (۴۳)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خیبر کی فتح اس لیے آسان ہوئی کہ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد وہ یہودیوں سے لڑنے میں آزاد تھے اور معاہدے کی رو سے قریش یہودیوں کی مدد کو نہیں آ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ قبیلہ غطفان کو بھی اپنے گھروں کا خوف لاحق ہوا اور انہوں نے خیبر کے یہودیوں سے اپنا اتحاد ختم کر لیا۔ جب قریش کو یہ خبر ملی کہ مسلمانوں کو خیبر کے یہودیوں پر فتح حاصل ہو گئی تو وہ شدید غم اور غصے کا شکار ہوئے۔ (۴۴) یہ فتح اس لیے بالکل غیر متوقع تھی کہ خیبر میں یہودیوں کے مضبوط ترین قلعے، مستحکم پناہ گاہیں، ان کے جنگجوؤں کی بڑی تعداد اور بڑے پیمانے پر ان کے ہتھیاروں کی شہرت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ فتح خیبر کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ دیگر عرب قبائل جن کے لیے یہ فتح بڑی حیران کن تھی، مسلمانوں کی اس عظیم الشان کامیابی سے سخت خوفزدہ ہو گئے اور جارحیت سے باز آ کر مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اس طرح اسلام کی توسیع و اشاعت کے لیے نئے راستے کھل گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو وہاں سے جلا وطن نہیں کیا۔ ایک مستند روایت

سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو خیبر میں سکونت پذیر رہنے کی اجازت اس شرط پر دی تھی کہ ان کی زرعی زمینوں پر محنت بھی ان کی ہوگی اور سرمایہ بھی انہی کا ہوگا، لیکن ان کی فصلوں کا آدھا حصہ مسلمان وصول کریں گے۔ یہ شرط اس بناء پر عائد کی گئی تھی کہ اگر مسلمان چاہتے تو انہیں یہ حق حاصل تھا کہ یہودیوں کو خیبر سے جلاوطن کر دیتے، لیکن یہودیوں نے فوراً رسول اللہ ﷺ کو یہ پیشکش کر دی اور کہا: ''ہم اپنی زمینوں سے تم سے زیادہ واقف ہیں''۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ انہیں خیبر سے جلاوطن کرنے کا تھا، تاہم آپؐ نے ان کی پیشکش قبول کر لی۔ (۴۵)

آپ کے اس ارادے سے یہ پتا چلتا ہے کہ تمام خیبر طاقت کے ذریعے فتح کیا گیا تھا ۔جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ امن قائم کیا، انہوں نے یہ اس شرط پر کیا کہ ان کی جان بخشی کی جائے گی اور انہیں بحفاظت وہاں سے جانے دیا جائے گا۔

یہودی بدستور خیبر میں آباد رہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنا ایک نمائندہ اس غرض سے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے کہ وہ فصلوں کا اندازہ لگا کر برداشت میں سے مسلمانوں کا حصہ وصول کرے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو اس مقصد سے وہاں بھیجا۔ انہوں نے آدھی فصل کا اندازہ ٹھہرایا جو بیس ہزار اونٹوں کے بوجھ کے بقدر کھجوریں تھیں۔ اب حضرت عبداللہؓ نے یہودیوں کو اختیار دیا کہ وہ دو برابر برابر حصوں میں سے جو حصہ چاہیں لے لیں اور دوسرا ان کے لیے چھوڑ دیں۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے اس انصاف کو دیکھ کر یہودی عش عش کرا اٹھے اور بولے: ''زمین اور آسمان اسی انصاف کی بناء پر قائم ہیں۔ ہم تمہارے کیے پر راضی ہیں اور جو حصہ تم دیتے ہو، وہی لینے کو تیار ہیں''۔ (۴۶)

لیکن ایک اور مستند روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے پوری فصل کا اندازہ ٹھہرایا جو چالیس ہزار اونٹوں کے بوجھ کے بقدر ٹھہرا۔ یہودیوں نے ان کے اندازے کو درست تسلیم کیا اور بیس ہزار اونٹوں کے بوجھ کے بقدر کھجوریں مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ (۴۷)

ان دونوں روایات کو ایک دوسرے کے ساتھ یوں ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے کہ ۴۰ سے مراد یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کا حصہ ہے اور ۲۰ سے کسی ایک فریق کا حصہ مراد ہے۔

فتح خیبر کے اثرات

بلاشبہ فتح خیبر سے مسلمانوں کو عظیم الشان فوائد حاصل ہوئے، اور آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بن جانے کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔ فتح خیبر پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''اب ہم پیٹ بھر کر کھجوریں کھا سکتے تھے''۔ ابن عمرؓ نے اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''خیبر کی فتح کے بعد ہم نے شکم سیر ہو کر کھایا''۔ (۴۸)

ان روایات سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ فتح خیبر سے پہلے مسلمانوں کی اقتصادی صورت حال کیا تھی اور فتح کے بعد انہیں کیا فوائد حاصل ہوئے، جن کی بناء پر ان کی اقتصادی حالت کافی مستحکم ہو گئی۔ اس فتح سے پہلے مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی ترجیح یہی تھی کہ مال غنیمت وصول نہ کریں، بلکہ یہودی اسلام قبول کر لیں، جیسا کہ آپ کے اس حکم سے بخوبی واضح ہوتا ہے جو آپ نے حضرت علیؓ کو دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ یہودیوں کو تباہ کریں یا انہیں جلا وطن کریں۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی القموص، الوطیح اور السلالم کے یہودیوں نے امن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آپؐ نے فوراً قبول فرما لیا۔ رسول اللہ ﷺ اور ان یہودیوں کے درمیان معاہدۂ امن طے پا گیا جس کی رو سے یہودی اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ خیبر کا علاقہ خالی کر دیں گے، اس کے بعد جب یہودیوں نے آپؐ سے یہ درخواست کی کہ انہیں خیبر ہی میں رہنے دیا جائے تو آپؐ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ یہ حضور ﷺ کے عدل وانصاف، تحمل اور بردباری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس اقدام سے اسلامی ریاست کو گوناگوں اقتصادی اور دفاعی فوائد حاصل ہوئے۔ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اپنی حربی اور عسکری طاقت کو یکجا کر کے یکسوئی کے ساتھ جزیرہ نمائے عرب کو اسلام کے جھنڈے تلے متحد کرنے میں اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ اب مسلمان زراعت سے بھی بے فکر ہو گئے، کیوں کہ زمین کی تیاری اور پودوں کی کاشت ایک محنت طلب کام تھا جس میں مسلمانوں کا

وقت اور توانائی صرف ہوتی تھی۔ انہوں نے یہودی کاشت کاروں کے تجربے اور صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہودی کاشت کاروں کو زراعت میں جو تجربہ حاصل تھا، اس کی وجہ سے انہیں خیبر میں زرعی پیداوار کا ایک بڑا حصہ حاصل ہوتا تھا جسے اسلامی ریاست اپنی دفاعی طاقت کے استحکام اور دیگر اخراجات پر صرف کیا کرتی تھی۔

مسلمانوں کو منقولہ دولت میسر آئی۔ ہر شخص کو ضرورت کے مطابق خوراک حاصل تھی اور کوئی دوسرا شخص اس میں شریک نہیں تھا۔ ریاست کو خمس ادا کرنے کی پابندی بھی نہیں تھی، کیوں کہ جو کچھ ایک فرد کو حاصل تھا وہ مقررہ نصاب سے کم تھا (۴۹)۔ اس بات سے واقدی کی اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے پاس اتنی زیادہ دولت تھی جو انہیں اور ان کے جانوروں کو ایک ماہ کے لیے کافی ہوتی تھی۔ (۵۰)

خیبر کے مالِ غنیمت کی تقسیم

قرآن کریم کی ایک آیت اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ خیبر کا مالِ غنیمت صرف ان مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا جو حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے، ان کے علاوہ کوئی دوسرا فرد اس غنیمت میں حصہ دار نہیں تھا:

> جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے، وہ عنقریب جب تم (خیبر کا) مالِ غنیمت لینے چلو گے، کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں۔ وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کو بدل ڈالیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یوں ہی فرما دیا ہے تو وہ لوگ کہیں گے کہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو، بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں (الفتح ۴۸: ۱۵)۔ (۵۱)

رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمینوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ قحط وغیرہ کی صورت میں خوراک کی فراہمی اور غیر ملکی وفود کی ضیافت کے لیے مختص کر دیا تھا اور دوسرا حصہ ان مسلمانوں کے لیے تھا جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ غنیمت کے حصے کیے گئے تو کل حصوں کی تعداد ۳۶ تھی (۵۲) جن میں سے ۱۸ حصے ان لوگوں کو دیے گئے جو حدیبیہ میں شریک تھے۔

فوج میں ۱۵۰۰ جوان شامل تھے جن میں سے ۳۰۰ گھڑ سوار تھے۔ ہر گھڑ سوار کو دو دو حصے اور ہر پیدل کو ایک ایک حصہ دیا گیا۔ (۵۳)

ان لوگوں میں ایک فرد ایسے بھی تھے جو حدیبیہ میں تو شریک تھے، لیکن فتح خیبر کے موقع پر غیر حاضر تھے، ان کا نام حضرت جابرؓ بن عبداللہ تھا۔ ان کی غیر حاضری کے باوجود انہیں غنیمت میں سے اسی طرح حصہ دیا گیا جس طرح ان لوگوں کو ملا جو وہاں موجود تھے، تاہم یہ ایک کمزور روایت ہے جسے ابن اسحٰق نے بغیر کسی سند کے نقل کیا ہے۔ (۵۴)

اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی غنیمت کا کچھ حصہ اہل السفینہ (کشتی والوں) کو بھی عنایت فرمایا تھا۔ یہ مسلمانوں کی وہ جماعت تھی جس نے حبشے کی طرف ہجرت کی تھی اور فتح خیبر کے بعد مدینے ہوتے ہوئے خیبر پہنچے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد ۵۲ یا ۵۳ تھی اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب ان لوگوں کے امیر سفر تھے۔ یہ واحد جماعت تھی جو فتح میں شریک نہیں تھی، لیکن اسے غنیمت میں حصہ دیا گیا۔

ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے معاملے میں استثنائی صورت اس لیے اختیار کی گئی ہو کہ حدیبیہ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ ان کی حجاز سے غیر حاضری تھی۔ اگر وہ حجاز میں موجود ہوتے تو ضرور حدیبیہ کے موقع پر حاضر ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے جو غنیمت کے حقدار تھے، یہ اجازت لی تھی کہ ان لوگوں کو بھی غنیمت میں سے کچھ کا حصہ دار بنایا جائے۔ اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ اور قبیلہ اوس کے چند افراد نے اگرچہ لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن ان کی درخواست پر اور حق داروں کی رضامندی سے انہیں بھی غنیمت میں سے حصہ دیا گیا۔ (۵۶)

مجاہدین کی مثالیں

متعدد اسباب اور وجوہ کی بناء پر یہ روایت بھی ''صحیح'' مانی جاتی ہے کہ ایک بدو نے خیبر کی فتح میں حصہ لیا تھا، اور جنگ کے دوران میں رسول اللہ ﷺ غنیمت میں سے اس کا حصہ عطا کرنا چاہتے تھے، تاہم جس وقت مال غنیمت تقسیم کیا جا رہا تھا، اس وقت وہ بدو غیر حاضر تھا، بعد میں جب وہ واپس آیا تو اسے اس کا حصہ دیا گیا۔ وہ یہ حصہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت

میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "میں نے اس غنیمت کی خاطر آپ کی پیروی نہیں کی۔ میں نے تو آپ کی پیروی اس لیے کی ہے تاکہ اللہ کی راہ میں میرا گلا یہاں سے کاٹا جائے (اس نے اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا) اور میں جنت میں داخل ہو جاؤں"۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: "اگر تم واقعی اپنی نیت اور اپنے ارادے میں مخلص ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور وہ عطا کرے گا جس کی تم آرزو کرتے ہو"۔ تھوڑی ہی دیر بعد مسلم افواج دشمن سے مقابلے پر کمربستہ ہوگئیں۔ بعد میں اس بدو کو رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حالت میں لایا گیا کہ وہ گلے کے اسی مقام پر تیر لگنے سے جام شہادت نوش کر چکا تھا جس طرف اس نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی چادر مبارک میں کفن دیا، اس کی نماز جنازہ ادا کی اور اس کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی: "اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، اس نے تیری خاطر ہجرت کی اور تیری ہی خاطر جان دی اور میں اس پر گواہ ہوں"۔ (۵۷)

یہ روایت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ایمان اور یقین کی کیفیت نے ایک بدو کی روح پر کیا اثرات مرتب کیے۔ کہاں زمانۂ جاہلیت میں وہ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا عادی تھا اور کہاں جہاد کے عوض اپنی جائز اجرت بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہوا، کیوں کہ وہ صرف اور صرف جنت کا خواہاں تھا۔ جب بدوؤں کی یہ حالت تھی تو سوچنے کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین صحابہ کرامؓ میں کتنی انقلاب آفرین تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں گی؟ اس پس منظر میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے یہودیوں کے گھروں کو کسی مال یا جائیداد کی حرص میں فتح کیا ہوگا؟ کیا یہ مذہبی تعصب تھا جس نے انہیں یہودیوں کو مدینے سے نکال باہر کرنے پر مجبور کیا؟ صحابہ کرامؓ نے سب سے پہلے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی، محاصرے کے بعد انہیں تحفظ فراہم کیا اور ان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں خیبر میں رہنے کی اجازت دی۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت تک یہودی خیبر میں آباد رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بار پھر مسلمانوں کے خلاف جارحیت اور نفرت کا مظاہرہ کیا اور غداری کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ایک آدمی کو شہید کیا اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے ہاتھ اور پاؤں ان کے جسم سے اس وقت الگ کر دیے تھے جب وہ

خیبر میں اپنی رہائش گاہ میں محوِ خواب تھے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر کے علاقے سے نکال دیا اور جو کھجوریں واجب الادا تھیں، ان کی قیمت نقدی، اونٹ اور دیگر سامان، مثلاً کاٹھیوں اور رسیوں کی شکل میں انہیں ادا کر دی۔

اس طرح حجاز میں یہودیوں کا جو عسکری اور اقتصادی مقام تھا، وہ مکمل طور پر اختتام پذیر ہو گیا۔ مسلمانوں کو یکسوئی کے ساتھ ان عرب قبائل کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا موقع مل گیا جو ابھی تک کفر پر قائم تھے اور جزیرہ نمائے عرب میں امن کی بحالی کا راستہ ہموار ہو گیا۔

حواشی

۱- میں نے اس موضوع پر روایات جمع کرنے اور پھر ان میں سے مستند روایات کا انتخاب کرنے میں شیخ عوض احمد الشہری کے مقالے سے استفادہ کیا ہے۔ مقالے کا عنوان ہے: **مرویات غزوة خیبر**۔ شیخ نے یہ مقالہ جامعہ اسلامیہ۔ مدینہ منورہ میں ایم۔اے کی سند کے لیے پیش کیا ہے۔ میں مقالے کے ممتحنین میں بھی شامل تھا۔

۲- یہ وہ فاصلہ ہے جو جدید شاہراہ کے ذریعے ہے اور یہ اس راستے سے مختلف ہے جو رسول اللہ ﷺ نے خیبر جاتے ہوئے استعمال فرمایا تھا۔

۳- دیکھیے: **الموسوعة العربية الميسرة**، ص ۷۷۰؛ حمد الجاسر، **فی شمال غرب الجزيرة**، ص ۲۳۶-۲۳۸

۴- ایضاً

۵- ایضاً

۶- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۳:۲۷۲

۷- ایضاً

۸- ابن ہشام (**سیرۃ**، ۳:۲۵۳) نے سیرت نگاروں کی تمام اسناد کو جمع کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ سندوں میں ایک مجہول راوی شامل ہے جو ''مرسل'' ہونے کی وجہ سے غیر مقبول ہے، لیکن یہ روایت قابل قبول ہے، کیوں کہ ''اخبار'' کے قبول کرنے میں حدیث جیسی ثقاہت شرط نہیں ہے۔

۹- ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۱۹۵

۱۰- ابن حجر، فتح الباری، کتاب المغازی، باب قتل ابو رافق، ۷: ۳۴۰

۱۱- ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۱۳۰؛ واقدی، مغازی، ۲: ۶۳۴

۱۲- ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق، ۱: ۳۳

۱۳- فتح الباری، ۷: ۴۶۴

۱۴- بخاری، صحیح، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر، ۷: ۴۷۰

۱۵- واقدی، مغازی، ۲: ۶۳۹

۱۶- ایضاً

۱۷- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۳۸

۱۸- بخاری، صحیح، کتاب الصلوۃ، ۱: ۴۷۸؛ کتاب الاذان، ۲: ۸۹؛ مسلم، صحیح، کتاب الجہاد و السیر، باب غزوۃ خیبر، ۳: ۴۲۶

۱۹- واقدی، مغازی، ۳: ۶۵۰؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۳۸

۲۰- احمد، مسند، ۵: ۳۵۳؛ حاکم، المستدرک، ۳: ۳۷؛ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶: ۱۵۰۔ حاکم کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کی سند "صحیح" ہے۔ ذہبی اور ہیثمی دونوں نے ان سے اتفاق کیا ہے۔

۲۱- احمد، مسند، ۵: ۳۵۸؛ ہیثمی، کشف الاستار عن زوائد مسند البزار، ۲: ۳۳۸؛ طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۳۰۰؛ ابن حجر، تقریب التہذیب، ۲: ۲۹۲

۲۲- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۵۵؛ طبری، تاریخ الرسل، ۲: ۳۰۰؛ حاکم، مستدرک، ۲: ۳۷۔ مزید دیکھیے: ابن حجر، تہذیب، ۱: ۴۳۳؛ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۹: ۱۲۴ اور بزار (ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۳: ۳۵۳) نے اسے ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں حکیم بن جبیر شامل ہے جو "ضعیف" ہے، جیسا کہ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ذکر کیا ہے، ۱: ۲۹۲

۲۳- مسلم، صحیح، کتاب فضائل الصحابۃ، ۴: ۱۸۷۲

۲۴- شرح النووی علی مسلم، ۱۵: ۱۷۷

۲۵- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۳۸؛ واقدی، مغازی، ۲: ۶۴۵

۲۶- مسلم، صحیح، کتاب الجہاد و السیر، باب غزوۃ ذی القرد، ۳: ۱۴۳۳

۲۷- ساعاتی، الفتح الربانی، ۲۱: ۱۲۰؛ ابن ہشام، سیرۃ ۳: ۴۴۶؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۳: ۳۵۹؛ ابن حجر، الاصابۃ، ۲: ۵۰۹

۲۸- واقدی، مغازی، ۲: ۶۵۷

۲۹- ایضاً، ۲: ۶۵۹، ۶۷۰

۳۰- یہ حیی بن اخطب کا چچا تھا۔ عون المعبود، ۸: ۲۴۱

۳۱- ابوداؤد، سنن، کتاب الخراج والامارة والفیء، باب ماجاء فی حکم ارض خیبر، ۳: ۴۰۸

۳۲- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۴۹

۳۳- ابن سعد، طبقات، ۲: ۱۱۲

۳۴- ابن حجر، تقریب التهذیب، ۲: ۱۸۴

۳۵- ابن ہشام، سیرۃ، ۳۲: ۴۴۹

۳۶- ایضاً

۳۷- خلیفہ، تاریخ، ۸۵۔ ابن اسحٰق سے مروی ہے۔

۳۸- ابن قیم، زادالمعاد، ۱: ۴۰۵

۳۹- واقدی، مغازی، ۲: ۶۹۹

۴۰- مسلم، صحیح، کتاب النکاح، ۲: ۱۰۴۵

۴۱- ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۸۰۴-۸۰۵، یہاں ابن اسحٰق نے شہداء کے اسمائے گرامی کی فہرست بھی دی ہے۔

۴۲- واقدی، مغازی، ۲: ۷۰۰

۴۳- بخاری، صحیح، ۵: ۱۷۶؛ مسلم، صحیح، ۷: ۱۴-۱۵

۴۴- احمد، مسند، ۳/۱۳۸، موارد الظمان، ص ۴۱۳

۴۵- بخاری، صحیح، کتاب المغازی، باب معاملة النبی اهل خیبر، ۷: ۴۹۶؛ مسلم، صحیح، کتاب المساقاة، باب المساقاة والمعامله بجزء من التمر والذرع ۳: ۱۱۸۶-۱۱۸۷؛ ابوداؤد، سنن، باب فی المساقاة، ۳: ۶۹۷۔ اس بات کا سنن ابی داؤد کی اس روایت سے کوئی تضاد نہیں ہے (کتاب الخراج، باب ماجاء فی حکم ارض خیبر، ۳: ۴۱۲) جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو خیبر کی دولت بشمول اراضی حاصل ہوئی تو ان کے پاس کافی تعداد میں کاشت کار موجود نہیں تھے جو ان زمینوں پر کام کر سکتے، چنانچہ رسول اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو طلب فرمایا اور ان کے ساتھ ایک معاہدہ فرمایا۔"

دونوں روایتوں کے مابین مطابقت یوں بھی ممکن ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیش کش کی اور آپؐ نے غور و فکر کے بعد مسلمانوں کے مفاد کی خاطر اس پیش کش کو قبول فرمالیا، چنانچہ آپؐ نے یہودیوں کو طلب فرمایا اور ان کے ساتھ معاہدہ فرمالیا۔

۴۶- ساعاتی، الفتح الربانی، ۲۱: ۱۲۵۔ یہ ایک ''صحیح'' حدیث ہے۔

۴۷- ابوداؤد، سنن، کتاب البیوع، باب الخراص، ابوعبید، الاموال، ص ۱۹۸

۴۸- بخاری، صحیح، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر، ۷: ۴۹۵

۴۹- ساعاتی، الفتح الربانی، ۲۱: ۱۲۵؛ ابوداؤد، سنن، کتاب الجهاد، باب النهی عن النهب اذا كان فی الطعام قلة فی ارض العدو، ۳: ۱۵۱

۵۰- واقدی، مغازی، ۲: ٦٦٥

۵۱- مزید دیکھیے: طبری، تفسیر، ٢٦: ٥٠

۵۲- عوض الشہری، مرویات غزوۃ خیبر، ص ۱۹۵

۵۳- ابو داؤد، سنن، کتاب الخراج والفیء والامارۃ، باب ماجاء فی حکم ارض خیبر، ۳: ۴۱۳؛ حاکم، المستدرک، ۲: ۱۳۱ (ذہبی نے اسے ''صحیح'' کے طور پر قبول کیا ہے)۔

۵۴- ابن ہشام، السیرۃ، ۳: ۳٦٧

۵۵- بخاری، صحیح، کتاب فرض الخمس، ٦: ٢٣٧؛ مسلم، صحیح، کتاب فضائل الصحابة، ۴: ۱۹۴٦

۵٦- عمر بن شبہ، تاریخ المدینة، ص ۱۰۵

۵۷- عبدالرزاق، المصنف، ٥: ٢٧٦

حصہ دوم

مشرکین کے خلاف جہاد

تمہید

تمام تعریفوں کی مستحق اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ درود اور سلام ہو محمد ﷺ پر، آپؐ کے ماننے والوں پر اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ پر۔

تاریخ اسلام کے اوّلیں دور ہی سے مسلمانوں کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کو مرتب اور محفوظ کرنے کی امنگ نمایاں نظر آتی ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں مؤرخین اور محدثین نے اس موضوع پر متعلقہ مواد جمع کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ واقدی اور بلاذری جیسے مؤرخین کی تحریروں کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے واقعات کو موضوع کے مطابق اور زمانی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا۔ دوسری طرف کچھ تاریخی مواد محدثین کی کتابوں میں بکھرا ہوا ملتا ہے۔ یہ حضرات روایت کے اصولوں پر زور دیتے ہیں اور سلسلہ ہائے ''اسناد'' کے راویوں کی چھان پھٹک میں باریک بینی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک ہی روایت کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ اس کا ایک حصہ ایک جگہ اور دوسرا حصہ دوسری جگہ نقل کرتے ہیں جو ان کی سوانحی ترتیب کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ چیز نہایت واضح طور پر **صحیح بخاری** کی ''کتاب المغازی'' (فوجی مہمات) میں، اور اس سے ذرا کم تر درجے میں **صحیح مسلم** میں دیکھی جا سکتی ہے، کیوں کہ امام مسلم طویل متون پیش کرنے اور ان کے الفاظ پر تبصرہ کرنے میں خاص دلچسپی لیتے ہیں، نیز اس کا ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ امام بخاریؒ سے زیادہ اس چیز کا اہتمام کرتے تھے کہ سوانحی مواد کے مطابق روایات کو تقسیم کیا جائے۔

بعض مصنفین، مثلاً محمد بن اسحٰق، خلیفہ بن خیاط، یعقوب بن سفیان الفسوی اور محمد بن جریر طبری نے محدثین اور مورخین کے زاویہ ہائے نظر کو باہم یک جا کیا ہے، ان حضرات نے ''اسناد'' پیش کرنے میں محدثین کے طریقِ کار کی پیروی کی ہے، اور یہ کوشش کی ہے کہ ایک واقعہ

کی تصویر اس طرح مکمل کی جائے کہ گاہ بہ گاہ ''اسناد'' کو بھی ملایا جائے، یا ایک ہی مسئلے سے تعلق رکھنے والی متعدد روایتوں کو، متعلقہ عنوان کے تحت یک جا کر دیا جائے، تاہم تمام سیرت نگاروں کی دلچسپی کا محور اور مرکز یہ تھا کہ جتنی زیادہ سے زیادہ روایات جمع کی جاسکیں، انہیں جمع کر دیا جائے اور ان میں سے ہر ایک کے صحیح ہونے کی شرط عائد کیے بغیر انہیں قلم بند کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ انہوں نے اپنے قاری پر چھوڑ دیا کہ دی ہوئی ان ''اسناد'' کے ذریعے قاری خود یہ دیکھے اور پرکھے کہ کون سی روایات ''صحیح'' ہیں اور کون سی ''ضعیف''، البتہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اس طریق کار سے مستثنیٰ ہیں، ان دونوں حضرات نے اپنی صحیحین میں سیرت کے متعلق جو روایات قلم بند کی ہیں، ان میں ''صحت'' (استناد) کی شرط موجود ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور کے ائمۂ حدیث، راویانِ حدیث اور ان کے مقام و مرتبہ سے واقف تھے، اور ''اسناد'' کی ''صحت'' کے معیاروں سے بھی بخوبی آگاہ تھے، نیز ان کے اندر یہ غیر معمولی اہلیت تھی کہ وہ روایات کو پوری طرح پرکھ کر ان کے درمیان امتیاز کر سکیں، لیکن بعد کے ادوار میں راویوں کے بارے میں انفرادی معلومات اور ''اسناد'' کا فہم تعلیم کی بنیاد نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اب شاذ ہی کوئی صاحبِ علم ایسا نظر آتا ہے جسے اس نوعیت کی معلومات سے کوئی علاقہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ ورجدید کے مصنفین اور مؤرخین علم حدیث کے اصول اور اصطلاحات لاگو کر کے مختلف روا ' ت کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہمارے زمانے کے عظیم ترین مؤرخین بھی تاریخی تنقید کا وہی طریقِ کار اپناتے ہیں جو گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں مغرب میں وجود میں آیا اور رائج ہوا۔ وہ سیرت کی روایات کے لیے بھی وہی منہجِ تنقید اختیار کرتے ہیں جو تاریخ کے موضوع پر اہل مغرب کے مطالعے پر مبنی تحریروں کے ذریعے وجود میں آیا، لیکن اسلامی تاریخی روایات کے سلسلے میں مغربی طریقِ کار اختیار کرنا موزوں نہیں ہے۔ اسلامی تاریخی روایات کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جن میں سب سے نمایاں بات راویوں کے سلسلے یا ''اسناد'' کا اصول ہے جو روایات کے آغاز میں دیا جاتا ہے اور جسے محدثین اس بات کے تعین کے لیے بنیاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ ''اسناد''، ''صحیح'' ہے یا نہیں۔ اس موضوع پر متعدد کتب تصنیف کی

گئی ہیں جن میں راویوں کے حالات اوران کے مقام اور مرتبے کا ذکر کیا جاتا ہےاوراس بات کی بھی تحقیق ہوتی ہے کہ ایک دوسرے سے روایت کرنے والے راویوں کی آپس میں ملاقات ثابت بھی ہے یانہیں۔ان کتب میں محدثین کی روایات کے مفصل مطالعے کے بعدانہیں پرکھا گیا ہےاوران راویوں کے متعلق ان کے ہم عصرلوگوں کی آراءکومحفوظ کرلیا گیا ہے،لیکن تاریخِ اسلام اور سیرت کی جدید تحریروں میں ان قابلِ قدر کتب اور اس عظیم الشان علمی ذخیرے سے چنداں استفادہ نہیں کیا گیا۔اگرہم تاریخی تنقید کے مغربی طریق کارہی پر جمے رہےاورہم نے اپنے عظیم مصنفین کونظرانداز کر کے ان کی مساعی جمیلہ کو جوانہوں نے اسلامی تاریخی روایات کی حفاظت کے سلسلے میں انجام دی ہیں، اسی طرح نظرانداز کیے رکھا تو اس رویے کے علمی نقصانات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔

اگرہم تاریخی روایات کے صرف متن پرتنقید کریں گےاور''اسناد''پرتنقید کےاہم پہلو کونظرانداز کردیں گےتو ہم اس وقت الجھن کا شکار ہوجائیں گے جب ہماراواسطہ متضادروایات سے پڑے گا جوسب کی سب اپنی اپنی جگہ تنقیدی اور منطقی اصولوں پر پوری اترتی ہوئی نظرآئیں گی۔متعددتاریخی واقعات کی تفصیلات کے ساتھ ایسا ہوا ہے،خاص طور پران روایات کے ساتھ جن کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے ہے۔''اسناد''پرتنقید کرنے کے معاملے میں محقق اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ محدثین ہی کا طریقِ کاراختیار کرے،بصورت دیگراس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کون سی روایت زیادہ درست ہے۔

ہمارا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہم غیرضروری طور پر مغربی طریقِ تنقید کو بے وقعت ثابت کریں، یا حَکم بن کراس کے متعلق کوئی فیصلہ دے دیں۔ بلاشبہ مغربی طریقِ تنقید بھی عظیم اہلِ علم کی محنت کا نتیجہ ہے جنھوں نے گہرے مطالعے اور تجربے کے بعد یہ طریق کاروضع کیا اوراسے ترقی دی۔اس موضوع پر ہر مصنف نے اپنے پیش رو کے کام کوآگے بڑھایا ہے،حتیٰ کہ مغربی منہجِ تنقیدا پنی موجودہ جامع اور عمیق شکل میں ہم تک پہنچا۔

بہت سی تفصیلات، اصول اور ضوابط کے معاملے میں مغربی مصنفین کا واسطہ مسلمان

اہل علم کے طریقِ تحقیق سے پڑتا ہے، جنہوں نے صدیوں پہلے اپنے میدانِ مطالعہ کو مستحکم کرلیا تھا۔ مغربی مصنفین اور مسلمان اہل علم کے درمیان نظر آنے والا یہ اخذ و اکتساب اس حقیقت کا غماز ہے کہ یورپ کے فکر پر اسلام کے اثرات ہیں۔ ان اثرات کی تاریخ پیچھے یورپی ازمنۂ وسطیٰ تک جاتی ہے جب مغرب اور اسلامی دنیا میں روابط استوار ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی علمی تحقیق کا منہج محض محدثین کے اختیار کردہ اصولوں تک محدود نہیں ہے۔ اصولِ فقہ کے علماء نے بھی اصول وضوابط مرتب کیے جو اس فن کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں مسلمان اہل علم و دانش نے ریاضیات، ہیئت اور طب کے متعلق مخصوص اصول مقرر کیے اور انہیں اپنی تحقیق کے طریقِ کار میں شامل کیا۔ یہی وہ طریقے ہیں جو راجر بیکن کے حوالے سے مغربی افکار کے ارتقاء کے ساتھ دنیا میں متعارف ہوئے، جیسا کہ مشہور فرانسیسی مؤرخ گستاؤ لیبان نے ذکر کیا ہے(۱)۔ یہی وہ علمی منہج تھا جس کی بدولت مغربی مادی تہذیب اپنا اعلیٰ سائنسی وفنی معیار حاصل کرسکی، تاہم ہمارے اس تعارف میں بحث کا اصل موضوع محدثین کا اختیار کردہ منہجِ تحقیق ہے جس کا حدیث کی روایات سے براہِ راست تعلق ہے جسے ہم تاریخی روایات پر بھی منطبق کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں، کیوں کہ محدثین کے منہج اور تاریخی تحقیق کے طریقِ کار کے درمیان گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

حدیث کی درجہ بندی اور اصطلاحات حدیث کے متعلق محدثین کا طریق کار پانچویں صدی ہجری میں خطیب بغدادی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے بعد اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ ابن صلاح اور قاضی عیاض نے تعلیمی اور تدریسی مقاصد کے لیے اس طریقِ کار پر نظرِ ثانی کی اور اسے نئی ترتیب دی۔ حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر نے یہ طریقِ کار اپنی تصنیفات میں برتا، اور اس میں کچھ معمولی اضافے کیے، لیکن اس طریق کار میں انہوں نے کوئی بنیادی تبدیلی نہ کی۔ ذہبی، ابن کثیر اور ابن حجر نے جو بھی اضافے کیے، وہ اس کے عمومی اصولوں میں انتہائی معمولی نوعیت کے نکات کی حیثیت رکھتے تھے، تاہم یہ اضافے اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان کے ذریعے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر عالم اسلام کی علمی اور فکری تحریک مسلسل

سرگرمِ عمل رہتی اور زمانۂ دراز کی غفلت اور لاپروائی کے سبب جمود کا شکار نہ ہوتی تو یہ طریقِ کار کس قدر مکمل اور جامع ہو گیا ہوتا۔

محدثین کرام کے منہج اور مغربی تنقید کے طریقِ کار کے باہمی اشتراک سے بہترین علمی نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ مغربی تنقید کے طریقِ کار کی اسلامی معیاروں کے مطابق کڑی جانچ پڑتال کی جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جدید اسلامی تاریخی تحقیق بشمول مطالعۂ سیرت، ابھی تک اپنے عہد طفولیت میں ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے عالمی تاریخی تحقیق کے معیار پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اگر ہم کسی قاری کو سیرت پر کوئی جدید کتاب پڑھنے کے لیے دیں تو وہ بمشکل اس میں اور سیرت ابن ھشام، یا ابن قیم کی زادالمعاد میں کوئی فرق پائے گا، چاہے دونوں کتابوں کے منہج اور اسلوب میں فرق ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دورِ جدید میں عمرانی علوم نے جو کمال کی ترقی کی ہے، اس سے اور جدید سائنس کی فراہم کردہ معلومات سے ان کتب میں قابل قدر مدد لی جا سکتی ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ابھی تک جدید علمی دنیا کے کنارے پر کھڑے ہیں اور ہمارے اندر یہ جرأت نہیں کہ ہم اس کے اندر کود کر اس کی ہمہ جہت زرخیزی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں، باوجود اس کے کہ ہم نے تاریخی تحقیق کے میدان میں اپنے آباء واجداد سے جو کچھ ورثے میں پایا ہے، وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جو مغربی مؤرخین کو ان کے پیش رووں سے ملا ہے۔

ہمارے علمی سرمائے میں تاریخی تنقید کا پہلو کمزور رہا ہے اور روایات کا تجزیہ اس سے بھی کمزورتر۔ روایات کے ساتھ ہمارا سطحی رویہ، واقعات کو مجموعی طور پر دیکھنے کے بجائے خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کا انداز، سبب اور نتیجے کے حوالے سے واقعات کا اندازہ لگانے میں کمی، اسلامی تاریخ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں فرد کے کردار کی غیر واضح تصویر (بالخصوص تقدیر اور فرد کی آزادی کے درمیان متنازعہ تعلق)، سب ایسے عناصر ہیں جن کی وجہ سے تاریخی تنقید میں بڑی کمزوریاں واقع ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے کی کتبِ تاریخ تجزیے کا کوئی واضح انداز یا علمی فیصلہ کرنے کا کوئی جامع طریقِ کار نہیں دیتیں۔ قدیم مؤرخین کا طریقِ

کار یہ تھا کہ وہ محض روایات پیش کرنے پر ہی اکتفاء کیا کرتے تھے۔ قدیم مؤرخین کے ہاں شاذ و نادر ہی ان معاشرتی تصورات کا حوالہ ملتا ہے جو تاریخ کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں، اگرچہ قرآن کریم نے نہایت واضح طور پر مسلمانوں کی توجہ ان تصورات کی طرف دلائی ہے۔ کسی مسلمان مؤرخ نے نہ قرآن کے تصورِ تاریخ کی بنیاد پر کوئی قاعدہ وضع کرنے کی کوشش کی اور نہ تاریخی حقائق اور واقعات پر مبنی کوئی جامع نظریہ ہی پیش کیا، سوائے ابن خلدون کے جنہوں نے پہلی مرتبہ اس موضوع پر اپنا مقدمہ تصنیف کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان مفکرین نے ابتدائی دور ہی سے فلسفے اور منطق پر توجہ دی تھی، اور لغت اور اصول فقہ کو مستحکم کرنے میں ان علوم سے بے پناہ فائدہ اٹھایا تھا۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی سے فلسفے اور منطق کے علمی سرمائے سے اس طرح استفادہ کیا کہ اس کے جو عناصر اسلامی عقائد و افکار کے خلاف جاتے تھے، انہیں یکسر نظر انداز کر دیا۔ اپنی اس کوشش میں انہوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

بہت سے محققین، بالخصوص مستشرقین کا خیال ہے کہ علمائے اسلام نے روایات کی ''اسناد'' کو جانچنے پر تو خاصا زور دیا، مگر روایات کے متن کو پرکھنے میں لاپرواہی برتی۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس غفلت کا سبب ناقدانہ ذہن کا فقدان رہا ہے، لیکن یہاں ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے اس خیال کو ایک عام رجحان کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ علمائے اسلام، جہاں ''اسناد'' کو پرکھنے میں بہت آگے تک گئے، وہاں انہوں نے متون کا بغور مشاہدہ کرنے میں بھی کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے اس مسئلے پر بھی بہت زیادہ توجہ دی۔ اس سلسلے میں شہادتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بے حد دشوار ہے، البتہ یہاں ہم چند ایک تاریخی واقعات کا حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں، جن سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ مسلمان مصنفین نے روایات کے متون کا جائزہ کتنے غور و خوض سے لیا ہے۔ ابن حزم نے غزوۂ اُحد میں مسلمان سپاہیوں کی اس تعداد کو مسترد کیا ہے جس کا ذکر متعدد مآخذ میں ملتا ہے، اور انہوں نے اس تردید کی بنیاد متن کی درایت پر رکھی ہے۔ موسیٰ بن عقبہ غزوہ بنی المصطلق کا زمانہ ۴ھ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح وہ سیرت نگاروں کی اکثریت سے اختلاف کرتے ہوئے، اس

واقعے کو متقدم بتاتے ہیں، جب کہ سیرت نگاروں کی اکثریت کے ہاں غزوہ بنی المصطلق ٦ ھ میں پیش آیا۔ ابن قیم اور ذہبی بھی ان کی اس رائے سے متفق ہیں، کیوں کہ ان کی یہ رائے متن کے گہرے تجزیے کی بنیاد پر ہے۔ یہ حضرات اس نتیجے پر اس لیے پہنچے کہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے اس غزوے میں شرکت فرمائی تھی، اور وہ بنو قریظہ کے خلاف مہم میں شہید ہوئے تھے۔

قدیم مؤرخین کے درمیان اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع کس سال میں پیش آیا تھا؟ اس اختلاف کا سبب بھی یہی ہے کہ سب نے اپنے اپنے فہم کے مطابق متون کو سمجھا ہے۔ امام بخاری کا خیال ہے کہ یہ غزوہ معرکۂ خیبر کے بعد پیش آیا، ابن قیم، ابن کثیر اور ابن حجر امام بخاری کی اس رائے سے متفق ہیں، ان کی یہ رائے ابن اسحٰق اور واقدی کی رائے سے مختلف ہے۔ امام بخاری اپنی رائے کی بنیاد اس بات پر رکھتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے اس مہم میں حصہ لیا تھا اور یہ دونوں حضرات فتح خیبر کے فوراً بعد اسلام لائے تھے۔

اسی طرح صلوٰۃ الخوف کی فقہی تاریخ پر بھی متعدد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اختلافات ومباحث کی بنیاد متون کے عمیق مطالعے پر رکھی گئی ہے۔ مشہور مؤرخ خطابی نے متون کا گہرا جائزہ لینے کے بعد اسی بنیاد پر اس بات کی تردید کی ہے کہ طائف میں وادی وج کو مقدس قرار دیا گیا تھا۔

ہم نے زیر نظر ''تمہید'' میں ان امور کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ یہ مثالیں اس کتاب سے لی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار مثالیں موجود ہیں جن کا یہاں تذکرہ مشکل ہے، لیکن ہم اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ابتدائی تین صدیوں کے دوران میں مؤرخین کی توجہ ان معلومات کی چھان پھٹک کرنے اور انہیں قلم بند کرنے کی طرف مبذول رہی۔ یہ تنقیدی عمل اس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے جب ہم کسی روایت کا اس کے اصل مآخذ سے تقابل کر کے دیکھتے ہیں۔ بعض تصانیف ایسی ہیں جن میں ان کے موضوع سے متعلق پیشرووں کی بعض روایات ترک کر دی گئی ہیں، یہی طرز عمل ابن ہشام نے ابن اسحٰق کے ساتھ، اور طبری

نے اپنے مآخذ کے ساتھ اختیار کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ روایات کی چھان پھٹک بذات خود ایک مشکل کام ہے، قدیم مؤرخین کی اصل توجہ روایات کو محفوظ کرنے پر مبذول رہی۔ بعد میں آنے والے مؤرخین نے قدیم مصنفین کے کام کے خلاصے تیار کیے اور ان پر شروح کا اضافہ کیا۔ روایات کے متون کے گہرے اور مفصل جائزے کا رجحان متاخرین کی کتابوں میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بات ہر اس شخص پر بخوبی آشکار ہے جس نے ابن کثیر کی البداية والنهاية کا مطالعہ کیا ہے، یا ابن حجر کی فتح الباری (شرح صحیح بخاری) کے اس حصے کا، جس کا تعلق مغازی سے ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمارے ہاں روایات کے متن کا جائزہ اتنی ہی گہرائی کے ساتھ لیا گیا ہے، جتنی گہرائی اور تفصیل کے ساتھ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران میں یورپ کی تاریخ کے متعلقہ متون کا جائزہ لیا گیا ہے، جب اہل یورپ تاریخی تنقید کے طریق کار کو بڑی ترقی دے چکے تھے، لیکن کیا یہ بات قرین انصاف ہوگی کہ ہم قدیم مؤرخین کی مساعی کو آج کے جدید پیمانوں کے مطابق پرکھنے لگیں جو صدیوں کی علمی اور سائنسی ترقی کا نتیجہ ہیں؟

تاہم ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ ہم محض تاریخ کی کتابوں کا جائزہ لے کر قدیم مسلمان مصنفین کی ناقدانہ ذہنیت کا اندازہ لگائیں۔ ہمیں مجموعی طور پر ان کے اس تمام علمی اور فکری سرمائے کو سامنے رکھنا چاہیے جو فقہ اور تقابلی مطالعۂ فقہ (احادیث الاحکام سے بحث کرنے والی کتابوں) کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتبِ فقہ میں قرآن وحدیث پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے، اور ان کی تشریح وتوضیح کے ضمن میں آنے والے صرف ونحو کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، اور ان سے احکام کا استنباط کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ محدثین اور فقہاء کا تحقیقی کام ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمان علماء اور مؤلفین نے رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ ایک بڑا ہی متوازن تعلق قائم رکھا ہے۔

اصول فقہ کی کتابوں کے مطالعے سے واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ ان میں متون کا عمیق جائزہ لیا گیا ہے، اور یہ حقیقت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ علمائے اصول کے ہاں ایک منفرد

اور یکتا ناقدانہ ذہن پایا جاتا ہے۔ بے شمار قدیم مؤرخین ایسے ہیں جنہوں نے اسلامی علوم کے دیگر میدانوں میں بھی دادِ تحقیق دی ہے، لہٰذا ان مؤرخین کے کام کا اندازہ ان کی مجموعی علمی کاوشوں کی بنیاد پر لگانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ حقیقت بھی سامنے رکھنا ہوگی کہ وہ تحقیق و تدقیق کا ابتدائی زمانہ تھا، جب ان حضرات نے اپنے علمی کارنامے انجام دیے۔ اس طرح ہم ان کی علمی کاوشوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکیں گے۔

ہمیں یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہیے کہ متون کی تنقید کے فکری اور اصولی پہلو کی وضاحت بڑی حد تک ابتدائی صدیوں میں ہی کر دی گئی تھی۔ یہ وضاحت ہمیں منہج اور نقدِ حدیث کی کتابوں میں مختلف اصطلاحات، مثلاً مدرّج، معلل، مضطرب، شاذ، منکر، موضوع وغیرہ (ان اصطلاحات کا تعلق ان مخصوص احادیث کے مقام اور مرتبے سے ہے جو ''اسناد'' اور ''متن'' دونوں پر تنقید سے تعلق رکھتی ہیں) کے ضمن میں مل جاتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تاریخی روایات کو احادیث کی طرح نہیں کھنگالا گیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے معجزات کا ذکر کریں اور ان معجزات کے وقوع کے ثبوت بھی پیش کریں۔ اگرچہ قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کا ایک زندہ اور ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے معجزات ایسے ہیں جو آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں وقوع پذیر ہوئے۔

حضور ﷺ کے ابدی معجزے قرآن کریم کی تصدیق کرنا اور دیگر معجزات کا انکار کرنا جو ''صحیح'' سلسلہ ہائے اسناد کے ذریعے ثابت شدہ ہیں، دراصل ایک ایسا رویہ ہے جو مادہ پرستانہ فکر اور لادینی فلسفے سے مغلوب ہونے کا نتیجہ ہے۔ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ مکمل طور پر بیرونی فکر کے اثرات سے آزاد ہو کر اپنے مطالعے اور علمی تحقیق کو آگے بڑھائے۔ زیرِ نظر کتاب ان معجزات کی تصدیق سے بھی بحث کرتی ہے جو ''صحیح'' سلسلہ ہائے اسناد سے ثابت نہیں ہیں۔

اس کتاب میں فقہی اصول و احکام اور ان کی قانونی تشکیل کے تاریخی پس منظر سے بھی بحث کی گئی ہے، کیوں کہ کسی بھی کتاب میں، جو سیرت کی تاریخ سے متعلق ہو، سیرت کے تشریعی پہلو کو لازماً سامنے رکھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ تشکیلِ قانون کا پہلو ان اخلاقی اصول

وضوابط کی بھی وضاحت کردے جو افراد اور معاشروں کی حرکات پر لاگو ہوتے ہیں۔ سیاسی اور عسکری پہلوؤں کو اخلاقی اور قانونی پہلوؤں سے علیحدہ کرنا بڑا مشکل، بلکہ ناممکن ہے، خاص طور پر وہ امور جن کا تعلق اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں سے ہے۔ اس وقت معاشرتی، معاشی، سیاسی اور عسکری تعلقات عقیدے اور ایمان کے ساتھ اس طرح مربوط اور باہم دگر پیوست تھے کہ اس زمانے کی تاریخ کو اسلامی اصولوں اور اسلام کی روح کو سمجھے بغیر جاننا بے حد مشکل ہے۔

ہماری یہ کتاب بیک وقت فرد کے ارتقاء اور معاشرے کی رفتار سے بحث کرتی ہے۔ تاریخ کے مختلف خدوخال اور گوناگوں جہات اسی وقت نمایاں ہوکر سامنے آتی ہیں جب افراد کی اثر آفرین سرگرمیوں کو بھی سامنے لایا جائے۔ تاریخ کی عظیم شخصیات کے واقعات کو محض اس بناء پر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ معاشرے کی ہمہ گیر بساط پر محض پیادے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہماری تاریخ میں بعض ایسی شخصیات گزری ہیں جو اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں اور غیر معمولی قابلیت سے مالا مال تھیں۔ اگر عقیدۂ توحید نے ان کے دلوں میں جا گزیں ہوکر ان کے تخیلات کو روشن اور ان کے افکار کو نئی جہت نہ دی ہوتی تو ان شخصیتوں کا غیر معمولی کردار سامنے نہ آیا ہوتا، یہ اسلام پر غیر معمولی ایمان تھا جس نے عربوں کی شخصیت کے بنیادی خدوخال اور ان کے ضمیر میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اسلامی عقیدے نے مسلمان شخصیت کی تشکیل میں جو کردار ادا کیا ہے، اسے ذہن میں لانے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہم شخصیت پرستی اور بعض افراد کی برتری کے مبالغہ آمیز رویے سے بچ جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ جو ساری کائنات کی تمام عظیم شخصیات میں عظیم ترین تھے، کمال انکسار و عجز کے ساتھ خدائے بزرگ و برتر کے آگے جھکا کرتے تھے، انتہائی تضرع اور خاکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے، اور اپنی ہر کامیابی اور فتح کو اسی کے فضل و کرم کی جانب منسوب فرمایا کرتے تھے۔

اس کتاب میں قاری کو ان مغالطہ آمیز دلائل کی کوئی تردید نظر نہ آئے گی جو موجودہ زمانے کی کتبِ سیرت میں عموماً ملتے ہیں، بالخصوص ان کتابوں میں جو مستشرقین نے لکھی ہیں۔ ان کی کتابوں میں جو چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے، وہ واقعات اور متون کی دانستہ طور پر غلط تعبیر

ہے اور اس کی وجہ محض ان کا مذہبی اور نسلی تعصب ہے۔ اس کے علاوہ اس غلط تعبیر کی وجہ عربی زبان، اسلام کے احکام اور اس کے مقاصد سے ان کی ناواقفیت ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا واحد مقصد یہ ہے کہ سیرتِ طیبہ کی امتیازی خصوصیات پر مشتمل ایک صحیح تصویر پیش کی جا سکے۔ دراصل سیرت پر تحقیق اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے لیے علیٰحدہ سے ایک علمی منصوبہ تیار کیا جائے۔ میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ سیرت نگاری میں موجود دانستہ یا نادانستہ کی گئی سابقہ غلطیوں کی تصحیح کرنے کی اہمیت کو کم کر کے دکھایا جائے، یہ کام بعض دوسری کتابوں میں کیا جا چکا ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ہمیں تاریخ اسلام سے دلچسپی ہے تو ہمیں مغالطہ آمیز دلائل پر بحث کرنے سے پہلے اس کی تدوینِ نو پر توجہ دینا چاہیے۔

یہ کتاب میری بلندترین خواہش، جس کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کا مظہر نہیں، یہ محض ایک کوشش ہے جس میں میرا منشاء یہ ہے کہ تاریخی روایات کی تنقید میں محدثین کے طریقِ کار سے استفادہ کیا جائے۔ کتاب میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ متون پر تنقید کے ساتھ ساتھ ''اسناد'' اور راویوں کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جائے، خاص طور پر قدیم ترین سیرت نگاروں نے روایات کا جو وسیع ذخیرہ مرتب کیا ہے، اس میں سے روایات کے انتخاب کے دوران میں اس مقصد کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان روایات پر اعتماد کیا جائے گا جنہیں قدیم ترین ناقدین نے مستند قرار دیا ہے۔ اس کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ جن روایات کا وہ جائزہ نہیں لے سکے، ان کا مقام متعین کرنے میں ان کے طریقوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ یہ کتاب اپنے پڑھنے والے کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی اور یہ سیرت کی ایک زیادہ مکمل اور زیادہ واضح تصویر پیش کرے گی۔

میں نے کچھ ایسی روایات نظر انداز کر دی ہیں جو خالص مذہبی اور اخلاقی تعلیمات پر مبنی ہیں اور میں نے ایسا صرف اس لیے کیا ہے کہ وہ روایات کمزور تھیں۔ یہ بات تو پوری طرح ظاہر ہے کہ ''صحیح'' اور ''حسن'' روایات پر اعتماد کر کے سیرت کی تاریخی جہتوں کی ایک واضح تصویر یقینی طور پر پیش کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ کمزور روایات کا حوالہ نہ دیا گیا ہو۔

یہ کتاب پڑھتے وقت قاری محسوس کرے گا کہ حدیث کے نقطۂ نظر سے جو روایات کمزور ہیں، انہیں مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ میں نے اس قسم کی روایات کو ان موضوعات کے سلسلے میں استعمال کیا ہے جن کا عقیدے اور شریعت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور ایسا میں نے اس وقت کیا ہے جب مجھے ان موضوعات کے بارے میں ایسی روایات نہ مل سکیں جو محدثین کے معیار کے مطابق "صحیح" قرار دی گئی ہوں۔ ان روایات کو تاریخی تنقید کے معیار کے مطابق پرکھا گیا ہے۔

میں نے تقریباً ۱۵ سال کلیۂ فنون۔ جامعۂ بغداد میں اور جامعۂ اسلامیہ۔ مدینہ منورہ میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر سیرۃ النبیؐ کی تدریس کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ان جامعات میں طلبہ کو میں جو لیکچر دیتا رہا، انہیں تحریری شکل دے کر متعدد باران پر نظر ثانی کی اور ان میں سے چند ایک زیور طباعت سے آراستہ بھی ہو چکے ہیں (۲)۔

مجھے امید ہے کہ میں اپنے تمام لیکچروں پر آئندہ کسی وقت نظر ثانی کروں گا تا کہ ان کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جا سکے۔ میں نے جامعہ اسلامیہ۔ مدینہ منورہ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے متعدد مقالات جو ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر لکھے گئے تھے، کی نگرانی کی۔ اس سارے کام کے بعد میں نے سیرۃ النبی پر اپنی تحریر کو آخری شکل دی ہے۔ میں نے اپنے طلبہ کو اس کام پر لگایا تھا کہ سیرت کے متعلق روایات کا گہرائی سے جائزہ لیں اور انہیں محدثین کے تنقیدی معیار کے مطابق پرکھیں۔ اس عظیم الشان کام کے دوران میں ان اصولوں کا انطباق سیرت کی ان تمام روایات پر کیا گیا جو ہمیں حدیث، تاریخ، سوانح اور ادب کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں جو مقالات سامنے آئے، وہ پانچ ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں۔

یہ مقالات میری معلومات اور تجربے میں اضافے کا باعث بنے اور انہی کی بنیاد پر میں نے گزشتہ چھ برسوں کے دوران میں ایک بار پھر سیرت سے متعلق تمام روایات کا نہایت غور وخوض کے ساتھ مطالعہ وتقابل کیا۔ ان کے علاوہ مقالات کی ایک خاصی تعداد ہے جو ان دنوں

میری نگرانی میں لکھے جا رہے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ سیرت کے موضوع پر لکھنے والے حضرات اس کوشش سے فائدہ اٹھائیں گے اور سیرت پر ایک مفید اور تجزیاتی کام پیش کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔ سیرت کا یہ پہلو بدستور تشنہ ہے جو بڑی شدت کے ساتھ اہل علم کی توجہ کا مستحق ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس انداز سے سیرت کی خدمت کر کے اس کے اعلیٰ پیغام کی وضاحت کی جائے۔ ہماری نئی نسل کو سیرت کے اعلیٰ اور ارفع پیغام کی اسی طرح اشد ضرورت ہے جس طرح وہ زندگی گزارنے کے اُن دیگر ذرائع کی ہمہ وقت محتاج ہے جو جدید ٹیکنالوجی انسان کو فراہم کر رہی ہے۔

انسان اپنی عقل اور روح کی بناء پر ایک ممتاز و منفرد مخلوق ہے۔ انسانی عقل و روح کی آبیاری نظریات سے ہوتی ہے، افکار و نظریات انسانی عقل و روح کی اس طرح نشوونما کرتے ہیں، جیسے خوراک جسم کی نشوونما کا کام کرتی ہے۔ اگر صحت مند نظریات کی غذا فراہم نہ کی گئی تو کل کا انسان محض ایک جسد بے روح بن کر رہ جائے گا۔

اس بات کا خدشہ ہے کہ اسلامی فکر کی موجودہ پس ماندگی اگلی نسل کو، کہیں اس بات پر بالکل مجبور نہ کر دے کہ وہ مغربی فکر سے اپنی غذا حاصل کرنے لگے۔ مغربی فکر کا حال یہ ہے کہ وہ گزشتہ صدیوں کے دوران میں بدترین مادہ پرستی، خدا تعالیٰ سے دوری، روحانی اقدار کے خلاف باغیانہ رویے اور سخت پیچیدہ اور الجھے ہوئے لادینی تصورات کا بری طرح شکار ہوگئی ہے۔ مغربی معاشرہ آج جن سماجی اور اخلاقی خطرات میں گھرا ہوا ہے، وہ دراصل اس زہریلے درخت کا پھل ہیں جس کی آبیاری لادینی خیالات سے ہوئی ہے۔ بنابریں ہمارے اہل علم کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ہماری نئی نسل کو انحراف کی ان راہوں پر چلنے سے روکیں جن پر آج اہل مغرب چل رہے ہیں۔ ہمارے پاس اس وقت بہترین ہتھیار یہ ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو اسلامی نظریات اور تصورات کی صحت مند غذا فراہم کر کے پروان چڑھائیں۔ یہی وہ واحد پناہ گاہ ہے جسے اختیار کر کے نئی نسل کو مادہ پرستی کے خطرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

میں آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری یہ کوشش قبول فرمائے، اس کاوش

کو میری زندگی کا بہترین کام بنا دے اور میری موت کے بعد اسے میرے لیے صدقۂ جاریہ بنا دے۔ یقیناً ہماری بہترین امیدوں کا مرکز ومحور اسی کی ذات لاشریک ہے، اور وہی عظیم ترین ہستی ہے جس کے حضور ہم التجا کر سکتے ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

مدینہ منورہ — اکرم ضیاء العمری

حواشی

۱- گستاؤلیبان، حضارۃ العرب، ص ۲۶

۲- میرے مطبوعہ لیکچر یہ ہیں: ☆اوّل دستور اعلنه الاسلام، دراسة كتابة بين المهاجرين والانصار واليهود فى المدينة ، مجلة كلية الامام الاعظم، ۱۹۷۲ء ☆اهل الصفة، مجلّة كلية الدراسات الاسلامية، ۱۹۶۸ء ☆موسىٰ بن عقبه(یہ کتبِ مغازی کے اوّلین لکھنے والوں میں سے ہیں)، مجله كلية الدراسات الاسلامية، ۱۹۶۷ء☆نظرة فى مصادر و دراسات السيرة النبوية، مجله كلية الدراسات الاسلامية، ۱۹۷۰ء

احکامِ جہاد

''جہاد'' اسلام کی ایک قانونی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں ایک عادلانہ نظام کے قیام کی خاطر اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑنا، وہ عادلانہ نظام جو شریعت کے قوانین کو سربلند رکھے اور اس روے زمین پر اسلام کے مقاصد کو پورا کرے۔ مکی دور میں جہاد کو قانونی شکل نہیں دی گئی تھی۔ اُس مرحلے میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ نہ تو مشرک اور بت پرست طاقتوں کے مدِ مقابل آئیں اور نہ ان کے خلاف ہتھیار ہی اٹھائیں۔ اُس زمانے میں جس حکمت عملی کے ذریعے مسلمانوں کی رہنمائی کی گئی، وہ یہ تھی: ''اپنے ہاتھوں کو تھامے رہو اور نمازوں کی پابندی رکھو'' (النساء ۴:۷۷)۔

مسلمانوں نے اسی رہنما اصول پر عمل کیا، جب کہ اسلام کی دعوت ابھی نئی نئی تھی۔ اس وقت دعوتِ اسلامی کی مثال اس ننھے پودے کی سی تھی جسے پانی کی ضرورت تھی اور جڑ پکڑنے اور تندوتیز ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے غذا فراہم کرنے کی شدید ضرورت تھی۔ اگر اس وقت مسلمان مشرکوں کے مقابلے میں تلوار اٹھا لیتے تو مشرکینِ مکہ اسلام کے اس پودے کو آغاز ہی میں جڑ سے اکھاڑ پھینکتے اور تباہ و برباد کر دیتے۔ اس وقت حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمان صبر وتحمل اور بردباری کے ساتھ مشرکینِ مکہ کے مظالم اور ایذا رسانی کو برداشت کریں اور اپنی تمام تر توجہ عقیدے کی پختگی، عبادت و ریاضت، اصلاح باطنی اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے میں صرف کریں، تاکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ مسلمان اپنی عام زندگی میں مشرکوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، ان کا کوئی ایسا باقاعدہ مرکز نہیں تھا کہ وہ قبولِ اسلام کے بعد اس سے وابستہ ہوتے، لیکن دارالارقم اور چند دیگر مقامات ایسے تھے، جہاں جمع ہو کر وہ اسلام کی تعلیمات

حاصل کیا کرتے تھے۔ اگر اس زمانے میں جہاد کو ضروری قرار دے دیا جاتا تو ہر گھر میں جہاں کوئی نہ کوئی مسلمان ہوتا، ایک کشمکش برپا ہو جاتی۔ جب مسلمانوں نے مدینے ہجرت کی، انصار نے مکمل مدد اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور مسلمانوں کے ہاتھ ایک ایسا خطۂ زمین آ گیا، جہاں مکمل طور پر ان کا حکم چلتا تھا تو اس وقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جہاد کے احکام جاری فرمائے اور اس کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل کی گئی۔ سب سے پہلے دفاع کی اجازت دی گئی: ''(اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے'' (الحج ۲۲:۳۹)۔(۱)

اس کے بعد مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اپنے دفاع میں جنگ کر سکتے ہیں اور اپنے عقائد اور اصولوں کے دفاع کی خاطر بھی ہتھیار اٹھا سکتے ہیں: ''اور (بے تکلف) تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو (تنقیض عہد کر کے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حدِ (معاہدہ) سے مت نکلو۔ واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے'' (البقرۃ ۲:۱۹۰)۔

قانونی طور پر اجرائے جہاد کا یہ دوسرا مرحلہ تھا۔ اس لحاظ سے جہاد تاریخ انسانی کی دیگر جنگوں کے مقابلے میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ جہاد کا مطمحِ نظر ایسی جماعتوں اور افراد کے سیاسی اور اقتصادی اہداف کا حصول ہے: ''جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا'' (القصص ۲۸:۸۳)۔

جہاد کا واحد مقصد حق و انصاف اور نظامِ رحمت کا قیام ہے اور جہاد کو ان اعلیٰ مقاصد کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ یہی وہ نصب العین ہے جو جہاد کو دیگر اقسام کی تمام جنگوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق: ''جو لوگ پکے ایمان دار ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں، وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں'' (النساء ۶:۷۶)۔

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ''اللہ کے نام کے ساتھ اللہ کے راستے میں

جنگ کرو اور جب جنگی مہمات پر روانہ ہو تو نہ ڈاکے ڈالو، نہ عہد شکنی کرو، نہ مثلہ کرو اور نہ معصوم بچوں کو قتل ہی کرو''۔(۲)

اس کے بعد تیسرے مرحلے کا آغاز ہوا۔ اس مرحلے میں مسلمانوں کو مشرکوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ابتدائی قدم اٹھا لینے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی توسیع و ترقی میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جائے اور اس کے راستے میں جو مشرک یا بت پرست طاقتیں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کریں، ان کی رکاوٹوں کو دور کیا جائے اور دنیا میں مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہو جائے۔ اس طرح کوئی یہ جرأت نہ کر سکے گا کہ کسی مومن پر ظلم کرے، یا اسے اپنے عقیدے سے دستبرداری پر مجبور کرے، خواہ وہ کہیں بھی رہتا ہو۔ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے اس حکم کا صاف پتہ چلتا ہے:

اور تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فسادِ عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (الانفال ۸:۳۹)۔

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعًا) گراں (معلوم ہوتا) ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو (البقرہ ۲:۲۱۶)۔

اہلِ کتاب جو نہ اللہ پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر، اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے حرام بتلایا ہے، اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کر لیں (التوبۃ ۹:۲۹)۔

جہاد اسلام کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔ یہ اس عظیم مقصد کی نشاندہی کرتا ہے جس کے حصول کے لیے مسلمان جدوجہد کرتے ہیں، یعنی دنیا کے ہر حصے میں لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ اس آزادی کی مکمل حمایت اور مسلمانوں کے تحفظ کے

لیے سیاسی اور عسکری قوت حاصل کی جائے، البتہ انفرادی سطح پر اسلام کی نشر و اشاعت میں طاقت اور جبر کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی: ''دین میں زبردستی کوئی نہیں'' (البقرة ۲:۲۵۶)۔

اسلام کی توسیع، استحکام اور دنیا بھر میں اس کے ماننے والوں کے تحفظ کی خاطر یہ ضروری ہے کہ اسلام کو دنیا کی تمام سیاسی اور عسکری طاقتوں پر بالادستی حاصل ہو، بالخصوص اس دنیا میں جہاں ۱۴سو برس قبل اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ اس زمانے کی حکومتیں اپنے باشندوں کو قبولِ اسلام سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی تھیں۔ مکے میں قریش نے مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کر دی تھی، اسی طرح ایران اور روم کی حکومتوں نے بھی جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر شام اور مصر میں تشدّد کا رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ اسلام میں یہ چیز واضح کر دی گئی ہے کہ احکامِ جہاد کا قانونی اجراء کوئی عارضی امر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مستقل مذہبی فریضہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان مقدس ہے:

جہاد کی فرضیت قیامت تک برقرار رہے گی۔ جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے نہ تو راہِ خدا میں جنگ کی اور نہ جہاد کے لیے اپنی خواہش ہی ظاہر کی، تو وہ شخص ایک منافق کی موت مرا۔ (۳)

کتبِ فقہ میں قوانینِ جہاد کے لیے اسی طرح ابواب مختص کیے گئے ہیں جس طرح نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے لیے کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جہادِ امت مسلمہ کے ذمے ایک مستقل فریضہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح اسلام کے دیگر فرائض اور ارکان ہیں۔ جہاد وہ چیز ہے جس نے امتِ مسلمہ کی متفرق جماعتوں کو باہم متحد کیا اور ان کی تمام تر صلاحیتوں اور قوتوں کو دشمن سے مقابلے پر مرکوز کیا۔ مسلم افواج دنیا کے جس علاقے میں بھی گئیں، انہوں نے انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلانے، انسانوں کے درمیان برابری اور مساوات پیدا کرنے اور رنگ و نسل سے بے نیاز ہو کر انسان کی عزت و تکریم کرنے کی دعوت دی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے دل تلوار کے ذریعے نہیں جیتے گئے، بلکہ جس چیز نے ان کے قلوب کو پگھلا کر رکھ دیا، وہ یہی اعلیٰ انسانی اصول اور اقدار ہیں۔ اسلام کی

عظیم الشان توسیع اور بے مثال فتوحات کے پیچھے یہی راز کارفرما ہے۔

کچھ محققین، جنہوں نے ان فتوحات (انسانوں کو آزادی دلانے کی مہمات جو اسلام کی توسیع کا سبب بنیں) کا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے اسلام کی اس تیز رفتار اور کامیاب توسیع کی متعدد وجوہ پیش کی ہیں۔ کائتانی اور دیگر مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے کچھ معاشی مقاصد تھے جن کی بناء پر یہ توسیع عمل میں آئی۔ وہ اپنے خیال کی بنیاد اس دعوے پر رکھتے ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب میں شدید خشک سالی کی وجہ سے قحط کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے جزیرہ نما کے اطراف و اکناف سے انسانوں کے سیلاب نے ''ہلال خصیب'' (Fertile Crescent) کی جانب نقلِ مکانی کی۔ اس میں لوگوں کو معاشی آسودگی نظر آتی تھی، اور یہ کہ فتوحات کی حیثیت بھی عام جنگوں ہی کی طرح تھی۔ اگر غیر جانبداری کے ساتھ تاریخی حقائق کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں نہ تو کوئی موسمی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں اور نہ اس کے معاشی حالات ہی میں کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ عرب قبائل نے اس وقت تک ''ہلال خصیب'' کی طرف اتنی بڑی تعداد میں نقل مکانی نہیں کی تھی جب تک اسلام کا مکمل احیاء نہیں ہو گیا تھا، اور وہ اسلام کے جھنڈے تلے متحد نہیں ہوئے تھے، نیز ان میں اسلام کے اصولوں کا پوری طرح شعور اور احساس پیدا نہیں ہو گیا تھا۔

جب ہم ان مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں جو خلفائے اسلام اور فاتحین نے ایک دوسرے کو لکھے تھے، اور ان فتوحات کے بارے میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان مجاہدین پر ان کے عقیدے اور نظریہ حیات کی مکمل گرفت تھی اور یہی وہ چیز تھی جس نے ان کی صفوں میں نظم و ضبط اور استحکام پیدا کر دیا تھا۔ مسلم افواج کے سپہ سالار سے ایک عام سپاہی تک ہر شخص اعلیٰ انسانی اصولوں سے سرشار ہو کر انسانیت کو سیدھی راہ دکھانے کے سچے اور پُر خلوص جذبے سے معمور تھا، اگرچہ بعض سپاہیوں کے لیے غنیمت بھی رغبت کا باعث تھی اور اس رغبت کی بناء پر جنگ میں حصہ لینے والوں کی تعداد میں، خاص طور پر بدوؤں کا اضافہ ہو جاتا تھا، تاہم امرائے لشکر جو فتوحات کی منصوبہ بندی کرتے تھے،

ان کا جذبہ چند بدو سپاہیوں کے انفرادی رویے سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سپہ سالارانِ لشکر اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ تھے اور انہیں بجا لانے کے شائق تھے، اور ان کا یہ جذبہ مالِ غنیمت کے حصول پر بازی لے گیا تھا۔

مسلم فاتحین نے جن علاقوں کو آزاد کرایا، ان کے باشندوں پر لاگو محاصل میں خاطر خواہ کمی کی، انہوں نے کسی کے ذاتی مال اور اسباب پر قبضہ نہیں کیا اور اقتصادی نظام کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ ان کا رویہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ ایک مثبت اور تعمیری رہنمائی کے جذبے سے سرشار ہیں۔

توسیع اسلام کے بارے میں ایک اور توجیہ پیش کی جاتی ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد کچھ سیاسی عوامل پر رکھی گئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ ارتداد کی تحریک کا فوری قلع قمع کرنے کے خواہش مند تھے اور ہر اس کوشش کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے تھے جو ملت اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کی جائے۔ ان کی اس خواہش نے انہیں اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اپنی طاقت کا رخ توسیع اسلام کی جانب موڑ دیں، اور امت کی صفوں میں داخلی اتحاد کو قائم رکھیں، بصورت دیگر زبردست مشکلات اور اختلافات جنم لیتے۔ اگرچہ اس توجیہ کے ذریعے ایک مثبت پہلو سامنے آتا ہے اور قوانینِ جہاد کی پشت پر جو حکمت کارفرما ہے، وہ بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے، تاہم اس بات کی پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی کہ وہ کون سی قوت تھی جو اسلام کی توسیع کا سبب بنی۔ ارتداد کے فتنے نے عرب کے بدوؤں میں جنم لیا اور اس کے بیشتر مسائل اور نزاعات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں پیش آئے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس فتنے پر پوری طرح قابو پالیا اور آپ مرتدین کو مکمل طور پر ریاست کے زیرنگیں لے آئے تو آپ نے انہیں اس کی ممانعت کر دی کہ وہ کسی فوجی مہم میں حصہ لیں اور سزا کے طور پر ان کے ہتھیار بھی ان سے اتروا لیے۔ آپ نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ ان کی وفاداری مشکوک ہو گئی تھی اور ان کا طرزِ عمل اسلامی شخصیت کی صحیح عکاسی نہیں کر رہا تھا۔ اس وجہ سے اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ آزاد کرائے ہوئے علاقوں کے باشندوں کے سامنے اسلام کے صحیح نمونے کے طور پر

آ سکیں۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوج کی تیاری میں صرف شہر کے لوگوں (مکہ، مدینہ اور طائف) پر اکتفاء کیا جن کے اندر اسلامی عقائد اور اصولوں کے اثرات پوری طرح راسخ تھے۔اس کے علاوہ امارت کے مناصب کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ محض ان حضرات کا انتخاب فرماتے تھے جنہیں صحبتِ رسول ﷺ کا شرف حاصل تھا۔

فتوحات کے جواز کی ایک تیسری توجیہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ یہ فتوحات اصلاً دفاعی نوعیت کی تھیں اور مسلم افواج نے طاقت کا استعمال محض دفاع کے طور پر اس وقت کیا، جب اسلامی ریاست اپنے زور آور دشمنوں کے نرغے میں تھی۔ زیادہ تر عرب اور دوسرے مسلمان مؤرخین نے یہ توجیہ اختیار کی ہے۔اس طرح وہ ان تصورات کو تسلیم کر لیتے ہیں جن کا بیسویں صدی میں چلن تھا۔ یہ نظریات جنگ اور اس کے نتیجے میں تہذیبوں کی تباہی، قتل وغارت اور انسانوں کے گھر سے بے گھر ہو جانے جیسے معاملات سے انسانی نفرت کا نتیجہ ہیں۔ یہ مؤرخ دراصل ان بین الاقوامی تنظیموں سے شدید طور پر متأثر ہیں جو قوموں کے متنازعہ معاملات میں مصالحت کرانے، عالمی سطح پر امن قائم رکھنے، اور جنگ کے بجائے مذاکرات پر زور دے کر بین الاقوامی مسائل حل کرنے میں کوشاں ہیں۔

زمانے کے رجحان کی وجہ سے فتوحات کا ذکر کرنے والے بہت سے مصنفین نے ایک معذرت خواہانہ سوچ پیدا کر لی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے تصورِ جہاد کو دورِ جدید کے خیالات کے مطابق بنایا جائے۔اس متأسفانہ روّیے کے کچھ نفسیاتی اور ذہنی اسباب ہیں جن میں سے ایک مضبوط سبب یہ ہے کہ مسلمان اہل علم کی اکثریت پر مغربی افکار کا غلبہ ہے۔اس غلبے کی وجہ مغرب کی وہ فکری یلغار ہے جس نے مسلمانوں کے اندر مغرب کے مقابلے میں احساس کمتری کو جنم دیا ہے۔ اس سے ان کے اندر یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر اس چیز کا جواز پیش کریں جو مغربی تہذیب کی روح اور اس کے فکری اور نفسیاتی تصورات سے متصادم ہے۔ اس افسوس ناک رویے کا ایک قوی سبب یہ بھی ہے کہ اس قسم کے لوگ جہاد اور اس کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بہت سے مسلمان واضح طور پر یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ

جہاد کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو جبریہ اسلامی عقائد کا پیرو کار بنایا جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کر کے اسلام کی نشر واشاعت کے لیے میدان صاف کیا جائے، خواہ اس کے لیے دنیا میں موجود سیاسی طاقتوں کو کمزور یا نیست و نابود ہی کیوں نہ کرنا پڑے، تا کہ مسلمانوں کو دنیا میں بالادستی حاصل ہو اور وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والے مظالم کی روک تھام کر سکیں۔

سب سے پہلے مستشرقین نے اپنی تحریروں میں جہاد کے خلاف غلط بیانی سے کام لیا اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے جہاد کا تعلق اس تصور کے ساتھ لے جا کر جوڑا کہ یہ لوگوں پر زبردستی عقائد ٹھونسنے کی ایک کوشش ہے۔ جہاد کی صحیح تصویر کشی کے لیے سب سے پہلے اس تعلق کو توڑنا پڑے گا۔ قرآن کریم میں، بغیر کسی شک وشبہ کے واضح طور پر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ لوگوں کو مکمل طور پر یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے اسلام کا راستہ منتخب کریں، یا عیسائی اور یہودی رہنا پسند کریں، چاہے وہ اسلامی معاشرے میں رہتے ہوں، یا ان علاقوں میں جہاں اسلامی ریاست کا اقتدار قائم ہے۔ اس آزادی کی مثالیں قرآنی آیات سے ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ مستند تاریخی واقعات میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ماتحت قوموں نے اس آزادی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا جو اسلام نے انہیں ایرانی اور بازنطینی تسلّط سے دلائی تھی۔ مصر میں قبطیوں اور شام میں یعقوبیوں نے اس وقت اپنی بھر پور خوشی کا اظہار کیا، جب اسلام نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اگر مذہبی آزادی کا یہ اعلان اخلاص پر مبنی نہ ہوتا تو تمام مذہبی اقلیتیں مسلم معاشرے میں جذب ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتیں، اور اس طرح زندہ نہ ہوتیں جیسے یہ غیر مسلم اقلیتیں آج موجود ہیں، جب کہ اسلام کو ظہور پذیر ہوئے چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔

فتوحات کو محض دفاعی حیثیت دینا ایک معذرت خواہانہ رویہ ہے جو اس قابل نہیں ہے کہ اس پر دلائل پیش کیے جائیں اور کوئی سنجیدہ بحث کی جائے۔ کیا اندلس اور ماوراء النہر کے لوگوں نے مسلمانوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے مسلم سرحدیں عبور کی تھیں؟ کیا یہ سرحدوں کی محض

حفاظت کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تین براعظموں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے قلب تک پہنچ گئے، جہاں جزیرہ نمائے عرب سے دُور پُر خطر واقعات اور فیصلہ کن جنگیں وقوع پذیر ہوئیں۔ ان جنگوں میں فرانس کے جنوب میں پوئٹیر کے مقام پر ٹورس کی جنگ، جزیرہ کریٹ اور جنوبی اٹلی کی فتح، ماوراء النہر میں دریائے تالاس پر تیراز کی جنگ اور ویانا کا محاصرہ شامل ہے۔

فتوحات کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے جو انہوں نے ادا کیا، اور جس میں شمولیت کو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کا بلند ترین مرتبہ قرار دیا ہے۔

حواشی

۱- سبب نزول کے لیے دیکھیے: احمد ابن حنبل، **مسند**، ۷:۱۲۲۔ مزید دیکھیے: ابن قیم، **زاد المعاد**، ۲:۵۸

۲- امام مسلم نے اپنی **صحیح** میں حدیث روایت کی ہے، ۲:۱۳۵۷

۳- مسلم بن حجاج، **صحیح**، ۳:۱۵۱۷

۲

جہاد کا آغاز

جہاد کے سلسلے میں سب سے پہلے جو غزوات (بڑی مہمات) اور سرایا (چھوٹی مہمات) انجام پائے، وہ مدینے کے مغربی سمت میں واقع مقامات کے خلاف تھے۔ ان غزوات اور سرایا کے تین مقاصد تھے:

۱- شام کی طرف جانے والے قریش کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو پرخطر بنانا۔ یہ مکے کی تجارت پر مبنی اقتصادیات پر ایک زبردست وار تھا۔

۲- قرب و جوار کے دیگر قبائل کے ساتھ امن کے معاہدے کرنا، تاکہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان لڑائی کی صورت میں ان قبائل کی حمایت، یا کم از کم غیر جانبداری کی ضمانت حاصل ہو۔

یہ منصوبہ بندی بے حد اہمیت کی حامل تھی اور اس منصوبہ بندی کی تکمیل مسلمانوں کے لیے ایک بڑی کامیابی کی علامت تھی، کیوں کہ یہ قبائل ابتداء میں قریش کا ساتھ دینے کی طرف مائل تھے۔ اس کا سبب ان کے اور قریش کے درمیان قدیم حلیفانہ معاہدات تھے، جنہیں قرآن نے ''ایلاف'' (حفاظتی اقدامات اور تحفظ کے معاہدے) کا نام دیا ہے (القرآن ۱:۱۰۶)۔ ان معاہدوں کے ذریعے قریش نے شام اور یمن کے ساتھ اپنی تجارت محفوظ بنالی تھی۔ اس کے علاوہ ان قبائل کو قریش کے ساتھ ایک خاص تعلق اس لیے بھی تھا کہ قریش کعبے کے متولی تھے اور عرب کے تمام لوگ طوافِ کعبہ اور وہاں موجود اپنے بتوں کی عبادت کرنے مکے آیا کرتے تھے۔ قریش اور ان قبائل کے عقائد مشترک تھے، اس لیے وہ اسلام دشمنی میں متحد تھے۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کے لیے اس مرحلے پر یقیناً یہ ایک بہت بڑی فتح تھی کہ وہ ان قبائل کے ساتھ امن

کے معاہدے طے کرنے اور قریش کے ساتھ تصادم کی شکل میں ان کی غیر جانبداری کی یقین دہانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

۳- یہودیوں اور مشرکوں پر یہ ثابت کرنا کہ مدینے میں مسلمانوں کو کتنی طاقت حاصل ہے، نیز اس امر کا اظہار کہ مسلمانوں کا غلبہ صرف مدینے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اب مسلمان اپنے اطراف کے علاقوں پر بھی نہ صرف اپنا تسلط قائم کر رہے ہیں، بلکہ مختلف قبائل کے مفادات اور تعلقات پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔

پہلا غزوہ غزوۃ الابواء (۱) تھا جسے غزوۂ وَدّان کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دو ملحقہ علاقے ہیں جن کا درمیانی فاصلہ چھ یا سات میل ہے۔ الابواء مدینے سے تقریباً چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس غزوے کے دوران میں کوئی جنگ نہیں لڑی گئی، لیکن بنوضمرہ (جن کا تعلق قبیلہ کنانہ سے تھا) کے ساتھ امن کا ایک معاہدہ کیا گیا۔ یہ غزوہ ہجرت کے دوسرے برس ۱۲ صفر کو پیش آیا۔ (۲) مدائنی کی روایت کے مطابق فوج نے ربیع الاوّل کا مہینہ شروع ہونے تک مدینے کے باہر پڑاؤ ڈالے رکھا، اس کے بعد مجاہدین واپس آئے۔ (۳)

عروہ بن زبیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے الابواء سے ایک مہم (سریہ) روانہ فرمائی جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھی اور حضرت عبیدہؓ بن حارث کو اس مہم کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔ (۴) ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ یہ سریہ مدینے واپسی کے بعد سیف البحر کی طرف روانہ کیا گیا تھا، نیز ایک اور سریہ بھی جو تیس افراد پر مشتمل تھا اور اس کی امارت حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو سپرد کی گئی تھی، مدینے واپسی کے بعد، سیف البحر کی طرف بھیجا گیا تھا جس کا مقصد قریش کے قافلے کا راستہ روکنا تھا، لیکن یہ دونوں سرایا قریش کے ساتھ جنگ میں ملوث نہیں ہوئے۔ حضرت حمزہؓ کے ساتھ تو یہ معاملہ پیش آیا کہ قبائل نے جن کے دونوں فریقوں کے ساتھ امن کے معاہدے تھے، فریقین کو جنگ کرنے سے باز رکھا اور حضرت عبیدہؓ کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ مسلمانوں اور قریش دونوں کے درمیان محض تیروں کا تبادلہ ہوا۔ (۵)

بلاشبہ ان سرایا کا اوّلیں مقصد قریش کی تجارت کے لیے خطرہ پیدا کر دینا تھا، یہ پہلی

دھمکی تھی جو قریش کو اس لیے دی گئی تھی کہ اگر وہ اسلام کے خلاف اپنے سخت مخالفانہ رویے سے باز نہ آئے تو ان کی تجارت سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ربیع الثانی [۲ھ] کے مہینے میں بھی مسلمانوں نے تجارتی راستوں (کو پُر خطر بنانے کے لیے) اپنی مہم جاری رکھی۔ ینبوع کے نزدیک رضوا کے مقام پر غزوۂ بواط پیش آیا جس میں دو سو مجاہدین نے قریش کے ایک تجارتی قافلے کا راستہ روکا۔اس کے بعد جمادی الاولیٰ میں (ینبوع کے مقام پر) غزوۂ عشیرہ پیش آیا۔ان دونوں غزوات یعنی رضوا اور عشیرہ میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کی گئی، بلکہ عشیرہ کے (۶) مقام پر جمادی الاخریٰ کے مہینے میں بنو مُدلج کے ساتھ امن کا ایک معاہدہ طے پا گیا۔غزوۂ عشیرہ کے فوراً بعد کرز بن جابر الفہری مدینے کے مضافات میں وارد ہوا اور کچھ اونٹ اور مویشی چُرا کر لے گیا۔رسول اللہ ﷺ نے بدر کے نواحی علاقے سفوان تک اس کا پیچھا کیا،اس لیے اس مہم کو پہلا غزوۂ بدر قرار دیا جاتا ہے۔کرز فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اپنا تعاقب کرنے والوں کے ہاتھ نہ لگ سکا،(۷) لیکن اس واقعے سے مسلمانوں میں اس ضرورت کا احساس مزید شدت اختیار کر گیا کہ انہیں اپنے ہمسایہ قبائل سے پُر امن بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے کی اشد ضرورت ہے، تاکہ یہ مہمات جاری رکھی جا سکیں۔مسلمانوں نے قریش کے صرف انہی قافلوں کو روکنے پر اکتفاء نہیں کیا جو شام کے ساتھ تجارت کرتے تھے، بلکہ مسلمان ان تجارتی راستوں میں بھی حائل ہوئے جو یمن کی طرف جاتے تھے۔ ماہِ رجب کے اختتام پر، حضرت عبداللہؓ بن جحش کی سرکردگی میں آٹھ مہاجرین پر مشتمل ایک سریہ نخلہ کے علاقے کی طرف روانہ کیا گیا جو مکے کے جنوب میں واقع ہے۔اس سریہ کا مقصد محض یہ تھا کہ قریش کی سرگرمیوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کی جائیں، لیکن ان مہاجرین نے قریش کے ایک تجارتی قافلے کو راستے میں روک لیا، قافلے کے سربراہ کو قتل کر دیا اور قافلے کے سروسامان پر قبضہ کر کے اور اس میں شامل دو افراد کو قیدی بنا کر مدینے (۸) لے آئے۔ چونکہ یہ واقعہ ایک محترم مہینے کے دوران میں پیش آیا تھا، اس لیے مشرکینِ مکہ نے اس بارے میں بہت شور وغوغا کیا کہ مسلمانوں نے ایک مقدس مہینے کی حرمت کو پامال کیا ہے۔اس واقعے سے بدوؤں اور شہریوں دونوں پر گہرا

اثر ہوا۔ اس واقعے سے ایک ایسی روایت کو توڑ دیا گیا تھا جو عرب میں ظہور اسلام سے مدتوں پہلے سے رائج اور راسخ تھی۔ عبداللہ بن جحش بھی اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ اس قدیم روایت کی خلاف ورزی کس قدر تشویش ناک ہے، لیکن انہوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب وہ مدینے واپس آئے، اور مالِ غنیمت رسول اکرم ﷺ کو سپرد کرنا چاہا، تو آپؐ نے اس غنیمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ''میں نے تمہیں مقدس مہینے کے دوران میں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا، قریش نے ہر طرف یہ باتیں پھیلائی ہوئی ہیں کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں نے مقدس مہینے کی حرمت پامال کی ہے، انہوں نے اس ماہ میں خون ریزی کی، مال و دولت پر قبضہ کیا اور لوگوں کو قیدی بنایا ہے''۔

اس واقعے کے بعد کچھ قرآنی آیات نازل ہوئیں جن میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ مسلمانوں کی کارروائی درست اور بجا تھی۔ ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت بھی وصول فرمایا اور دونوں قیدیوں کا فدیہ قبول کر کے انہیں قریش کے حوالے کر دیا۔

قرآن کریم کی متعلقہ آیت یہ ہے:

لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ ان میں خاص طور پر قتال کرنا جرم عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک ٹوک کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے، ان کو اس سے خارج کر دینا عظیم تر جرائم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک فتنہ پردازی کرنا قتل سے بدرجہا بڑھ کر ہے (البقرۃ ۲: ۲۱۷)۔

اس آیت میں صاف طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف قریش کی ظالمانہ سرگرمیوں اور مسلمانوں کو مکے سے نکال باہر کرنے کا سنگ دلانہ عمل اس فعل سے کہیں زیادہ برا ہے جو مسلمانوں سے ایک محترم مہینے میں جنگ کرنے کی شکل میں (۹) سرزد ہوا، تاہم آیت کا ابتدائی حصہ ''محترم مہینے'' کے تقدس کی تصدیق کرتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قریش نے مسلمانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کیوں ان روایات اور اقدار کا خیال نہیں رکھا، تاکہ ان

کے اس دعوے میں کچھ وزن ہوتا جس کے تحت وہ خود کو محترم مقامات کے محافظ اور مقدس روایات کے امین کہتے تھے؟

ممکن ہے، بعض افراد کے دل میں غلطی سے یہ شک پیدا ہو کہ مسلمانوں کا مشرکین کے قافلوں کا راستہ روکنا قزاقی اور رہزنی کے مترادف تھا۔ ان کے اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ مسلمان قریش کے ساتھ مسلسل حالتِ جنگ میں تھے اور انہوں نے قریش کو کمزور کرنے کے جتنے بھی اقدامات کیے، خواہ وہ کسی بھی میدان میں ہوں، وہ دراصل حالتِ جنگ کی ایک اشد اور اہم ضرورت تھے۔ ان کے اس اقدام کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے مکے سے ہجرت کی تھی تو قریش نے ان کی تمام دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ دور جدید میں بھی اس عمل کو جائز سمجھا جاتا ہے کہ دورانِ جنگ میں دشمن کے انسانی اور اقتصادی وسائل پر کاری ضرب لگائی جائے۔

رجب کے مہینے میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا جس کی افادیت کے پیش نظر اس کا ذکر ضروری ہے۔ اس واقعے کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک امتیازی مقام عطا ہوا، اور نماز میں انہیں مستقل طور پر ایک نئی سمت کی جانب موڑ دیا گیا۔ یہ تحویل قبلہ کا واقعہ ہے، یعنی بیت المقدس (جو یروشلم میں ہے) کے بجائے کعبے (جو مکے میں ہے) کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا۔

حواشی

۱۔ **صحیح بخاری** کی ایک حدیث میں، جو زید بن ارقم سے مروی ہے، یہ ذکر ملتا ہے کہ غزوۂ عشیرہ پہلا غزوہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کو ابن اسحٰق کی روایت کے ساتھ اس طرح تطبیق دی ہے کہ زید بن ارقم کی مراد یہ ہے کہ پہلا غزوہ جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرکت کی، وہ عشیرہ ہے۔ **البدایة والنهایة**، ۳:۲۴۶

۲۔ خلیفہ بن خیاط، **تاریخ**، ص ۵۶

۳۔ ابن حجر عسقلانی، **فتح الباری**، ۷:۲۷۹؛ خلیفہ، **تاریخ**، ۵۶، ابن اسحٰق کی روایت سے ماخوذ ہے، جو بغیر سند کے ہے۔

۴۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۲۷۹

۵- خلیفہ، **تاریخ**، ص ۶۱-۶۲: ابو محمد عبدالملک بن ہشام الحمیری، **السیرة النبویة**، ۱: ۵۹۱-۵۹۲۔ ابن اسحٰق کی ایک روایت سے جو بغیر سند کے ہے۔ اموی، **مغازی**، یہ بھی بغیر سند کے ہے جیسا کہ **فتح الباری** میں ذکر ہے، ۶: ۲۷۹۔

۶- خلیفہ، **تاریخ**، ۵۷۔ ابن اسحٰق سے بغیر سند کے منقول ہے۔

۷- ایضاً

۸- ایضاً، ص ۶۳- عروہ سے مروی ''حسن'' درجے کی ''مرسل'' روایت ہے۔

۹- ابن ہشام، **سیرة**، ۱: ۵۹-۶۰، عروہ کی ''مرسل'' احادیث سے۔ ابوبکر احمد بن حسین بن علی بیہقی، **السنن الکبریٰ**، ۹: ۱۲، ۵۸-۵۹ (ایک صحیح سند کے ساتھ جس کا سلسلہ عروہ سے جا کر ملتا ہے)۔ اس قسم کی چند ملتی جلتی روایات طبرانی میں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے کچھ ''حسن'' درجے کی سند کے ساتھ ہیں اور کچھ دیگر اسناد کے ساتھ (دیکھیے: **الاصابة**، ۳: ۲۷۸؛ **ابن کثیر**، ۳: ۲۵۱ اور ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۶: ۶۶-۶۷)۔ جب راویوں کے تمام سلسلوں کو یک جا کیا جاتا ہے تو حدیث **صحیح لغیرہ** قرار پاتی ہے۔

۳

تحویلِ قبلہ

ہجرت سے پہلے، رسول اللہ ﷺ بیت المقدس (یروشلم) کی جانب رُخ کر کے اس طرح نماز ادا کیا کرتے تھے کہ کعبہ آپؐ کے اور بیت المقدس کے درمیان رہتا تھا۔ اس بات کا ذکر ایک روایت میں ہے جس کی سند ''صحیح'' ہے اور اس سند کا سلسلہ حضرت عبداللہؓ بن عباس (۱) سے جا کر مل جاتا ہے۔ چند اہلِ علم نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ مکے میں آپؐ کعبے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے اور جب آپؐ ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو وہاں آپؐ بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز ادا کرنے لگے۔ حافظ ابوعمر بن عبدالبر قرطبی کا رجحان آخر الذکر رائے کی جانب ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے: ''یہ ایک کمزور اور ضعیف روایت ہے۔ اگر اسے درست مان لیا جائے تو پھر تنسیخ کی دو روایات ہونا چاہییں''۔ (۲) پہلی روایت اس لحاظ سے زیادہ مستند ہے کہ یہ اپنے اندر دونوں بیانات کو سموئے ہوئے ہے۔ حاکم اور دیگر محققین نے بھی اسے ''صحیح'' مانا ہے۔ (۳)

سعید بن مسیّب نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے سے انصار بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ (۴)

جب رسول اللہ ﷺ نے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ ۱۶ ماہ تک بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ (۵) ہجرت کے دوسرے سال، رجب کے وسط میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ حکم ہوا کہ نماز کے دوران میں آپ اپنا رخ کعبے کی سمت کر لیں، جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ تھا۔ سعید بن مسیّب تحویلِ قبلہ

کا زمانہ معرکۂ بدر سے دو ماہ قبل کا قرار دیتے ہیں۔(۶) اس طرح ایک محتاط اندازے کے مطابق تحویلِ قبلہ کی صحیح تاریخ ۱۷ رجب ۲ھ ہے۔ محققین کی اکثریت کا خیال ہے کہ یہ واقعہ وسطِ رجب میں پیش آیا۔ اس طرح ان کے ہاں دو روز کم ہو جاتے ہیں۔(۷) ابن اسحٰق کے مطابق تحویل قبلہ کی تاریخ رسول اللہ ﷺ کی مدینے تشریف آوری کے کوئی ۱۷ ماہ بعد رجب کی کوئی تاریخ ہے۔(۸) اس سلسلے میں وہ ایک غیر متواتر ''شاذ'' روایت بھی نقل کرتے ہیں جس کی رو سے تحویلِ قبلہ کا واقعہ ہجرت کے ۱۸ ماہ بعد شعبان میں پیش آیا تھا۔(۹)

واقدی نے جو تاریخ متعین کی ہے، وہ ہجرت کے ۱۷ ماہ بعد وسط رجب ہے۔(۱۰) ان کے علاوہ کچھ غیر متواتر روایات اور بھی ہیں، مثال کے طور پر، موسیٰ بن عقبہ پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ تحویلِ قبلہ جمادی الاخریٰ میں ہوئی۔ کچھ دوسرے مصنفین نے مختلف تاریخوں کا ذکر کیا ہے جن کے مطابق ہجرت کے ۱۳ ماہ بعد، ۱۹ ماہ بعد، ۲۰ ماہ بعد، ۲ ماہ بعد(۱۱) اور دو سال بعد قبلہ تبدیل ہوا۔(۱۲)

اگر ہم غیر متواتر روایات کو نظر انداز کر دیں تو ۱۶ اور ۱۷ ماہ کی روایات میں جو تضاد پایا جاتا ہے، اسے ہم اس طرح رفع کر سکتے ہیں کہ دونوں آراء کو باہم ملا دیا جائے۔ وہ لوگ جن کی رائے یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ ہجرت کے ۱۶ ماہ بعد ہوئی، وہ دراصل اس مہینے کو جس میں حضور ﷺ مدینے تشریف لائے اور اس مہینے کو جس میں تحویلِ قبلہ ہوئی، ایک ہی شمار کرتے ہیں اور اضافی دنوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور وہ لوگ جن کا خیال یہ ہے کہ تحویل قبلہ ۱۷ ماہ بعد ہوئی، وہ ان دونوں مہینوں کو شمار کرتے ہیں۔ [اس کے علاوہ] کچھ محققین نے تاریخ کے تعین میں تامل کیا ہے۔(۱۳)

واقعہ یہ ہے کہ یہودی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک معاہدۂ امن کیا تھا، اس بات سے بے حد خوش تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینے تشریف آوری کے بعد بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مجاہد کہتے ہیں کہ انہوں نے اس بات سے فائدہ اٹھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ ''محمد (ﷺ) ہم سے اختلاف کرنے کے

باوجود ہمارے ہی قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں''،(۱۴) اور غالباً یہ روایت درست ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نیا مذہب سمتِ قبلہ میں ان کی پیروی کر رہا ہے اور یہ کہ اس مذہب نے ان کی کچھ روایات اور مذہبی رسوم کو بھی اختیار کر رکھا ہے۔ ان کی غالباً یہ خواہش ہو گی کہ نیا مذہب ان کے تابع فرمان ہو کر رہے۔ کچھ مصنفین نے یہ کہا ہے کہ ہجرت کے پہلے سال بیت المقدس کو اس لیے قبلہ قرار دیا گیا تا کہ یہودیوں کو اسلام کی طرف مائل کیا جا سکے،(۱۵) لیکن ایسا قطعاً نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مکے میں مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور ہجرت کے بعد بھی انہوں نے یہ عمل جاری رکھا۔

رسول اللہ ﷺ [اس باب میں] وحی کے منتظر رہتے تھے، اور آپؐ اپنا رخ کعبے کی طرف موڑنے کے متمنی تھے۔ آپؐ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلے کی جانب مڑ جائیں، کیوں کہ یہی وہ پہلا گھر ہے جو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنے قبلے میں ممتاز ہو جائیں اور یہودی پروپیگنڈا دم توڑ دے۔ آپؐ کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی خواہش پوری کر دی:

> ہم آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، اس لیے ہم آپ کو اس قبلے کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کے لیے آپ کی مرضی ہے۔ پھر اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کیا کیجیے اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو، اپنے چہروں کو اسی کی طرف کیا کرو (البقرۃ ۲:۱۴۴)۔

پہلی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے کعبے کی طرف رخ کر کے ادا کی، وہ ظہر کی نماز تھی جو بنو سلمہ کے درمیان ادا کی گئی تھی، لیکن مسجد نبوی میں جو پہلی نماز کعبے کی طرف رخ کر کے ادا کی گئی، وہ عصر کی تھی اور مسجد قبا میں جو پہلی نماز ادا کی گئی وہ فجر کی تھی۔ جوں جوں لوگوں کو قبلہ تبدیل ہونے کی خبر ملتی گئی، اسی حساب سے نمازوں میں رخ تبدیل ہوتا گیا۔(۱۶) قبلے کی تبدیلی سے یہودی بے حد متأسف اور پریشان ہوئے۔ غم اور غصے کی حالت میں انہوں نے مختلف قسم کی

افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے کچھ آیات نازل کیں جن میں ان کے تمام دعوؤں کی تردید کی گئی، مثال کے طور پر ان کے اس دعوے کے جواب میں کہ نیکی تو فقط یہ ہے کہ نماز میں بیت المقدس ہی کی جانب رخ کیا جائے، قرآن کریم کی درج ذیل آیت نازل ہوئی:

اب تو بے وقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان [مسلمانوں] کو ان کے قبلے سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس نے بدل دیا؟ آپ فرما دیجیے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں جس کو اللہ ہی چاہیں سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں (البقرۃ ۲:۱۴۲)۔(۱۷)

قرآن کریم میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قبلے کی تبدیلی، یعنی بیت المقدس کے بجائے کعبے کی طرف رخ کرنا، دراصل مومنوں کے لیے ایک امتحان تھا جس سے ان کے ایمان کا اندازہ لگایا گیا اور یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانے میں کتنے مستعد ہیں:

اور جس سمتِ قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس مصلحت کے لیے تھا کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون رسول اللہ ﷺ کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹتا ہے۔ اور یہ قبلے کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) بڑا ثقیل ہوا، (ہاں)، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع اور (ناقص) کر دیں۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں (البقرۃ ۲:۱۴۳)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کا رخ اگر قبلۂ اوّل سے پھیرا، تو یہ ایک آزمائش تھی۔ آزمائش کی یہ بات اس وقت زیادہ واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے جب ہم ان روایات کا مطالعہ کرتے ہیں، جن سے تحویلِ قبلہ کے بعد سامنے آنے والے تأثرات کا اندازہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر مشرکین نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دین کے بارے میں سخت الجھن کا شکار ہیں، اسی لیے ان کے قبلے کی طرف پلٹ گئے ہیں۔ منافقین نے

مسلمانوں کے درمیان یہ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں کہ ''آخر کیا وجہ ہے کہ محمد (ﷺ) ہمیں کبھی ایک جانب موڑتے ہیں اور کبھی دوسری جانب؟'' اور مومن اس مخمصے کا شکار ہو گئے کہ جو نمازیں انہوں نے بیت المقدس کی جانب رخ کر کے ادا کی ہیں، وہ قبول نہیں ہوں گی۔(۱۸) قرآن کریم کی یہ آیت اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ جس شخص نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور تحویلِ قبلہ سے پہلے ہی وفات پا گیا، اور اس نے ایک مرتبہ بھی کعبے کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھی، اس کی نمازیں اکارت نہیں گئیں۔ تقریباً دس صحابہ کرامؓ ایسے تھے جنھوں نے اس حالت میں وفات پائی تھی کہ وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ صحابہ کرامؓ جو حیات تھے، کعبے کی طرف رخ کر کے اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کر رہے تھے۔(۱۹)

حواشی

۱- محمد بن سعد، **طبقات** ،۱: ۲۴۳۔ حاکم اور چند دیگر حضرات نے ابن عباسؓ کی حدیث سے تصدیق کی ہے۔ بخاری نے اس موضوع سے متعلق اپنے باب میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب مسلمان کعبے میں نماز ادا کرتے تھے تو بیت المقدس کی جانب رخ کرتے تھے۔ ابن حجر، **فتح الباری**،۱: ۹۵-۹۶

۲- ابن حجر، **فتح الباری** ،۱: ۹۷

۳- ایضاً، ۱: ۹۶

۴- طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، **تاریخ الرسل والملوک**،۲: ۴۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ اگرچہ یہ قتادہ سے ''معنعن'' ہے جو ''مدلس'' ہیں۔ ابن مدینی نے ان کی روایات کو جو سعید بن مسیب سے مروی ہیں، کمزور قرار دیا ہے، جبکہ انہیں زبانی بھی نقل نہ کیا گیا ہو، جیسا کہ قتادہ کی سوانح کے متعلق **تهذيب التهذيب** میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ مفسرین میں سے طبری نے سعید بن مسیب سے ملتی جلتی رائے پیش کی ہے (طبری، **تفسیر**،۲: ۵)۔ پڑھنے والا دیکھ سکتا ہے کہ ابن مسیب نے بجائے **ثلث سنوات** (تین سال) کے **ثلث حجج** (تین حج) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

۵- متعدد صحابہؓ نے اسے روایت کیا ہے۔ ان صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی یہ ہیں: معاذؓ بن جبل، انسؓ

بن مالک اور براءؓ بن عازب ۔سعید بن مسیّب نے اسے ''مرسل'' سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ وہ سندیں جوان صحابہ کرامؓ سے جا کر ملتی ہیں، ''صحیح'' ہیں (**صحیح مسلم** ۱:۳۷۴)اور مسلم نے اس کی تصدیق کی ہے، لیکن بخاری کی روایت میں ''۱۶یا ۱۷ماہ'' کا ذکر ہے۔ **صحیح بخاری** (ابن حجر، **فتح الباری**، ۱:۹۵)۔اس بارے میں وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

۷۔ خلیفہ، تاریخ،۶۴؛ ابن سعد، **طبقات**، ۱:۲۴۲۔اس کی سند ''صحیح'' ہے، لیکن ''مرسل'' ہے اور سعید بن میسّب کی ''مراسیل'' قوی ہیں۔مزید دیکھیے: طبری، **تفسیر**،۲:۳

۸۔ خلیفہ، تاریخ، ص۶۴، (۶۴) بغیر سند کے۔

۹۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ص۶۴۔بغیر سند کے۔

۱۰۔ ابن سعد، **طبقات** ، ۱:۲۴۲۔ان کا کہنا ہے کہ واقدی ''متروک'' ہیں۔

۱۱۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۱:۹۷؛ طبری، **تفسیر** ،۲:۳-۴؛ خلیفہ، **تاریخ**، ص۶۴۔ان کی سند میں عثمان بن سعد کاتب شامل ہیں جو ''ضعیف'' ہیں۔

۱۲۔ حسن بصری کی ''مرسل'' احادیث سے، جو ''ضعیف'' ہیں۔خلیفہ بن خیاط، **تاریخ**، ص۶۵

۱۳۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۱:۹۶

۱۴۔ طبری، **تفسیر**، ۲:۲۰

۱۵۔ اس سے متعلق روایات طبری میں نقل کی گئی ہیں۔ **تفسیر**، ۲:۴۔یہ روایات محمد بن حمید رازی کے واسطے سے نقل کی گئی ہیں جو ''ضعیف'' ہیں اور مثنیٰ بن ابراہیم آملی کے واسطے سے جو ''مجہول'' ہیں۔

۱۶۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۱:۹۷

۱۷۔ طبری، **تفسیر**، ۱:۱-۲

۱۸۔ ایضاً، ۲:۱۱-۱۲

۱۹۔ ابن سعد، **طبقات**، ۱:۲۴۳۔ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ۔ابن حجر، **فتح الباری**، ۱:۹۸؛ طبری، **تفسیر**، ۲:۱۷

۴

بدر کا عظیم الشان معرکہ

اگر چہ مسلمان شام کو جانے والے تجارتی راستوں کو [قریش کے لیے] پُر خطر بنا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن ابھی تک انہوں نے قریش کے کسی تجارتی قافلے کے ساتھ کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں کی تھی، اس لیے قریش ان راستوں پر مسلح دستوں کی حفاظت میں بدستور اپنے تجارتی قافلے روانہ کرتے رہے۔ مسلمان ان قافلوں کی آمد و رفت کا پوری طرح جائزہ لے رہے تھے، جب انہوں نے سنا کہ قریش کا ایک بڑا تجارتی قافلہ شام سے لوٹنے والا ہے، تو انہوں نے اِس امر کی تصدیق کی غرض سے اپنے سپاہی روانہ کر دیے۔ معلوم ہوا کہ یہ قافلہ ابوسفیان صخر بن حرب کی کمان میں ہے اور بے پناہ مال و اسباب کے ساتھ قریش کی طرف جا رہا ہے۔ اس قافلے کی حفاظت پر کوئی تیس یا چالیس افراد مامور ہیں۔ (۱) رسول اللہ ﷺ نے مزید تحقیقات کے لیے حضرت بسباسؓ کو روانہ فرمایا اور ان کی واپسی کے بعد آپ صحابہ کرامؓ کو لے کر قافلے کا سامنا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مہم پر نکلنے میں نہایت عجلت سے کام لیا اور جو صحابہ کرامؓ آپؐ کے پاس موجود تھے، انہی کو ساتھ لے جانے پر اکتفاء کیا۔ آپ نے اُن صحابہ کرامؓ کے انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا جو شہر کے بالائی علاقوں میں مقیم تھے تا کہ ایسا نہ ہو کہ قافلہ ہاتھ سے نکل جائے۔ (۲)

یہی وجہ ہے کہ بدر کے مقام پر مسلمان آبادی کی بھرپور عسکری قوت کی نمائندگی نہ ہو سکی۔ مسلمان دراصل قافلہ روکنے کے ارادے سے نکلے تھے اور انہیں اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ انہیں قریشی فوج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت عکرمہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

حضرت عدیؓ بن زغباء اور حضرت بسباسؓ بن عمرو کو اس غرض سے بدر کی طرف روانہ کیا تھا کہ قافلے کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکیں اور وہ دونوں قافلے کے بارے میں خبریں حاصل کر کے لوٹ آئے تھے۔(۳) **صحیح مسلم** میں بھی اس روایت کی تائید کی گئی ہے کہ حضرت بسباسؓ کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کسی خاص مقصد کے لیے مسلمان دشمن کی جاسوسی اور اس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے مناسب طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔

جب مسلمان بدر کی جانب روانہ ہوئے تو ان کی کل تعداد ۳۱۹ تھی،(۴) جن میں ایک سو مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ یہ حضرت زبیرؓ بن عوام کی روایت ہے اور وہ خود اس مہم میں شریک تھے، تاہم حضرت براءؓ بن عازب، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے کم عمری کی بناء پر جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی تھی، کا کہنا ہے کہ مہاجرین کی تعداد ساٹھ سے زیادہ تھی اور انصار ۲۴۰ سے متجاوز تھے۔(۵) متعلقہ مآخذ میں ۳۴۰ صحابہ کرامؓ کے نام ملتے ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ مختلف روایات میں اس حوالے سے تضاد پایا جاتا ہے کہ کس نے اس مہم میں حصہ لیا تھا۔(۶)

مسلمانوں کا لشکر ابھی راستے ہی میں تھا کہ ایک مشرک آ کر ملا۔ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنا چاہتا ہے، کیوں کہ اسلامی لشکر میں اس کے اپنے لوگ موجود ہیں جو مسلمان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو یہ کہہ کر واپس فرما دیا کہ ''میں کبھی کسی مشرک سے مدد نہیں لوں گا''۔ اس شخص نے ایک بار پھر کوشش کی، مگر رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ اس کی مدد لینے سے انکار فرما دیا۔ مشرک نے اسی موقع پر اسلام قبول کر لیا اور اسلامی لشکر میں شامل ہو گیا۔(۷) یہ واقعہ اس لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ اسلام کی پہلی جنگ نظریے کے ساتھ وابستگی اور نصب العین کی وفاداری کی بنیاد پر لڑی گئی تھی۔

مسلمان مجاہدین کے پاس صرف ۷۰ اونٹ تھے جن پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔(۸) رسول اللہ ﷺ، حضرت ابولبابہؓ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب ایک ہی اونٹ کی سواری

میں باہم شریک تھے۔ حضرت ابولبابہؓ اور حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو مسلسل سواری کا موقع دیں، لیکن آپؐ نے فرمایا: ''تم مجھ سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو اور میں اللہ تعالیٰ کے اجر کا تم سے کم مستحق نہیں ہوں''۔ (۹) یہ طرزِ عمل اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ سالارِ اعظم اور عام سپاہی دونوں جہاد میں مساوی سطح پر شریک ہیں، اخلاص کی دولت سے مالا مال اور رضائے الٰہی اور اجرِ آخرت کے یکساں طلب گار ہیں۔ وہ سپاہی کیسے مشقت برداشت نہ کرتے جن کا سالارِ اعظم ایسا کرنے میں سب سے آگے ہو، اور اپنے سپاہیوں کو اپنے سے زیادہ مشقت میں نہ دیکھ سکتا ہو، حالانکہ وہ خود ۵۵ برس کی سال خوردگی میں ہو!

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم کو اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ آپؐ کی غیر حاضری میں مدینے میں امامت کے فرائض انجام دیں۔ بعد ازاں آپؐ نے حضرت ابولبابہؓ کو روحاء سے مدینے واپس بھیج دیا اور انہیں مدینے کا امیر مقرر کیا۔ روحاء، مدینے سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے (۱۰)۔ رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے قیادت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو سفر اور حضر، امن اور جنگ ہر حالت میں ضروری ہے۔

جب ابوسفیان نے یہ سنا کہ مسلمان قافلے پر قبضہ کرنے کی غرض سے مدینے سے باہر نکل آئے ہیں تو اس نے اپنے لیے ساحلی راستے کا انتخاب کیا اور ضمضم بن عمرو الغفاری کو مکے روانہ کر دیا، تاکہ وہ اہل مکہ کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دعوت دے۔ جب قریش کو یہ خبر ملی تو وہ فوری طور پر روانگی کے لیے تیار ہو گئے تاکہ اپنے قافلے کا دفاع کر سکیں۔

ابن عباسؓ اور عروہ بن زبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ عاتکہ بنت عبدالمطلب نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ایک شخص نے قریش کو جنگ کرنے کے لیے بلایا اور مکے میں ابوقبیس پہاڑ کی چوٹی سے ایک چٹان نیچے پھینکی۔ چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یہ ٹکڑے قریش کے ہر گھر میں جا پڑے۔ یہ خواب ابوجہل اور عباس کے درمیان ایک مسئلہ بنا ہوا تھا جو اس وقت حل ہوا، جب ضمضم مکے پہنچا اور قافلے کا پیغام پہنچایا۔ (۱۱)

یہ خبر سن کر قریش کے ہوش اڑ گئے، کیونکہ ماضی میں مسلمانوں نے قریش کو متنبہ کرنے

کے لیے جتنے تجارتی قافلوں کا راستہ روکا تھا، ان سب کے ساتھ معمولی جھڑپیں ہوئی تھیں، لیکن اس مرتبہ مسلمانوں نے قافلے پر مکمل طور پر قبضہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا تھا: ''یہ قریش کے اونٹ ہیں جو سامان سے لدے پھندے آ رہے ہیں، انہیں راستے ہی میں جا لو، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ غنیمت کے طور پر تمہیں یہ عطا کر دے''۔ (۱۲) قریش نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنی تمام افواج کو مجتمع کر کے حرکت کی، حتیٰ کہ ان کا کوئی گھڑسوار یا پیدل ایسا نہیں بچا تھا جو پیچھے رہ گیا ہو، سوائے ابولہب کے، کہ اس نے اپنی جگہ کسی دوسرے شخص کو روانہ کر دیا تھا۔ قریش کے درمیان غیظ و غضب کی اس لیے ایک لہر دوڑی ہوئی تھی کہ پیش آمدہ صورتِ حال کو وہ اپنی توہین کے مترادف سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عرب میں انہیں جو مقام حاصل ہے، اسے بری طرح للکارا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے اس اقدام کو اپنے اقتصادی مفادات پر ایک کاری ضرب گردانتے تھے۔ اس نازک صورت حال میں اگر ان کے کسی فرد نے جنگ میں شرکت سے ذرہ برابر بھی پس و پیش کی تو اسے اس قدر سخت لعنت ملامت کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ مقابلے پر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ (۱۳)

یہ ایک مستند روایت ہے کہ قریشی فوج کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ (۱۴) ابن اسحٰق نے بغیر کسی سند کے یہ ذکر کیا ہے کہ قریشی فوج میں ۹۵۰ لڑنے والے اور ۲۰۰ گھوڑے شامل تھے۔ فوج کے ساتھ گلوکاروں کی ایک جماعت بھی شریک تھی جو ڈھول پیٹتی جا رہی تھی اور مسلمانوں کے خلاف توہین آمیز گیتوں کا راگ الاپ رہی تھی۔ (۱۵)

فوج کو خوراک مہیا کرنے کے سلسلے میں الاموی کسی سند کے بغیر یہ بات نقل کرتے ہیں کہ امرائے قریش فوج کے کھانے کا بندوبست کرنے کے لیے کسی روز ۹ اور کسی روز ۱۰ اونٹ ذبح کیا کرتے تھے۔ (۱۶)

قریش کی فوج میں سے بنو زہرہ نے راستے ہی میں علیحدگی اختیار کر لی اور مکے لوٹ گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اخنس بن شریق نے جب یہ سنا کہ ابوسفیان کا قافلہ بحفاظت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے تو اس نے بنو زہرہ کو مکے واپس جانے کا مشورہ دیا۔ وہ لوگ اس

وقت جحفہ کے مقام پر تھے جو رابغ کے مشرق میں واقع ہے اور اس جگہ سے وہ پلٹ گئے۔(۱۷) لیکن قریش کی فوج کے بڑے حصے نے پیش قدمی کی اور بدر کے مقام تک آ گئے۔ اب ان کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ اپنے تجارتی قافلے کو مسلمانوں کی زد سے بچائیں، بلکہ اب ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کو تجارتی راستوں میں دخل اندازی سے روکیں اور انہیں اس کی سخت سزا دیں تا کہ عربوں پر قریش کی طاقت اور بالادستی کی دھاک بیٹھ جائے۔ مسلمانوں نے قریش کے کچھ کارندوں کو بدر کے چشمے پر گرفتار کر لیا اور انہیں قیدی بنا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان قیدیوں سے دشمن کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیں، یعنی فوج کی تعداد کتنی ہے، اس نے کہاں پڑاؤ ڈالا ہے اور ان کے سپہ سالار کون لوگ ہیں، یہاں تک کہ آپؐ نے یہ بھی دریافت فرما لیا کہ ہر روز کی خوراک کے لیے کل کتنے اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ نتیجہ اخذ فرمایا کہ لوگوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے، کیوں کہ ایک اونٹنی اور اس کا بچہ ایک سو افراد کے لیے کافی ہوتا ہے۔(۱۸)

کچھ مسلمان ایسے تھے جو قافلے کے بچ کر نکل جانے پر خوش نہیں تھے اور ان کی یہ مرضی نہیں تھی کہ قریش کی فوج کا مقابلہ کیا جائے۔ ان کے خیال میں مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیات سے ان کے اس رویے کی تصویر کشی ہوتی ہے:

جیسا کہ آپؐ کے رب نے آپ کے گھر (اور بستی سے) مصلحت کے ساتھ آپؐ کو (بدر کی طرف) روانہ کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کو گراں سمجھتی تھی۔ وہ اس مصلحت میں بعد اس کے کہ اس کا ظہور ہو گیا تھا، آپؐ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی ان کو موت کی طرف ہانکے لیے جاتا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں اور تم لوگ اس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتے تھے کہ وہ تمہارے ہاتھ آ جائے گی اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آ جائے اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا

ثابت کر دے اور ان کافروں کی بنیاد کو قطع کر دے (الانفال ۸:۵-۷)(۱۹)

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے ملک میں ہر قیمت پر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کریں گے، لیکن ان کے عہد میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ وہ آپؐ کے ساتھ مدینے سے باہر جا کر بھی لڑیں گے۔ یہی سبب تھا کہ غزوۂ بدر سے پہلے جو مہم پیش آئی، اس میں صرف مہاجر مسلمان ہی شریک تھے۔

چونکہ بدر کے موقع پر انصار نہ صرف موجود تھے، بلکہ ان کی تعداد مہاجرین سے تجاوز کر گئی تھی، رسول اللہ ﷺ نے اس نئی صورت حال کے بارے میں ان کا عندیہ لینا چاہا۔ آپؐ نے اس مقصد کے لیے اپنے صحابہ کرامؓ سے ایک عمومی مشورہ کیا، لیکن اصلاً آپؐ خصوصی طور پر انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ابن اسحٰق نے ''صحیح'' سند کے ساتھ اس مشاورت کے بارے میں روایت کیا ہے:

جب رسول اللہ ﷺ تک یہ خبریں پہنچیں کہ قریش اپنے قافلے کی حفاظت کی خاطر مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں تو آپؐ نے لوگوں کو اس بارے میں بتایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ ابوبکرؓ اور آپ کے بعد عمرؓ کھڑے ہوئے اور بہت اچھی گفتگو کی۔ اس کے بعد مقدادؓ بن عمرو اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور بولنا شروع کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ جایے جہاں بھی اللہ تعالیٰ آپؐ کو جانے کا حکم دیتا ہے اور ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو، ہم گھر میں بیٹھے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ آپؐ اور آپؐ کا خدا لڑیں گے، اور ہم بھی آپ کے ساتھ ساتھ لڑیں گے۔ قسم ہے اس ذات کی! جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپؐ ہمیں برک الغماد تک لے جائیں گے، تب بھی ہم آپؐ کے ساتھ ساتھ پورے عزم اور جذبے سے مقابلہ کریں گے، تاوقتیکہ آپؐ فتح پا لیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر مقدادؓ کی تعریف کی اور ان کے حق میں دعائے خیر کی۔ اس کے بعد آپؐ نے دوبارہ

فرمایا: ''لوگو! مجھے مشورہ دو''۔ آپؐ کا اشارہ انصار کی طرف تھا، کیوں کہ ایک تو ان کی اکثریت تھی، دوسرے یہ کہ جب انہوں نے عقبہ میں وفاداری کا عہد کیا تھا تو اس میں صاف طور پر یہ کہا تھا کہ جب تک حضورﷺ ان کے علاقے سے باہر ہوں گے، ان پر حضورﷺ کی حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں ہوگا، لیکن جب آپؐ ان کے علاقے میں موجود ہوں گے، اس وقت وہ آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں رسول اللہﷺ کا خیال تھا کہ انصار آپؐ کی مدد کے اسی وقت پابند ہیں جب مدینے کی حدود کے اندر دشمن آپؐ کے مدمقابل آئے، اور اگر آپؐ کو مدینے سے باہر جا کر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑے تو پھر انصار کے لیے آپؐ کا ساتھ دینا ضروری نہیں، مگر جب آپؐ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تو سعدؓ بن معاذ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا اشارہ ہماری طرف ہے''۔ رسول اللہﷺ نے اس بات کی تصدیق کر دی تو سعدؓ یوں گویا ہوئے:

''ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ آپؐ لے کر آئے ہیں، وہ حق ہے اور ہم نے آپؐ سے یہ عہد کیا ہے کہ آپؐ سے جو کچھ سنیں گے، اس کی فوری اطاعت کریں گے، اس لیے آپؐ جہاں بھی جانا چاہتے ہیں، جائیں، ہم آپؐ کا ساتھ دیں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپؐ ہمیں یہ حکم دیں کہ ہم سمندر کا سینہ چیر کر دوسری طرف نکل جائیں تو ہم ایسا ہی کریں گے، اور اگر آپ سمندر میں کود پڑیں تو ہم بھی آپؐ کے ساتھ ہی چھلانگ لگا دیں گے اور ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہم آپؐ کے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ ہمیں جنگ کا تجربہ بھی ہے اور مقابلے کا اعتماد بھی حاصل ہے، بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعے سے آپؐ کو وہ دکھا دے جس سے آپؐ مسرور ہوں، آپ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے ہمیں ساتھ لے کر چلیے''۔ سعدؓ کی یہ تقریر سن کر حضورﷺ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور آپؐ کو بہت زیادہ اطمینان کا احساس ہوا۔ پھر آپؐ نے

فرمایا: ''آگے بڑھو اور خوش ہو جاؤ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دشمن کے دونوں گروہوں میں سے کسی ایک پر مجھے قابو عطا فرمائے گا۔ خدا کی قسم! اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں دشمن کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ (۲۰)

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے سپاہیوں کی اطاعت اور شجاعت کا اندازہ کر لیا کہ وہ سب کے سب لڑنے کے لیے کمر بستہ اور اسلام کی خاطر قربانی دینے کے جذبے سے سرشار ہیں تو آپؐ نے فوج کو منظم کرنا شروع کیا۔ آپؐ نے سفید رنگ کا ایک علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کے سپرد کیا اور سیاہ رنگ کے دو علم حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت سعدؓ بن معاذ کے حوالے کیے اور حضرت قیسؓ بن ابی صعصعہ کو عقبی دستے پر مامور کیا۔ (۲۱)

دوسری طرف قریش کی فوج میں اس وقت اختلافات پیدا ہو گئے، جب عتبہ بن ربیعہ نے مسلمانوں کے مقابل صف آرا ہونے سے انکار کرتے ہوئے واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فریقین کے درمیان قتل و غارت گری سے احتراز کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کی آپس میں رشتہ داری تھی اور خون کا رشتہ قائم تھا، تاہم ابوجہل لڑنے پر تلا ہوا تھا اور آخر کار اسی کی رائے غالب رہی۔ (۲۲) مشرکوں نے مسلمانوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے لیے اپنا ایک جاسوس روانہ کیا۔ (۲۳) ابوجہل رسول اللہ ﷺ کے خلاف مسلسل ان الفاظ میں دہائی دیتا رہا: ''اے خدا! ہم میں سے جو فریق بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نامہربان ہو، ہم میں سے اُس پر وہ مسلط کر دے جو ہم نہیں جانتے، تو کل اسے تباہ و برباد کر دے''۔ یہ اس کی التجا تھی جو وہ اپنی کامیابی کے لیے کر رہا تھا اور قرآن کریم نے اسے مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں محفوظ کیا ہے:

اور اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تو تمہارے سامنے آ موجود ہوا۔ اور اگر باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لیے نہایت خوب ہے اور اگر تم پھر وہی کام کرو گے تو ہم بھی پھر وہی کام کریں گے اور تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آئے گی، گو کتنی زیادہ

ہو۔اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ہے(الانفال ۸: ۱۹)۔(۲۴)

مسلمانوں کی فوج بدر کے مقام پر پہنچی اور مشرکوں کے آنے سے قبل ہی اس نے اپنے لیے ایک موزوں جگہ کا انتخاب کر لیا۔ایک ایسے سلسلۂ سند سے جو''حسن'' ہے اور جس کا سلسلہ عروہ سے جا کر ملتا ہے، ہم تک یہ روایت پہنچی ہے۔اس کے برعکس ایک''مرسل'' روایت کے مطابق حضرت حبابؓ بن منذر نے رسول اللہ ﷺ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ بدر کے میدان میں اس طرح پڑاؤ ڈالیں کہ پانی کے چشمے پشت پر ہوں تاکہ مشرکین ان چشموں کو استعمال نہ کر سکیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تجویز قبول فرمالی تھی۔(۲۵) اگرچہ یہ روایت کمزور ہے، تاہم مشاورت کا اصول قرآن کریم کے متن اور سیرت کے واقعات سے ثابت شدہ اور مستحکم ہے۔

رسول اللہ ﷺ اکثر و بیشتر ان معاملات میں اپنے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے جن میں نہ تو وحی کی رہنمائی حاصل تھی اور نہ سنت ہی میں اس کا کوئی طریقِ کار (بذریعۂ وحی) واضح کیا گیا تھا۔آپؐ ایسا اس لیے کیا کرتے تھے کہ صحابہ کرامؓ عمومی مسائل پر غور و خوض کرنے کے بھی عادی ہوں۔اس کے ساتھ ساتھ آپؐ انہیں یہ تعلیم بھی دیتے تھے کہ ان کے اندر احساسِ ذمہ داری زیادہ سے زیادہ اجاگر ہو جائے۔اس طرزِ عمل سے آپؐ کا مقصد یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مشاورت کا دستور رائج کرنے کا جو حکم دیا ہے، وہ حکم بھی نافذ العمل ہو جائے اور اس بارے میں امت کی تعلیم و تربیت ہو جائے کہ وہ اس حکم پر کس طرح عمل درآمد کیا کرے۔

ایک صحیح روایت کے مطابق حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے بدر کے مقام پر، جب مشرک فوج ان کے بالمقابل تھی، رمضان کی سترہویں شب کس طرح گزاری:

اس رات ہم سب سو رہے تھے سوائے رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے۔آپؐ ایک درخت کے قریب کھڑے ہو کر نماز اور دعا میں مشغول رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔اسی دوران میں تھوڑی سی بارش بھی ہوئی اور ہم لوگ درختوں کے نیچے پناہ لینے کے لیے دوڑے۔کچھ لوگوں نے چمڑے کے ٹکڑوں سے اپنے کو ڈھانپا، لیکن رسول

اللہ ﷺ پوری رات اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف رہے۔ آپؐ کی زبان مبارک سے بار بار یہ الفاظ نکلتے تھے: ''اے اللہ! اگر آج یہ مختصر جماعت نیست و نابود ہوگئی تو پھر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا''۔ جب صبح ہوئی تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی: ''اللہ کے بندو! نماز کے لیے آؤ''۔ لوگ درختوں کے نیچے سے اٹھ کر اور چمڑے کی چادریں پھینک کر نماز کے لیے جمع ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم سب کو نماز پڑھائی اور جنگ کے لیے ہمارے حوصلے بلند فرمائے۔ (۲۶)

ایک کمزور روایت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جنگ کی تیاری اور سپاہیوں کو مختلف مقامات پر تعینات کرنے کا کام رات کو کیا گیا تھا۔ (۲۷) قرآن کریم کی ایک آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس روز بدر کے مقام پر بارش ہوئی تھی:

اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا، اپنی طرف سے چین دینے کے لیے اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا، تا کہ اس پانی کے ذریعے تم کو پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسے کو دفع کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہارے پاؤں جما دے (الانفال ۸:۱۱)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ فوج رات بھر مکمل آرام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ پوری رات ان کی حفاظت کی خاطر جاگتے رہے۔ ۱۷ رمضان کی صبح رسول اللہ ﷺ نے اپنی فوج کو، جو لڑنے کے لیے بالکل تیار اور تازہ دم تھی، مختلف صفوں میں ترتیب دیا۔ (۲۸) یہ جنگ کا ایک نیا طریقہ تھا جو عربوں کے اس عام طریقۂ جنگ سے مختلف تھا، جس میں حملہ کر کے پیچھے ہٹنا ہوتا ہے۔ مشرکین نے اس موقع پر بھی وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ صفوں کی ترتیب کے اس طریقے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے مقتولین کی تعداد بہت کم رہی۔ اس طرح مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کو جس قلتِ تعداد کا سامنا تھا، اس کا کچھ نہ کچھ تدارک ہو گیا۔ اس جدید طرزِ جنگ میں ایک بڑا فائدہ یہ پوشیدہ تھا کہ پوری فوج

ہمہ وقت سپہ سالار کے مکمل اختیار اور نگرانی میں رہی جس سے وہ فوج کے عقبی دستے کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا، کیوں کہ سپہ سالار ناگہانی اور اتفاقی حالات میں کام آنے والی فوج کو ہمیشہ عقب میں رکھتا ہے۔(۲۹)

رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک چبوترہ بنایا گیا تھا، جہاں سے آپ نے جنگ کی نگرانی فرمائی۔ حضرت سعدؓ بن معاذ (۳۰) کی تجویز پر یہ محفوظ چبوترہ بنایا گیا تھا جو یہ بات ثابت کرتا ہے کہ دورانِ جنگ میں سپہ سالار کے لیے حفاظتی اقدامات کرنے کی کیا اہمیت ہے۔

جب مشرکوں کی فوج مسلمانوں کی جانب بڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی فوج کو یہ ہدایت جاری فرمائی: ''جب تک میں حکم نہ دوں، تم میں سے کوئی حملہ نہ کرے''۔ مشرکوں نے پیش قدمی کی اور رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ''اور دوڑو مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی جانب سے ہو اور جنت کی طرف جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین، وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے'' (آل عمران ۳:۱۳۳)۔

جب حضرت عمیرؓ بن حمام نے یہ آیت سنی تو دریافت کیا: ''یارسول اللہؐ! کیا جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا ''ہاں''۔ حضرت عمیرؓ بے ساختہ بولے: ''کیا خوب ہے اور کیا عمدہ ہے''! رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم نے کس بناء پر ان تاثرات کا اظہار کیا ہے''؟ حضرت عمیرؓ نے جواب دیا: ''یارسول اللہؐ! صرف اس بناء پر کہ میری شدید خواہش ہے کہ میں اہل جنت کے ساتھ شامل ہو جاؤں''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا شمار اہل جنت میں ہے''۔ حضرت عمیرؓ اپنے ترکش میں سے کچھ کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر خود ہی بولے: ''اگر میں ان کھجوروں کے ختم ہونے تک بھی زندہ رہوں تو یقیناً یہ ایک لمبی مدت ہے''۔ یہ خیال آتے ہی ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور قریش کے خلاف لڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔(۳۱)

حضرت عمرؓ بن خطاب بیان کرتے ہیں کہ بدر کے روز رسول اللہ ﷺ مسلسل دعا اور مناجات میں مصروف رہے۔ عمرؓ کہتے ہیں:

بدر کے روز رسول اللہ ﷺ نے مشرک فوج پر نظر ڈالی۔ وہ ایک ہزار لوگ تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد محض ۳۱۹ تھی۔ رسول اللہ ﷺ قبلہ رخ ہو گئے، اپنے ہاتھ اللہ تعالیٰ کے آگے پھیلا دیے اور ان الفاظ میں اپنے رب کے حضور التجا کی: ''مالک! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے، اسے پورا فرما اور مجھے وہ عطا کر جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ مالک! اگر آج تو نے مسلمانوں کے اس قلیل گروہ کو ختم کر دیا تو پھر قیامت تک اس زمین پر تیری پرستش نہ ہو گی''۔ رسول اللہ ﷺ اس کیفیت میں اپنے رب کو پکارتے رہے، آپ کا چہرہ قبلے کی جانب تھا اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے، اسی حالت میں آپ ؐ کی چادر مبارک بھی آپ ؐ کے کندھوں سے پھسل کر نیچے جا گری، پھر حضرت ابوبکرؓ آئے، آپ ؐ کی چادر نیچے سے اٹھائی اور اسے دوبارہ آپ ؐ کے شانوں پر پھیلا دیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے پشت کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو گلے لگایا اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ ؐ نے اللہ تعالیٰ کے حضور بہت الحاح وزاری کی ہے، اللہ تعالیٰ یقیناً وہ وعدہ پورا فرمائے گا جو اس نے آپ ؐ سے کیا ہے''۔

اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ''اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری سن لی کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آئیں گے'' (الانفال ۸:۹)۔

اور آپ کی کمک کے لیے فرشتے بھیجے گئے۔ (۳۲) رسول اللہ ﷺ اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور پھر پیٹھ دکھا کر بھاگے گی'' (القمر ۵۴:۴۵)۔ (۳۳)

رسول اللہ ﷺ نے بنفس نفیس لڑائی میں حصہ لیا۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں: ''بدر کے روز ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پناہ لیتے تھے، وہ ہم میں سے دشمن کے سب سے زیادہ قریب تھے اور اس روز آپ ؐ ان لوگوں میں بہادر ترین شخص تھے جو وہاں موجود تھے''۔ (۳۴)

لڑائی کا آغاز انفرادی مقابلے سے ہوا۔ سب سے پہلے عتبہ بن ربیعہ اپنے بیٹے ولید

اور اپنے بھائی شیبہ کے ساتھ سامنے آیا اور اس نے مسلمان فوج کو للکارا۔ انصار کے چند نوجوان مقابلے کے لیے آئے تو مشرکین نے یہ کہہ کر مقابلے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے لڑنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو حکم دیا کہ وہ مقابلے میں نکلیں۔ حضرت حمزہؓ نے عتبہ کا کام تمام کیا، حضرت علیؓ نے شیبہ کو قتل کیا اور حضرت ابوعبیدہؓ نے ولید کے ساتھ مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں دونوں زخمی ہو گئے۔ حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ حضرت ابوعبیدہؓ کی مدد کے لیے آئے اور ولید کو قتل کیا اور حضرت ابوعبیدہؓ کو واپس اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ (۳۵)

اس انفرادی مقابلے نے قریش کو بری طرح متاثر کیا اور انہوں نے عام حملہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ تیروں سے مشرکین کا مقابلہ کریں۔ تیروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے آپؐ نے یہ ہدایت جاری فرمائی کہ ''جب دشمن بالکل نزدیک آ جائے، اس وقت اسے اپنے تیر کا نشانہ بناؤ اور اپنے تیروں کو کفایت کے ساتھ استعمال کرو''۔ (۳۶) عروہ اور قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے چہروں کی طرف کچھ کنکریاں پھینکیں اور اس قرآنی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت مستند ہے (۳۷):

''اور آپؐ نے خاک کی وہ مٹھی نہیں پھینکی، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے ان کی محنت کا خوب بدلہ دے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں'' (الانفال ۸: ۱۷)۔

دونوں طرف سے فوجیں جنگ میں کود پڑیں اور مشرکوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے جن میں ابوجہل عمرو بن ہشام بھی شامل تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے ''اس قوم کا فرعون'' (۳۸) قرار دیا تھا۔ اسے حضرت معاذؓ بن عمرو بن جموح اور حضرت معاذؓ بن عفراء نے قتل کیا۔ یہ دو نوجوان صحابی تھے جو ابوجہل کو نہ پہچانتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اس سلسلے میں ان کی رہنمائی فرمائی اور ابوجہل کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ نوجوان صحابیوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ابوجہل کو قتل کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں

گستاخی کی ہے۔ دونوں لڑکوں نے اسے زخمی کیا اور ابن مسعودؓ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ (۳۹)

ایک اور مشرک سردار جو اس لڑائی میں مارا گیا، وہ امیہ بن خلف تھا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اسے اور اس کے بیٹے علی کو جنگ کے اختتام پر قیدی بنا لیا تھا، مگر حضرت بلالؓ نے امیہ کو جا لیا۔ یہ وہی امیہ تھا جس نے مکے میں حضرت بلالؓ کے اوپر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ حضرت بلالؓ اسے دیکھتے ہی پکار اٹھے: ''امیہ بن خلف، کافر اعظم! اب میں زندہ رہوں گا یا یہ رہے گا''۔ انہوں نے مدد کے لیے انصار کو پکارا اور ان سب نے مل کر امیہ اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگا دیا۔ (۴۰)

قرآن کریم کی رو سے یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے معرکے میں مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتے بھیجے اور ''صحیح'' روایات بھی اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ بدر کے میدان میں فرشتوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ متعلقہ قرآنی آیات یہ ہیں:

اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم بے سروسامان تھے۔ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکر گزار رہو، جبکہ آپ مسلمانوں سے یوں فرما رہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جائیں گے۔ ہاں، کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آ پہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے، جو ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لیے کی کہ تمہارے لیے بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جائے اور نصرت صرف اللہ کی طرف سے ہے جو کہ زبردست حکیم ہیں (آل عمران ۳:۱۲۳-۱۲۶)۔

[ایک دوسرے مقام پر کہا گیا ہے]:

اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری سن لی کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آئیں گے۔ اللہ

تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لیے کی کہ بشارت ہو اور تمہارے دلوں کو قرار آ جائے اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست حکمت والا ہے (الانفال ۸: ۹-۱۰)۔

[اس سے پہلی آیت میں کہا گیا ہے]:

جب آپؐ کا رب فرشتوں کو حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں، سو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ۔ میں ابھی کفار کے قلوب میں رعب ڈالے دیتا ہوں، سو تم (کفار کی) گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور کو مارو (الانفال ۸: ۱۲)۔

آیت بالا میں لفظ اضربوا (کاری ضرب لگاؤ) فرشتوں کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے، لیکن طبری نے اسے مومنوں کی طرف خطاب قرار دیا ہے اور یہ توضیح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے مومنوں کو حملہ کرنے کی تعلیم دی ہے۔(۴۱) اس بارے میں متعلقہ حدیث درج ذیل ہے:

ابن عباسؓ کہتے ہیں:

اس روز ایک مسلمان کسی کافر کا تعاقب کر رہا تھا۔ یکا یک اس نے ایک ایسی آواز سنی جیسے کسی نے کافر کو کوڑے کے ذریعے زور سے مارا ہو پھر اسے کسی سوار کی آواز آئی: ''آگے بڑھو حیزوم!'' (۴۲) مسلمان نے جب کافر پر نظر ڈالی تو وہ پشت کے بل زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مسلمان نے جب اس پر غور سے نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کی ناک پر زخم کا نشان ہے اور چہرے کا گوشت اس بری طرح پھٹ گیا ہے جیسے کسی نے نہایت طاقت سے چہرے کے اوپر کوڑا رسید کیا ہو، اس کے چہرے کا رنگ مکمل طور پر سبزی مائل ہو چکا تھا۔ ایک انصاری صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا واقعہ بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سچ کہتے ہو، یہ ایک مدد تھی جو تیسرے آسمان (۴۳) سے آئی تھی (**صحیح مسلم**)۔

ایک انصاری صحابی نے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کو گرفتار کر لیا اور رسول اللہ ﷺ

کی خدمت میں لے کر آئے۔ قیدی نے کہا: ''یا رسول اللہ! خدا کی قسم! مجھے اس شخص نے گرفتار نہیں کیا، بلکہ مجھے ایک ایسے شخص نے گرفتار کیا ہے جو گنجا تھا، لیکن بے حد وجیہ چہرے کا مالک تھا اور ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ مجھے اس وقت یہاں لوگوں کے درمیان نظر نہیں آ رہا ہے''۔ انصاری صحابی نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! اسے میں نے گرفتار کیا ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً فرمایا: ''خاموش رہو! اللہ تعالیٰ نے ایک معزز اور مکرم فرشتے کے ذریعے تمہاری مدد کی ہے''۔ (۴۴)

اموی کی مغازی میں یہ حدیث ہے جس کی سند ''حسن'' ہے:

جب رسول اللہ ﷺ اپنے خیمے میں تشریف فرما تھے تو آپ ؐ کو تھوڑی دیر کے لیے اونگھ آ گئی۔ جب آپ ؐ کی آنکھ کھلی تو آپ ؐ نے فرمایا: ''ابوبکر! خوش ہو جاؤ، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد آ گئی ہے۔ یہ جبریل ہیں، عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور اپنے گھوڑے کی لگامیں پکڑے ہوئے ہیں، گرد کا ایک بادل ان کے اوپر چھایا ہوا ہے، خدا کی مدد اور کمک تمہارے لیے آن پہنچی ہے''۔ (۴۵)

صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا:

اہل بدر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم انہیں تمام مسلمانوں میں بہترین سمجھتے ہیں (یا اس سے ملتا جلتا تأثر ظاہر کیا)''۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا: ''اور اسی طرح ہم بھی ان فرشتوں کو بہترین گردانتے ہیں جنہوں نے بدر کے موقع پر معاونت کی''۔ (۴۶)

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی شرکت کے بارے میں یہ ''صحیح'' روایات ہیں۔ سبکی نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جبریل علیہ السلام، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تن تنہا مشرکوں کو تباہ و برباد کر سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ بہت سے فرشتے آئیں۔ ان کے خیال میں ایسا اس لیے کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کے ذریعے ہی جنگ کا عمل پایۂ تکمیل تک

پہنچے۔فرشتوں کو صرف ان کی مدد اور فوج کی کمک کے طور پر بھیجا گیا تھا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لیے اسباب کا جو سلسلہ رکھا ہے، اسے بھی برقرار رکھا۔ تمام اسباب کے پیچھے اللہ ہی کی قوت کارفرما ہے اور وہی ہر کام بہتر جانتا ہے۔(۴۷)

بعض مسلمان مصنفین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ غزوۂ بدر میں فرشتوں کی شرکت کا حوالہ دینے سے گریز کریں۔ اس قسم کا گریز مادہ پرستانہ سوچ کی علامت ہے جو صرف محسوسات پر یقین رکھتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ فرشتوں پر بھی یقین رکھا جائے۔

غزوۂ بدر میں مشرک دھڑا دھڑ گرنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ ۷۰ مشرک مارے گئے اور ۷۰ ہی گرفتار ہوئے۔(۴۸) کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جنگ شروع ہونے سے قبل ہی صحابہ کرامؓ کو نام لے کر بتا دیا تھا کہ فلاں شخص اس مقام پر گرے گا، اور فلاں شخص اس مقام پر۔ ان سب کی موت اسی طرح واقع ہوئی جس طرح آپؐ نے نشان دہی فرما دی تھی۔(۴۹) آہستہ آہستہ مشرکین نے میدان جنگ سے بھاگنا شروع کر دیا اور بڑی تعداد میں مالِ غنیمت چھوڑ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ مشرکین کی لاشوں کو بدر کے گڑھوں میں ایک ساتھ دفن کر دیا جائے۔ آپ نے تین روز بدر میں قیام فرمایا اور مسلمان شہداء کی تدفین فرمائی۔ شہداء کی تعداد چودہ تھی جن کے نام متعلقہ مآخذ میں موجود ہیں۔(۵۰) ابن حجر نے الاصابۃ(۵۱) میں دو ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ متعلقہ مآخذ میں یہ ذکر موجود نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان شہداء کی نماز جنازہ ادا کی یا نہیں۔ آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ شہداء کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔ تمام شہداء کو بدر کے میدان ہی میں دفن کر دیا گیا اور کسی ایک کو بھی اس غرض سے وہاں سے نہ لایا گیا کہ اسے مدینے میں دفن کیا جائے گا۔

بدر میں قیام کے تیسرے روز، رسول اللہ ﷺ ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے جس میں قریش کے چوبیس سرداروں کی لاشیں ایک ساتھ دفن کی گئی تھیں۔ آپؐ نے ان

سرداروں میں سے ایک ایک کو ان کے اپنے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں کے ساتھ پکارا اور ان سے یوں مخاطب ہوئے: ''کیا تم اللہ اور اس کے رسول کے (اس طرح) فرماں بردار بن کر خوش ہو؟ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جتنے وعدے کیے تھے وہ سب پورے ہوئے''!

یہ خطاب سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ ان سے کلام کرتے ہیں جن کے اندر جان ہی نہیں ہے''؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے یہ اسی طرح سن رہے ہیں جس طرح تم سن رہے ہو''!

قتادہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی دی تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سرزنش سن سکیں اور شرمندگی اور ندامت محسوس کر کے ذلت والے عذاب میں گرفتار ہوں''۔ (۵۲)

غزوۂ بدر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کے قافلے کا پیچھا کرنے کا قصد نہیں کیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ دشمن کے دو گروہوں میں سے ایک پر آپ کو غلبہ عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی فوج پر آپ کو فتح دے کر اپنا وعدہ پورا فرما دیا تھا۔ (۵۳)

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ مشورہ دیا کہ ان مشرکوں کی زندگیوں کا تحفظ کیا جائے جو معرکۂ بدر میں بادلِ ناخواستہ شریک ہوئے اور اب انہیں قوم کی ملامت کا خوف تھا۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے مکے میں مسلمانوں کی مدد کی تھی۔ ان میں سے جن لوگوں کے نام حضور ﷺ نے گنوائے، وہ عباس بن عبدالمطلب اور ابوالبختری بن ہشام تھے۔ (۵۴) آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان دونوں افراد کو گرفتار کر لیا جائے، لیکن انہیں قتل نہ کیا جائے۔ (۵۵) عباس بن عبدالمطلب کو قیدی بنا لیا گیا، لیکن ابوالبختری نے لڑنے پر اصرار کیا تھا، اور وہ قتل ہو گیا۔ (۵۶)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے اس بارے میں مشورہ کیا کہ قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ حضرت ابوبکرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ انہیں

فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے، اور اپنی رائے کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا: "فدیے کی جو رقم وصول ہوگی، وہ کفار کے مقابلے میں ہمارے کام آئے گی، اور جہاں تک ان قیدیوں کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قبولِ اسلام کی توفیق عطا فرما دے"۔ حضرت عمرؓ نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کا مشورہ دیا اور عرض کیا: "یہ کفر کے سردار ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی اس رائے کو ترجیح دی کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے، مگر اس کے بعد مندرجہ ذیل قرآنی آیات نازل ہوئیں جن میں حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی گئی تھی:

> نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح خون ریزی نہ کرلیں۔ تم تو دنیا کا اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت کو چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست، بڑا حکمت والا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے، اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی، سو جو کچھ تم نے لیا ہے، اس کو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ (الانفال ۸:۶۷-۶۹) (۵۷)۔

ان آیات میں سردارانِ کفر کو قتل کرنے کے بجائے ان سے فدیہ لینے پر زجر وتوبیخ کی گئی ہے، لیکن یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ جو کچھ وصول کیا جا چکا ہے، وہ جائز اور حلال ہے، لیکن یہ پابندی اسلام کے ابتدائی زمانے تک ہی محدود تھی، بعد میں امیر کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ قیدیوں کو قتل کر دے، یا ان سے فدیہ لے کر انہیں رہا کر دے، یا انہیں بغیر کسی فدیے کے رہا کر دے، سوائے عورتوں اور بچوں کے، کیوں کہ انہیں قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ (۵۸)

مختلف قیدیوں کا فدیہ مختلف تھا۔ وہ قیدی جو صاحبِ ثروت تھے، انہوں نے چار ہزار درہم ادا کیے۔ (۵۹) رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابوالعاص بن ربیع کا فدیہ ایک ہار کی شکل میں ادا کیا۔ صحابہ کرامؓ نے حضرت زینبؓ کے قیدی شوہر کو رہا کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا اعزاز کرتے ہوئے وہ ہار بھی واپس کر دیا۔ (۶۰) اگر کسی قیدی کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی تو اس کا یہ فدیہ قرار دیا گیا کہ وہ انصار کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے گا۔ (۶۱) مسلمانوں کو مال و دولت کی زیادہ پروا نہیں تھی، بلکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ دشمن

کے حوصلے پست ہو جائیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان قیدیوں کی رہائی کی بات کرتا تو میں ان تمام قیدیوں کو (بغیر کسی فدیے کے) اس کے حوالے کر دیتا''۔(۶۲)

انصار چاہتے تھے کہ عباس بن عبدالمطلب کو فدیے سے مستثنیٰ قرار دے دیں، کیوں کہ عباس رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے اور ان کی دادی ان کے اپنے لوگوں میں سے تھیں، مگر رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر انکار فرما دیا کہ ''ان کے فدیے میں سے ایک درہم بھی کم نہیں کیا جائے گا''۔(۶۳) اس معاشرے میں جانبداری کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا کے معاملے میں بھی ایسا سوچنا محال تھا۔اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے کے آگے سب برابر تھے، اس حقیقت کے باوجود کہ عباس نے رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دی کہ وہ اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور بدر کے معرکے میں بادل ناخواستہ شریک ہوئے تھے۔(۶۴) عباس نے اپنے فدیے کے طور پر ایک سو اوقیہ سونا ادا کیا تھا۔عقیل بن ابی طالب نے اسی (۸۰) اوقیہ اور بعض قیدیوں نے صرف چالیس اوقیہ سونا ادا کیا۔(۶۵)

مالِ غنیمت کے معاملے میں اس لیے اختلافات پیدا ہوئے کہ اس وقت تک اس کی تقسیم قانونی طور پر منضبط نہیں ہوئی تھی۔حضرت عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں:''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کے ارادے سے نکلے اور میں بدر کے موقع پر آپؐ کے ہمراہ موجود تھا۔جنگ شروع ہوئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے دشمن کو شکست فاش سے دوچار کیا۔کچھ مسلمانوں نے دشمن کا تعاقب کیا، کچھ نے غنیمت لوٹنے پر توجہ دی اور کچھ مسلمان ایسے تھے جو مسلسل رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے پہرہ دے رہے تھے تاکہ دشمن کہیں موقع پا کر آپؐ پر حملہ نہ کر دے۔جب رات پڑنے پر تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہوئے تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت اکٹھا کیا تھا، انھوں نے کہا:''غنیمت پر صرف ہمارا حق ہے، کیوں کہ اسے ہم ہی نے اکٹھا کیا ہے''۔جن لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تھا، وہ بولے:''اس پر ہمارا حق زیادہ ہے، کیوں کہ ہم ہی نے دشمن کو دور تک مار بھگایا ہے''، اور وہ اصحاب جو رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے،

کہنے لگے: ''غنیمت پر سب سے زیادہ ہمارا حق بنتا ہے۔ ہمیں یہ خدشہ تھا کہ دشمن پلٹ کر اچانک حملہ نہ کر دے، اس لیے ہم رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرنے کے لیے مستعد کھڑے تھے''۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

یہ لوگ آپؐ سے اموال غنیمت کا حکم دریافت کرتے ہیں، آپؐ فرما دیجیے کہ یہ اموال غنیمت اللہ اور رسول کے ہیں، سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (الانفال ۸:۱)۔

رسول اللہ ﷺ نے غنیمت کو مسلمانوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا۔ (۲۶)

''صحیح'' روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) خود رکھا اور بقیہ فوج میں تقسیم کر دیا۔ (۲۷) پانچویں حصے یا خمس کے متعلق آیت بھی انہی آیات کے ساتھ نازل ہوئی جن کا تعلق غزوۂ بدر سے ہے: ''اور اس بات کو جان لو کہ جو شئے بطور غنیمت تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ کل کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے اور آپؐ کے قرابت والوں کا ہے اور یتیموں، غریبوں اور مسافروں کا ہے---'' (الانفال ۸:۴۱)۔ (۲۸)

کم و بیش نو صحابہ کرامؓ ایسے تھے جو غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کر سکے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں غنیمت میں سے کچھ حصہ عنایت فرمایا۔ ان میں سے چند ایک صحابہؓ وہ تھے جنہیں مدینے میں مختلف کاموں پر مامور کیا گیا تھا، کچھ وہ تھے جو بدر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں زخمی ہو گئے تھے اور بقیہ لوگوں کو دیگر خصوصی اسباب کی بناء پر مال غنیمت میں شریک کیا گیا۔ انہی آخر الذکر لوگوں میں حضرت عثمانؓ بن عفان بھی شامل تھے۔ ان کی اہلیہ، سیّدہ رقیہؓ صاحبِ فراش تھیں اور حضور ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو ان کی دیکھ بھال کی خاطر مدینے ہی میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا تھا۔ (۲۹) جونہی مالِ غنیمت کی تقسیم کے متعلق آسمانی فیصلہ صادر ہوا، لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور تمام اختلافات رفع ہو گئے۔ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ آ جاتا تھا تو ان لوگوں کا ہمیشہ یہی طرزِ عمل ہوتا تھا۔ مدینے واپس آتے وقت، صفراء کے مقام پر مالِ غنیمت کی تقسیم عمل میں آئی۔ حضرت زیدؓ

بن حارثہؓ مسلم فوج سے پہلے ہی مدینے پہنچ گئے اور انہوں نے اہل شہر کو فتح کی خوشخبری سنائی تھی۔ مسلمانوں کو اس خبر سے بے پناہ خوشی ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خبر غلط ہو۔ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم میں نے اس خبر پر اس وقت تک یقین نہیں کیا تھا، جب تک میں نے اپنی آنکھوں سے قیدی نہیں دیکھ لیے''۔(۷۰) ہر شخص پر حیرت اور خوشی کا غلبہ تھا۔ کیا واقعی قریش کو شکست ہوگئی ہے؟ ان کے سردار گرفتار ہوگئے ہیں؟ ان کے غرور کا بت ٹوٹ چکا ہے اور کیا واقعی ان کے خداؤں اور ان کے عقائد کا باطل ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جو حیرت اور خوشی کے ملے جلے تأثرات کے ساتھ لوگوں کی زبان پر تھے۔ اسی حیرت کے عالم میں رسول اللہ ﷺ کی اہلیہ حضرت سودہؓ کی نظر ابو یزید سہیل بن عمرو پر پڑی جس کے ہاتھ ایک رسی سے اس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ حضرت سودہؓ نے بے ساختہ کہا: ''ابو یزید! تم نے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دیے، تمہیں تو عزت کی موت مرنا چاہیے تھا''۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اضطراب پیدا کر رہی ہو''؟ حضرت سودہؓ نے جواب دیا: ''یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، جب میں نے ابو یزید کو اس حال میں دیکھا تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی اور وہ کچھ کہہ بیٹھی جو آپؐ نے سنا ہے''۔(۷۱)

مدینے واپس جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ دو قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ یہ دو قیدی نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط تھے۔(۷۲) ان دونوں نے مکے میں مسلمانوں پر بے حد مظالم کیے تھے اور انہیں اللہ اور اس کے رسول سے دلی نفرت تھی۔ وہ کفر کے سرداروں میں سے تھے اور جنگ کے مجرم تھے۔ انہیں سزائے موت اس لیے دی گئی کہ ظالموں کو عبرتناک سبق سکھایا جا سکے۔ عقبہ اپنا تمام غرور اور تکبر بھول کر چلا اٹھا: ''اے اللہ کے رسول! کون میرے بچوں کی دیکھ بھال کرے گا''؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''(جہنم کی)(۷۳) آگ''۔ کیا عقبہ وہ دن بھول گیا تھا جب اس نے اونٹ کی اوجھڑی لا کر رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر رکھ دی تھی، جبکہ آپؐ سجدے کی حالت میں تھے اور حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئی تھیں

اور آپ ﷺ کے اوپر سے اوجھڑی ہٹائی تھی۔(۷۴)

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ قیدیوں کے ساتھ از حد حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آئیں۔لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس نصیحت پر اس شدت سے عمل کیا کہ ابوعزیز جو اپنے بھائی حضرت مصعبؓ بن عمیر اور ایک انصاری شخص کے پاس قید تھا، بیان کرتا ہے کہ جب کھانے کا وقت آتا تو وہ دونوں صاحب مجھے روٹی کھلایا کرتے تھے (جو کھانے کا ایک اہم اور قابل قدر حصہ ہوتا تھا)، اور خود کھجوروں پر گزارا کر لیتے تھے۔گھر میں، اگر جو کی روٹی بھی میسر ہوتی تو وہ ابوعزیز کو پیش کر دی جاتی تھی۔ابوعزیز نے مزید کہا: ''مجھے اس بات سے شرم آنے لگی کہ میں روزانہ روٹی کھا لیتا ہوں اور میرے مالک کھجور پر گزارا کرتے ہیں، چنانچہ میں نے روٹی واپس کرنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا''۔(۷۵) یہ طرزِ عمل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلام میں قیدیوں کے نگران کو چاہیے کہ اپنے قیدی کو اچھے سے اچھا کھلانے کی کوشش کرے۔اس قسم کی مثالیں دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ہمیں نظر نہیں آئیں گی۔

اگرچہ بدر ایک مختصر معرکہ تھا، تاہم اسلام کی تاریخ میں یہ ایک اہم موڑ تھا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس معرکے کو ''یوم فرقان'' کا نام دیا گیا ہے، یعنی حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا دن۔اس معرکے میں اسلام نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی اور مومنوں کے دلوں میں دین نے تمام دنیاوی مفادات، جذبات اور تعلقات کے مقابلے میں برتری حاصل کر لی۔جنگ شروع ہونے سے پہلے انصار نے اعلان کیا تھا کہ عقیدے کے ساتھ ان کی وابستگی محض اس تحریری معاہدے تک محدود نہیں ہے جو انہوں نے عقبہ کے مقام پر دوسری بیعت کرتے ہوئے کیا تھا۔وہ تابعدار سپاہی ہیں اور بلا کسی حدود و قیود کے دین کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد ہیں۔جنگ کا آغاز ہوا تو مہاجرین نے دیکھا کہ ان کا سامنا اپنے ہی عزیز و اقارب سے ہے۔بیٹا باپ کے مقابلے میں ہے تو بھائی بھائی کے خلاف صف آرا ہے، لیکن یہ خونی رشتے انہیں جہاد سے باز نہ رکھ سکے، کیوں کہ عقیدے کا مفاد دیگر تمام تر

مفادات اور تعلقات پر بازی لے گیا تھا۔ وہ صحابہ کرامؓ جنہوں نے اس معرکے میں حصہ لیا، انہیں عزوشرف کا اعلیٰ مقام عطا ہوا اور ''اصحابِ بدر'' کے نام سے پکارے گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام صحابہ کرامؓ کے مقابلے میں، اصحابِ بدر کا مرتبہ سب سے اونچا قرار دیا اور ریاست کی طرف سے ان کے لیے سب سے بھاری وظائف مقرر کیے۔ سوانح کی کتب میں سب سے پہلے انہی بدری صحابہؓ کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔ انہیں زندگی میں بہترین بدلہ عطا ہوا اور بعد کے تمام ادوار میں ان کا اعزاز واکرام مسلم رہا۔

رسول اللہ ﷺ کے مستند اقوال سے اصحابِ بدر کے فضائل اور جنت میں ان کے اعلیٰ مقام کا پتہ چلتا ہے:

بدر کے روز حضرت حارثہؓ بن سراقہ انصاری شہید ہو گئے، (اس وقت) وہ نوجوان تھے۔ ان کی والدہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپؐ جانتے ہیں کہ حارثہ مجھے کتنا عزیز تھا۔ اگر وہ جنت میں ہے تو میں اس کی جدائی برداشت کرلوں گی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اجر کی امید رکھوں گی، لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی صورت ہے تو پھر آپ بتایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے''؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے! کیا تم اپنے حواس میں ہو؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ جنت صرف ایک ہی ہے؟ یاد رکھو! جنت کے بے شمار درجات ہیں اور تمہارا بیٹا جنت کے سب سے بلند ترین مقام پر ہے''۔(۷۶)

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا واقعہ بھی اس لحاظ سے اہم ہے۔ انہوں نے قریش کو اطلاع دی تھی کہ مسلمان مکہ فتح کرنے کی غرض سے آ رہے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ کہتے ہوئے معاف کردیا: ''ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کردے جنہوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا اور ان کے حق میں یہ فیصلہ فرمادے۔ 'جو چاہو سو کرو، جنت اب تمہاری ہے اور میں نے تمہارے تمام گناہ بخش دیے ہیں''۔(۷۷) جب حضرت حاطبؓ کے خادم نے حضور ﷺ سے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! حاطبؓ یقیناً دوزخ میں داخل ہوں

گے''۔رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''بالکل غلط! وہ کبھی دوزخ میں داخل نہیں ہوں گے، کیوں کہ وہ بدر اور حدیبیہ دونوں جگہ شریک رہے ہیں''۔(۷۸)

غزوۂ بدر کے جو نتائج برآمد ہوئے، انہوں نے مکہ و مدینہ اور جزیرہ نمائے عرب کے بقیہ علاقوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مدینے میں مسلمانوں کو یہودیوں اور دوسرے مشرکوں پر برتری حاصل ہوگئی۔ یہودیوں پر سخت مایوسی طاری ہوئی، ان کی نفرت میں اضافہ ہوا اور ان کی نفرت بعد میں کھلی جارحیت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ مسلمانوں کی اس غیر متوقع کامیابی کو دیکھ کر یہودی غصے سے پیچ و تاب کھانے لگے، انہیں اپنے اقوال اور افعال پر قابو نہ رہا اور ان کا ہیجان انگیز اضطراب اور صدمہ وقتاً فوقتاً ظاہر ہونے لگا۔ ان کی سرکشی اور جارحیت اتنی بڑھ گئی کہ بالآخر وہ مدینے سے بنو قینقاع کی جلاوطنی کا سبب بنی۔

بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس واقعے کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا مقصد محض اپنا مفاد حاصل کرنا تھا، کیوں کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اب مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ منافق تھے جنہوں نے ظاہری طور پر تو قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا تھا، لیکن دل سے کفر پر قائم تھے۔ ان منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔

قریشِ مکہ کے لیے اس صورت حال پر یقین کرنا بے حد مشکل تھا، ان کے تمام سردار اور چوٹی کے لوگ مارے گئے تھے۔ ایک ''مرسل'' روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قریش نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ممانعت کر دی تھی کہ کسی مرنے والے پر نہ تو رویا جائے اور نہ نوحہ ہی کیا جائے۔ یہ بندش اس لیے لگائی گئی تھی کہ مسلمان ان کے مصائب پر خوشی محسوس نہ کریں (۷۹)، لیکن وہ اپنے مرنے والوں کا انتقام لینے کا پوری طرح عزم کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے عمیر بن وہب الجمحی کو یہ منصوبہ دے کر مدینے روانہ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دے۔ صفوان بن امیہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر بدلے میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کے اہل خانہ کی دیکھ بھال اور ذمہ داری صفوان کے سر ہوگی۔ عمیر ایک تلوار لے کر مدینے جا پہنچا۔ جب وہ مسجد نبوی کے قریب جا کر اترا تو حضرت عمرؓ بن خطاب اسے گرفتار کر کے رسول اللہ ﷺ کی

خدمت میں لے آئے۔ آپؐ نے اس سے استفسار فرمایا: ''عمیر! کیسے آنا ہوا''؟ عمیر نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ وہ قیدی چھڑانے کی غرض سے آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی آمد کا اصل مقصد بتاتے ہوئے اسے یہ بھی بتایا کہ اس کے اور صفوان کے درمیان کیا بات طے ہوئی تھی۔ یہ سن کر عمیر نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ وہ مکے جا کر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ (۸۰) آپ نے اجازت عطا فرما دی۔ اپنے مرنے والوں کا انتقام لینے کے لیے قریش نے دو مسلمان قیدی خریدے جنہیں رجیع کے واقعے میں گرفتار کیا گیا تھا اور ان دونوں کو قتل کر دیا۔ یہ دو قیدی خبیب اور زید بن الدثنہ تھے۔ (۸۱)

بدر کے بعد کی مہمات

غزوۂ قرقرۃ الکدر

مسلمانوں نے قریش کا جو اقتصادی محاصرہ کیا تھا، اسے برقرار رکھنے پر انہوں نے مسلسل اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ کچھ قبائل ایسے تھے جنہیں قریش کی تجارت سے متعدد فوائد حاصل ہوئے تھے، ان قبائل نے مسلمانوں کے خلاف فوج جمع کرنا شروع کر دی، مثال کے طور پر بنوسلیم اور غطفان قرقرۃ الکدر کے مقام پر جمع ہو گئے۔ یہ ایک چشمہ تھا جس کا تعلق بنوسلیم سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ فوج لے کر روانہ ہوئے۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ رسول اللہ ﷺ فوج لے کر آ رہے ہیں تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے چشمے پر حملہ کیا تو وہاں صرف اونٹ تھے۔ آپؐ تین روز وہاں مقیم رہے، اس کے بعد آپؐ واپس مدینے تشریف لے آئے۔ (۸۲) ابن سعد نے بغیر کسی سند کے روایت کیا ہے کہ مال غنیمت میں ۵۰۰ اونٹ شامل تھے اور ان کے جنگجوؤں کی تعداد ۲۰۰ تھی۔ (۸۳)

غزوۂ سویق

ابوسفیان غزۂ بدر کے بعد انتقامی کارروائی کے طور پر ۲۰۰ سوار لے کر مکے سے نہایت خفیہ طور پر روانہ ہوا، اور مدینے کے مضافات میں بنونضیر کے علاقے میں جا کر پناہ گزین ہوا۔ اس

کے بعد اس نے مدینے کی العریض نامی وادی پر حملہ کیا جو حرۂ واقم کے کنارے واقع تھی۔ اس نے دو افراد کو قتل کیا، کھجور کے کچھ درخت جلائے اور واپس مکے فرار ہو گیا۔ مسلمانوں نے قرقرۃ الکدر تک اس کا تعاقب کیا، لیکن اسے پکڑ نہ سکے، البتہ انہیں راستے میں سویق (ایک قسم کا کھانا) پڑا ہوا ملا جسے وہ اپنے ساتھ لیتے آئے۔ مشرکوں نے جب دیکھا کہ مسلمان ان کا تعاقب کر رہے ہیں تو وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے کھانے کو راستے میں گراتے ہوئے فرار ہوئے تاکہ ان کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور جلدی فرار ہونا ممکن اور آسان ہو جائے۔ یہی سبب ہے کہ اس مہم کو غزوۂ سویق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۸۴)

غزوۂ ذوامر

غزوۂ سویق ہجرت کے تیسرے سال ذوالحجہ میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے ایک ماہ بعد رسول اللہ ﷺ نے نجد کی طرف قبیلہ غطفان کے افراد کے خلاف پیش قدمی کی جو ذوامر میں جمع ہو گئے تھے، مگر وہ آپؐ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گئے اور لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی۔ آپؐ نے صفر کے مہینے کے دوران میں ان کے علاقے میں قیام فرمایا اور پھر مدینے واپس تشریف لائے۔ اسے غزوۂ ذوامر کا نام دیا جاتا ہے۔ (۸۵) واقدی اور ابن سعد مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو ذوامر کے چشمے پر جمع ہوئے تھے، ان کا تعلق بنوثعلبہ سے تھا جو غطفان کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ اس غزوے میں مسلمان فوج ۴۵۰ جوانوں پر مشتمل تھی۔ اس غزوے کی تاریخ کے متعلق ابن اسحٰق کی رائے مختلف ہے۔ ان کی روایت کے مطابق جمعرات ۱۲ ربیع الاوّل ۳ھ کو مسلمان فوج ذوامر کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ (۸۶)

غزوۂ بحرین

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بحرین کی طرف فروع نام کے ایک مقام پر مہم لے کر روانہ ہوئے جو مکے اور شام کے درمیان تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس غزوے میں بھی کوئی لڑائی عمل میں نہ آئی۔ (۸۷) واقدی کا بیان ہے کہ اس مہم کے دوران میں رسول اللہ ﷺ دس روز

مدینے سے باہر رہے۔(۸۸) ابن سعد کا بیان ہے کہ مسلمان فوج کی تعداد ۳۰۰ کے قریب تھی۔(۸۹)

غزوۃ القردہ

قریش نے مسلمانوں کے اقتصادی حصار سے بچ کر نجد کی طرف جانے والی تجارتی شاہراہ کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان اور قریش کے دیگر تاجر ایک قافلہ لے کر اس نئے راستے پر نکلے۔ یہ قافلہ چاندی کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر جا رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو اس مہم پر روانہ کیا۔ انہوں نے القردہ نامی ایک چشمے پر اس قافلے کو جا لیا تھا۔ قریش انہیں دیکھتے ہی فرار ہو گئے اور پورا قافلہ مالِ غنیمت کے طور پر چھوڑ گئے۔ یہ واقعہ بدر کے عظیم الشان معرکے کے چھ ماہ بعد پیش آیا تھا۔(۹۰) ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کے ساتھ ایک سو سپاہی تھے۔ قریش کے قافلے کے ساتھ چاندی کا جو ذخیرہ تھا اس کا وزن تیس ہزار سکوں (درہم) کے مساوی تھا جس کی قدر ایک ہزار درہم کے برابر تھی۔(۹۱) اس مہم کا یہ اثر ہوا کہ قریش کی وہ منصوبہ بندی خاک میں مل گئی جو انہوں نے نئی تجارتی شاہراہ دریافت کرنے کے لیے کی تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے قریش کا جو اقتصادی محاصرہ کیا ہوا تھا، وہ مزید مستحکم ہو گیا اور مکے کی اقتصادیات پر جو سراسر تجارتی بنیادوں پر استوار تھی، اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ قریش کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ اپنی معاشی زندگی اور اپنی ساکھ بچانے کے لیے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھائیں۔

حواشی

۱۔ علی بن احمد بن سعد بن حزم، **جوامع السیرۃ**، ص ۱۰۷۔ اس مال کی قدر و قیمت کا اندازہ پچاس ہزار دینار لگایا گیا تھا اور وہ اپنی تجارت میں ہر دینار کے عوض ایک دینار کمایا کرتے تھے۔ واقدی، **مغازی**، ۱: ۲۰۰؛ بلاذری، **انساب الاشراف**، ۱: ۳۱۲

۲۔ مسلم، **صحیح**، حدیث ۱۱۵۷۔ اس حدیث میں ''بساس'' کے بجائے ''بسیسہ'' نام کا ذکر کیا گیا

ہے۔ابن حجر کا کہنا ہے کہ صحیح نام 'بساس' ہے۔ **اصابة**،۱:۱۵۱

۳- ابن سعد، **طبقات**،۲:۲۴۔ یہ روایت، ایک ''صحیح مرسل'' سند کے ساتھ حضرت عکرمہؓ تک جاتی ہے۔

۴- **شرح النووی علی صحیح مسلم**،۱۲:۸۰- بخاری نے اپنی روایت میں کہا ہے: ''۳۱۳ اور ۳۱۹ کے درمیان''۔ابن حجر، **فتح الباری**،۷:۲۹۰-۲۹۲

۵- ایضاً،۷:۲۹۰-۲۹۷،۳۲۴-۳۲۶

۶- ابن کثیر، **البداية والنهاية**،۳:۱۴۔مزید دیکھیے: علیمی، **مرويات غزوة بدر**،ص۳۶۵،ص۴۱۹

۷- ابوزکریا محی الدین یحییٰ بن شریف نووی، **شرح صحيح مسلم**،۱۲:۱۹۸

۸- **البداية والنهاية**،۲:۲۶۰۔ابن اسحٰق سے بغیر سند کے مروی ہے۔ابن حزم، **جوامع السيرة**، ص۱۰۸

۹- احمد، **مسند**،۱:۴۱۱۔ ایسی سند کے ساتھ جو حاکم کے قول کے مطابق مسلم کی شرائط پر ''صحیح'' اترتی ہے(**مستدرک**،۲:۳۰)۔ہیثمی کہتے ہیں: ''احمد اور بزار نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عاصم بن بہدلہ شامل ہیں جن کی احادیث 'حسن' ہیں، لیکن احمد کی سند میں باقی ماندہ اصحاب 'صحیح' ہیں'' (**مجمع الزوائد**،۶:۶۹)۔

۱۰- **البداية و النهاية**،۳:۲۶۰۔ابن اسحٰق نے بغیر سند کے نقل کیا۔حاکم، **المستدرک**،۳:۶۳۲۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں، لیکن وہ اپنی کتاب کے نذر آتش ہو جانے کے بعد حواس باختہ ہو گئے تھے(ابن حجر، **تقريب**)۔ مجھے ابوجعفر بغدادی اور ابو علاثہ محمد بن عمرو بن خالد کی سوانح دستیاب نہیں ہو سکیں۔ذہبی نے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

۱۱- حاکم نیشاپوری، **مستدرک**،۳:۱۹، ایک کمزور سند کے ساتھ جو ابن عباسؓ تک جاتی ہے۔ **البداية والنهاية**،۳:۲۵۷۔ابن اسحٰق سے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ جو عروہ تک جاتی ہے، لیکن ''مرسل'' ہے۔اس کے علاوہ چند دیگر روایات ہیں جو مختلف کمزوریوں سے خالی نہیں ہیں، لیکن ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ واقعہ ''صحیح'' ہے(**اصابة**،۴:۳۴۷؛ **مجمع الزوائد**،۶:۷۲)۔

۱۲- ابن ہشام، **سيرة**،۲:۶۱۔ابن اسحٰق سے ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ جو ابن عباسؓ تک جاتی ہے۔

۱۳- ابن حجر، **فتح الباری**،۷:۲۸۳

۱۴- نووی، **شرح صحيح مسلم**،۱۲:۸۴

۱۵- ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۳: ۲۶۰

۱۶- ایضاً

۱۷- ابن ہشام، سیرة، ۲: ۳۰؛ طبری، تاریخ الرسل والملوک، ۲: ۴۴۳

۱۸- احمد، مسند، ۲: ۱۹۳، ۹۴۸۔ مسند احمد بن حنبل کے شارح احمد شاکر کا کہنا ہے کہ "اس کی سند 'صحیح' ہے"۔ ہیثمی کا کہنا ہے کہ "احمد کے افراد 'صحیح' ہیں، سوائے حارثہ بن مضرب کے جو ثقہ ہیں" (مجمع الزوائد، ۶: ۷۶)۔

۱۹- الانفال، ۸: ۵۷

۲۰- الفریڈ گیوم، ص ۲۹۳-۲۹۴؛ ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۳: ۲۶۲-۲۶۳۔ ایک "صحیح" سند کے ساتھ ابن اسحٰق کی روایت ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں: "اس سے ملتی جلتی متعدد روایات موجود ہیں جن میں بخاری، نسائی اور احمد کی روایات بھی شامل ہیں"۔ ابن کثیر اس بارے میں بخاری اور امام احمد کی روایات کا حوالہ دیتے ہیں کہ مقداد بن اسود نے کیا کہا (فتح الباری ۷: ۲۸۷)؛ مسند احمد ۵: ۲۵۹، حدیث ۳۶۹۸ از احمد شاکر

۲۱- ایضاً، ۳: ۲۶۰۔ بغیر سند کے ابن اسحٰق سے۔ ابن قیم، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، ۲: ۸۵

۲۲- طبری، تاریخ، ۲: ۴۲۴-۴۲۵، ۴۴۳۔ "حسن" سند کے ساتھ مروی ہے۔

۲۳- البدایة والنهایة، ۲: ۲۶۹۔ ابن اسحٰق سے "جید سند" کے ساتھ مروی ہے۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اسحٰق بن یسار کے شیوخ میں صحابہ شامل ہوں۔ اگر یہ بات درست ہو تو پھر یہ حدیث "صحیح" ہے، کیونکہ کسی صحابیؓ سے ناواقفیت کوئی مسئلہ نہیں ہے، بالخصوص اگر بہت سے صحابہ موجود ہوں۔

۲۴- حاکم، مستدرک، ۲: ۳۲۸؛ طبری، تفسیر، ۱۳: ۴۵۴۔ دونوں "صحیح" سند کے ساتھ ہیں اور عبداللہ بن ابی صعیر ازری جو صغار صحابہ میں سے ہیں، کی حدیث ہے۔ یہ بات ثابت شدہ نہیں ہے کہ انہوں نے اسے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، لیکن صحابہ کی "مرسل" علت قادحہ نہیں ہیں، کیوں کہ تمام صحابہ کرامؓ عدول ہیں۔

۲۵- ابن حجر، الاصابة فی معرفة الصحابة، ۱: ۳۰۲، یہ روایت ابن اسحٰق کی ہے جن کا کہنا ہے کہ انہوں نے اسے سنا ہے۔ مستدرک میں حاکم کی ایک روایت ہے (۲: ۴۲۶-۴۲۷) جس کی سند میں ایسے افراد شامل ہیں جن کے حالات ہمیں دستیاب نہ ہو سکے، تاہم ذہبی کا کہنا ہے کہ یہ "منکر" حدیث ہے۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کے حوالے سے ایسی سند کے ساتھ اس روایت کا

ذکر کیا ہے جس میں ابہام ہے۔ اگر ''مبہم'' کے بارے میں معلوم ہوتا تو سند ''حسن'' ہوتی۔

۲۶- احمد، **مسند**، ''صحیح'' سند کے ساتھ (**الفتح الربانی**، ۲۱:۳۰-۳۲)۔

۲۷- **تحفة الاحوذی**، ۵:۳۲۴-۳۲۵۔ ترمذی کی سند میں محمد بن حمید رازی شامل ہے جو ''ضعیف'' ہے اور سلمہ بن فضل الابرش شامل ہے جو ''صدوق'' ہے، لیکن ابن حجر نے **تقریب** میں ذکر کیا ہے کہ کثرت سے غلطیاں کرتا ہے۔ یہ روایت اتنی مضبوط نہیں ہے کہ امام احمد کی روایت کا مقابلہ کر سکے۔

۲۸- احمد، **مسند**، صحیح سند کے ساتھ (۵:۴۲۰)۔ ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۶:۷۵۔ ''صحیح'' سند کے ساتھ امام احمد کی روایت ہے۔

۲۹- محمود شیث خطاب، **الرسول القائد**، ص ۷۸-۷۹

۳۰- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۲۸۷، بخاری کی روایت ہے۔

۳۱- مسلم، **صحیح** (شرح از محمد فواد عبدالباقی)، ۳:۱۵۰۹-۱۵۱۰، حدیث نمبر ۱۹۰۱

۳۲- نووی، **شرح صحیح مسلم**، ۱۲:۸۴-۸۵

۳۳- صحیح بخاری کی روایت ہے۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۲۸۷

۳۴- احمد، **مسند**، ۲:۲۲۸۔ احمد شاکر کا کہنا ہے کہ یہ ''صحیح'' ہے۔

۳۵- ابوداؤد، **سنن**، ۴:۴۹۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ ''صحیح'' ہے (**فتح الباری**، ۷:۲۹۸)۔

۳۶- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۳۰۶۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

۳۷- طبری، **تفسیر**، ۱۳:۴۴۲-۴۴۳۔ دو ''صحیح'' سندوں کے ساتھ روایت ہے جن کا سلسلہ عروہ اور قتادہ سے جا کر ملتا ہے، لیکن دونوں ''مرسل'' ہیں۔ دونوں ایک دوسری کو تقویت دیتی ہیں، کیوں کہ اگر ایک ''مرسل'' حدیث کی مختلف اسناد ہوں تو وہ زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔

۳۸- ہیثمی، **مجمع الزوائد**، طبرانی کے حوالے سے، جن کا کہنا ہے کہ ''ان کے افراد صحیح ہیں سوائے محمد بن وہب بن ابوکریمہ کے جو **تقریب** کے بیان کے مطابق ''ثقہ'' یا ''صدوق'' ہیں، ۲:۲۱۶

۳۹- ابن حجر، **فتح الباری**، ۳:۲۹۳-۲۹۶، ۳۲۱؛ مسلم، **شرح النووی**، ۱۲:۱۵۹-۱۶۰

۴۰- ابن حجر، **فتح الباری**، ۴:۴۸۰۔ بخاری کی روایت ہے۔ ابن کثیر، **البداية والنهاية**، ۳:۲۸۶۔ ''صحیح'' سند کے ساتھ ابن اسحٰق کی ایک روایت ہے۔

۴۱- طبری، **تفسیر**، ۱۳:۴۳۰

۴۲- فرشتے کے گھوڑے کا نام

۴۳- احمد، مسند، ۲: ۱۹۴۔ احمد شاکر کا کہنا ہے کہ "اس کی سند صحیح ہے"۔ ہیثمی کہتے ہیں: "اس کے افراد صحیح ہیں سوائے حارثہ بن مضرب کے کہ وہ ثقہ ہیں" (مجمع الزوائد، ۶: ۷۵-۷۶)۔

۴۴- ایضاً

۴۵- ابن کثیر، البدایة و النهایة، ۳: ۲۸۴۔ البانی نے غزالی کی فقه السیرة کی شرح میں اسے "حسن" قرار دیا ہے۔

۴۶- ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۳۱۱-۳۱۲

۴۷- ایضاً، ۷: ۳۱۳۔ سبکی کے تبصرے سے اسلام کے اس تصور کی وضاحت ہوتی ہے کہ حصول مقاصد کے لیے فطرت کے اصولوں اور معاشرتی قوانین کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے انسانی کوشش پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس تبصرے سے اسلام کا واضح تصور اور اس کی گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

۴۸- نووی، شرح صحیح مسلم، ۱۲: ۸۶-۸۷

۴۹- احمد، مسند، ۱: ۲۳۲، بہ سندِ "صحیح"۔

۵۰- ابن ہشام، سیرة، ۲: ۲۴۸؛ ابن کثیر، البدایة و النهایة، ۳: ۳۲۷

۵۱- ابن حجر، الاصابة، ۳: ۳۲۸، ۶۰۸۔ وہ نام یہ ہیں: معاذ بن حارث، ہلال بن معلّی بن لوذان

۵۲- ابن حجر، فتح الباری، ۸: ۳۰۰۔ بخاری کی ایک روایت سے۔

۵۳- احمد، مسند ۳: ۳۲۰، ۴: ۳۱۳، ۵: ۵۔ ایسی سند کے ساتھ جس کے بارے میں احمد شاکر کا کہنا ہے کہ وہ "صحیح" ہے۔ ابن کثیر اسے "جید" قرار دیتے ہیں اور ترمذی "حسن" بتاتے ہیں (ابن کثیر، تفسیر ۲: ۲۸۸؛ تحفة الأحوذی، ۸: ۴۷۱)

۵۴- اس شخص کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مکے میں مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی مقاطعے کا معاہدہ توڑا تھا، اور ان لوگوں نے مسلمانوں پر تشدد کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا (البدایة والنهایة، ۳: ۲۸۵)۔

۵۵- احمد، مسند، ۲: ۷۶-۷۷، بہ سندِ "صحیح"، جیسا کہ احمد شاکر کا خیال ہے۔

۵۶- ابن کثیر، البدایة و النهایة، ۳: ۲۸۵؛ ابن ہشام، سیرة، ۲: ۶۹-۷۱

۵۷- شرح نووی علی صحیح مسلم، ۱۲: ۸۶-۸۷

۵۸- ابن قدامہ مقدسی، المغنی، ۸: ۳۷۲-۳۷۴

۵۹- ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶: ۹۰۔ وہ کہتے ہیں کہ "طبرانی نے اسے بیان کیا ہے اور ان کی سند کے

افرادثقہ ہیں''۔

۶۰- احمد، **مسند**، ایک ''جید'' سند کے ساتھ (**فتح الباری**، ۱۴:۱۰۰)۔

۶۱- ایضاً، ایسی سند کے ساتھ جس میں ابی ابن عاصم شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں، لیکن غلطیاں بہت کرتے ہیں اور اصرار زیادہ کرتے ہیں، **مسند**، ۴:۴۸

۶۲- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۳۲۱۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

۶۳- ایضاً، ۷:۳۲۱۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

۶۴- طبری، **تفسیر**، ۱۴:۷۳، بہ سندِ ''حسن''

۶۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۳۲۲۔ ابونعیم کی **کتاب الاوائل** سے بہ سندِ ''حسن''، جیسا کہ حافظ ابن حجر کا بیان ہے۔

۶۶- احمد نے اسے ''صحیح'' سند کے ساتھ بیان کیا (**الفتح الربانی**، ۱۴:۷۳)، نیز دیکھیے: (البنا کی شرح)

۶۷- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۳۱۶۔ بخاری کی ایک روایت ہے

۶۸- دیکھیے: ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۳:۳۰۲-۳۰۳

۶۹- علیمی، **مرویات غزوۃ بدر**، ص ۴۲۰-۴۲۴

۷۰- ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۳:۳۰۴، بہ سندِ ''صحیح''

۷۱- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲:۳۳۵، بہ سندِ ''صحیح''

۷۲- ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۳:۳۰۵

۷۳- ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۶:۸۹۔ وہ کہتے ہیں کہ ''طبرانی نے اسے **الکبیر** اور **الاوسط** میں بیان کیا ہے۔ اس کی سند کے افراد صحیح ہیں''۔ ابو داؤد نے بھی بہ سندِ ''حسن'' **سنن** میں روایت کیا ہے (۲:۵۵)۔

۷۴- ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۳:۳۶۶، بہ سندِ ''حسن'' جس کا سلسلہ شعبی سے جا کر ملتا ہے، لیکن یہ ''مرسل'' ہے۔

۷۵- ایضاً، ۳:۳۰۶-۳۰۷

۷۶- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۳۰۴ حدیث ۳۹۸۴

۷۷- ایضاً، ۷:۳۰۴-۳۰۵

۷۸- نووی، **شرح صحیح مسلم**، ۱۶:۵۵

۷۹- ابن ہشام، سیرۃ،۲: ۳۴۰

۸۰- ابن حجر، **الاصابۃ**، ۳: ۳۶۱۔ ایک ''مرسل'' حدیث سے جسے عروہ بن زبیر اور زہری نے بیان کیا ہے۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ زہری نے اسے عروہ سے بیان کیا ہو اور آغاز میں دونوں اسناد ایک ہی ہوں، لیکن اس سے ''مرسل'' کو تقویت نہیں ملتی۔

۸۱- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷: ۳۰۸۔ بخاری کی ایک روایت سے

۸۲- ابن اسحٰق؛ **سیرۃ ابن ھشام**، ۲: ۴۲۱، بلا سند

۸۳- ابن سعد، **طبقات**،۲: ۳۱

۸۴- ابن اسحٰق، بہ سندِ ''صحیح'' جس کا سلسلہ عبداللہ بن کعب بن مالک سے جا کر ملتا ہے، لیکن یہ ''مرسل'' ہے (**سیرۃ ابن ھشام**،۲: ۴۲۲-۴۲۳؛ ابن سعد، **طبقات**،۲: ۳۰، بلا سند)۔

۸۵- ابن اسحٰق، **سیرۃ ابن ھشام**،۲: ۴۲۵، بلا سند

۸۶- ابن کثیر، **البدایۃ و النھایۃ**،۴: ۴؛ ابن سعد، **طبقات** ۲: ۳۴

۸۷- ابن اسحاق، **سیرۃ ابن ھشام**،۲: ۴۲۵، بلا سند

۸۸- ابن کثیر، **البدایۃ و النھایۃ**،۳: ۴

۸۹- ابن سعد، **طبقات**،۲: ۳۵، بلا سند

۹۰- ابن اسحٰق، **سیرۃ ابن ھشام**،۲: ۴۲۹-۴۳۰، بلا سند؛ ابن کثیر، **البدایۃ و النھایۃ**،۵: ۴

۹۱- ابن سعد، **طبقات**،۲: ۳۶، بلا سند

۵

غزوۂ احد

احد اس پہاڑ کا نام ہے جس پر یہ غزوہ پیش آیا، اس لیے اس غزوے کو غزوۂ احد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ پہاڑ مسجد نبوی کے بابِ مجیدی سے مدینے کے شمال کی جانب پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ پہاڑ سرخ عمارتی پتھر کا ہے اور اس کی بہت سی چوٹیاں ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس کا نام عینین ہے۔ غزوۂ احد کے بعد اس پہاڑ کو جبل الرماۃ (تیر اندازوں کا پہاڑ) کا نام دے دیا گیا۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے جس کا نام وادی قناۃ ہے۔

غزوۂ بدر کو ابھی گیارہ ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ قریش نے مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے مہم روانہ کر دی، جس کے نتیجے میں غزوۂ احد واقع ہوا۔ اُن کے پیش نظر اس مہم کا ایک مقصد تو مقتولینِ بدر کا انتقام لینا تھا، دوسرا مقصد یہ تھا کہ شام کو جانے والے تجارتی راستے پر سے مسلمانوں کا تسلط ختم کر دیا جائے، اور تیسرا مقصد یہ تھا کہ بدر کے موقع پر ذلت آمیز شکست کھانے سے قریش کے وقار کو جو ٹھیس لگی تھی اور عربوں میں ان کی جو کمزوری ظاہر ہوئی تھی، اس کا تدارک کیا جائے۔ سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ غزوۂ اُحد شوال ۳ھ میں واقع ہوا، لیکن وہ کوئی متعین تاریخ بتانے سے قاصر ہیں۔ اس بارے میں جو معروف ترین روایات پائی جاتی ہیں، ان کی رو سے یہ غزوہ شوال کے وسط میں سنیچر کے روز پیش آیا تھا۔ (۱)

ابن اسحٰق اپنے چند اساتذہ کی سند پر روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں شکست کھانے کے فوراً بعد ہی قریشِ مکہ نے اس معرکے کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع کر دی

تھیں۔ انہوں نے اس تجارتی قافلے کو جو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا تھا (۲) اور اس سے حاصل ہونے والے تمام منافع کو فوج کی تیاری کے لیے مختص کر دیا تھا۔ (۳) ابن اسحٰق لکھتے ہیں کہ قریشی فوج میں آٹھ خواتین شامل تھیں (ابن اسحٰق نے ان خواتین کے نام بھی دیے ہیں)، جب کہ واقدی کا خیال ہے کہ ان خواتین کی تعداد ۱۴ تھی اور واقدی نے ان تمام خواتین کے نام جمع کیے ہیں۔ (۴) قریشی فوج تین ہزار افراد پر مشتمل تھی جن میں دو سو گھڑ سوار تھے۔ گھڑ سواروں کے اس دستے پر دائیں جانب خالد بن ولید اور بائیں جانب عکرمہ بن ابی جہل متعین کیے گئے تھے۔ (۵) فوج کے سات سو جوان زرہیں پہنے ہوئے تھے۔ (۶)

مشرکوں کی فوج میں قبیلۂ قریش کے علاوہ قبیلہ کنانہ اور قبیلہ تہامہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو قریش کے پیروکار تھے۔ (۷) مسلمانوں کو اس بات کا علم تھا کہ قریش مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے آ رہے ہیں۔ اسی دوران میں رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب دیکھا۔ انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں اور وحی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا یہ خواب صحابہ کرامؓ کو سنایا:

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک تلوار لہرائی اور وہ درمیان سے ٹوٹ گئی۔ یاد رکھو! یہ اس بات کی علامت ہے کہ غزوۂ احد کے روز مسلمانوں کو کچھ نقصان اٹھانا پڑے گا، پھر میں نے دوبارہ تلوار لہرائی تو پہلے سے کہیں زیادہ اچھی حالت میں ہو گئی۔ یاد رکھو! یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بہت جلد سامنے لانے والا ہے، اور میں نے مویشی دیکھے (جنہیں ذبح کیا جا رہا تھا)، لیکن اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو اجر ملنے والا ہے، وہ دنیاوی منافع سے بہت بہتر ہے۔ یاد رکھو! ان مویشیوں سے مراد غزوۂ احد کے مومن ہیں [جو شہید ہو گئے]۔ (۸)

رسول اللہ ﷺ نے اس خواب کی یہ تعبیر فرمائی کہ آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان کی بڑی تعداد شہید ہو گی۔ (۹) ایک اور روایت میں آپؐ نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک مضبوط زرہ پہنے ہوئے ہوں، اس زرہ کو میں نے مدینے سے

تعبیر کیا''۔(۱۰)

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کہ آیا انہیں مدینے میں رہ کر اپنی پوزیشن مستحکم کرنا چاہیے یا مدینے سے باہر نکل کر قریش کا مقابلہ کرنا چاہیے؟ مدینہ شہر اپنی عمارتوں کی کثرت کی وجہ سے ایک قلعے کی مانند تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں ایک محفوظ پناہ گاہ میں ہوں''۔(۱۱) انصار کے کچھ لوگوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہمیں تو یہ بات اچھی نہیں لگے گی کہ ہم مدینے کی گلیوں میں مارے جائیں۔ ہم نے تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ مدینے میں ہم پر حملہ کرے، اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی دولت سے نوازا ہے تو ہم کیسے اس بات کو پسند کر سکتے ہیں، اس لیے ہم آپ کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ مدینے سے باہر جا کر قریشی افواج کا سامنا کریں (اور ہم مدینے سے باہر نکل کر جنگ کریں گے)''۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ اب لوگوں نے انصار کو ملامت کرنا شروع کر دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک تجویز پیش کی اور تم ہو کہ اس سے مختلف رائے دے رہے ہو! لوگوں نے حضرت حمزہؓ سے کہا: ''اے حمزہ! تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جاؤ اور عرض کرو کہ آپؐ جیسے چاہیں ویسے کریں''۔ حضرت حمزہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! لوگ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے ہیں اور سب نے مل کر اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ آپؐ پر چھوڑ دیا جائے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب ایک پیغمبر جنگی لباس زیب تن کر لیتا ہے تو اس وقت تک اسے وہ لباس نہیں اتارنا چاہیے، جب تک جنگ نہ کر لے''۔(۱۲)

اس واقعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ جب ان سے مشورہ کیا جاتا تو وہ اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے تھے، خواہ ان کی رائے رسول اللہ ﷺ کی ذاتی رائے سے کتنی ہی مختلف ہو۔ آپؐ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپؐ ان تمام معاملات میں اپنے صحابہؓ سے کھل کر مشورہ کیا کرتے تھے جن کے بارے میں وحی کی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اس مشاورت سے رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ صحابہ کرامؓ

امت کے عام مسائل پر غور و خوض کرنے اور ان سے کماحقہٗ نمٹنے کی تربیت حاصل کریں۔ وہ مشورہ قطعاً سودمند نہیں ہوتا جس میں اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ ہو۔ اگر کسی صحابیؓ نے کسی موقع پر مسئلے کے استنباط میں غلطی کی، یا وہ کسی درست نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے کبھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ ایک رہنما اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو مشورے میں شریک رکھے۔ قرآن کریم میں مشورے (شوریٰ) کے اصول کو اپنانے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ آپؐ اس حکم پر عمل درآمد کریں: ''--- اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے، پھر جب آپؐ رائے پختہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیجیے'' (آل عمران ۳:۱۵۹)۔

یہاں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سیاسی شعور کتنا بیدار تھا۔ اگرچہ انہیں اپنی رائے کے اظہار کا پورا پورا حق حاصل تھا، لیکن انہیں یہ حق نہیں تھا کہ وہ اپنے رہبر کے اوپر اپنی رائے مسلّط کریں۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ کھل کر اپنی رائے پیش کردیں۔ اس کے بعد اپنے رہبر و رہنما کو مکمل آزادی دیں کہ وہ جس رائے کو بہتر سمجھے، اسی کو اختیار کرلے۔ جونہی انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر باہر نکل کر جنگ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا ہے اور یہ کہ ان کے زور دینے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ ایسا کرنے پر تیار ہوگئے ہیں تو وہ فوراً آپؐ کے پاس پہنچے اور معذرت خواہ ہوئے، لیکن اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں کامیاب قیادت کے ایک زرّیں اصول کی تعلیم دی، اور وہ اصول یہ ہے کہ ایک قائد جب کوئی فیصلہ کرلے اور اس پر عمل درآمد شروع کردے تو پھر اسے ڈگمگانا نہیں چاہیے، کیوں کہ یہ طرزِ عمل لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کردیتا ہے اور اس کے ماننے والے الجھن میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ لوگ جو شہر سے باہر جاکر جنگ کرنے کے حامی تھے، وہ دشمن کا سامنا کرکے اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرنے کے جذبے سے سرشار تھے۔ اس رائے کا دوسرا محرک یہ تھا کہ جن لوگوں کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی اسی قسم کی جنگ میں حصہ لیں۔

رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مدینے کے اندر رہ کر جنگ کی جائے۔ آپؐ کے ساتھ بے شمار صحابہؓ ایسے تھے جو آپؐ کی اس رائے سے متفق تھے۔ ان حضرات نے یہ رائے اس بنیاد پر پیش کی تھی کہ اس صورت میں مدینے کی قلعہ نما حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، نیز اس صورت میں دفاع کرنے والوں کا نقصان کم سے کم ہوگا، جب کہ حملہ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا ممکن ہوگا۔ دوسرا اہم فائدہ یہ تھا کہ مدینے کی پوری آبادی کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو لڑنے کے قابل نہیں تھے، یعنی عورتیں اور بچے بھی کسی نہ کسی کام آ سکتے تھے۔

[اس معرکے میں] ایک سیاہ علم (۱۳) اور تین جھنڈے بلند کیے گئے۔ پہلا جھنڈا مہاجرین کا تھا جسے حضرت مصعبؓ بن عمیر اٹھائے ہوئے تھے۔ جب وہ شہید ہو گئے تو اس جھنڈے کو حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اٹھالیا۔ دوسرا جھنڈا قبیلہ اوس کا تھا اور حضرت اسیدؓ بن حضیر کے ہاتھ میں تھا اور تیسرا جھنڈا قبیلہ خزرج کا تھا اور اسے حضرت حبابؓ بن منذر (۱۴) تھامے ہوئے تھے۔ ان جھنڈوں کے نیچے جو فوج جمع تھی وہ ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی جن میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی شامل تھے جو مسلمان ہونے کا صرف زبانی دعویٰ کرتے تھے۔ فوج میں صرف دو گھوڑے اور ایک سو افراد زرہیں پہنے ہوئے تھے۔ (۱۵)

رسول اللہ ﷺ نے اس روز دو زرہیں زیبِ تن فرمائیں، (۱۶) اس کے باوجود کہ آپؐ جانتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائیں گے اور دشمن آپ کو قتل نہیں کر سکے گا، لیکن اپنے اس عمل سے آپ امت کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ ہر قسم کی صورتِ حال میں مادی ذرائع اور اسباب کو اختیار کرنے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا کرنا چاہیے۔

مسلمان افواج حرۃ الشرقیہ (۱۷) کی مغربی جانب سے اُحد کی طرف روانہ ہوئیں۔ اس جگہ پر عبداللہ بن اُبَی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت جو سب کے سب منافق تھے، مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر واپس ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مشرکوں کے ساتھ قتال کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے اس فیصلے پر بھی اعتراض کیا جو آپؐ نے مدینے سے باہر نکل کر جنگ

کرنے کے سلسلے میں فرمایا تھا اور کہا: ''آپؐ نے دوسروں کی بات مانی اور میری بات نہیں مانی''۔(۱۸)

واقدی لکھتے ہیں کہ منافقین شیخین کے مقام پر الگ ہوئے اور یہ علاقہ اُحد کے قریب ہی ہے۔(۱۹) قرآن اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ منافقوں کی جماعت کے علیحدہ ہو جانے میں اللہ تعالیٰ کی یہ مصلحت پنہاں تھی کہ مسلم افواج میں سے کھوٹا اور کھرا الگ الگ ہو جائے، مسلمانوں کی صفیں منافقوں کے اثر سے بالکل پاک صاف ہو جائیں اور ان کی صفوں میں کوئی جھوٹ اور پست ہمتی پھیلانے کی کوشش نہ کرے: ''اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتے جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے ممیّز نہ فرمادیں'' (آل عمران ۳:۱۷۹)۔

مزید فرمایا گیا:

اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ وہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے، سو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوئی اور تا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو بھی دیکھ لیں اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے یوں کہا گیا کہ آؤ! اللہ کی راہ میں لڑنا یا دشمن کا دفعیہ بن جانا۔ وہ بولے کہ اگر ہم کوئی ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ یہ منافقین اس روز کفر سے نزدیک تر ہو گئے بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ ایمان سے نزدیک تھے۔ یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں (آل عمران ۳:۱۶۶-۱۶۷)۔

ابن اسحٰق نے اپنے استاد کے حوالے سے ایک ''مرسل'' روایت میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حزام نے منافقوں کو مسلمانوں سے علیحدہ ہونے اور واپس ہو جانے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن انہوں نے وہی بات کہی جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے۔ ان کی بات سن کر حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حزام نے کہا: ''اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے! تم

اللہ کے دشمن ہوا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تم سے بے نیاز کر دے گا''۔ (۲۰)

مسلمانوں میں دو جماعتیں تھیں جو کچھ دیر کے لیے منافقین کے زیر اثر آ گئیں اور ان کے دلوں میں بھی مدینے واپسی کا خیال پیدا ہوا، لیکن انہوں نے جلد ہی اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنی اس کمزوری پر قابو پا لیا اور مسلمانوں کے ساتھ رہ کر جنگ میں حصہ لیا۔ یہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ تھے جن کا تعلق بالترتیب خزرج اور اوس سے تھا۔ (۲۱) قرآن نے ان دونوں جماعتوں کے طرز عمل کی اس طرح نقشہ کشی کی ہے: ''جب تم میں سے دو جماعتوں نے دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا'' (آل عمران ۳:۱۲۲)۔

مسلم فوج نے شیخین میں پڑاؤ ڈالا۔ یہاں رسول اللہ ﷺ نے فوج کا معائنہ کیا اور ان تمام لڑکوں کو جو چودہ سال یا اس سے کم عمر کے تھے، مدینے واپس بھیج دیا۔ صرف دو لڑکوں کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی، جن میں سے ایک حضرت رافعؓ بن خدیج تھے اور دوسرے حضرت سمرہؓ بن جندب۔ حضرت رافعؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ بہترین تیر انداز ہیں اور حضرت سمرہؓ کے بارے میں آپؐ کو یہ پتا چلا کہ وہ رافعؓ سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ (۲۲) جن لڑکوں کو مدینے واپس بھیجا گیا، ان کی تعداد ۱۴ تھی اور ابن سیّد الناس نے ان سب کے نام لکھے ہیں۔ (۲۳) ایک اور مستند روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کے صاحبزادے بھی انہی لڑکوں میں شامل تھے۔ (۲۴) یہ نو عمر لڑکے جس جذبے اور ولولے کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے چلے تھے، وہ حیران کن ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے، کسی آمرانہ قیادت نے انہیں اس فوج میں جبراً بھرتی نہیں کیا تھا۔ یہ تھے رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ تعلیم و تربیت کے نمایاں خدوخال اور آپ کے پیدا کردہ جذبۂ ایمانی کی دلکش تصویریں!

اب مسلم فوج نے میدانِ جنگ کی طرف پیش قدمی کی اور رسول اللہ ﷺ نے ایک محتاط اور موزوں منصوبہ بندی کے مطابق اپنی فوج کو اُحد کے میدان میں اتارا۔ آپؐ نے فوج کی صفوں کو اس طرح ترتیب دیا کہ جبلِ اُحد ان کی پشت پر اور مدینہ ان کے سامنے تھا۔ اس کے بعد

آپؐ نے حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو پچاس تیر اندازوں کے ایک دستے کے ساتھ عینین نامی پہاڑ کی چوٹی پر متعین کیا۔ یہ پہاڑ جبلِ اُحد کے بالکل مخالف سمت پر واقع تھا۔ اس پہاڑی درے پر دستہ متعین کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان فوج کو مشرکوں کے کسی اچانک اور غیر متوقع حملے سے بچایا جائے۔ آپؐ نے اس دستے کو پرزور الفاظ میں یہ تاکید کی کہ وہ اس جگہ کو مستقل سنبھالے رکھیں اور یہاں سے بالکل نہ ہلیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم یہ دیکھو کہ ہمارے اوپر گدھ اتر آئے ہیں، پھر بھی تم اپنی جگہ ہرگز نہ چھوڑنا اور اگر تم یہ دیکھو کہ ہم نے دشمن پر قابو پالیا ہے، پھر بھی اس جگہ کو مت چھوڑنا''۔ (۲۵) اس طرح مسلمانوں نے اونچے مقامات پر قبضہ کرلیا، اور وادی قریشی فوج کے لیے چھوڑ دی۔ قریشی فوج نے اس طرح پیش قدمی کی تھی کہ مدینہ اس کی پشت پر اور جبلِ اُحد اس کے سامنے تھا۔

کچھ روایات جو حدیث کے نقطۂ نگاہ سے کمزور سمجھی جاتی ہیں، اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ دونوں فوجوں کے مقابلے میں اترنے سے پہلے ایک انفرادی مقابلہ ہوا جو حضرت علیؓ بن ابی طالب اور طلحہ بن عثمان کے درمیان تھا۔ طلحہ مشرکوں کا علم بردار تھا جو حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔ (۲۶) ان روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابو عامر الفاسق (راہب) جو اوس کا ایک سردار تھا اور مشرکوں کے ساتھ شریک ہونے کی خاطر مدینہ چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس نے قبیلۂ اوس پر زور ڈالا کہ وہ بھی اس کے ساتھ مشرکوں کی فوج میں شامل ہو جائے، لیکن قبیلے والوں نے ایسا کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ (۲۷)

دونوں فوجوں کے درمیان لڑائی شدت اختیار کر گئی۔ مسلمانوں نے عظیم الشان شجاعت اور جواں مردی کا مظاہرہ کیا۔ مشرک اپنے مقامات کی طرف پسپا ہونے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک تلوار بلند کی اور دریافت فرمایا: ''تم میں سے کون اس تلوار کو لینا پسند کرے گا''؟ بہت سے مسلمانوں نے بیک وقت آپؐ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے تلوار لینے کی خواہش ظاہر کی۔ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ دریافت فرمایا: ''تم میں سے کون ایسا ہے جو اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے''؟ اب لوگوں کے ہاتھ پیچھے ہٹ گئے اور وہ سوچنے لگے۔ حضرت

ابودجانہؓ نے عرض کیا: "میں اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لوں گا"۔ پھر انہوں نے یہ تلوار لی اور اس سے مشرکوں پر کامیاب حملے کیے۔ (۲۸)

سبا بن عبدالعزیٰ نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو مقابلے کی دعوت دی۔ حضرت حمزہؓ نے دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے سبا بن عبدالعزیٰ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جبیر بن مطعم نے اپنے غلام وحشی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو جبیر اسے آزاد کر دے گا۔ حضرت حمزہؓ نے جبیر کے ماموں طعیمہ بن عدی کو بدر کے موقع پر ہلاک کیا تھا۔ وحشی ایک چٹان کی اوٹ میں ہو کر حضرت حمزہؓ کی طرف گھات لگائے ہوئے بیٹھا تھا اور جونہی حضرت حمزہؓ اس کے نیزے کی زد میں آئے، اس نے تاک کر نیزہ مارا اور حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا۔ (۲۹) کیا وحشی یا اس جیسے کتنے ہی لوگ اس بات کی جرأت کر سکتے تھے کہ حضرت حمزہؓ کے سامنے آئیں اور مردوں کی طرح مقابلہ کریں!

لڑائی کے پہلے ہی مرحلے میں حضرت حمزہؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان میں سے ایک حضرت مصعبؓ بن عمیر تھے جو ایک داعی بھی تھے اور اسلامی فوج کے علم بردار بھی تھے۔ حضرت خبابؓ بیان کرتے ہیں:

ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہجرت کی اور ہم اللہ کی رضا کے طلب گار تھے۔ اللہ کے ہاں ہمارا اجر طے شدہ اور یقینی ہے، لیکن ہم میں سے کچھ لوگ اس حالت میں دنیا سے چلے گئے کہ وہ اپنی دنیاوی زندگی میں ہجرت کے ثمرات سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ مصعبؓ بن عمیر کا تعلق بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ انہیں اُحد کے روز شہید کیا گیا اور انہوں نے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا، سوائے ایک چادر کے جس میں انہیں کفن دیا گیا۔ چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر ہم ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور اگر پاؤں ڈھانکنے کی کوشش کرتے تو سر کھل جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ان کا سر چادر سے ڈھک دو اور پیروں کے اوپر اذخر (ایک پودا) کے پتے رکھ دو، یا (یہ فرمایا کہ) پیروں کے اوپر اذخر ڈال دو"۔ (۳۰)

جب حضرت مصعبؓ بن عمیر شہید ہو گئے تو حضرت علیؓ بن ابی طالب نے علم تھاما۔ (۳۱)

اس قرآنی آیت سے پتا چلتا ہے کہ جنگ کے اس مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکین پر مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو رہا تھا: ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا تھا جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے'' (آل عمران ۳:۱۵۲)۔

درّے پر متعین تیر اندازوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان فوج نے دشمن پر قابو پا لیا ہے تو انہوں نے حضرت عبداللہؓ بن جبیر سے کہا: ''ہمارے ساتھی جیت گئے ہیں، اب یہاں کس لیے کھڑے ہو! آؤ ہم بھی چل کر مالِ غنیمت سمیٹیں''! حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے کہا: ''کیا تم بھول گئے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کیا تاکید کی تھی''؟ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بولے: ''خدا کی قسم! ہم تو ان لوگوں کے پاس جا رہے ہیں اور غنیمت میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے''۔ (۳۲) چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن جبیر کے ساتھی غنیمت کی خاطر وہاں سے چلے گئے۔

سدّی نے ایک ''مرسل'' روایت میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جب تیر انداز وہ پہاڑی درّہ چھوڑ کر چلے گئے جہاں انہیں تعینات کیا گیا تھا تو کیا واقعہ پیش آیا۔ خالد بن ولید نے موقع پا کر مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا اور مشرک پشت کی طرف سے ان کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ میدانِ جنگ سے بھاگتے ہوئے مشرکوں نے جب یہ منظر دیکھا تو انہوں نے بھی پلٹ کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ (۳۳) اب مسلمان دونوں طرف سے گھر کر دشمن کے نرغے میں پھنس گئے۔ مسلمانوں کی ترتیب بگڑ گئی، ان کی صفیں الٹ گئیں اور انہوں نے کسی منصوبہ بندی کے بغیر لڑنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ اس ابتر صورتِ حال میں وہ دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکے اور انہوں نے حضرت حذیفہؓ بن یمان کے والد حضرت یمانؓ کو جو ایک معمر شخص تھے، شہید کر دیا۔ حضرت حذیفہؓ یہ منظر دیکھ کر بلبلا اٹھے اور چیخ کر بولے: ''یہ میرے والد ہیں''! لیکن لوگ ان کا کام تمام کر چکے تھے۔ حضرت حذیفہؓ نے لاچار ہو کر کہا: ''اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو معاف کرے، وہ سب رحم

کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔(۳۴)

اب مسلمانوں کی طاقت وقوت اور ان کا جذبہ اور ولولہ کوئی کام نہیں دے رہا تھا، وہ انتہائی بدنظمی اور بے ترتیبی کے ساتھ لڑ رہے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار مسلمان شہید ہو ہو کر میدان جنگ میں گرتے گئے۔ اسی ہنگامے میں مسلمان رسول اللہ ﷺ سے بھی بچھڑ گئے اور کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔(۳۵)

مسلمانوں کا سخت جانی اور مالی نقصان ہو چکا تھا اور بہت سے لوگ میدانِ جنگ سے نکل گئے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو ہتھیار چھوڑ کر زمین پر بیٹھ گئے (۳۶) اور بہت سے لوگوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں تو اب زندگی پر موت کو ترجیح دینا چاہیے۔ حضرت انسؓ بن نضر بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔ یہ وہ صحابیؓ رسول ہیں جو غزوۂ بدر میں حصہ نہیں لے سکے تھے اور انہیں اس بات کا بہت ملال تھا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے انہیں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کسی جنگ میں شرکت کا موقع عطا فرمایا تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو دکھائیں گے کہ وہ کس طرح اس کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں۔

جب انہوں نے چند مسلمانوں کو اضطراب کے عالم میں احد کے میدان میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو پکار کر بولے: "کس قدر مسحور کن ہے جنت کی خوشبو اور یہ کتنی قریب ہے"! یہ کہہ کر جو انہوں نے لڑنا شروع کیا تو اس وقت تک ہاتھ نہ روکا جب تک شہید نہیں ہو گئے۔ ان کے جسم پر ۸۰ سے زیادہ زخم پائے گئے جو تیروں، خنجروں اور مختلف قسم کی ضربات سے لگے تھے۔ زخموں سے چور چور اس جسم کی شناخت میں مشکل پیش آئی تو ان کی بہن حضرت ربیعہؓ بنت نضر کو بلایا گیا جنہوں نے اپنے بھائی کو انگلیوں کی پوروں کی مدد سے پہچانا۔ قرآن کریم کی یہ آیات اسی قسم کے مجاہدین کی شان میں نازل ہوئی ہیں:

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا، اس میں سچے اترے، پھر بعض تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعض ان میں مشتاق ہیں اور انہوں نے ذرا تغیر وتبدل نہیں کیا (الاحزاب ۳۳:۲۳)۔(۳۷)

جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو حضرت انسؓ بن نضر کی تلاش میں بھیجا۔ وہ شہداء کے جھرمٹ میں پڑے ہوئے پائے گئے اور ان کے اندر زندگی کی تھوڑی سی رمق موجود تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے سلام کا جواب دینے کے علاوہ جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے، وہ یہ تھے: ''مجھے جنت کی خوشبو آ رہی ہے! میرے انصاری ساتھیوں کو میرا یہ پیغام دینا کہ زندگی کی آخری چنگاری تک رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کریں، اگر آپؐ کی ذات کو کوئی نقصان پہنچا اور تم میں سے کسی ایک کے اندر بھی زندگی کی رمق موجود ہوئی تو پھر اللہ کے ہاں تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا''۔ یہ پیغام دے کر ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ (۳۸) کس قدر عظیم ہے یہ آخری وصیت اور کتنی مضبوط ہے عہد کی پاسداری جسے موت کی سختی اور زخموں کا کرب بھی متاثر نہ کر سکا!

قرآن کریم نے ان لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے اس روز میدان جنگ سے پیٹھ موڑلی تھی، مگر اللہ نے انہیں معاف کیا:

یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی، ان کے بعض اعمال کے سبب سے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنے والا ہے، بڑے حلم والا ہے (آل عمران ۳:۱۵۵)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ سے مسلمانوں کے ہٹ جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے حوصلے اسی وقت پست ہو گئے تھے، جب انہوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے۔ (۳۹) حضرت کعبؓ بن مالک وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں تو انہوں نے اسی وقت مسلمانوں کو پکار کر یہ خوشخبری سنائی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا تا کہ مشرک یہ خبر نہ سننے پائیں۔ (۴۰)

رسول اللہ ﷺ کے گرد مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت ایسی تھی جو مسلسل مقابلے پر ڈٹی رہی۔ رسول اللہ ﷺ میدان جنگ میں چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے اور ان واقعات نے

بھی آپؐ کے اوپر پریشانی کے کوئی اثرات پیدا نہیں کیے۔ ہر مشکل صورتِ حال میں آپ کا یہی طرزِ عمل ہوتا تھا۔ اس موقع پر آپ نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی، جیسا کہ قرآن نے ہمیں خبر دی ہے: ''وہ وقت یاد کرو جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے'' (آل عمران ۳:۱۵۳)۔(۴۱)

کچھ مشرک رسول اللہ ﷺ کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ اس وقت جو صحابہؓ آپؐ کے قریب موجود تھے، ان کی تعداد نو تھی، ان میں سے سات انصاری اور دو مہاجر تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ان مشرکوں کو پیچھے دھکیلے گا، وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا''۔ انصاری صحابی ایک ایک کر کے آگے بڑھتے گئے اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کا دفاع کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرتے گئے، یہاں تک کہ سب شہید ہو گئے۔(۴۲) اس کے بعد حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ جواں مردی سے لڑے، وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف آنے والی تیروں کی بوچھاڑ کو اپنے ہاتھ پر روکتے رہے، یہاں تک کہ ان کا ہاتھ بالکل ناکارہ ہوگیا۔(۴۳) اس کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کی جگہ لے لی۔ حضرت سعدؓ ایک مشاق تیرانداز تھے۔ رسول اللہ ﷺ انہیں تیر پکڑاتے جا رہے تھے اور فرما رہے تھے: ''لو نشانہ لگاؤ اور تیر چلاؤ! میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں!''(۴۴) حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے بھی تیر چلا کر رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا۔ اس دوران میں رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر مبارک بلند کر کے دشمن کا جائزہ لیا تو حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے عرض کیا: ''آپ اپنا سر نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ دشمن کا کوئی تیر آپ کو زخمی کر دے، اس کے بجائے اگر میری گردن کام آ جائے تو زیادہ بہتر ہے''۔ ایک شخص تیروں سے بھرا ہوا ترکش لے کر قریب سے گزرا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ''اس میں سے کچھ تیر ابوطلحہؓ کو دے دو''۔(۴۵) اس کے بعد آپؐ نے حضرت ابوطلحہؓ کی جنگی صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''ابوطلحہؓ کی للکار مشرکوں کو امدادی فوج سے بھی زیادہ دہلا دیتی ہے''۔(۴۶)

اس کے باوجود کہ صحابہ کرامؓ نے غیر معمولی شجاعت اور بے جگری کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا تھا، لیکن پھر بھی آپؐ زخمی ہو گئے۔ ایک دانت مبارک شہید ہو گیا اور چہرۂ

مبارک پر ایک گہرا زخم آیا جس کی وجہ سے چہرہ خون آلود ہو گیا۔ آپؐ خون صاف کر رہے تھے اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے: ''وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی ﷺ کے چہرے کو خون آلود کر دے، حالانکہ وہ انہیں اسلام کی دعوت دے رہا ہے''۔ اس بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ''آپؐ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائے اور یا ان کو کوئی سزا دے دے، کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں'' (آل عمران ۳:۱۲۸)۔ (۴۷)

رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ جو قوم اپنے نبی کو اس طرح زخمی کر دے، اس کا ہدایت یاب ہونا بعید از امکان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت کے ذریعے اپنے نبی ﷺ کو بتایا کہ اگر اللہ انہیں ہدایت دینا چاہے تو اس کے لیے یہ ناممکن نہیں ہے۔ اب ان کے قبولِ اسلام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی امیدیں تازہ ہو گئیں اور آپؐ نے یہ دعا کرنا شروع کر دی: ''اے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو ہدایت دے، کیوں کہ وہ نہیں جانتے''۔ (۴۸)

روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابو دجانہؓ نے اپنی کمر کو ڈھال بنا کر رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا۔ ان کی کمر تیروں سے چھلنی ہو گئی اور ان کی ایک آنکھ بھی زخمی ہوئی جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ٹھیک کر دیا اور وہ پہلے سے بہتر ہو گئی۔ (۴۹)

ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اگر میں شہید ہو جاؤں تو میرا مقام کہاں ہو گا''؟ آپؐ نے فرمایا: ''جنت میں''۔ صحابی کے ہاتھ میں چند کھجوریں تھیں، انہیں ایک طرف ڈال کر جنگ کے میدان میں کود پڑے اور شہید ہو گئے۔ (۵۰)

حضرت عبداللہؓ بن جحش نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ''اے اللہ! میں یہ دعا کرتا ہوں کہ کل جب میں دشمن سے میدانِ جنگ میں ملوں تو وہ مجھے قتل کر دے، پھر میرے پیٹ کو چیر پھاڑ کر میرا مثلہ کر دے، پھر جب میں تجھ سے ملوں تو تو مجھ سے سوال کرے 'یہ کیا ہوا ہے'؟ اور میں کہوں کہ یہ سب تیری خاطر ہوا ہے''۔ جب مسلمانوں کا دشمن سے میدانِ جنگ میں آمنا سامنا ہوا تو حضرت عبداللہؓ بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور مشرکوں نے ان کی لاش کا مثلہ

کیا۔اس طرح ان کی دعا قبول ہوگئی۔(۵۱)

حضرت عمروؓ بن جموح ایک صحابی رسول تھے جن کی ٹانگ میں لنگ تھا۔ان کے اپاہج پن کی وجہ سے انہیں جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا،لیکن انہوں نے اپنے چار بیٹوں کے ساتھ جنگ میں حصہ لینے پر اصرار کیا،کیوں کہ وہ شہادت کی شدید خواہش رکھتے تھے۔انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا:''اگر آج میں مارا جاؤں تو آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اپنی اس لنگڑی ٹانگ کے ساتھ جنت میں داخل ہوسکتا ہوں''؟رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''یقیناً''۔حضرت عمروؓ نے کہا:''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔اگر اس نے چاہا تو آج میں اپنی اس لنگڑی ٹانگ کے ساتھ ضرور جنت میں داخل ہوں گا''۔اس کے بعد لڑائی میں حصہ لیا اور شہید ہوگئے۔(۵۲)

حضرت حنظلہؓ بن ابی عامر نے جنابت کی حالت میں شہادت پائی۔غزوۂ اُحد سے ایک دن پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی اور جونہی انہیں جہاد کی خبر ملی،وہ غسل کیے بغیر ہی میدان جنگ کی طرف روانہ ہوگئے۔رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:''تمہارے ساتھی کو فرشتے غسل دے رہے ہیں''۔(۵۳)

شہدائے اُحد میں مُخیرِق بھی شامل ہیں جو ایک یہودی عالم تھے اور قبیلہ بنونضیر سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی تمام دولت رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوگی اور آپ ﷺ نے ان کی یہ وصیت قبول فرمائی تھی۔(۵۴)

دو معمر افراد ایسے تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے خواتین اور بچوں کے ساتھ قلعے میں رہنے کا حکم دیا تھا،لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ جنگ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تاکہ شہادت کی نعمت سے سرفراز ہوں۔ان میں سے ایک کا نام حضرت یمانؓ تھا اور یہ حضرت حذیفہؓ بن یمان کے والد تھے،اور دوسرے حضرت ثابتؓ بن وقش تھے۔دونوں میدان جنگ میں شہید ہوگئے۔ حضرت ثابتؓ کو مشرکوں نے شہید کیا،لیکن حضرت یمانؓ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہو گئے،کیوں کہ مسلمان انہیں پہچان نہ سکے تھے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کا خون بہا ادا کیا،لیکن ان

کے صاحبزادے حضرت حذیفہؓ نے یہ رقم صدقہ کر دی۔ ان کے اس عمل سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں ان کی منزلت مزید بڑھ گئی۔ (۵۵)

حضرت عمروؓ بن اقیش کو اسلام سے شدید نفرت تھی، لیکن وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے لیے میدان کی طرف بڑھے تو لوگوں نے انہیں روکا، لیکن انہوں نے جواب دیا: "میں نے اسلام قبول کر لیا ہے"۔ انہیں شدید زخمی حالت میں اپنے اہلِ خانہ کے پاس لایا گیا۔ حضرت سعدؓ بن معاذ ان کے قریب آئے اور ان کی بہن سے کہا: "ان سے پوچھو کہ یہ اپنی قوم کا نام بلند کرنے کے لیے لڑ رہے تھے، یا اللہ کی خاطر"؟ حضرت عمروؓ نے کہا: "اللہ اور اس کے رسول کی خاطر"۔ اس کے بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ وہ صحابی تھے جنہوں نے ایک دفعہ بھی نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن وہ جنت میں داخل ہو گئے۔ (۵۶)

ایک مستند روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک شخص (۵۷) کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بہت بہادری سے لڑا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: "وہ اہل جہنم میں سے ہے"، کیوں کہ اس کی لڑائی اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے قبیلے کی حمیت کے لیے لڑا تھا اور جب اس کے زخموں نے اسے زیادہ تکلیف دینا شروع کی تو اس نے ایک تیر مار کر اپنے آپ کو ختم کر لیا۔

ان دونوں روایات سے پتا چلتا ہے کہ جہاد میں نیّت کی کس قدر اہمیت ہے! جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، وہی دراصل اللہ کی خاطر لڑتا ہے، لیکن جو شخص اس کے علاوہ کسی بھی سبب سے لڑتا ہے، خواہ وہ سبب انسان کی نظر میں کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، ایسے شخص کو جان دے دینے پر شہید نہیں کہا جا سکتا۔ (۵۸)

مسلمان فوج کے ساتھ چند خواتین بھی غزوۂ احد میں شامل تھیں۔ ان خواتین میں سے ایک کا نام حضرت ام عمارہؓ نسیبہ بنت کعب المازنیہ ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے مشرکوں سے جنگ کی اور متعدد زخم کھائے۔ (۵۹) حضرت حمنہؓ بنت جحش الاسدیہ نے پیاسوں کو پانی پلایا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ (۶۰) مستند روایت سے یہ بھی پتا چلتا

ہے کہ حضرت ام سلیطؓ پانی کے کنستر بھر بھر کر لاتیں اور مسلمانوں کی پیاس بجھاتی رہیں۔(۶۱)

اُم المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ کے بارے میں بھی مستند ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے پیچھے ہٹنے کے بعد انہوں نے زخمیوں کی خبر گیری کی۔(۶۲) ان روایات کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اگر ضرورت محسوس کی جائے تو خواتین کو اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ زخمیوں کی دیکھ بھال اور ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے کا فریضہ انجام دیں، بشرطیکہ ان کی موجودگی وہاں کسی فتنے کا سبب نہ بنے اور بے حجابی کا اظہار نہ ہو۔ اگر دشمن ان پر حملہ کرے تو وہ اپنے دفاع میں لڑنے کا بھی حق رکھتی ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ جہاد صرف مردوں پر فرض ہے، لیکن اگر دشمن مسلم علاقے پر حملہ کر دے تو مردوں اور عورتوں کی یہ مشترک ذمہ داری ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کریں۔

[اُحد میں] رسول اللہ ﷺ کے زخمی ہونے اور مسلمانوں کے زخم کھانے کے باوجود لڑائی اس وقت تک جاری رہی، جب تک دونوں فوجیں تھک کر چور نہ ہوگئیں۔

رسول اللہ ﷺ کچھ پیچھے ہٹ کر اُحد کی وادیوں کی طرف تشریف لے گئے اور مسلمانوں نے بھی آپ کی پیروی کی۔ آپ ایک ڈھلوان چٹان پر چڑھ گئے جہاں سے مشرکین کو پیچھے دھکیلنا زیادہ آسان تھا۔

یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے دفاع کی خاطر جبریل اور میکائل علیہما السلام کو بھیجا تھا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تھا،(۶۳) تاہم اس بارے میں کوئی صحیح روایت دستیاب نہیں ہوتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ فرشتوں نے کسی اور شکل میں بھی لڑائی میں حصہ لیا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد کرے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تین شرائط پر مبنی تھا: صبر (یعنی ثابت قدم رہنا)، تقویٰ (یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا) اور یہ کہ دشمن ان کے اوپر چڑھ دوڑے: (۶۴)

جب کہ آپؐ مسلمانوں سے یوں فرما رہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا

رب تمہاری مدد کرے، تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جائیں گے۔ ہاں، کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آ پہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو کہ ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے" (آل عمران ۳:۱۲۴-۱۲۵)۔

جنگ میں جو صورتِ حال پیش آئی تھی، اس کے سبب مسلمانوں پر سخت مایوسی کا عالم طاری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اوپر ایک اونگھ طاری کر دی۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کی آنکھ لگ گئی۔ اس کے بعد جب وہ جاگے تو خوف اور مایوسی کی حالت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ اعتماد اور یقین نے لے لی تھی۔ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ بیان کرتے ہیں: "میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جن کے اوپر اونگھ طاری ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں میری تلوار کئی مرتبہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گری، ایک دفعہ گر گئی، میں نے اٹھا لی، مگر دوبارہ گر گئی اور میں نے دوبارہ اٹھا لی"۔ (۶۵) اس بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین بھیجا، یعنی اونگھ، کہ تم میں سے ایک جماعت پر تو اس کا غلبہ ہوا اور ایک جماعت وہ تھی کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑی ہوئی تھی، وہ لوگ اللہ کے ساتھ خلاف واقعہ خیالات کر رہے تھے جو کہ محض حماقت کا خیال تھا۔ وہ یوں کہہ رہے تھے کہ کیا ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے۔ آپ فرما دیجیے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا ہے (آل عمران ۳:۱۵۴)۔

یہ گروہ جو صرف اپنے بارے میں سوچ رہا تھا اور مسلمانوں کی ناکامی اور اسلام کے مستقبل سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، دراصل منافقوں کا گروہ تھا۔ قرآن کریم نے ایک منافق کے الفاظ نقل کیے ہیں: "کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا تو ہم یہاں مقتول نہ ہوتے" (آل عمران ۳:۱۵۴) (۶۶)۔

واقعہ یہ ہے کہ نیند کے ایک مختصر جھونکے نے مسلمانوں کو نئے سرے سے تازہ دم کر دیا تھا اور وہ اپنی قوت بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کچھ مشرکوں نے ان کا پیچھا کیا جن میں

ابی بن خلف الجمحی بھی شامل تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی قسم کھائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے اوپر نیزے سے وار کیا جس سے وہ زخمی ہو گیا، اور اسی حالت میں اپنے ساتھیوں کی طرف واپس چلا گیا۔ اُحد سے واپس جاتے ہوئے راستے ہی میں مر گیا۔

مشرکینِ مکہ کو اب یہ امید باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اس جنگ میں فیصلہ کن فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے، جنگ کی طوالت اور مسلمانوں کے ہمت نہ ہارنے کے سبب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور وہ تھکن سے چور ہو چکے تھے۔ انہوں نے اُحد کی گھاٹیوں میں مسلمانوں کا تعاقب کرنے کا ارادہ ترک کر دیا، لیکن ابوسفیان مسلمانوں کی تلاش میں اس چٹان تک جا پہنچا جس کے اوپر رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ اس نے نیچے سے آواز لگائی: کیا محمد (ﷺ) لوگوں کے درمیان موجود ہیں''؟ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ ابوسفیان نے دوبارہ آواز لگائی: ''کیا ابوقحافہؓ کا بیٹا [ابو بکر صدیقؓ] یہاں موجود ہے''؟ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ ارشاد فرمایا: ''اس کی بات کا جواب نہ دیا جائے''۔ ابوسفیان نے ایک تیسری آواز لگائی: ''کیا خطاب کا بیٹا [عمرؓ] موجود ہے؟'' لیکن کوئی جواب نہ پا کر وہ خود ہی بڑبڑایا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام لوگ مر چکے ہیں۔ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے''۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ خاموش نہ رہ سکے اور بول اٹھے: ''او دشمنِ خدا! تو غلط سمجھ رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو باقی رکھا ہوا ہے جن سے تو ناخوش ہے''۔ ابوسفیان نے نعرہ لگایا: ''ہبل کی شان اونچی ہے''۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اسے جواب دو۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''کیا جواب دیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہو کہ اللہ ہمارا حامی ہے اور تمہارا کوئی حامی نہیں''۔ ابوسفیان نے جواباً کہا: ''ہمارے پاس عزیٰ (بت) ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اسے جواب دو۔ انہوں نے پوچھا: ''کیا جواب دیں''؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہو: اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے''۔ ابوسفیان نے کہا: ''آج ہم نے بدر کے نقصان کا بدلہ لے لیا، اور جنگ میں فتح کبھی ایک فریق کے مقدر میں ہوتی ہے اور کبھی دوسرے کے۔ تم دیکھو گے

کہ تمہارے کچھ مقتولین کا مثلہ کیا گیا ہے، مگر نہ میں نے اس عمل پر کسی کو اکسایا اور نہ مجھے اس کا افسوس ہے''۔(٦٧)

ایک اور روایت میں یہ ذکر ملتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا: ''ہمارے مقتولین جنت میں اور تمہارے دوزخ میں ہیں''۔(٦٨) شروع میں جب مسلمانوں نے ابوسفیان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا تو پہلے اس نے اسے اپنی توہین خیال کیا، لیکن بعد میں وہ فخر اور غرور سے اکڑ گیا، اس لیے مسلمانوں نے اصل صورت حال اس پر واضح کر دی اور نڈر ہو کر جواب دیا۔ ابن اسحٰق اور واقدی اس پر متفق ہیں کہ ابوسفیان نے مسلمانوں کو یہ فیصلہ سنایا کہ آئندہ برس میدانِ جنگ میں ملاقات ہوگی جسے مسلمانوں نے تسلیم کر لیا۔(٦٩)

ابن اسحٰق اور سدّی ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو یہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کیا کہ قریش کی نقل وحرکت کس سمت میں ہے، آیا وہ مدینے پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یا مکے واپس جا رہے ہیں۔(٧٠) واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو جاسوسی کی اس مہم پر روانہ فرمایا تھا۔(٧١) ان دونوں روایات میں سے پہلی روایت زیادہ قابل اعتماد ہے۔ بہر حال، قریش مکے واپس ہو گئے۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کے انتقام کی آگ بجھ چکی ہے۔ اب انہیں کسی فیصلہ کن فتح کی خواہش باقی نہیں رہی تھی، کیوں کہ اس کی خاطر انہیں اُحد کی وادیوں میں مسلمانوں کا تعاقب کرنا پڑتا یا مدینے پر حملہ کرنا پڑتا۔

جونہی قریش واپس روانہ ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے شہداء کی تدفین کا حکم جاری فرما دیا۔ شہداء کی تعداد ٧٠ تھی (٧٢) اور کوئی مسلمان گرفتار نہیں ہوا۔ قریش کے ۲۲ آدمی مارے گئے جن کے نام ابن اسحٰق نے نقل کیے ہیں۔(٧٣) ابوعزّہ نامی شاعر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، اس کی گردن مار دی گئی، کیوں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدعہدی کی تھی۔ ابوعزّہ کو بدر کے موقع پر گرفتار کیا گیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس پر احسان کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا تھا اور اس نے یہ کہا تھا کہ وہ کبھی رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود وہ دوبارہ دشمن بن کر آیا اور اُحد کی جنگ میں شریک ہوا۔(٧٤)

ایک صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک کفن میں دو دو شہیدوں کو دفن کرایا، اور وہ لوگ جو قرآن کا علم زیادہ رکھتے تھے، انہیں پہلے دفن کیا گیا۔ آپؐ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ شہداء کو اسی حالت میں دفن کر دیا جائے کہ ان کے جسم خون میں لت پت ہوں، نہ انہیں غسل دیا جائے اور نہ ان کی نماز جنازہ ہی ادا کی جائے۔ آپؐ نے فرمایا: ''حشر کے روز میں ان کے اوپر گواہ بنوں گا''۔ (۷۵)

چند روایات ایسی ہیں جن میں یہ ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہدائے اُحد کی نماز جنازہ ادا کی، لیکن یہ روایات اتنی مضبوط نہیں ہیں کہ اس حدیث کے مقابلے پر لائی جاسکیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی نماز ادا نہیں کی۔ ان روایات کو بہت زیادہ تنقید کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ (۷۶) رسول اللہ ﷺ نے دو دو اور تین تین شہیدوں کو ایک ہی قبر میں دفن کروایا۔ (۷۷) کچھ شہداء ایسے بھی تھے جنہیں ان کے اہلِ خانہ مدینے لے گئے اور وہاں لے جا کر دفن کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم جاری فرمایا کہ شہداء کو اسی مقام پر دفن کر دیا جائے جہاں انہوں نے شہادت پائی ہے۔ (۷۸)

جب آپ شہداء کی تدفین سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو صفوں کی شکل میں ترتیب دیا اور اپنے مالک حقیقی کے حضور یوں دعا گو ہوئے: (۷۹)

میرے مالک! تمام تعریفوں کی مستحق تیری ذات ہے۔ جو تو عطا کرے اسے کوئی روک نہیں سکتا، اور جو تو روکے اسے کوئی دے نہیں سکتا، جسے تو بھٹکا دے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جسے تو ہدایت دے، اسے کوئی بھٹکا نہیں سکتا، جس شے کو تو روک لے، اسے کوئی دینے پر قدرت نہیں رکھتا اور جس چیز کو تو دینے کا ارادہ کرے، اسے کوئی روکنے پر قادر نہیں۔ کوئی شخص اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا جسے تو قریب کر لے۔ اے ہمارے مالک! ہم پر اپنی رحمت، نعمت، مودت اور عنایت نازل فرما۔ اے ہمارے مالک! میں تجھ سے وہ مہربانی طلب کرتا ہوں جو ہمیشہ رہنے والی، غیر متغیر اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہو۔ مالک! میں تجھ سے غربت کے وقت تیری نعمت اور

خوف کے وقت تیرا امن طلب کرتا ہوں۔ اے ہمارے مالک! میں اس برائی سے بھی تیری پناہ طلب کرتا ہوں جو تو نے ہمارے مقدر میں لکھ دی ہے، اور اس برائی سے بھی تیری پناہ میں آتا ہوں جسے تو نے ہم سے روک لیا ہے۔ اے ہمارے آقا! ہمیں ایمان سے محبت کرنے والا اور کفر، بے انصافی اور سرکشی سے نفرت کرنے والا بنا دے اور ہمیں سیدھے راستے پر چلا دے۔ اے ہمارے مالک! ہمیں اسلام کی حالت میں موت عطا فرما اور اسلام ہی کی حالت میں دوبارہ اٹھا کر کھڑا کر دے اور بغیر کسی ندامت اور تکلیف کے ہمارا شمار صالحین میں فرما دے۔ اے مالک! ان کافروں سے جنگ کر جو تیرے نبی کا مقابلہ کرتے ہیں اور لوگوں کو سیدھے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں اور اپنی طرف سے انہیں سزا دے۔ مالک! ان کافروں سے جنگ فرما جنہیں تیری کتاب دی گئی، لیکن انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ اے تمام مخلوقات کے خدا!

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مدینے کی جانب روانہ ہو گئے۔

حضور ﷺ کے دل میں ہمیشہ شہدائے احد کی یاد تازہ رہی۔ آپؐ خواہش کیا کرتے تھے کہ آپؐ بھی ان لوگوں کے ساتھ شہادت کے عظیم الشان مقام پر فائز ہوتے۔ جب بھی شہدائے احد کا ذکر آتا تو آپؐ فرمایا کرتے تھے: ''خدا کی قسم! میری آرزو ہے کہ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان پر چھوڑ دیا جاتا''۔ (۸۰)

جب بھی مجاہدین کی بہادری کا منظر آپؐ کو یاد آتا، آپؐ ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو اپنی تلوار دیتے ہوئے کہا: ''یہ میری تلوار آج میرے بہت کام آئی ہے''۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم بہت اچھا لڑے ہو تو تمہارے ساتھ سہلؓ بن حنیف، ابودجانہؓ، عاصمؓ بن ثابت الاقلح اور حارث الصمہؓ کے کارنامے بھی بہت زبردست ہیں''۔ (۸۱)

خواتین اور بچوں نے جب یہ دیکھا کہ اسلامی فوج مدینے واپس پہنچ گئی ہے تو وہ اپنے باپوں اور شوہروں کی تلاش میں مدینے سے باہر نکل آئے۔ جب حضرت حمنہؓ بنت جحش کو بتایا گیا کہ ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ماموں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب شہید ہو گئے ہیں تو انہوں نے بلند آواز سے یہ کہا: ''بے شک ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں واپس لوٹنا ہے''۔ اس کے بعد ان دونوں شہیدوں کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اس کے بعد انہیں بتایا گیا کہ ان کے شوہر حضرت مصعبؓ بھی اس لڑائی میں کام آ گئے ہیں تو انہوں نے ایک چیخ ماری اور گریہ وزاری کرنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس خاتون کے دل میں شوہر کا ایک خصوصی مقام تھا، تم نے دیکھا کہ بھائی اور ماموں کی موت پر اس نے صبر و ضبط سے کام لیا، لیکن شوہر کی موت کا سن کر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی''۔ (۸۲)

رسول اللہ ﷺ بنو دینار کی ایک خاتون کے قریب سے گزرے جس کا شوہر، باپ اور بھائی شہید ہو چکے تھے۔ جب اسے ان سب لوگوں کی شہادت کی اطلاع ملی تو اس نے رسول اللہ ﷺ کی خیریت دریافت کی۔ اسے یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے کرم سے رسول اللہ ﷺ بالکل خیریت سے ہیں، تو اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی آنکھوں سے رسول اللہ ﷺ کو دیکھنا چاہتی ہے اور اپنی آنکھوں سے آپ ﷺ کا دیدار کرنے کے بعد بولی: ''آپ کی موجودگی میں ہر مصیبت ہیچ ہے''۔ (۸۳)

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس عظیم الشان اجر کی خوشخبری سنائی جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے شہداء کو عطا ہوا تھا۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن عمرو کی صاحبزادی سے فرمایا جو حضرت جابرؓ کی بہن تھیں: ''تم کیوں رو رہی ہو؟ فرشتوں نے انہیں اپنے پروں کے سائے میں لیا ہوا ہے اور اس وقت تک لیے رہیں گے، جب تک وہ جنت میں اپنے مقام تک نہ پہنچ جائیں گے۔'' (۸۴)

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی آوازیں سنیں جو اپنے اپنے مُردوں پر نوحہ کر رہے تھے اور رو رہے تھے تو آپ نے افسردگی کے عالم میں فرمایا: ''حضرت حمزہؓ کے اوپر کوئی رونے والا

نہیں ہے''۔ یہ سن کر چند انصاری عورتوں نے حضرت حمزہؓ پر نوحہ کرنا شروع کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی آوازیں سنیں تو آپؐ ان کے پاس تشریف لائے اور نہایت نرمی سے گفتگو فرماتے ہوئے اس بات کی سختی سے ہدایت کی کہ بلند آواز سے نہ رویا جائے۔ (۸۵) اسی وقت سے بلند آواز سے رونا ہمیشہ کے لیے ناجائز ہو گیا، لیکن غم اور صدمے کی شدت میں آنسو بہانے کی اجازت کو باقی رکھا گیا۔

شہدائے احد کے بارے میں یہ قرآنی آیت نازل ہوئی: ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، انہیں مردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں۔ اپنے پروردگار کے مقرب ہیں، ان کو رزق بھی ملتا ہے'' (آل عمران ۳:۱۶۹)۔ (۸۶) علماء کی اکثریت اسی حقیقت پر متفق ہے کہ شہداء واقعتاً زندہ ہیں اور ان کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہیں، انہیں جنت کا رزق دیا جاتا ہے جس سے وہ کھاتی ہیں اور آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ (۸۷) اس کے علاوہ قرآن کریم کی چند دیگر آیات بھی اس موقع پر نازل ہوئیں جن کے ذریعے مسلمانوں کو تسلی دی گئی اور اس طرح ان کے ذہنوں سے اُحد کے اثرات کو محو کیا گیا: ''اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے'' (آل عمران ۳:۱۳۹)۔

مزید ارشاد ہوا: ''اگر تم کو زخم پہنچ جائے تو اس قوم کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور ہم ان ایام کو ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں'' (آل عمران ۳:۱۴۰)۔ ''ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں جا داخل ہو گے، حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو، اور نہ ان کو دیکھا جو ثابت قدم رہے'' (آل عمران ۳:۱۴۲)۔

مدینے میں مسلمانوں کو یہودیوں کا سامنا کرنا تھا جو مسلمانوں کی اس ناکامی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، اور ان کے علاوہ شہر میں منافق بھی موجود تھے، ان سے بھی نمٹنا تھا، جو مسلسل جھوٹی افواہیں اڑانے میں سرگرمِ عمل تھے۔ تیسرا مسئلہ جو مسلمانوں کو درپیش تھا، وہ

یہ تھا کہ مدینے کے مضافات میں بسنے والے مشرک بدو مدینے کی دولت کی طرف مستقل للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان تمام مسائل کے ساتھ ساتھ یہ امکان بھی موجود تھا کہ اگر قریش کو یہ خیال آ گیا کہ وہ مسلمانوں کو مکمل طور پر تباہ کر کے اپنی فتح مکمل کر لیں تو عین ممکن ہے کہ وہ لوٹ کر مدینے پر حملہ کر دیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ اپنی طاقت کو جلد از جلد بحال کر کے اپنی حیثیت کو مستحکم کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ حمراء الاسد تک قریشی فوج کا تعاقب کریں۔ یہ حکم فوج کے اسی حصہ کو دیا گیا جو اُحد کے میدان میں موجود تھی (۸۸) اگرچہ وہ زخموں سے چور تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاوہ کسی اور کو اس فوجی عمل میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ سب سے پہلے ۷۰ صحابہ کرامؓ اس پیش قدمی کے لیے تیار ہوئے اور اس کے بعد پوری فوج تیار ہو گئی۔ آخر میں ۶۳۰ افراد تھے جو اس مقصد کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

اسلامی لشکر نے قریش کا تعاقب کرنے کے لیے جس مستعدی کا مظاہرہ کیا، اس کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ قرآنی آیت نازل فرمائی: ''جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے کہنے کو قبول کر لیا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگا تھا۔ ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں، ان کے لیے ثواب عظیم ہے'' (آل عمران ۳:۱۷۲)۔

سیدہ عائشہؓ نے حضرت عروہ سے فرمایا:

تمہارے والد زبیرؓ اور ابوبکرؓ ان لوگوں میں شامل تھے (، جنھوں نے جنگِ اُحد کے روز اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا تھا) جس روز اللہ کے رسول کو اُحد کے میدان میں مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب مشرکینِ مکہ اُحد سے روانہ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ ممکن ہے وہ لوٹ آئیں، اس لیے آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے کون ان کے تعاقب میں نکلے گا''؟ اس کے بعد آپؐ نے اس مقصد کے لیے پوری فوج میں سے ۷۰ افراد کا انتخاب کیا۔ (۸۹)

ابن اسحٰق نے کسی سند کا حوالہ دیے بغیر نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین روز، یعنی

سوموار، منگل اور بدھ کے روز حمراء الاسد میں قیام فرمایا۔ معبد الخزاعی مسلم افواج کے قریب سے گزرا اور روحاء کے مقام پر ابوسفیان اور دوسرے مشرک سرداروں سے ملاقات کی۔ وہ واپس آنے اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے درپے تھے، لیکن معبد نے ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے انہیں یہ خبر دی کہ مسلمان ان کا تعاقب کرتے ہوئے حمراء الاسد تک پہنچ چکے ہیں، اس کے ساتھ مشرکین کو مکے واپس جانے کا مشورہ دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس پیش قدمی کے گوناگوں فوائد حاصل ہوئے جو انہوں نے حمراء الاسد تک کی تھی، اور وہ مقصد بھی پورا ہو گیا تھا جس کی خاطر یہ مہم انجام پائی تھی۔ وہ مقصد یہ تھا کہ قریشی فوج اور بدوؤں پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ اُحد میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس کے باوجود مسلمانوں میں مدافعت کی بھرپور اہلیت موجود ہے اور یہ کہ جب مسلمان مدینے سے باہر نکل کر عسکری کارروائی کی طاقت رکھتے ہیں تو مدینے کے اندر رہ کر یہودیوں اور منافقوں سے مقابلے کی قوت ان میں کہیں زیادہ ہے۔

غزوۂ احد کے بعد پیش آنے والی مہمات

غزوۂ اُحد کا ایک نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف مدینے کے نواحی علاقوں میں بسنے والے بدوؤں کی جرأت میں اضافہ ہو گیا۔ ان کی یہ جرأت اس طرح ظاہر ہوئی کہ بنو اسد کی افواج طلیحہ الاسدی اور اس کے بھائی سلیمہ کی سرکردگی میں نجد میں جمع ہو گئیں اور بنو ہذیل کی افواج خالد بن سفیان الہذلی کی سربراہی میں عرفات میں جمع ہوئیں۔ یہ لوگ دولت کے لالچ میں مدینے پر حملہ کرنے کے متمنی تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کفر اور الحاد پر مبنی اپنے مذہب کی حمایت میں کھڑے ہوں اور قریش کو بھی اپنے اس عمل سے یہ باور کرا دیں کہ ان کے ساتھ ان کے حلیفانہ تعلقات کس قدر گہرے ہیں۔ یہ واقعہ محرم ۴ھ میں پیش آیا۔ (۹۰)

اس سے پہلے کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی، مسلمانوں نے فوری کارروائی کی اور رسول اللہ ﷺ نے سلمہ ابن عبدالاسد کو ۱۵۰ افراد کے ہمراہ طلیحہ الاسدی کی طرف روانہ کیا۔ اس کے لوگوں کو جب مسلمانوں کی آمد کا علم ہوا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے اور خوفزدہ ہو کر منتشر ہو گئے،

اور اپنے اونٹ اور مویشی مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے۔(۹۱)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن انیس الجہنی کو خالد بن سفیان الہذلی کی طرف روانہ کیا۔ عبداللہ نے بطن عرنہ (۹۲) میں جو عرفات کے نزدیک ایک مشہور وادی ہے، خالد بن سفیان کو قتل کیا اور اس کے مویشیوں پر قبضہ کر لیا۔

قبیلہ ہذیل نے ابن سفیان الہذلی کے قتل کا انتقام لینے کے بجائے مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ دہی اور غداری کا معاملہ کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ صفر ۴ھ (۹۳) میں دو مضری قبائل عضال اور قارہ کا ایک وفد مدینے آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ اپنے چند ساتھیوں کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ ہمیں اسلام کی تعلیم دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دس صحابہ کرامؓ (۹۴) کو ان کے ہمراہ روانہ فرمایا۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ ان صحابہ کرامؓ کی تعداد چھ تھی، مگر موسیٰ بن عقبہ لکھتے ہیں کہ وہ سات صحابہ کرامؓ تھے اور موسیٰ نے ان کے نام بھی گنوائے ہیں اور یہ کہ حضرت عاصمؓ بن ثابت الاقلح کو اس وفد کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔ جب یہ لوگ عسفان اور مکے کے درمیان ایک مقام پر پہنچے تو بنو ہذیل کی ایک شاخ بنولحیان کے تقریباً ۱۰۰ حملہ آوروں نے انہیں گھیر کر ان پر حملہ کر دیا۔ وفد کے تمام ارکان نے ایک بلند مقام پر پناہ لے لی۔ بدوؤں نے انہیں اس بات کی ضمانت دی کہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ حضرت عاصمؓ بن ثابت نے یہ سن کر فرمایا: ''میں کسی 'کافر' کی ضمانت پر نیچے نہیں آؤں گا''۔ اب مسلمانوں نے لڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ حضرت عاصمؓ اور ان کے چھ ساتھی شہید ہو گئے اور تین لوگ بچ گئے۔ ایک مرتبہ پھر بدوؤں نے انہیں یہ ضمانت دی کہ ان کی زندگی محفوظ ہے اور وہ لوگ ان کی ضمانت قبول کرتے ہوئے نیچے اتر آئے، لیکن جونہی وہ لوگ نیچے آئے، بدوؤں نے ایک بار پھر غداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی مشکیں کس لیں۔ حضرت عبداللہؓ بن طارق نے مدافعت کی کوشش کی تو وہ شہید کر دیے گئے۔ وفد کے آخری دو ارکان حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ تھے، بدو انہیں لے کر مکے آ گئے اور انہیں قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

حضرت خبیبؓ کو بنو حارث بن عامر بن نوفل نے اس لیے خرید لیا کہ وہ انہیں

حارث کے انتقام میں قتل کرنا چاہتا تھا۔ حضرت خبیبؓ نے حارث کو بدر کے موقع پر قتل کیا تھا۔ ان لوگوں نے کچھ عرصے تک حضرت خبیبؓ کو قیدی بنا کر رکھا اور پھر متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ انہیں سولی دی جائے۔ اس موقع پر حضرت خبیبؓ نے حارث کی ایک بیٹی سے استرا طلب کیا تاکہ غیر ضروری بالوں کی صفائی کر سکیں۔ اس خاتون کو یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب اس کا چھوٹا بچہ حضرت خبیبؓ کے پاس گیا اور جا کر ان کی گود میں بیٹھ گیا۔ استرا دینے کے بعد جونہی اس نے بچے کو حضرت خبیبؓ کے گھٹنے پر بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ سخت خوف زدہ ہوگئی اور اسے یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ حضرت خبیبؓ انتقاماً اس کے بچے کو قتل کر دیں گے۔ جب حضرت خبیبؓ کو خاتون کی پریشانی کا احساس ہوا تو انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''کیا تمہیں یہ خدشہ ہے کہ میں تمہارے بچے کو قتل کر دوں گا؟ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا، ان شاء اللہ''۔ بعد میں اس خاتون نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''میں نے حضرت خبیبؓ سے بہتر قیدی کبھی نہیں دیکھا، ایک مرتبہ میں نے اسے انگور کے خوشے میں سے انگور کھاتے ہوئے دیکھا، حالانکہ اس زمانے میں مکے میں کوئی پھل بھی میسر نہیں تھا اور خبیبؓ آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا خاص عطا کردہ رزق تھا جو وہ کھا رہا تھا''۔ جب لوگ انہیں سولی دینے کے ارادے سے حرمِ مکہ سے باہر لے کر چلے تو انہوں نے کہا: ''مجھے دو رکعت نماز ادا کرنے کی اجازت دے دو''۔ نماز کے بعد انہوں نے لوگوں سے کہا: ''اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم سمجھو گے کہ میں موت سے ڈرتا ہوں تو میں اپنی نماز کو طویل کرتا''۔ حضرت خبیبؓ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تختۂ دار پر جانے سے پہلے دوگانہ ادا کرنے کی روایت قائم کی۔ اس کے بعد حضرت خبیبؓ نے یہ دعا کی: ''اے میرے مالک! انہیں ایک ایک کر کے گن لے''۔ اس کے بعد اتنا اضافہ فرمایا: ''جب میں اسلام کی حالت میں شہادت حاصل کر رہا ہوں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ میں اللہ کی راہ میں کس طرح مارا جاؤں، کیوں کہ میری یہ موت محض اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاطر ہے۔ اگر اس نے چاہا تو وہ میرے اعضائے بریدہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے گا''۔ اس کے بعد انہیں شہید کر دیا گیا۔ (۹۵)

حضرت زید بن دثنہ کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا تھا اور وہ انہیں اپنے باپ امیہ بن

خلف کے انتقام میں قتل کرنا چاہتا تھا جو بدر کے موقع پر مارا گیا تھا۔ حضرت زید بن دثنہ کے قتل سے پہلے ابوسفیان نے ان سے دریافت کیا: "زید! میں تمہیں خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو گے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد (ﷺ) ہمارے پاس ہوں اور ہم ان کا سر قلم کر دیں اور تم اپنے خاندان کے ساتھ آرام سے رہو"؟ زیدؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم! میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ محمد ﷺ میری جگہ پر ہوں اور انہیں ایک کانٹا بھی چبھے، جب کہ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھا رہوں"۔ ابوسفیان نے حیرت اور تعجب سے کہا: "میں نے کبھی ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس سے اتنی محبت کرتے ہوں، جیسے محمد (ﷺ) کے ساتھی اس کے ساتھ کرتے ہیں"۔ (۹۶)

واقدی کا خیال ہے کہ قبیلہ ہذیل نے عضال اور قارہ کے ساتھ مل کر یہ سازش تیار کی تھی۔ (۹۷) اس واقعے کو واقعہء رجیع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ رجیع اس چشمے کا نام ہے جس کے نزدیک یہ واقعۂ پیش آیا تھا۔ رجیع کے مقام پر پیش آنے والے اس افسوس ناک واقعے کے باوجود مسلمانوں نے بدوؤں میں اسلام کی نشر و اشاعت کی خاطر وفود بھیجنے کا سلسلہ ترک نہیں کیا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں ہر قسم کے خطرات کے باوجود اسلام کا پیغام عام کرنا ہے۔

جب ابو براء عامر بن مالک، جسے "نیزوں سے کھیلنے والا" کہا جاتا تھا، مدینے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس نے فوراً تو اسلام قبول نہیں کیا، لیکن وہ اسلام سے اتنا دور بھی نہ تھا۔ اس نے اس وفد کو تحفظ دینے کا وعدہ کیا جسے رسول اللہ ﷺ نجد کی طرف روانہ کرنے کی خواہش رکھتے تھے تاکہ اس علاقے کے بدوؤں کو اسلام کی دعوت دی جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے صفر ۴ھ (۹۸) میں حضرت منذرؓ بن عمرو الخزرجی (۹۹) کی سربراہی میں ایک وفد روانہ فرمایا۔ ان کے ہمراہ ۷۰ قرائے کرام تھے۔ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ کل ۴۰ تھے۔ جب یہ لوگ بئر معونہ کے مقام پر پہنچے جو نجد میں مدینے سے ۱۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے (۱۰۰) تو عامر بن طفیل نے ان لوگوں کے ساتھ غداری کی اور حضرت حرامؓ بن ملحان کو قتل کرا دیا جنہیں عامر کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس نے ایک شخص کو حکم دیا کہ حضرت حرامؓ بن

ملحان کی پشت میں خنجر گھونپ دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ حضرت حرامؓ نے یہ مہلک وار سہتے ہی نعرہ بلند کیا: "ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا"۔ رعل اور ذکوان کے بدوؤں نے ان قرائے کرام کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ وہ لوگ اس وقت تک اپنے دفاع میں لڑتے رہے، جب تک ان سب نے ایک ایک کر کے جامِ شہادت نوش نہیں کر لیا۔ ان میں سے صرف حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری زندہ بچے جو سب سے پیچھے تھے۔ وہ واپس مدینے آئے اور رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کی خبر دی، اور رسول اللہ ﷺ رعل اور ذکوان کے خلاف ایک ماہ تک نماز فجر کے دوران میں بددعا کرتے رہے۔ اسی زمانے سے قنوت کی تشریعی حیثیت کا آغاز ہوا۔ یہ ۷۰ قرائے کرام بہترین مسلمان تھے، دن بھر لکڑیاں جمع کرتے تھے اور انہیں فروخت کر کے ان کی آمدنی اہل صفہ کو صدقہ کر دیا کرتے تھے اور رات کو ایک جگہ جمع ہو کر قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ (۱۰۱)

اس طرح مسلمانوں کو صفر ۶ ھ میں اپنے ۸۰ بہترین مبلغین اور داعیانِ کرام سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بدوؤں کے صحرائی علاقے میں اسلام کی نشر واشاعت نہ آسان تھی اور نہ محفوظ، بلکہ یہ کام خطرات سے پُر اور موت کے منہ میں جانے سے عبارت تھا، لیکن اس کے باوجود مسلمان مبلغین کو اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا میں پھیلانے سے کوئی چیز باز نہ رکھ سکی۔

مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی متبادل نہیں تھا کہ بدوؤں کو ان کی غداری کا سبق سکھائیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ جمادی الاولیٰ ۶ ھ میں ایک فوج لے کر بنو لحیان کی طرف روانہ ہوئے (جنہوں نے رجیع کے مقام پر قرائے کرام کو شہید کیا تھا)۔ بدوؤں کو جب اسلامی لشکر کی آمد کا علم ہوا تو وہ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ یہ مدائنی کی روایت (۱۰۲) ہے۔ ابن اسحٰق کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے چھٹے سال پیش آیا، (۱۰۳) لیکن ممکن ہے کہ یہ دو مختلف واقعات ہوں۔

غزوۂ بدر الموعد

ذی قعدہ ۶ ھ میں رسول اللہ ﷺ پندرہ سو صحابہ کرامؓ اور دس گھڑ سواروں کے ہمراہ ایک

مہم پر روانہ ہوئے، حضرت علیؓ بن ابی طالب نے علم اٹھایا ہوا تھا۔ یہ مہم اس وعدے کے مطابق ترتیب دی گئی تھی جو قریش کے سردار ابوسفیان نے غزوۂ اُحد کے موقع پر کیا تھا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ اس وعدے کی روشنی میں قریش کی آمد کا انتظار کیا جائے۔ مسلمانوں نے بدر کے مقام پر قریش کے انتظار میں آٹھ دن تک پڑاؤ ڈالے رکھا، لیکن قریش وہاں نہ پہنچے۔ ابوسفیان دو ہزار افراد اور ۵۰ گھڑسواروں کے ساتھ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے نکلا تھا، لیکن یہ لوگ جب مرّالظہر ان پہنچے جو مکے سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے تو وہاں سے یہ بہانہ بنا کر واپس چلے گئے کہ ان دنوں خشک سالی ہے۔ ان کی وعدہ شکنی کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کی حیثیت مستحکم ہوگئی اور ان کی شہرت بحال ہوگئی۔ (۱۰۴)

مسلمانوں نے حجاز اور نجد کے مختلف علاقوں میں مہمات روانہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ بدوؤں کو اچھی طرح سبق سکھایا جا سکے۔ حضرت ابوعبیدہؓ ایک مہم لے کر نجد میں طے اور اسد کے علاقوں کی سمت روانہ ہوئے، لیکن بدو ان کی آمد کی خبر سن کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے اور لڑائی پیش نہ آئی۔ (۱۰۵)

ربیع الاوّل ۵ھ میں رسول اللہ ﷺ نے دومۃ الجندل کی طرف ایک ہزار مجاہدین پر مشتمل فوج کی رہنمائی فرمائی۔ آپ نے یہ خبر سنی تھی کہ وہاں مشرکین کی ایک تعداد مسلمانوں کے خلاف جمع ہوگئی ہے، لیکن ان مشرکوں کو جب مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ وہاں سے تتر بتر ہو گئے۔ مسلمانوں نے اس علاقے میں چند روز قیام کیا اور مختلف سرایا روانہ کیے، لیکن کسی جگہ بھی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ مسلمان فوج مدینے کی جانب واپس ہوئی اور راستے میں عیینہ بن حصن الفزاری کے ساتھ امن کا معاہدہ طے کیا۔ (۱۰۶)

حواشی

۱۔ غزوۂ اُحد کی روایت خلیفہ بن خیاط نے زہری اور یزید بن رومان کے حوالے سے ایک ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس کے کچھ راوی ''مجہول'' ہیں (خلیفہ، تاریخ، ۹۷)۔ طبری نے عکرمہ

کے حوالے سے ایک ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس میں حسین بن عبداللہ ہاشمی شامل ہیں اور یہ "ضعیف" ہیں (طبری، تفسیر، ۷:۳۹۹)۔ یہ روایت اپنی کمزوریوں کے باوجود اپنے مضمون میں درست اور قوی ہے۔

۲۔ ابن ہشام، سیرۃ،۳:۱۔ ابن اسحٰق کے شیوخ ایسے راویوں کو شامل کرتے ہیں جو "ثقہ" ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان راویوں کو بھی جگہ دیتے ہیں جو "ضعیف" ہیں۔ انہوں نے ان تمام کی روایات کو کسی امتیاز کے بغیر جمع کر دیا ہے۔ کچھ راوی ایسے ہیں جو کم تر درجے کے تابعی ہیں اور ان کی "مرسل" اور "ضعیف" دونوں قسم کی روایات ہیں، لیکن اس قسم کی روایات کو عام طور پر قبول کر لیا جاتا ہے۔

۳۔ واقدی، محمد ابن عمر، مغازی، ۱:۲۰۰

۴۔ ابن ہشام، سیرۃ،۳:۶، (بلاسند)؛ واقدی، مغازی، ۱۵۸۔ واقدی "ضعیف" ہیں۔

۵۔ ابن ہشام، سیرۃ ،۳: ۸-۱۲، ابن اسحٰق کی ایک روایت سے بغیر سند کے۔ طبری، تاریخ ۳:۵۰۴، واقدی کی ایک روایت سے۔ اس مسئلے کے متعلق کوئی "صحیح" روایت موجود نہیں ہے۔ یہ روایات اخباریوں کی ہیں جنہیں اس قسم کی تفصیلات سے دلچسپی ہوتی ہے۔

۶۔ طبری، تاریخ،۳:۵۰۴، واقدی کی ایک روایت سے۔

۷۔ ابن اسحٰق، (بلاسند)؛ ابن ہشام، سیرۃ،۳:۴؛ واقدی، مغازی، ۱:۱۰۱

۸۔ امام بخاری کی روایت ہے (فتح الباری، ۷:۲۷۴)۔

۹۔ امام احمد کی روایت ہے (الفتح الربانی ،۲۱:۵۰۔ ساعاتی کا کہنا ہے کہ اس کی سند "صحیح" ہے)۔ مزید ملاحظہ کیجیے: الفتح الربانی میں دیگر روایات، ۲۱:۵؛ ابن سعد، طبقات الکبری، ۲:۴۵۔ دونوں روایات ایک ایسی سند کے ساتھ ہیں جس میں "ثقہ" افراد شامل ہیں اور ابوزبیر کا "عنعنہ" بھی شامل ہے جو "مدلس" ہے۔

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ عبدالرزاق صنعانی، المصنف، ۵:۳۶۳

۱۲۔ طبری، تفسیر، ۷:۳۷۲، ایک "حسن" سند کے ساتھ روایت کا سلسلہ قتادہ سے ملتا ہے اور "مرسل" ہے۔ امام احمد نے سلسلۂ سند کو جابر سے ابوزبیر کے واسطے سے مکمل کیا ہے، لیکن اس میں ابوزبیر کا "عنعنہ" شامل ہے جو "مدلس" ہیں۔ بیہقی کی روایت کو ابن عباس کی ایک "حسن" سند کے ذریعے سے تقویت ملتی ہے۔ جب تمام سلسلے آکر ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں تو وہ حدیث "صحیح" ہو جاتی ہے۔ فقہ السیرۃ میں البانی کی بھی یہی رائے ہے۔

۱۳- خلیفہ بن خیاط، تاریخ، ص ٦٧، ایک مرسل ''حسن'' سند کے ساتھ جو پیچھے جا کر سعید بن میتب سے جا ملتی ہے اور سعید بن میتب کی مرسل احادیث قوی ہیں۔

۱۴- واقدی، مغازی، ۱:۳۳، مزید دیکھیے: ابن عبدالبر، الاستیعاب، ۳:۴۵۰۔ جھنڈوں کے بارے میں کوئی ''صحیح'' روایت موجود نہیں ہے۔

۱۵- طبری، تاریخ، ۳:۵۰۴؛ ابن سعد، طبقات، ۳:۴۴

۱۶- حاکم، المستدرک، ۳:۲۵۔ ذہبی ان سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ بیان ''صحیح'' ہے۔

۱۷- یہ علاقہ آج کل ملعب التعلیم کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں وہاں شہ سواری کے مقابلے منعقد کیے جاتے تھے (عیاشی، المدینة بین الماضی والحاضر، ص ۳۹٦؛ بلادی، معجم المعالم الجغرافية فی السيرة النبوية، ص ۱۷۰)۔

۱۸- ابن اسحٰق (سیرۃ ابن ھشام، ۳:۸-۱۲، بغیر سند کے)

۱۹- بخاری، صحیح، (فتح الباری، ٦:۱٦۲)

۲۰- ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۹

۲۱- صحیح بخاری؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۵۷، ۸:۳۲۵؛ مسلم، صحیح، ۲:۴۰۲؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳:٦۷

۲۲- ابن اسحٰق، سیرۃ ابن ھشام، ۳:۱۱؛ واقدی، مغازی، ۱:۱۰۹؛ ابن حزم، جوامع السیرۃ، ص ۱۵۹۔ اس مسئلے کے متعلق کوئی ''صحیح'' روایات نہیں ملتیں۔ اس میں بہت بڑا فرق ہے کہ کسی روایت کو حدیث کے نقطۂ نظر سے ''صحیح'' قرار دیا جائے، یا اسے مسترد کیا جائے۔

۲۳- عیون الأثر، ۲:۷

۲۴- بخاری نے بیان کیا۔ ابن حجر، فتح الباری، ۵:۲۷٦؛ مسلم، صحیح، ۲:۱۴۲

۲۵- بخاری، صحیح، (فتح الباری، ٦:۱٦۲)

۲٦- طبری، ایسی سند کے ساتھ جو ''صحیح'' ہے، لیکن سدی کی ''مرسل'' احادیث میں سے ایک ہے (تفسیر، ۷:۲۸۱)۔

۲۷- ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۱۳؛ واقدی، مغازی، ۱:۲۲۳۔ عاصم بن عمر بن قتادہ کی ایک روایت سے جنہوں نے سند شامل نہیں کی۔

۲۸- مسلم، صحیح، ۲:۳۸۴

۲۹- بخاری نے وحشی ہی کی ایک حدیث سے روایت کیا (ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۷۵)۔

۳۰- بخاری کی روایت سے۔ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۷۵۔ اذخر ایک قسم کی گھاس ہے جو اپنی خوشگوار خوشبو کے لیے مشہور ہے، جو خشک ہونے پر سفید ہو جاتی ہے (المصباح، ۱:۲۴۵)۔

۳۱- خلیفہ، تاریخ، ص ۶۷، سعید بن میتب کی ''مراسیل'' میں سے ایک ہے۔ سعید بن میتب کی ''مراسیل'' قوی ہیں۔

۳۲- بخاری کی ایک روایت سے (ابن حجر، فتح الباری، ۶:۱۶۲)۔

۳۳- ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۴:۲۸

۳۴- حاکم، المستدرک، ۳:۲۰۲۔ اگرچہ مسلم نے اسے روایت نہیں کیا، لیکن اس کی شرائط کے مطابق یہ ایک ''صحیح'' حدیث ہے۔ ذہبی نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ احمد، مسند، ۴:۲۶۰۹ (اشاعت مرتبہ محمد احمد شاکر)۔

۳۵- ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۶۱، بخاری کی ایک روایت سے۔

۳۶- چند مسلمانوں کے میدان جنگ کے کنارے پر بیٹھنے کے متعلق دیکھیے: ابن ہشام، سیرة، ۳:۳۳؛ طبری، تفسیر، ۷:۲۵۶

۳۷- عبداللہ بن مبارک کتاب الجهاد، ص ۶۳؛ بخاری، (ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۷۴، ۸:۵۱۷)۔ یہ جاننے کے لیے کہ یہ آیت حضرت مصعبؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، دیکھیے: حاکم، مستدرک، ۳:۲۰۰۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اپنی سند میں ''صحیح'' ہے، اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے روایت نہیں کیا۔ ذہبی نے بھی حاکم کی اس بات سے اتفاق کیا ہے۔

۳۸- ابن اسحٰق کی ایک روایت سے جس کی سند میں ''ثقہ'' افراد شامل ہیں (مجمع البحرين ۲:۲۳۹؛ شرح المواهب، ۲:۴۴)۔

۳۹- ابن جوزی، زاد المصير في علم التفسير، ۱:۴۸۳

۴۰- حاکم، مستدرک، ۳:۲۰۱۔ وہ کہتے ہیں: ''یہ ایک ایسی حدیث ہے جو اپنی سند کے اعتبار سے ''صحیح'' ہے، اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے روایت نہیں کیا''۔ ذہبی نے حاکم سے اتفاق کیا ہے۔

۴۱- طبری، تفسیر، ۷:۳۰۱-۳۰۲

۴۲- صحيح مسلم بشرح النووی، ۱۲:۱۴۶

۴۳- بخاری کی ایک روایت سے

۴۴- ایضاً، ۷:۳۵۸

۴۵- ایضاً، ۷:۳۶۱

۴۶- احمد نے جس سند کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے افراد 'ثقہ' ہیں (الفتح الربانی، ۵۸۹:۲۲)۔

۴۷- صحیح مسلم، ۱۴۹:۲؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۲۹:۳؛ بخاری؛ ابن حجر، فتح الباری، ۳۶۵:۷

۴۸- مسلم، صحیح، ۱۴۹:۲

۴۹- ابن اسحٰق نے عاصم بن عمر بن قتادہ کی ''مرسل'' حدیث سے نقل کیا ہے۔ یہ بیان کسی ''صحیح'' سند سے ثابت نہیں ہے، لیکن سیرت کی کتب میں بغیر سند کے یا ''مرسل'' اسناد کے ساتھ ہی معروف ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۳۳:۳؛ واقدی، مغازی، ۲۴۲:۱؛ البدایۃ والنہایۃ، ۲۳:۳)۔

۵۰- صحیح بخاری: (فتح الباری، ۳۵۴:۷)؛ مسلم، صحیح، ۱۵۴:۲۔ یہ غیر معروف شخص عمیر بن حمام کے علاوہ کوئی اور تھا، عمیر بدر میں شہید ہو چکے تھے۔

۵۱- حاکم، المستدرک، ۱۹۹:۳، سعید بن مسیّب کی مراسیل سے۔ حاکم کا کہنا ہے کہ ''یہ حدیث شیخین (بخاری اور مسلم) کی شرائط کے مطابق 'صحیح' ہے، اگرچہ یہ 'مرسل' ہے''۔ ذہبی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث ''مرسل صحیح'' ہے۔ میری رائے میں سعید بن مسیّب کی روایت کی ہوئی ''مرسل'' احادیث قوی ہیں۔

۵۲- ابن مبارک، کتاب الجہاد، ۶۹۔ عکرمہ اور ابن اسحٰق کی ''مرسل'' حدیث سے، ان کے والد سے، اور بنوسلمہ کے دو شیوخ سے (ابن ہشام، سیرۃ، ۴۴:۳)۔ جملہ بیانات کی اسناد مختلف ہیں اور یہ ایک دوسرے کو قوی کر دیتی ہیں۔

۵۳- حاکم، المستدرک، ۲۰۴:۳۔ وہ کہتے ہیں ''مسلم کی شرائط کے مطابق یہ 'صحیح' ہے''۔ ذہبی نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ البانی کہتے ہیں ''حدیث صرف 'حسن' ہے''۔ جب مسلم نے اسے ابن اسحٰق سے روایت کیا تو اسے صرف تابعات میں شامل کیا۔ ابن عساکر کے پاس بھی ایک اسی قسم کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں ''یہ ایک 'حسن صحیح' روایت ہے'' (الاحادیث الصحیحۃ ۳۶:۴، حدیث ۳۲۶)۔

۵۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۱۴۸:۲، ۱۵۲۔ ایسی کوئی ''صحیح'' حدیث نہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ مخیرّق نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن ابن اسحٰق اور واقدی نے بغیر سند کے اس کے قبولِ اسلام کا ذکر کیا ہے اور اس کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ ابن حجر نے ان کی سوانح کا ذکر صحابہؓ کے ذیل میں کیا ہے (الاصابۃ، ۵۷:۶)۔ مخیرّق کی اس دولت و ثروت کے لیے دیکھیے: ابن سعد، طبقات، ۵۰۱:۱؛ ترکۃ النبی، ص ۷۸)

۵۵- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۰؛ حاکم، المستدرک، ۲: ۲۰۲۔ وہ کہتے ہیں: ''مسلم کی شرائط کے مطابق یہ ایک 'صحیح' حدیث ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا''۔ ذہبی حاکم کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔

۵۶- ابوداؤد، سنن، ۲: ۱۹؛ حاکم، المستدرک، ۳: ۲۸

۵۷- ابن اسحٰق نے اس شخص کا نام قزمان بتایا ہے اور واقدی نے اس سے اتفاق کیا ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴؛ واقدی، مغازی، ۱: ۲۶۳)

۵۸- ہیثمی، مقاصد العلیٰ، ۱: ۸۰ (ابویعلیٰ کی ایک روایت سے)۔ ہیثمی نے کہا: ''اس کے راوی 'صحیح' ہیں''۔

۵۹- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۳۲، ایک منقطع سند کے ساتھ۔ واقدی، مغازی، ۱: ۲۶۸۔ وہ بہت کمزور ہے۔

۶۰- ہیثمی، مجمع الزوائد، ۹: ۲۹۲۔ ہیثمی کہتے ہیں کہ ''طبرانی نے اسے بیان کیا اور اس کی سند 'حسن' ہے''۔

۶۱- ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۳۶۶

۶۲- فتح الباری، ۶: ۷۸؛ نووی، شرح صحیح مسلم، ۱۲: ۱۸۹

۶۳- بخاری نے اسے روایت کیا ہے (فتح الباری، ۷: ۳۵۸، ۱۰: ۲۸۲)؛ مسلم، صحیح، ۲: ۳۲۱

۶۴- ابن کثیر، تفسیر، ۷: ۳۲۳

۶۵- بخاری، صحیح، (فتح الباری، ۷: ۳۶۵)

۶۶- طبری، تفسیر، ۷: ۳۲۳؛ ابن کثیر، تفسیر، ۱: ۴۱۸

۶۷- بخاری کی روایت (فتح الباری، ۷: ۳۴۹)

۶۸- احمد، مسند، ۴: ۲۰۹، ۶: ۱۸۱، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ۔

۶۹- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۹؛ واقدی، مغازی، ۱: ۲۹۷

۷۰- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۴۹؛ طبری، تفسیر، ۷: ۳۱۹

۷۱- واقدی، مغازی، ۱: ۲۹۸

۷۲- ابن اسحٰق نے ان میں سے ۶۵ کے نام گنوائے ہیں اور ابن ہشام نے ان میں پانچ ناموں کا مزید اضافہ کیا ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۱۰۲)۔ دیگر شہداء جن کے ناموں کا ذکر ابن اسحٰق نے نہیں کیا، ان کے نام سیرت کی کتب میں اور صحابہ کرامؓ کی سوانحی کتب میں دستیاب ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہو سکا

کہ ابن اسحٰق کی فہرست پر جن ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے، اور کل تعداد ۷۴ بنتی ہے، وہ احد میں شہید ہوئے تھے (مغازی، ۱:۳۰۰)۔ صحیح بخاری میں مذکور انس اور براء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شہداء کی تعداد ۷۰ تھی (فتح الباری، ۷:۳۴۹،۳۷۴)۔

۷۳- ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۱۰۶۔ واقدی کہتے ہیں کہ ۲۷ افراد مارے گئے تھے (مغازی، ۱:۳۰۷)، اور ابن سعد کا کہنا ہے کہ مرنے والوں کی تعداد ۲۳ تھی (طبقات، ۲:۴۲)۔

۷۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۶۳؛ ابن کثیر، سیرۃ، ۳:۱۰۴۔ اس روایت کے بارے میں کوئی ''صحیح'' حدیث نہیں ہے۔

۷۵- بخاری (فتح الباری، ۳:۲۰۹، ۷:۳۷۴) دیکھیے: ایک اور صحابی سے ابوداؤد کی روایت جس کے تمام افراد ''ثقہ'' ہیں (سنن ۲:۱۷۴)۔

۷۶- ابن اسحٰق، سیرۃ ابن ھشام، ۳:۵۳؛ احمد مسند، ۶:۱۹۱؛ ابوداؤد، سنن، ۳:۱۹۶؛ المراسیل، ص ۴۶

۷۷- ترمذی، سنن، (تحفۃ الأحوذی، ۵:۱۷۱)۔ وہ کہتے ہیں ''یہ ایک حسن صحیح حدیث ہے''؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۵۴-۵۵

۷۸- ابوداؤد، سنن، ۳:۲۰۲؛ ترمذی (تحفۃ الأحوذی، ۵:۲۷۹)۔ ترمذی کہتے ہیں: ''یہ ایک حسن صحیح ہے''۔ احمد، مسند، ایک صحیح سند کے ساتھ (الفتح الربانی، ۸:۱۴۹)۔

۷۹- حاکم، المستدرک، ۳:۲۳

۸۰- احمد، مسند، (الفتح الربانی، ۲۱:۵۸۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ)

۸۱- حاکم، المستدرک، ۳:۲۴۔ وہ کہتے ہیں: ''بخاری کی شرائط کے مطابق یہ ایک 'صحیح' حدیث ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا''۔ ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶:۱۲۳۔ وہ کہتے ہیں: ''طبرانی نے اسے بیان کیا اور اس کے افراد صحیح ہیں''۔

۸۲- ابن اسحٰق اپنے والد کی سند کے ساتھ، بنوسلمہ کے مجہول شیوخ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ، سنن، ۱:۵۰۷۔ اس کی سند میں عبداللہ بن عمر العمری شامل ہیں جنہیں کمزور سمجھا جاتا ہے۔

۸۳- ابن اسحٰق، (سیرۃ ابن ھشام، ۳:۵۷۱)، ایک ایسی سند کے ساتھ جس میں عبدالواحد بن ابی عون مدنی شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں، لیکن غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

۸۴- مسلم، صحیح، ۳:۳۸۵

۸۵- احمد، مسند، ۷:۹۸۔ ابن کثیر کہتے ہیں: ''مسلم کی شرائط کے مطابق ہے''۔ احمد شاکر کہتے ہیں:

''اس کی سند صحیح ہے''۔ حاکم، (المستدرک، ۱:۳۸۱) کہتے ہیں کہ ''مسلم کی شرائط کے مطابق یہ صحیح ہے''۔ ذہبی نے ان کی اس بات سے اتفاق کیا ہے؛ ابن سعد، طبقات، ۳:۱۶

۸۶- احمد، مسند، ۴:۱۲۳؛ ابو داؤد، سنن، ص ۳۱۵؛ حاکم، المستدرک، ۳:۸۸۔ وہ کہتے ہیں: ''مسلم کی شرائط کے مطابق یہ صحیح ہے''۔ ذہبی نے حاکم سے اتفاق کیا ہے۔

۸۷- شوکانی، فتح القدیر، ۱:۳۹۹

۸۸- مکے کی طرف جانے والی شاہراہ پر یہ مدینے سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۱۰۲؛ معجم ما استعجم للبکری، ۲:۴۶۸؛ معجم البلدان، ۲:۳۰۱)۔ بلادی کہتے ہیں: ''یہ مدینے کے جنوب میں ۲۰ کلومیٹر پر واقع ہے'' (معجم المعالم الجغرافیہ، ص ۱۰۵)

۸۹- بخاری کی ایک روایت سے (فتح الباری، ۷:۳۷۳)۔

۹۰- ابن سعد، طبقات، ۲:۵۰؛ ابن قیم، زاد المعاد، ۲:۱۲۱

۹۱- ابن سعد، طبقات، ۲:۵۰

۹۲- احمد، مسند، ۳:۴۹۶۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ اور ابن اسحٰق نے سند میں صاف طور پر سماع کا ذکر کیا ہے۔ ابو داؤد، سنن، ۱:۲۸۷۔ ابن حجر کہتے ہیں: ''اس کی سند حسن ہے'' (الفتح الربانی، ۲:۴۳۷)۔

۹۳- ابن حزم کہتے ہیں: ''ماہ صفر کے نصف میں'' (جوامع السیرۃ، ص ۱۷۶)۔

۹۴- بخاری، صحیح، ۵:۴۰

۹۵- بخاری، صحیح، ۵:۴۰-۴۱ (مطبوعہ استنبول)؛ احمد، مسند، ۲:۳۱۰-۳۱۱؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۱۶۵-۱۶۷، عاصم بن عمرو بن قتادہ کی ایک ''مرسل'' روایت سے۔

۹۶- ابن اسحٰق نے اپنے استاد عاصم بن عمرو بن قتادہ کی ایک ''مرسل'' حدیث سے بیان کیا ہے۔ ابن اسحٰق کا واضح بیان ہے کہ انہوں نے اسے اپنے استاد سے سنا ہے (سماع)، لیکن یہ حدیث پھر بھی ''مرسل'' ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۱۶۰)۔

۹۷- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲:۵۰

۹۸- ابن حزم نے بئر معونہ کی جو تاریخ بیان کی ہے، وہ ماہ صفر کے اختتام سے ۲۰ روز قبل کی ہے (جوامع السیرۃ، ۱۸۰)۔ انہوں نے اس کی تاریخ واقعۂ رجیع سے پہلے کی بیان کی ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ رجیع کا واقعہ صفر کے وسط میں پیش آیا۔ اگرچہ انہوں نے ابن اسحٰق کا اتباع کرتے ہوئے واقعۂ

رجیع کو بئر معونہ کے واقعے سے قبل جگہ دی ہے۔

۹۹۔ ابن اسحٰق نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم اور مغیرہ بن عبدالرحمٰن مخزومی کی ''مرسل'' روایت سے لیا ہے، یہ دونوں اصحاب ''ثقہ'' ہیں (خلیفہ بن خیاط، تاریخ، ص ۷۶؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۴:۱۷۴)۔ موسیٰ بن عقبہ نے اسے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کعب بن مالک کی ایک ''مرسل'' روایت سے بیان کیا اور طبری نے اسے کعب بن مالک کی ایک حدیث سے بیان کیا ہے (تاریخ الامم والملوک، ۲:۳۰-۳۱)۔

۱۰۰۔ یاقوت، معجم البلدان، ۵:۱۵۹، لیکن انہوں نے اس فاصلہ کا اندازہ چار مراحل میں لگایا ہے اور ہر مرحلہ ۴۰ کلومیٹر ہے۔

۱۰۱۔ بخاری، صحیح، ۵:۴۱-۴۴۔ یہ احادیث کی وہ تعداد ہے جو حضرت انسؓ بن مالک سے ہیں۔ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۸۶-۳۸۷

۱۰۲۔ خلیفہ بن خیاط، تاریخ، ص ۷۷۔ علی بن محمد مدائنی کی ایک روایت ہے۔

۱۰۳۔ ابن ہشام، سیرۃ، ۳:۳۲۱؛ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۴:۸۱

۱۰۴۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲:۵۹؛ ابن قیم، زاد المعاد، ۲:۱۲۰؛ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۴:۸۷

۱۰۵۔ خلیفہ بن خیاط، تاریخ، ص ۷۷-۷۸، مدائنی کی ایک روایت سے بغیر سند کے۔ یہ واقعہ ہجرت کے پانچویں سال کا ہے۔

۱۰۶۔ ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۲۱۳۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دومہ نہیں پہنچے تھے۔ ابن قیم، زاد المعاد، ۲:۱۲۵

۶

غزوۂ بنو مصطلق (المُریسیع)

بنو مصطلق خزاعہ کے یمنی (۱) ازدی قبیلے کی ایک شاخ تھے۔ یہ لوگ قدید (۲) اور عسفان (۳) کی بستیوں میں رہتے تھے جو مکے اور مدینے کو ملانے والے راستے پر واقع تھیں۔ قدید مکے سے ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر، اور عسفان ۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی، اور یہ دونوں بستیاں ایک دوسرے سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر تھیں۔ قبیلہ خزاعہ کی بستیاں مدینے سے مکے کو جانے والی شاہراہ پر مرالظہران اور ابواء کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ مرالظہران مکے سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر، اور ابواء (مستورہ سے تین کلومیٹر مشرقی جانب) (۴) مکے سے ۲۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ (۵) اس طرح بنو مصطلق کے مساکن خزاعی علاقے کے بالکل درمیان میں تھے۔ قریش اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی کشمکش میں بنو مصطلق کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ قبیلہ خزاعہ کا رویہ ہمیشہ بہت پرامن اور دوستانہ رہا، غالبًا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انصار کے ساتھ خزاعہ کا رشتۂ قرابت تھا، نیز ان کے درمیان امن کا معاہدہ قائم تھا، (۶) اگرچہ قریش کے ساتھ بھی خزاعہ کے تعلقات حلیفانہ تھے۔ [واضح رہے کہ] قریش کو شام جانے والی تجارتی شاہراہ سے دلچسپی تھی۔ خزاعہ کے علاقے میں شرک و بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ایک مشہور و معروف بت تھا جس کا نام مناۃ تھا۔ یہ بت قدید میں ایک پہاڑ کے اوپر بنا ہوا تھا، اس پہاڑ کا نام مشلل تھا۔ مزید براں یہ علاقہ مدینے کے مقابلہ میں مکے سے زیادہ نزدیک تھا۔

غالبًا یہی وہ اسباب ہیں جو قبیلہ خزاعہ میں عموماً اور بنو مصطلق میں خصوصاً اسلام کی اشاعت میں مانع ہوئے۔ تجارتی شاہراہ پر آباد ہونے کی وجہ سے انہیں جو حیثیت حاصل تھی، اس کے علاوہ انہیں اس چیز نے بھی روحانی اور مادی طور پر فائدہ پہنچایا کہ بت مناۃ الطاغیہ ان کے

علاقے میں نصب تھا اور عرب اس بت کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔

اسلام کے خلاف بنومصطلق کا پہلا جارحانہ اقدام یہ تھا کہ انہوں نے اُحد کے موقع پر قریشی فوج میں احابیش کے ساتھ شرکت کی۔(۷) غزوۂ احد کا جو نتیجہ سامنے آیا، اسے دیکھنے کے بعد بنومصطلق بھی مدینے کے گرد بسنے والے دیگر قبائل کی طرح مسلمانوں کے خلاف زیادہ نڈر اور بے باک ہوکر سامنے آ گئے۔ غالباً انہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ انہوں نے اُحد کے موقع پر جو کردار ادا کیا تھا، اب مسلمان اس کا انتقام لیں گے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ تجارتی شاہراہ قریش کے لیے بلا خوف وخطر کھلی رہے، کیوں کہ اس میں ان کا اپنا مفاد بھی پنہاں تھا۔ اس پس منظر میں ان لوگوں نے حارث بن ابی ضرار کی سرکردگی میں مسلمانوں کے خلاف ایک مہم کی تیاری شروع کر دی، اس مقصد کے لیے افراد اور ہتھیار جمع کرنے لگے اور قرب و جوار کے قبائل کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔

رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپؐ نے حضرت بریدہؓ بن حسیب اسلمی کو تمام حالات دریافت کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ انہوں نے وہاں جا کر یہ تأثر دیا کہ وہ ان کی مدد کرنے آئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے یہ پتا لگا لیا کہ بنومصطلق مدینے پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضرت بریدہؓ واپس آئے اور رسول اللہ ﷺ کو اس سازش سے مطلع کیا۔(۸)

پیر، ۲ شعبان ۵ھ کو رسول اللہ ﷺ فوج لے کر مدینے سے روانہ ہوئے اور بنومصطلق کے علاقے کا رخ کیا۔ یہ سب سے زیادہ قابل یقین بیان ہے، یہ موسیٰ بن عقبہ کی ''صحیح'' روایت ہے، جسے انہوں نے زہری اور عروہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔(۹) ابومعشر سندھی، واقدی اور ابن سعد (۱۰) نے موسیٰ بن عقبہ کی پیروی کی ہے، اور ابن قیم اور ذہبی نے بھی، لیکن (۱۱) ابن اسحٰق کا خیال ہے کہ یہ واقعہ شعبان ۶ھ میں پیش آیا۔ ان کا یہ بیان بخاری اور مسلم کی ان روایات سے میل نہیں کھاتا جن کے مطابق حضرت سعدؓ بن معاذ نے بنومصطلق کی مہم میں حصہ لیا تھا، جب کہ حضرت سعدؓ بن معاذ بنوقریظہ کے خلاف مہم میں شہید ہوئے تھے اور یہ مہم خندق کے فوراً بعد پیش آئی تھی، (۱۲) اس لیے غزوۂ بنومصطلق غزوۂ خندق سے پہلے ہی پیش آیا تھا۔

اس بارے میں کوئی ''صحیح'' روایات موجود نہیں کہ مدینے سے بنومصطلق کی جانب جو فوج روانہ ہوئی، اس کی صحیح تعداد کتنی تھی، لیکن ذہبی کا کہنا ہے کہ اس میں سات سو مجاہدین شامل تھے۔(۱۳) واقدی کا بیان ہے کہ اس فوج میں ۳۰ گھڑسوار شامل تھے جن میں ۱۰ مہاجر اور ۲۰ انصار تھے۔(۱۴)

بنومصطلق کے علاقے میں قدید کے مقام پر مُریسیع نامی پانی کے چشمے پر جو واقعہ پیش آیا، اس کے متعلق دو اہم روایات پائی جاتی ہیں۔ بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے، جو اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو مصطلق پر اچانک حملہ کیا تھا اور انہیں بے خبری کے عالم میں اس وقت جا لیا تھا، جب وہ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے مردوں کو قتل کر دیا اور ان کی عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ ان جنگی قیدیوں میں سے جس قیدی خاتون کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے حصے میں لیا، وہ حضرت جویریہؓ تھیں۔(۱۵) صحیح مسلم کے الفاظ اس طرح ہیں: ''میں نے نافع کو خط لکھا اور ان سے یہ دریافت کیا کہ جنگ کا آغاز کرنے سے پہلے دشمن کو دعوتِ اسلام دینے کی بابت مجھے کچھ بتائیں۔ انہوں نے مجھے جواباً لکھا کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں رسول اللہ ﷺ کی یہی سنت رہی تھی، لیکن آپؐ نے بنومصطلق پر اچانک حملہ کیا تھا اور انہیں بے خبری میں جا پکڑا تھا۔۔۔''(۱۶)

مسلم کی روایت سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ بنومصطلق پر بلا کسی تنبیہ کے حملہ کیا گیا،(۱۷) کیوں کہ رسول اللہ ﷺ انہیں پہلے ہی دعوتِ اسلام دے چکے تھے۔ انہیں اسی وقت سے مسلمانوں کے خلاف حالتِ جنگ میں سمجھا جا رہا تھا، جب انہوں نے قریش کے ساتھ مل کر جنگِ اُحد میں حصہ لیا تھا اور اب وہ مسلمانوں پر جنگ مسلط کرنے کے لیے اپنی فوجوں کو حرکت میں لا رہے تھے۔ اس اچانک حملے سے وہ خوفزدہ ہو گئے اور زیادہ دیر تک مدافعت نہ کر سکے۔ بخاری اور مسلم کی روایات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے مدافعت کی، لیکن ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ مریسیع نامی چشمے پر معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی جس کے بعد

بنو مصطلق میں بھگدڑ مچ گئی اور انہیں شکست فاش ہوئی، ان کے مردوں کی ایک تعداد ماری گئی اور مسلمانوں نے ان کی عورتوں، بچوں اور مال پر قبضہ کر کے آپس میں تقسیم کر لیا۔(۱۸)

اس بارے میں کوئی ''صحیح'' روایات موجود نہیں کہ ان کے مقتولین اور قیدیوں کی کل تعداد کتنی تھی اور ان کی دولت جو مسلمانوں کے قبضے میں آئی، اس کی کیا مقدار تھی، البتہ ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ بنو مصطلق کے سو خاندانوں کو آزاد کیا گیا تھا۔(۱۹) واقدی نے لکھا ہے کہ بنو مصطلق کے دس افراد کو قتل کیا گیا تھا اور باقی لوگوں کو قید کر لیا گیا تھا اور یہ کہ ''ان میں سے کسی ایک کے بھی فرار ہونے کی نوبت نہیں آئی''۔(۲۰) انہوں نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ جو مالِ غنیمت لگا، وہ ایک ہزار اونٹوں اور پانچ ہزار بھیڑوں پر مشتمل تھا، اور دو سو خاندانوں کو قیدی بنایا گیا تھا۔(۲۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ قیدیوں کی تعداد سات سو سے زیادہ تھی۔(۲۲)

رسول اللہ ﷺ تقریباً ایک ماہ مدینے سے باہر رہنے کے بعد رمضان المبارک کے اوائل میں مدینے واپس تشریف لائے۔(۲۳)

مُریسیع کے مقام پر منافقوں نے مسلمانوں کے درمیان کھڑے ہو کر کھلم کھلا اپنی اس نفرت کا اظہار کیا جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رکھتے تھے۔ بنو مصطلق کے مقابلے میں جب مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی تو منافقوں کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ اس دن کی تمنا کرنے لگے جب مسلمانوں کو شکست ہو اور ان کے غصے کی آگ ٹھنڈی پڑے۔ مُریسیع میں مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابی کے بعد منافقوں نے مہاجرین اور انصار کے درمیان قبائلی عصبیت کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی، لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کے بعد انہوں نے ایک اور چال چلی اور رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اہل خانہ کو تکلیف پہنچانے کی خاطر ایک بہتان گھڑا جو واقعۂ افک کے نام سے مشہور ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت زیدؓ بن ارقم منافقوں کی اس پہلی سازش کے چشم دید گواہ ہیں اور اس واقعے میں ان کا اپنا کردار اہم رہا ہے۔ اس بارے میں ان کی روایت یہ

ہے:

میں ایک غزوے میں شریک تھا۔(۲۴) میں نے عبداللہ بن ابی کو یہ کہتے سنا: ''ان لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول خدا کے ساتھ ہیں تاکہ وہ انہیں چھوڑ کر تتر بتر ہو جائیں اور جب ہم مدینے لوٹیں گے تو جو ہم میں معزز ترین ہوگا، وہ ان کے ذلیل ترین کو نکال باہر کرے گا''۔ میں نے یہ بات سن کر اپنے چچا، یا حضرت عمرؓ سے (۲۵) نقل کر دی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اس بات سے مطلع کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فوراً مجھے طلب فرمایا اور میں نے آپؐ کے سامنے پورا واقعہ نقل کر دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلایا اور ان سے اس بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ انہوں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی۔ اب رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات پر یقین کر لیا اور میری بات پر یقین نہیں کیا۔ اس پر میں اتنا افسردہ اور پریشان ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں گھر میں بند ہو کر رہ گیا اور میرے چچا نے بھی مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم چاہتے تھے کہ اللہ کے رسول تمہاری بات کو جھوٹ سمجھ کر تمہیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں'' آخر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے وہ سورۃ نازل فرمائی جس کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے: ''جب منافق تمہارے پاس آئیں'' (۲۶) (المنافقون ۶۳:۱)۔ رسول اللہ ﷺ نے فوراً مجھے بلا بھیجا، یہ سورۃ تلاوت فرمائی اور فرمایا: ''زید! اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیان کی تصدیق کر دی ہے''۔ (۲۷)

اس واقعے کے ایک اور چشم دید گواہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ ہیں۔ انہوں نے بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے جو مُریسیع کے چشمے پر پیش آیا تھا اور جس کے ذریعے منافقوں نے تعصب کو ہوا دے کر مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کہتے ہیں: ''ہم ایک مہم پر تھے کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو دھکا دیا۔ انصاری نے دہائی دی 'اے انصار! آؤ اور میری مدد کرو'۔ یہ سن کر مہاجر نے بھی آواز لگائی 'مہاجرو! میری مدد کرو'۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ

آوازیں سنیں تو فرمایا: 'تم اس چیز کو کیوں ہوا دے رہے ہو جس کا تعلق جاہلیت سے ہے'۔ لوگوں نے آپؐ کو حقیقت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا: 'یا رسول اللہ! ایک مہاجر نے ایک انصاری کو دھکا دیا ہے'۔ عبداللہ بن ابی کو جب اس واقعے کی خبر ہوئی تو بولا: 'اچھا! یہ لوگ اب اتنا آگے بڑھ گئے ہیں! خدا کی قسم! جب ہم مدینے لوٹیں گے تو ہم میں جو سب سے معزز ہے، وہ اسے نکال باہر کرے گا جو ان میں سب سے زیادہ ذلیل ہے'۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ الفاظ سنے اور حضرت عمرؓ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور عرض کیا: 'مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں'، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں منع کیا اور فرمایا: 'میں نہیں چاہتا کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کروا رہے ہیں''۔ جب مہاجر پہلے پہل مدینے آئے تو انصار کی تعداد ان سے زیادہ تھی، لیکن بعد میں مہاجرین کی تعداد بڑھ گئی۔ (۲۸)

کچھ مضبوط روایات ایسی ہیں (۲۹) جو مندرجہ بالا روایت سے متضاد ہیں۔ ان روایات کے مطابق عبداللہ بن ابی نے غزوۂ تبوک کے دوران میں یہ بات کہی تھی، لیکن یہ ایک غلط خیال ہے۔ ''صحیح'' روایت یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی نے تبوک کی مہم میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ (۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے یہ حقیقت پوری طرح واضح فرما دی کہ عصبیت کا تعلق جاہلیت سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، اگر وہ ظالم ہے تو اسے ظلم کرنے سے روکو اور اگر وہ مظلوم ہے تو اسے ظلم سے بچاؤ''۔ (۳۱) رسول اللہ ﷺ نے حق اور انصاف کے حصول کے لیے باہمی تعاون کو ایک شرط قرار دیا اور اس کلمے کے جاہلی مفہوم کو کالعدم قرار دیا کہ ''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم''۔

رسول اللہ ﷺ شدت سے اس بات کے خواہاں تھے کہ دیگر قبائل میں مسلمانوں کی نیک نامی داغدار نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی کو سزا دینے سے گریز کیا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ تمام قبائل اسلام کے قریب آئیں اور اس قسم کی تمام افواہوں کا سدباب کیا جائے جو انہیں اسلام سے دور کر سکتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس

صورتِ حال سے نمٹنے کی خاطر صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا کہ اپنے اصحاب سے اس سلسلے میں گفت وشنید فرمائیں، بلکہ ایک عملی اقدام یہ فرمایا کہ آپؐ اپنے لوگوں کے ساتھ دن بھر سفر کرتے رہے، حتیٰ کہ رات چھا گئی اور پھر پوری رات سفر کرتے ہوئے صبح کر دی۔ صبح کو پھر بلا توقف سفر شروع کیا۔ جب سورج کی تمازت نے لوگوں کو بالکل تھکا دیا تو آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ زمین پر سر رکھتے ہی سو گئے۔ ایسا کرنے سے آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے ذہن عبداللہ بن ابی کی ان باتوں کی طرف مبذول نہ ہوں جو اس نے مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کے لیے کی تھیں۔

اس واقعے کے بعد عبداللہ بن ابی کا مقام اس کے ہوا خواہوں کی نظروں میں بھی گر گیا اور انہوں نے اسے اس کی غلطیوں پر ملامت کرنا شروع کر دی۔ (۳۲) اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے حضور ﷺ سے اپنے باپ کو قتل کرنے کی اجازت مانگی، لیکن آپؐ نے یہ کہہ کر منع فرما دیا کہ "نہیں! تم اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور جب اس کے ساتھ بیٹھو تو حسنِ سلوک کا معاملہ کرو"۔ (۳۳) جب لوگ مدینے پہنچے تو حضرت عبداللہؓ نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا اور کہا کہ جب تک رسول اللہ ﷺ اجازت نہیں دیں گے، تم شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے عبداللہ بن ابی مدینے میں داخل ہوا۔ (۳۴) اگرچہ حضرت عبداللہؓ اپنے باپ کے ساتھ نہایت عزت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتے تھے، لیکن اس حسنِ سلوک کے باوجود انہوں نے عبداللہ بن ابی کو مدینے میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ (۳۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ایمان میں بے حد مخلص اور ہر قسم کے جاہلی تعصب سے پاک تھے، حالانکہ ان کی نسل کے لوگوں میں اس قسم کے اثرات بہت نمایاں تھے۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں پر کتنے گہرے اثرات چھوڑے تھے اور ان کے اندر کتنی واضح تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں کہ ان کے معیارات اور پیمانے یکسر بدل گئے تھے۔

جب منافقوں کی یہ کوشش، جو انہوں نے مسلمانوں کے درمیان تعصب پیدا کرنے

کے لیے کی تھی، ناکام ہوگئی تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئے۔ اب انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اہل خانہ کو تکالیف دینے کے لیے ایک اور موقع تلاش کرلیا۔ [اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ] جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ بنو مصطلق کے لیے روانہ ہوئے تو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ آپؐ کے ہمراہ تھیں۔ اس وقت خواتین کے لیے پردے کے احکام نازل ہو چکے تھے، غزوے سے واپسی پر جب مسلمان مدینہ شہر کے نزدیک پہنچ چکے تھے حضرت عائشہؓ اپنے اونٹ سے اتریں اور رفعِ حاجت کی غرض سے جنگل میں تشریف لے گئیں۔ جس وقت اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس آئیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا ہار جنگل میں کہیں گر گیا ہے، وہ ہار کی تلاش میں واپس جنگل کی طرف چلی گئیں۔ اسی اثناء میں قافلے کی روانگی کا وقت آ گیا اور لوگوں نے ان کے ہودج کو اٹھا کر اونٹ کے اوپر رکھ دیا۔ کسی نے یہ خیال نہیں کیا کہ حضرت عائشہؓ اپنے ہودج میں موجود نہیں ہیں، کیوں کہ وہ ہلکی پھلکی سی تھیں۔ قافلہ مدینے کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ جب حضرت عائشہؓ اپنا ہار لے کر واپس آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ قافلہ جا چکا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے اسی جگہ انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اسی دوران میں حضور ﷺ کے ایک نہایت قریبی صحابی حضرت صفوانؓ بن معطل وہاں سے گزرے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو اونٹ پر سوار کرایا اور مدینے لے آئے۔ جس وقت وہ حضرت عائشہؓ کو لے کر مدینے پہنچے تو رسول اللہ ﷺ بھی مدینے پہنچ چکے تھے۔ منافقوں نے اس واقعے کے متعلق بے شمار جھوٹ گھڑ لیے۔ ان کے سردار عبداللہ ابن ابی نے حضرت مسطحؓ بن اثاثہ، حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت حمنہؓ بنت جحش کو اس بات پر ابھارا کہ وہ ان جھوٹے الزامات کی تشہیر کریں۔ اس طرح ام المؤمنین (مسلمانوں کی ماں) حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشی کی گئی اور جھوٹے الزامات لگائے گئے۔

منافقوں کے ان بے بنیاد الزامات کی بناء پر رسول اللہ ﷺ بے حد پریشانی محسوس کر رہے تھے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور وہاں یہ اعلان فرمایا کہ آپ کو اپنی بیوی حضرت عائشہؓ اور اپنے صحابی حضرت صفوانؓ بن معطل پر پورا اعتماد ہے۔ حضرت سعدؓ بن معاذ کھڑے ہوئے اور یہ اعلان کیا کہ ان کے قبیلے اوس کا جو شخص بھی یہ غلط افواہ پھیلائے گا، وہ

اسے قتل کر دیں گے۔ یہ سن کر حضرت سعدؓ بن عبادہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے بارے میں کچھ تنقیدی کلمات کہے جن کی وجہ سے قریب تھا کہ اوس اور خزرج کے درمیان جھگڑا ہو جاتا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں ٹھنڈا کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔

اس دوران میں حضرت عائشہؓ بیمار پڑ گئیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے والد کے گھر جانے کی اجازت مانگی، آپؐ نے انہیں اجازت دے دی۔ والد کے گھر آ کر حضرت عائشہؓ کو معلوم ہوا کہ ان کے اوپر کتنا بڑا بہتان لگایا گیا ہے، تو ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے پوری امید تھی کہ وہ وحی کے ذریعے اپنے نبی پر ان کی بے گناہی کو ثابت کر دے گا، لیکن ایک ماہ گزر گیا اور وحی نازل نہ ہوئی۔ اس تمام عرصے میں رسول اللہ ﷺ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہے۔ منافق آپؐ کے وقار کو متزلزل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور آپؐ کی اہلیہ کو بدنام کر کے آپؐ کو سخت تکلیف پہنچا رہے تھے۔ اس وقت آپؐ شدت سے آمدِ وحی کے متمنی تھے اور اس کی انتہائی ضرورت محسوس کر رہے تھے تا کہ ایک طرف آپ کو ذہنی سکون حاصل ہو اور دوسری طرف منافقوں کا منہ بند ہو، نیز اپنی محبوب ترین بیوی اور ان کے والد کا دفاع کر سکیں جو آپؐ کو بے حد عزیز تھے۔ اس کے بعد یہ قرآنی آیات نازل ہوئیں:

جن لوگوں نے یہ طوفان برپا کیا ہے، وہ تمہارے میں سے ایک گروہ ہے۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے۔ ان میں سے ہر شخص کو جتنا کسی نے کچھ کیا تھا، گناہ ہوا اور ان میں سے جس نے اس میں سب سے بڑا حصہ لیا، اس کو سخت سزا ہوگی۔ جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا اور یوں کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔ یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔ سو جس صورت میں یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو بس اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا کرم و فضل نہ ہوتا، دنیا میں اور آخرت میں تو جس شغل میں تم پڑے تھے، اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا، جب تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در

نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے اور تم نے جب اسے سنا تھا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیب نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے بھی نکالیں۔ معاذ اللہ! یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر ایسی حرکت مت کرنا، اگر تم ایمان والے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا، بڑا حکمت والا ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں سزائے دردناک ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بڑا شفیق اور بڑا رحیم ہے (تو تم بھی اس وعید سے نہ بچتے) (النور ۲۴:۱۱-۲۰)۔

اس واقعے سے قبل حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ایک عزیز حضرت مسطاحؓ کی مالی مدد کیا کرتے تھے، اس واقعہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسم کھائی کہ اب وہ اس کی کبھی مدد نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

اور جو لوگ تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں، وہ اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں--- کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے (النور ۲۴:۲۲)۔

آیتِ بالا کے نزول کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دوبارہ حضرت مسطاحؓ کی مالی امداد کرنا شروع کر دی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے ان تین افراد نے اس بہتان کو پھیلانے میں حصہ لیا، جن کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے، لیکن اس بہتان تراشی میں کلیدی کردار منافقوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کی سربراہی میں ادا کیا۔ ان تین افراد کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان تھے اور انہیں منافقوں کے پھیلائے ہوئے جال میں نہ پھنسنا چاہیے تھا۔ قرآن

کریم کی اس آیت میں ان تین افراد پر تنقید کی گئی ہے: ''جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا اور یوں کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے'' (النور ۲۴:۱۲)۔

بہت سے مسلمان اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے کاشانہ اقدس میں کیا پیش آ رہا ہے، لیکن انہیں رسول اللہ ﷺ کے اہلِ خانہ پر کامل اعتماد تھا۔ مثال کے طور پر، جب حضرت ابوایوب انصاریؓ نے منافقوں کی پھیلائی ہوئی یہ افواہ سنی تو آپؓ نے فرمایا: ''ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے بھی نکالیں۔ معاذ اللہ! یہ تو بڑا بہتان ہے'' (النور ۲۴:۱۲)۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت مسطحؓ، حضرت حسانؓ اور حضرت حمنہؓ پر حدِ قذف جاری فرمائی۔ (۳۶) آپؐ نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو کوئی سزا نہ دی، حالانکہ اس نے جھوٹ اور بہتان کے پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا سے جرائم کی تلافی ہو جاتی ہے اور عبداللہ بن ابی ان افراد میں سے ایک تھا جن کے لیے اللہ نے آخرت میں سخت سزا تیار کر رکھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس منافقِ اعظم نے اس الزام کی تشہیر اس انداز سے کی تھی کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اس نے مسلمانوں کی موجودگی میں اس بہتان کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ (۳۷) چند کمزور روایات سے پتا چلتا ہے کہ اسے سزا دی گئی تھی۔ (۳۸)

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے نے اوس اور خزرج کے درمیان تعصب کے شعلوں کو تقریباً دوبارہ بھڑکا دیا تھا۔ دونوں قبائل کے سردار مسجدِ نبوی میں غصے سے جھگڑنے لگے اور منافقوں کا یہی مقصد تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیں اور ان کی یک جہتی کو پارہ پارہ کر دیں، سرداروں کے اوپر سے ان کا اعتماد ختم ہو جائے اور ان کے درمیان فتنے کی آگ بھڑک اٹھے، لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انہیں اس نقصان سے محفوظ رکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں سرداروں کو ٹھنڈا کر کے ان کے اتحاد کو قائم رکھا اور وہ اس مشکل امتحان

میں کامیاب ہوئے۔

حضرت عائشہؓ کو صبر و تحمل اور توکل کی جس کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا، اس کے انعام کے طور پر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے چند قرآنی آیات نازل فرمائیں جن میں حضرت عائشہؓ کی براءت ظاہر کی گئی ہے، یہ آیات آنے والے ہر دور میں مسلمانوں کی زبانوں پر جاری رہیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینے واپسی کے فوراً بعد حضرت جویریہؓ بنت حارث آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ درخواست کی کہ وہ حضرت ثابتؓ بن قیس سے آزاد ہونا چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں ان کی مدد کی جائے۔ حضرت جویریہؓ غنیمت کے طور پر حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس کے حصے میں آئی تھیں۔ انہوں نے حضرت ثابتؓ سے اپنی آزادی کا معاہدہ کیا تھا۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ انہیں اپنی قوم میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا باقی ماندہ فدیہ ادا کر کے ان سے شادی کر لی۔ جب لوگوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جویریہؓ سے شادی کر لی ہے تو سب نے اپنے قیدیوں کو یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ "اب یہ رسول اللہ ﷺ کے سسرالی رشتہ دار ہیں"۔ اس طرح ایک سو خاندان آزاد ہو گئے، اور حضرت جویریہؓ اپنی قوم کے لیے بہت بڑی رحمت بن گئیں۔ (۳۹) ان کا فدیہ ان کا مہر قرار پایا۔

بعد میں حارث بن ابی ضرار مدینے آئے اور رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیٹی حضرت جویریہؓ کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت جویریہؓ کو اختیار ہے، اگر وہ ساتھ رہنا چاہیں تو ساتھ رہیں اور اگر واپس جانا چاہیں تو واپس چلی جائیں۔ حضرت جویریہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ حضرت حارثؓ بن ابی ضرار نے اپنی قوم سمیت اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حارثؓ کو ان کی قوم کے صدقات کا مختار بنا دیا۔

حضرت جویریہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی شادی اور ان کے قبیلے کی رہائی کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا اور جہاد اور اطاعتِ خدا و رسولؐ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے مقرر

کردہ عاملِ زکوۃ کو ان لوگوں کے پاس پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، تو حضرت حارثؓ بن ابی ضرار اور ان کی قوم کو سخت پریشانی ہوئی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ کیا تا کہ اس تاخیر کی وجہ معلوم کریں۔ ہوا یوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ولیدؓ بن عقبہ کو زکوۃ وصول کرنے کے لیے روانہ کیا، لیکن راستے میں حضرت ولیدؓ پر سخت خوف طاری ہوا، واپس مدینے چلے گئے اور جا کر یہ بیان کیا کہ ان لوگوں نے نہ صرف انہیں زکوۃ ادا نہیں کی، بلکہ وہ ان کے قتل کے در پے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کی طرف ایک مہم روانہ فرما دی، حضرت حارثؓ فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور قسم کھا کر عرض کیا کہ ان کی تو حضرت ولیدؓ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: ''اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر تمہیں پچھتانا پڑے'' (الحجرات ۴۹:۶)۔

ابن کثیر کا کہنا ہے کہ اس آیت کے سببِ نزول کے بارے میں یہ روایت سب سے زیادہ مستحکم ہے۔ (۴۰) حضرت ولیدؓ بن عقبہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا اور یہ واقعہ ان کے قبولِ اسلام کے بعد کا ہے۔ (۴۱) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو مصطلق کے دلوں میں اسلام جڑ پکڑ چکا تھا اور ان کے خلاف مہم جوئی کے چند ہی برس کے اندر اندر ان کے عقائد مضبوط اور ایمان راسخ ہو گیا تھا۔

اس مہم کے نتیجے میں متعدد احکام مرتب ہوئے جو درج ذیل ہیں:

۱- جن لوگوں کو اسلام کا پیغام دیا جا چکا ہو [اور وہ اسلام نہ لائے ہوں،] ان پر اچانک اور بے خبری میں حملہ کرنے کی اجازت دی گئی، لیکن اگر کسی قوم تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچا تو جنگ کے آغاز سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے۔

۲- اس بات کی اجازت دی گئی کہ کسی قیدی خاتون کی رہائی کو اس کا مہر قرار دے دیا جائے، جیسا کہ اس غزوے کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت جویریہؓ بنت حارثؓ کے ساتھ کیا اور اس طرح غزوۂ خیبر (۴۲) کے موقع پر حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطبؓ کا مہر اسی طرح ادا

کیا۔[اس کا ذکر آپ آئندہ پڑھیں گے]۔

۳۔ اس بات کی بھی اجازت دی گئی کہ کوئی شخص سفر پر کسی ایک بیوی کو ساتھ لے جانا چاہے تو ان کے درمیان قرعہ ڈال سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر قرعہ اندازی کی تھی۔ حضرت عائشہؓ کے نام پر قرعہ نکلا اور آپؐ انہیں اپنے ہمراہ لے کر گئے۔(۴۳) واقدی نے لکھا ہے کہ اس موقع پر حضرت ام سلمہؓ بھی ہمراہ تھیں، مگر یہ درست نہیں ہے۔(۴۴) اس غزوے میں حضرت عائشہؓ کی ہمراہی سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ فوجی مہمات میں خواتین کو ساتھ جانے کی اجازت ہے۔ اس سے قبل غزوۂ اُحد کے باب میں اس اجازت اور اس کی شرائط پر بحث کی جا چکی ہے۔

۴۔ بہتان تراشی کرنے والوں کے لیے حدِ قذف جاری کی گئی۔

۵۔ عربوں کو جنگی قیدی بنانے کی اجازت دی گئی، جیسا کہ اس غزوے میں عربوں کو قیدی بنایا گیا تھا۔ علماء کی اکثریت اس رائے کی حامل ہے۔(۴۵)

تمام علمائے اسلام بلا استثناء اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم میں حضرت عائشہؓ کی براءت نازل ہونے کے بعد جو شخص حضرت عائشہؓ کی توہین یا تنقیص کرتا ہے، وہ بالاتفاق کافر ہے، کیوں کہ وہ قرآن کے خلاف بات کرتا ہے۔(۴۶)

اس مہم کے دوران میں عزل کا قانون بھی معلوم ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عزل کی بابت دریافت کیا اور آپؐ نے انہیں اجازت دیتے ہوئے فرمایا: ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم ایسا نہ کرو، کیوں کہ روزِ قیامت تک جس روح کا اس دنیا میں آنا مقدر ہو چکا ہے، وہ ہر حال میں آ کر رہے گی''۔(۴۷) علماء کی اکثریت کا خیال ہے کہ عزل آزاد بیوی کے ساتھ جائز ہے، بشرطیکہ اس کی اجازت سے کیا جائے۔(۴۸)

واقعۂ افک میں رسول اللہ ﷺ کی بشریت کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔ آپؐ اپنی بیوی پر منافقوں کی بہتان تراشی دیکھ کر حد سے زیادہ متاثر تھے، اس کے باوجود کہ آپ کو حضرت عائشہؓ اور ان کے والد سے شدید تعلق اور بے حد محبت تھی، نہ تو آپؐ معاملے کی تہہ تک پہنچ سکے اور

نہ اپنی خواہش سے وحی ہی لا سکے جو آپؐ کی آزمائش کے لیے ایک ماہ تک رکی رہی۔ اگر وحی آپؐ کے ذہن کی اختراع ہوتی تو اس میں ہرگز اتنی تاخیر واقع نہ ہوتی اور آپؐ اتنے طویل عرصے تک شدید ذہنی دباؤ کا شکار نہ رہتے، بلکہ جن اسباب نے آپ کو پریشان اور بے چین کیا ہوا تھا، وہ بہت جلد ختم ہو جاتے اور اس سنگین مسئلے کا کوئی وجود ہی نہ رہتا، لیکن رسول اللہ ﷺ محض ایک بشر تھے جیسا کہ قرآن کریم نے اعلان کیا ہے: ''آپ کہہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں۔ میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے---'' (الکھف ۱۸:۱۱۰)۔

آپ کو نہ تو وحی پر کوئی اختیار حاصل تھا اور نہ آپؐ اس کو جلدی لانے یا اس پر اضافہ کرنے کی کوئی استطاعت ہی رکھتے تھے: ''اور اگر یہ ہمارے ذمے کچھ باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ تے، پھر ہم ان کی رگِ جاں کاٹ ڈالتے، پھر تم میں کوئی ان کو اس سے بچانے والا بھی نہ ہوتا'' (الحاقۃ ۶۹:۴۴-۴۷)۔

واقعہ یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں مختلف مقامات پر مسلمانوں کی فوجی نقل و حرکت، بدر الموعد پر ان کا قریش کو للکارنا اور تجارتی شاہراہوں پر قبضے کے ذریعے مکے کی اقتصادیات پر مسلسل دباؤ ڈالنا، وہ عوامل تھے جنھوں نے مشرکین کو اس پر مجبور کیا کہ وہ مدینے کے یہودیوں سے اتحاد کر لیں۔ یہودیوں کے دو قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر کو بعد میں مسلمانوں نے جلاوطن کر دیا۔ بنو قریظہ اگرچہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدے کا احترام کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی اور وہ کسی بھی وقت مسلمانوں پر حملہ کرنے اور ان سے انتقام لینے کے شدید متمنی تھے، جیسا کہ غزوۂ احزاب کے واقعے سے ظاہر ہوا۔

حواشی

۱- قلقشندی، ابو العباس احمد ابن علی، **قلائد الجمان فی التعریف بقبائل عرب الزمان**، ص ۹۳۔ عمرو بن عامر انصار (اوس اور خزرج) کے اجداد میں دوسرے جد اور بنو مصطلق کے اجداد میں چوتھے جد تھے۔ ان کی شخصیت میں انصار اور بنو مصطلق کے سلسلۂ نسب کے اشتراک کے لیے

ملاحظہ کیجیے: خلیفہ بن خیاط، تاریخ،ص ۷۶،ص ۱۰۷۔

۲۔ حربی، ابو اسحٰق ابراہیم بن اسحٰق بن ابراہیم، **کتاب المناسک و اماکن طروق الحج و معالم الجزیرۃ**،ص ۴۵۸-۴۶۰

۳۔ ایضاً،ص ۴۶۳

۴۔ عبداللہ البسام، **تیسیر العلّام شرح عمدۃ الاحکام**، ۱:۵۸۴

۵۔ ابراہیم قُریبی، **مرویات غزوۃ بنو المصطلق**،ص ۵۴-۵۸

۶۔ معبد الخزاعی کے طرزِ عمل کا حوالہ سامنے رکھیے جب اس نے قریش کو غزوۂ احد کے بعد واپس نہ جانے اور مدینے پر حملہ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

۷۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲:۶۱؛ واقدی، **مغازی**، ۱:۲۰۰

۸۔ ابن سعد، **طبقات**، ۲:۶۳۔ انہوں نے کتاب کے آغاز میں اور اس جلد کے شروع میں سند درج کی ہے۔ اس صفحے پر انہوں نے اس بات کا حوالہ قالوا (انہوں نے کہا) کے لفظ سے دیا ہے۔ یہ واقدی، ابو معشر سندھی اور موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے ہے اور ان کی احادیث باہم مل گئی ہیں۔ سندوں کا یہ ارتباط غیر یقینی اور غیر قطعی ہے، کیوں کہ جب کمزور اور ''ثقہ'' راوی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو صحیح اور غلط کو علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقدی، **مغازی**، ۱:۴۰۴-۴۰۵

۹۔ ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۴:۱۵۶، ۳۰:۲۴۲؛ بیہقی، **السنن الکبریٰ**، ۹،۵۴۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ شامل ہیں، جن کی کتابیں نذرِ آتش ہونے کی وجہ سے ان کی تحریرات منتشر ہیں۔ یہاں روایت عبادلہ کے ذریعے سے نہیں ہے۔ سند میں محمد بن فلیح بھی شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں، لیکن بعض اوقات غیر واضح ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کے اقوال حاکم، ابو سعید عبداللہ بن محمد نیشاپوری اور بیہقی نے الدلائل میں روایت کیے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ سے **بخاری** کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، لیکن یہ قلم کی لغزش ہے۔ دیکھیے: ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۴۳۰

۱۰۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۴۳۰؛ واقدی، **مغازی**، ۱:۴۰۴؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲:۶۳

۱۱۔ ابن قیم، **زاد المعاد**، ۳:۱۲۵؛ ذہبی، **تاریخ اسلام**، ۲:۲۷۵

۱۲۔ مسلم، **صحیح**، ۸:۱۱۵؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۴۷۱-۴۷۲

۱۳۔ ذہبی، **تاریخ اسلام**، ۱:۲۳۰

۱۴۔ واقدی، **مغازی**، ۱:۴۰۴

۱۵- **صحیح بخاری**، ۳:۱۲۹، یہ الفاظ ان کے اپنے ہیں۔

۱۶- مسلم، **صحیح**، ۵:۱۳۹

۱۷- واقدی کو اختلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو حکم دیا کہ وہ بنو مصطلق کو پکاریں اور انہیں اسلام کی دعوت دیں، لیکن واقدی کی روایات پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے، کیوں کہ وہ واحد شخص ہیں جو ان کا ذکر کرتے ہیں۔ واقدی، **مغازی**، ۱:۴۰۴-۴۰۷

۱۸- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲:۲۹۰-۲۹۳۔ ان کے تین اساتذہ کے ''مراسیل'' سے جو ''ثقہ'' ہیں۔ انہوں نے ان روایات کے درمیان امتیاز نہیں کیا اور یہی چیز ان کی تقویت کا سبب بنی ہوگی، بلکہ انہوں نے آپس میں ایک دوسری کو ملایا اور ان کے درمیان مطابقت پیدا کی۔

۱۹- ایضاً ۲:۲۹۴، ۶۴۳؛ ابن اسحٰق، **سیرۃ**، ۱:۲۴۵، ایسی سند کے ساتھ جس کے افراد ''ثقہ'' ہیں۔

۲۰- غالباً ان کی مراد ان لوگوں سے ہے جو میدان جنگ میں موجود رہے تھے، کیوں کہ ان کا سردار حارث بن ابی ضرار قیدی نہیں بنایا گیا تھا۔

۲۱- واقدی، **مغازی**، ۱:۲۶۱؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲:۶۴۔ ''دوسو خاندان''، یعنی ہر خاتون اپنی جگہ ایک خاندان تھی، اور اس کے اہلِ خاندان اس کے ہمراہ تھے۔ اس خیال یا روایت کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ ۷۰۰ سے زائد افراد تھے۔

۲۲- زرقانی، محمد بن عبدالباقی بن یوسف، **شرح مواهب اللدنیه**، ۳:۲۴۵

۲۳- واقدی، **مغازی**، ۱:۴۰۴

۲۴- دیگر روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ غزوۂ بنو مصطلق تھا۔ (دیکھیے: احمد، **مسند**، ۳:۲۹۲-۲۹۳، ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ۔ **فتح الباری**، ۸:۶۶۹۔ اضافی صحیح مواد کے ساتھ **مستخرج اسماعیلی**؛ ترمذی، سنن، ۵:۹۰۔ وہ کہتے ہیں: ''یہ ایک حسن صحیح حدیث ہے)۔

۲۵- ''میرے چچا'' سے ان کی مراد سعدؓ بن عبادہ ہیں۔ یہ خزرج کے سردار تھے، اور ان کے حقیقی چچا نہیں تھے۔ ''عمر'' سے ان کی مراد عمرؓ بن خطاب ہیں۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۶۴۵

۲۶- یہ سورۃ غزوے سے واپسی کے دوران میں نازل ہوئی۔ ترمذی، سنن، ۵:۸۸، ''یہ ایک حسن صحیح حدیث ہے''۔

۲۷- **صحیح بخاری**، ۴:۱۲۶-۱۲۷؛ مسلم، **صحیح**، ۸:۱۱۹

۲۸- **صحیح بخاری**، ۴:۱۴۶، ۶:۱۲۸؛ مسلم، **صحیح**، ۸:۱۹

۲۹- ترمذی، سنن،۵:۸۹؛ بخاری، **صحیح بخاری**،۶:۱۲۷

۳۰- ابن کثیر، **تفسیر**،۴:۳۶۹؛ ابن حجر، **فتح الباری**،۸:۶۴۴

۳۱- مسلم، **صحیح**،۸:۱۹

۳۲- ابن ہشام، **سیرۃ** ۲:۲۹۰-۲۹۳۔ ابن اسحٰق سے، نیز ان کے تین اساتذہ سے بطور ''مرسل'' مروی ہے۔ عروہ بن زبیر کی ''مراسیل'' میں سے ایک ''مرسل جید حدیث'' سے اس کی تائید ہوتی ہے (**فتح الباری**، ۸:۶۴۹)۔ صحیحین میں بھی یہی معنی دیے گئے ہیں (**بخاری** ۶:۱۲۷؛ **مسلم**، ۸:۱۱۹)۔

۳۳- ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۹:۲۳۰، بزار کی ایک روایت سے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اس کے افراد ثقہ ہیں''۔ عروہ کی ''مراسیل'' سے طبرانی کی روایت بھی ملاحظہ کیجیے۔ ہیثمی نے کہا: ''اس کے افراد صحیح ہیں''۔

۳۴- ترمذی، سنن، ۵:۹۰۔ انہوں نے کہا، ''یہ ایک حسن صحیح حدیث ہے''۔

۳۵- ابن ہشام، **سیرۃ** ۲:۲۹۳

۳۶- ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۹:۲۳۰، بزار کی ایک روایت سے ''حسن'' سند کے ساتھ۔ بیہقی، سنن، ۸:۲۵۰، ''حسن'' سند کے ساتھ۔

۳۷- ابن قیم، **زاد المعاد**،۲:۱۲۷-۱۲۸

۳۸- ہیثمی، **مجمع الزوائد**،۸:۲۳۷-۲۴۰؛ ابن حجر، **فتح الباری**،۸:۴۷۹-۴۸۱

۳۹- ابن ہشام، **سیرۃ** ۲:۲۹۴، ۶۴۵، ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ۔ ابوداؤد، سنن، ۲:۳۴۷

۴۰- شوکانی، **فتح القدیر**، ۵:۶۰، ۶۲

۴۱- ابن حجر، **الاصابۃ**،۲:۵۱۶

۴۲-۴۴۔ [انگریزی ترجمے میں یہ حواشی درج ہونے سے رہ گئے ہیں]۔

۴۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۵:۱۷۰؛ شافعی، ابوعبداللہ محمد بن ادریس المطلبی، کتاب الام،۴:۱۸۶؛ مجدالدین ابن تیمیہ، **منتقی الاخبار**،۸:۴ (**نیل الاوطار** کے ساتھ شائع شدہ)

۴۶- ابن کثیر، **تفسیر**،۳:۱۲۷؛ نووی، **شرح صحیح مسلم**،۵:۶۴۳

۴۷- **صحیح بخاری** ۳:۱۲۹، ۵:۹۶، ۷:۲۹، ۸:۱۰۴

۴۸- طحاوی، ابوغفار احمد ابن محمد ابن سلمہ، **معانی الآثار**،۳:۳۰-۳۵؛ محمد بن علی شوکانی، **نیل الاوطار**،۶:۲۲۲-۲۲۴

۷

غزوۂ خندق (احزاب)

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب شوال ۵ ھ میں پیش آیا۔ اہل علم کی اکثریت کی یہی رائے ہے جن میں ابن اسحٰق، واقدی اور ان کے بعد آنے والے بہت سے حضرات شامل ہیں۔(۱) زہری، مالک بن انس اور موسیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ یہ غزوہ ۴ھ میں پیش آیا۔(۲) حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں آراء میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ اصحاب جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ ۴ھ کا ہے، وہ ہجرت کے بعد محرم کے مہینے سے تاریخ کا آغاز کرتے ہیں اور اس سے پہلے گزرنے والے مہینوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے خیال میں بدر کا معرکہ ہجرت کے پہلے سال، اُحد کا دوسرے سال اور خندق کا معرکہ ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا۔ یہ رائے ان اہل علم کی اکثریتی رائے سے متعارض ہے جو ہجری سال کے محرم سے تاریخ کا شمار کرتے ہیں۔(۳) یہی وجہ ہے کہ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ غزوۂ خندق ہجرت کے پانچویں سال پیش آیا۔ ابن حزم واحد شخص ہیں جو یہ لکھتے ہیں کہ غزوۂ خندق غزوۂ احد کے صرف ایک سال بعد پیش آیا۔(۴) انہوں نے اپنی رائے کی بنیاد اس حدیث پر رکھی ہے جس میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا یہ بیان ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں میدان جنگ سے واپس کر دیا تھا، کیوں کہ ان کی عمر صرف ۱۴ سال تھی اور غزوۂ خندق کے روز انہیں جنگ کرنے کی اجازت اس لیے مرحمت فرما دی تھی کہ اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔(۵) بیہقی، ابن قیم، ذہبی اور ابن حجر نے یہ وضاحت کی ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اپنی عمر کے چودھویں سال میں داخل ہوئے تھے اور غزوۂ خندق کے موقع پر وہ پورے پندرہ سال کے ہو کر سولہویں برس میں

داخل ہونے والے تھے۔(۶) یہ وضاحت سیرت نگاروں میں سے اکثریت کی رائے سے مطابقت رکھتی ہے۔

غزوۂ احزاب مسلمانوں اور قریش کے درمیان پہلے سے چلے آنے والے فوجی تصادم کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس موقع پر دونوں جانب سے کھلم کھلا اعلانِ جنگ کیا گیا اور لڑائی کے لیے مزید کوئی عذر تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی، تاہم اس لڑائی کے چند فوری اسباب بھی تھے جن کی وضاحت ضروری ہے۔

(پہلا سبب تو یہ تھا کہ) قریش کو اُحد کے موقع پر اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی ہوئی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تجارتی راستوں کو مسلمانوں سے محفوظ اور مامون کر دیں۔ (دوسرا سبب یہ تھا کہ) اگرچہ اُحد کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان پہنچایا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ نہ تو مسلمانوں کو پوری طرح تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے اور نہ مدینے پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکے۔ (تیسرا سبب یہ تھا کہ) تجارتی راستے، ان کے لیے بدستور خطرات سے پُر تھے۔

مسلمانوں نے اپنی مہمات اور لشکر کشی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا، جب تک اُحد کے منفی اثرات مدینے اور قریب کے علاقے سے معدوم نہیں ہو گئے۔ اب قریش نے مسلمانوں کے خلاف زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دیں، وہ ہر قیمت پر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان کا مقصد مسلمانوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنا تھا۔ قریش میں اتنی طاقت اور قوت نہیں تھی کہ وہ تنہا یہ مہم سر کر لیتے، لہٰذا انہوں نے مسلمانوں پر جنگ مسلط کرنے کی غرض سے دیگر قبائل کے ساتھ اتحاد قائم کرنا شروع کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کو مدینے سے جلاوطن کیا تو قریش کے لیے یہ کام مزید آسان ہو گیا۔ غم اور غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے یہودی سرداروں کی ایک تعداد خیبر میں جمع ہو گئی اور وہاں سے انہوں نے قریش اور دیگر قبائل کے ساتھ رابطے قائم کرنا شروع کر دیے، تاکہ مسلمانوں سے انتقام لینے اور اپنے وطن اور اپنی جائیداد کی طرف لوٹنے کا بندوبست کر سکیں۔ ان یہودی سرداروں نے قریش کے پاس ایک وفد روانہ کیا

جس میں سلام بن ابی الحقیق النضری اور حیی بن اخطب النضری شامل تھے۔ اس وفد نے قریش کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ وفد کے ارکان نے قریش کو یہ بھی یقین دلایا کہ وہ جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے، اور اس بات کا برملا اظہار کیا کہ شرک اسلام سے بہتر ہے۔ اس بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے۔ وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں اور وہ لوگ کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ راہِ راست پر ہیں'' (النساء ۴:۵۱)۔

مکے سے یہودیوں کا یہ قافلہ نجد روانہ ہوگیا جہاں اس نے قبیلہ غطفان سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیں گے۔ اس طرح بنونضیر کے یہودیوں کی کوششوں کے نتیجے میں ایک قبائلی اتحاد وجود میں آ گیا۔(۷) موسیٰ بن عقبہ لکھتے ہیں کہ یہودی وفد نے قبیلہ غطفان کو خیبر کی فصلوں کا نصف حصہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا، تاکہ اس الحاق میں شرکت کے لیے ان کے حوصلے بلند ہو جائیں۔(۸)

قریشی فوج اور ان کے اتحادی مرالظہران کے مقام پر جمع ہوئے جو مکے سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی جگہ بنوسلیم،(۹) کنانہ، تہامہ اور احابیش میں ان کے اتحادی بھی آ کر اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ اب فوج نے مدینے کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ ان لوگوں نے رُومہ میں مجتمع الاسیال کے مقام پر جو جرف اور زغابہ کے درمیان ہے، پڑاؤ ڈالا۔ غطفان اور بنواسد نے اُحد کے نزدیک ذنب نقمیٰ پر قیام کیا۔(۱۰) سیوطی نے ان تمام نجدی قبائل کے نام درج کیے ہیں جو اس اتحاد میں شریک تھے۔ ان میں سے بہت سے قبیلہ غطفان کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: غطفان، بنوسلیم، بنواسد، فزارہ، اشجع اور بنومرہ۔

رسول اللہ ﷺ کو جونہی یہ خبر ملی کہ مختلف قبائل کے درمیان الحاق ہوگیا ہے اور اب وہ حملہ کرنے کی غرض سے مدینے کی طرف بڑھ رہے ہیں تو آپؐ نے فوراً صحابہ کرامؓ سے اس سلسلے میں مشورہ کیا کہ اس نئی صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے۔ یہ آپؐ کا ایک طریقہ تربیت تھا جس کے ذریعے آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے اندر اسلام کی بے پناہ محبت کو اجاگر کر دیا تھا۔ آپؐ

نے دنیا میں آنے والے تمام رہنماؤں کے لیے یہ مثال قائم کردی کہ ان تمام معاملات میں جن میں آپ کو وحی کی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی تھی (جیسے جنگی اور دیگر اہم معاملات)،(۱۱) آپؐ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اس طرح آپ ان کی تربیت فرمایا کرتے تھے کہ ریاست اور معاشرے کو پیش آمدہ مسائل میں غور وفکر کیا کریں اور ان مسائل کا بہترین حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے اسی طریقۂ کار کی بدولت صحابہ کرامؓ کی جماعت میں ممتاز ترین رہنما اور تجربہ کار سیاست دان وجود میں آئے جنھوں نے امت کے عام مسائل میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور ان کے حل کرنے میں بھر پور حصہ لیا۔

حضرت سلمان فارسیؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ مدینے کے شمال میں ایک خندق (۱۲) کھودی جائے تا کہ حرۃ واقم اور حرۃ الوبرۃ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جائے۔ مدینے کی یہی ایک سمت ایسی تھی جو کھلی ہوئی تھی اور یہاں سے حملہ ہوسکتا تھا۔ باقی آبادی ایک قلعے جیسی تھی، عمارتوں اور درختوں نے اسے باہم جوڑ رکھا تھا، اور یہ اونچی نیچی زمین (حرۃ) سے گھری ہوئی تھی جس سے اونٹوں اور پیدل فوج کا گزرنا تقریباً ناممکن تھا۔ (۱۳)

مدینے کے دفاع کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ نے جو منصوبہ پیش کیا، اس پر نہ تو کسی نے اعتراض کیا اور نہ کسی نے مخالفت ہی کی ۔ اولاً اتحادی قبائل تعداد میں بہت زیادہ تھے، ثانیاً لوگوں کے ذہن میں اُحد کا واقعہ ابھی تازہ تھا۔ خندق کا مقصد ایک ایسی رکاوٹ تیار کرنا تھا جو مسلمانوں اور حملہ آوروں کے درمیان براہ راست جنگ کو روک سکے اور مدینے پر حملے میں بھی مانع ہو۔ اس خندق کی وجہ سے مسلمانوں کی دفاعی حیثیت مستحکم ہوگئی، کیوں کہ اب وہ خندق کے پیچھے سے تیراندازی کرکے دشمن کو بھاری نقصان پہنچا سکتے تھے۔

مسلمانوں نے خندق کی کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ یہ خندق مشرق کی جانب بنو حارثہ کے نزدیک عجم الشیخین سے مغرب میں مذاد تک پھیلی ہوئی تھی۔ (۱۴) یہ خندق پانچ ہزار ذراع (ہاتھ) لمبی، نو ذراع چوڑی اور اس کی گہرائی مختلف مقامات پر سات سے دس ذراع تک تھی۔ دس دس مسلمانوں پر مشتمل ہر جماعتوں نے تقریباً چالیس چالیس ذراع خندق

کھودی۔(۱۵) مشرق میں قلعہ راتج سے قلعہ ذباب تک کھدائی کا کام مہاجروں کے ذمے لگایا گیا تھا اور مغرب کی سمت میں قلعہ ذباب سے جبل عابد تک کی کھدائی انصار کو سونپی گئی تھی۔(۱۶)

اس حقیقت کے باوجود کہ موسمِ سرما کے دن تھے اور مدینے میں قحط پڑا ہوا تھا، کھدائی کا کام بہت جلد مکمل ہو گیا۔(۱۷) فوج کی خوراک محض جو کی ایک قلیل مقدار پر مشتمل تھی جسے تیل لگا ہوا تھا اور زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے اس میں بساند پیدا ہو گئی تھی۔ بھوک کی شدت تھی کہ لوگ اس کے بدمزہ ذائقے اور ناگوار بُو کے باوجود اس سے پیٹ بھر لیتے تھے۔(۱۸) بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ انہیں کھجوروں کے سوا کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی تھی (۱۹) اور اُن پر ایسا وقت بھی گزرا کہ انہوں نے لگاتار تین دن بغیر کچھ کھائے گزارا کیا،(۲۰) تاہم یہ ایمان کی حدت تھی جس نے سردی اور بھوک کے تمام اثرات کو ختم کر کے رکھ دیا اور مسلمانوں نے اپنے کندھوں پر مٹی ڈھونے کا کام بڑی جانفشانی سے انجام دیا۔ مسلمانوں کی اس جماعت میں وہ بڑے بڑے تاجر اور سردار بھی شامل تھے جو اس قسم کے کام کرنے کے عادی نہ تھے، لیکن سب نے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ مساوی بنیادوں پر زمین کھودنے اور مٹی ڈھونے کا کام انجام دیا، جوش اور جذبات کا عجیب وغریب عالم تھا، کام کرتے جاتے تھے اور شوق کے عالم میں گنگناتے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی صحابہ کرامؓ کے ساتھ یہ کٹھن کام کرنے میں شریک تھے۔ آپؐ اپنے حصے کی خندق کھودتے تھے اور مٹی پھینک کر آتے تھے۔ آپؐ کا جسم گرد وغبار سے اٹا ہوا تھا اور بھوک کی شدت سے آپؐ نے اپنے شکمِ مبارک پر پتھر باندھ رکھے تھے۔(۲۱) صحابہ کرامؓ کو جب بھی کھدائی کے دوران میں کسی سخت چٹان کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے مدد کی درخواست کرتے۔ آپ کدال لیتے اور چٹان کو پاش پاش کر دیتے۔(۲۲) آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ اشعار گنگنانے میں بھی شریک رہتے تھے اور اللہ کے حضور یہ مناجات کرتے تھے:

اے اللہ! اگر تو ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم نہ ہدایت یافتہ ہوتے اور نہ صدقہ خیرات ہی کرتے، اور نہ ہم نماز ادا کرنے کے قابل ہوتے۔ اے اللہ! اپنے کرم سے ہم پر سکینت نازل فرما دے! اور جب دشمن سے ہمارا سامنا ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ!

دشمن نے ہم پر بہت زیادتی کی ہے اور جب وہ ہمیں ایذاء دینے کا ارادہ کرے تو ہمیں مضبوط رکھنا۔

آخری الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ اپنی آواز کو بلند فرما لیتے تھے۔(۲۳)

مسلمان، جب خندق کی کھدائی اور مٹی کی ڈھلائی کا کام انجام دے رہے تھے، ان کے لبوں پر یہ الفاظ جاری ہوتے تھے:''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (ﷺ) کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا ہے۔ہم اس وقت تک اس عہد کو نباہیں گے جب تک ہمارے جسم میں زندگی کی آخری رمق موجود رہے گی''۔

ان کے اس فداکارانہ جذبے کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے جذبات کا یوں اظہار فرماتے تھے:''اے اللہ! اصل عیش تو آخرت ہی کا عیش ہے، انصار اور مہاجرین پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرما!''

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جذبات کے اس تبادلے میں رسول اللہ ﷺ پہل فرماتے اور صحابہ کرامؓ اس کا جواب دیتے۔(۲۴)

رسول اللہ ﷺ نے محض الفاظ کے ذریعے ہی اپنے ساتھیوں کے جذبے کو نہیں ابھارا، بلکہ عملی طور پر بنفسِ نفیس ان کے ساتھ کام میں شریک رہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے حوصلے بہت بلند ہوگئے۔ان کی سرگرمی عروج پر پہنچ گئی اور طویل وعریض خندق کی کھدائی کا کام صرف چھ روز میں مکمل ہوگیا،(۲۵) یعنی اتحادی لشکر کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی دفاعی منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

خندق کی کھدائی کے دوران میں رسول اللہ ﷺ کے کئی معجزے ظاہر ہوئے، جن میں سے ایک خوراک کی مقدار میں اضافے کا معجزہ تھا۔[اس معجزے کی تفصیل یہ ہے کہ] ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ نے یہ محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے شدید بھوک کے آثار ہویدا ہیں۔وہ فوراً اپنی اہلیہ کے پاس گئے اور ان سے کھانا تیار کرنے کے لیے کہا۔حضرت جابرؓ کے پاس ایک ہی بکری تھی جسے انہوں نے ذبح کیا اور ان کی

اہلیہ نے کچھ گیہوں پیس کر ایک چھوٹے سے برتن میں ڈالے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو حضرت جابرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو خاموشی سے کھانے کی دعوت دی، کیوں کہ کھانا قلیل مقدار میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سارے ساتھیوں کو بلایا اور کھانے میں برکت کے لیے دعا کی اور تمام لوگوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھا لیا، اس کے بعد بھی اس برتن میں کھانا وافر مقدار میں موجود تھا جسے حضرت جابرؓ کے گھر والوں نے بھی کھایا اور بچا ہوا دوسروں کو بھی دیا۔(۲۶)

رسول اللہ ﷺ کا ایک اور معجزہ یہ تھا کہ جب حضرت عمارؓ بن یاسر کھدائی میں مصروف تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں مستقبل کے ایک واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا: ''تم ایک باغی گروہ کے ہاتھوں قتل کیے جاؤ گے'' اور یہ واقعہ اس طرح پورا ہوا کہ حضرت عمارؓ بن یاسر جنگِ صفین میں شہید ہوئے۔(۲۷)

کھدائی کے دوران میں ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کے سامنے ایک ایسی سخت چٹان آ گئی جسے وہ کوشش کے باوجود نہ توڑ سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس چٹان پر تین مرتبہ کاری ضرب لگائی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پہلی ضرب کے ساتھ ہی آپؐ نے نعرہ بلند کیا: ''اللہ اکبر''، اور فرمایا: ''مجھے شام کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں، خدا کی قسم! مجھے اس کا سرخ محل صاف نظر آ رہا ہے''۔ دوسری ضرب کے ساتھ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے سلطنتِ فارس کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور خدا کی قسم! جس جگہ میں کھڑا ہوں، یہاں سے صنعاء کے دروازے مجھے نظر آ رہے ہیں''۔(۲۸)

یہ وہ موقع تھا جب مسلمان خندق کے پیچھے محصور تھے، بھوک اور سردی کی شدت انہیں پریشان کیے ہوئے تھی۔ اس عالم میں آپؐ نے انہیں یہ خبر دی کہ وہ دنیا کے کون کون سے ممالک فتح کریں گے۔ اس بارے میں قرآن کریم نے مومنوں کا یہ قول نقل کیا ہے: ''یہ وہی ہے جس کی ہمیں اللہ اور رسول ﷺ نے خبر دی تھی اور اللہ اور رسول ﷺ نے سچ فرمایا تھا اور اس سے ان کے ایمان اور اطاعت میں اور ترقی ہو گئی'' (الاحزاب ۳۳:۲۲)۔

منافقوں نے اس خوش خبری کا تمسخر آمیز انداز میں ذکر کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا:

"اللہ اور اس کے رسول نے ہمارے ساتھ نہایت پر فریب اور بے بنیاد وعدے کیے ہیں (الاحزاب ۳۳:۱۲)۔

چند کمزور روایات کے مطابق منافقوں کا رویہ نہایت بزدلانہ تھا، وہ جھوٹی افواہیں پھیلانے میں سرگرم رہتے اور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ قرآن کریم نے منافقوں کے اس طرز عمل کی مکمل تصویر کشی کی ہے:

اور جبکہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے محض دھوکہ ہی کا وعدہ کر رکھا ہے، اور جبکہ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں، سو لوٹ چلو اور بعض لوگ ان میں سے اجازت مانگتے تھے، کہتے تھے ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں۔ یہ محض بھاگنا ہی چاہتے ہیں۔ اور اگر مدینہ میں اس کے اطراف سے ان پر کوئی آ گھسے، پھر ان سے فساد کی درخواست کی جائے تو یہ اس کو منظور کر لیں اور ان گھروں میں بہت ہی کم ٹھہریں۔ حالانکہ یہی لوگ پہلے خدا سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ سے جو عہد کیا جاتا ہے اس کی باز پرس ہوگی۔ آپؐ فرما دیجیے کہ تم کو بھاگنا کچھ نافع نہیں ہو سکتا۔ اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس حالت میں بجز تھوڑے دنوں کے اور زیادہ متمتع نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی فرما دیجیے کہ وہ کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے، اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرنا چاہے، یا وہ کون ہے جو خدا کے فضل کو تم سے روک سکے اگر وہ تم پر فضل کرنا چاہے، اور خدا کے سوا نہ کوئی اپنا حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔ اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو مانع ہوتے ہیں اور جو اپنے بھائیوں سے یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ اور لڑائی میں بہت ہی کم آتے ہیں تمہارے حق میں بخیلی لیے ہوئے، سو جب خوف پیش آتا ہے تو ان کو دیکھتے ہو کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی

طاری ہو۔ پھر جب وہ خوف دور ہو جاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں، مال پر حرص لیے ہوئے۔ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو ان کے تمام اعمال اللہ نے بے کار کر رکھے ہیں اور یہ بات اللہ کے نزدیک بالکل آسان ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لشکر گئے نہیں، اور اگر یہ لشکر آ جائیں تو پھر یہی پسند کریں کہ کاش ہم دیہاتیوں میں باہر جا رہیں کہ تمہاری خبریں پوچھتے رہیں اور اگر تم ہی میں رہیں، تب بھی کچھ یوں ہی سا لڑیں (الاحزاب ۳۳:۱۲-۲۰)۔

ان آیات میں منافقت اور اس سے پھیلنے والے اثرات جیسے بزدلی، بے چینی اور توکل کی کمی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سخت ترین حالات اور آزمائش کے اوقات میں منافقین اللہ تعالیٰ کی ذات میں پناہ لینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے لیے گستاخانہ کلمات کا استعمال کرتے تھے۔ منافقت سے وہ نہ صرف اپنے عقیدے کو فاسد کرتے تھے، بلکہ جھوٹی افواہیں پھیلا کر دوسروں کے حوصلے پست کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ اجازت لے لی تھی کہ انہیں خندق کی کھدائی کے کام سے فارغ رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے یہ بودا عذر پیش کیا تھا کہ ان کے گھر کھلے اور غیر محفوظ ہیں اور انہیں دشمن سے خطرہ ہے، اس لیے وہ میدانِ جنگ میں حاضر نہیں رہ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی کمزوری کے سبب اور اس خوف کی بناء پر جو ان کے اوپر شدت سے طاری تھا، وہ موت سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے، یہاں تک کہ منافقوں نے مومنوں کو بھی اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ مورچے چھوڑ کر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور اپنے ایمان کا جو زبانی اقرار انہوں نے کیا تھا اور اسلام سے وفاداری کا جو عہد باندھا تھا، اس کی معمولی سی پاسداری کی بھی پروا نہ کی۔

منافقوں کی تمام تر مزاحمت، قحط کی سختی اور سردی کی شدت کے باوجود مسلمان اپنے مقصد کی دھن میں لگے رہے اور دفاعِ مدینہ کا جو خاکہ ان کے ذہنوں میں تھا، اسے بہت جلد عملی شکل میں ڈھال دیا۔ جب خندق تیار ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے تمام خواتین اور بچوں کو فارع نامی قلعے میں محفوظ فرما دیا۔ (۲۹) یہ بنو حارثہ کا قلعہ تھا (۳۰) جو مسلمانوں کا مضبوط ترین قلعہ سمجھا

جاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس کی پشت، شہر کے اندر (۳۱) واقع سلع نامی پہاڑ کی جانب تھی اور خندق مشرکوں اور ان کے درمیان تھی، مشرکوں نے رومہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا جو جرف، غابہ اور نقمیٰ کے درمیان واقع ہے۔ (۳۲)

مشرکوں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ ان کی فوج میں دس ہزار جنگجو شامل تھے۔ (۳۳) ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ قریش، احابیش اور ان کے ساتھ جو عرب شامل تھے، ان سب کی تعداد مل کر چار ہزار بنتی ہے۔ ان کی فوج میں تین سو گھوڑے اور پندرہ سو اونٹ بھی تھے۔ بعد ازاں مرالظہر ان کے مقام پر بنو سلیم بھی مشرکین کی فوج میں شامل ہو گئے تھے جن کی تعداد سات سو کے لگ بھگ تھی۔ (۳۴)

ابن جوزی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ قبیلہ فزارہ ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور قبیلہ اشجع اور بنو مُرہ دونوں کی تعداد چار سو تھی۔ (۳۵) ان سب کو ملا کر کل تعداد چھ ہزار پانچ سو ہو گئی، اور بقیہ تعداد بنو اسد اور غطفان نے پوری کی۔ اس طرح قریشی فوج دس ہزار کے جم غفیر پر مشتمل تھی۔

ابن اسحٰق لکھتے ہیں کہ مسلمان فوج میں مجاہدین کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی (۳۶)۔ سیرت نگاروں کی اکثریت نے ابن اسحٰق کے اس بیان سے اتفاق کیا ہے، تاہم ابن حزم وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ مجاہدین صرف نو سو تھے۔ (۳۷) وہ اپنی رائے کی بنیاد اس حقیقت پر رکھتے ہیں کہ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی، اور ان کا کہنا یہ ہے کہ غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق کا درمیانی زمانہ صرف ایک سال ہے اور اس قلیل مدت میں مسلمان مجاہدین کی تعداد تین ہزار تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ابن حزم کی یہ رائے جو انہوں نے اتنے یقین کے ساتھ پیش کی ہے، صحیح نہیں ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے مکان پر دعوت میں شرکت کی، ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی جیسا کہ ایک ''صحیح'' حدیث میں صراحت کی گئی ہے۔ وہ لوگ جو مدینے کی

حفاظت کی خاطر گشت پر خود نکلا کرتے تھے، ان کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی، (۳۸) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ فوج کی کل تعداد صرف نو سو افراد پر مشتمل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اُحد اور خندق کا درمیانی زمانہ دو سال کا ہے اور اس مدت کے دوران میں ان نوعمر صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد بالغ ہو کر جوان ہو چکی تھی جو اپنی نوعمری کے سبب اُحد میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ علاوہ ازیں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تھی کہ لوگ عام طور پر مسلمان ہونے کے بعد ہجرت کر کے مدینے آ جاتے تھے، اس لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ مسلم فوج کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔

جب رسول اللہ ﷺ نے یہ محسوس کیا کہ متحدہ قبائل کی ایک بڑی تعداد مقابلے کے لیے تیار ہے تو آپؐ نے مدینے سے دباؤ کم کرنے کی خاطر غطفان سے امن کا ایک معاہدہ کرنے کا ارادہ فرمایا اور یہ طے کیا کہ انہیں ہر سال مدینے کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ دیا کریں گے، لیکن جب آپؐ نے اس سلسلے میں حضرت سعدؓ بن معاذ سے جو قبیلہ اوس کے سردار تھے، اور حضرت سعدؓ بن عبادہ سے جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے، مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کیا: ''نہیں یا رسول اللہ! خدا کی قسم ہم زمانۂ جاہلیت میں بھی ان لوگوں سے کبھی دب کر نہیں رہے، اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت عطا فرمائی ہے تو ہم کیونکر ایسا کر سکتے ہیں''؟ طبرانی کی روایت کے مطابق انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم اس کے حکم کی اطاعت کریں گے، اور اگر یہ حکم عالمِ بالا سے نہیں آیا، بلکہ یہ آپؐ کی خواہش اور رائے ہے تو پھر ہم آپؐ کی رائے ہی کی پیروی کریں گے، لیکن اگر آپؐ محض ہماری بقا کی خاطر یہ اقدام کر رہے ہیں تو ہم آپؐ کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اور وہ ہمیشہ ماضی میں برابر رہے ہیں، وہ کبھی ہماری فصلوں کا کوئی حصہ ہم سے لینے میں کامیاب نہ ہو سکے، سوائے اس کے کہ یا تو ہم نے ان کے ہاتھ فروخت کیا، یا جب ان کا کوئی فرد ہمارے ہاں مہمان کی حیثیت سے آیا تو ہم نے اس کی ضیافت کی''۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے حارث الغطفانی سے گفت و شنید کا ارادہ ترک کر دیا جو بدوؤں کا نمائندہ تھا، اور بنو مُرہ کا سردار تھا۔ (۳۹)

مسلمانوں کے لیے صورتِ حال اس وقت مزید خراب ہوگئی، جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے یہودی حلیفوں، یعنی بنوقریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور عین وقت پر ان کے ساتھ غداری کی ہے۔ بنوقریظہ کا علاقہ عوالی میں تھا جو مدینے کے جنوب مشرق میں وادی مہزور میں ہے۔ ان کی بستی کا محل وقوع ایسا تھا کہ وہ مسلمانوں پر عقب سے بآسانی حملہ کر سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیرؓ بن عوام کو بنوقریظہ کی جانب روانہ کیا تاکہ دشمن کے حالات معلوم کیے جا سکیں۔ جب وہ واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے ماں اور باپ تم پر فدا ہوں۔ ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرے حواری زبیر ہیں''۔ (۴۰) اس کے بعد آپؐ نے حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو بنی قریظہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ بنوقریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور معاہدے کی دستاویز کو چاک کر دیا ہے، لیکن بنوسعنہ اس معاہدہ شکنی میں شامل نہیں تھے، وہ قلعے سے باہر آئے اور معاہدہ برقرار رکھنے کی خاطر مسلمانوں سے ملے۔ بنوقریظہ کی معاہدہ شکنی دراصل حُیَی بن اخطب کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس نے کعب بن اسد القرظی پر زور ڈالا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ توڑ دیں۔ اس نے کعب بن اسد کو اتحادی قبائل کی طاقت وقوت کا بھی یقین دلایا اور یہ امید بھی بندھائی کہ اتحادی فوجیں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی پوری اہلیت رکھتی ہیں۔ اس یقین دہانی کے بعد حُیَی بن اخطب نے کعب بن اسد سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اتحادی فوجیں مدینے سے روانہ ہوگئیں تو وہ اس کے ساتھ اس کے قلعے میں داخل ہو جائے گا (اور جو آفت کعب بن اسد اور اس کے لوگوں کے اوپر پڑے گی، حیی بن اخطب اس میں برابر کا شریک ہوگا)۔ اب بنوقریظہ نے باقاعدہ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ ان کی طرف سے یہ معاہدہ توڑا جا رہا ہے۔ یہ خبر جلد ہی مسلمانوں میں پھیل گئی اور مسلمانوں کو یہ خوف لاحق ہوا کہ ان کی عورتیں اور بچے بنوقریظہ کی طرف سے کسی خطرے میں نہ گھر جائیں۔ (۴۱)

مسلمانوں پر آزمائش کی جو گھڑی آئی، اسے قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے:

کہ وہ لوگ تم پر آ چڑھے تھے اوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی اور جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے

ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کا امتحان لیا گیا اور سخت زلزلے ڈالے گئے (الاحزاب ۳۳: ۱۰-۱۱)۔

اتحادی قبائل اوپر کی طرف سے مسلمانوں پر چڑھے آ رہے تھے، بنو قریظہ نیچے سے برسرِ پیکار تھے اور منافق مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بارے میں باطل خیالات کو ہوا دے رہے تھے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک کڑی آزمائش میں گرفتار تھے، لیکن مضبوط عقیدہ اور بہترین تربیت یہ دو ایسے عوامل تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں نے نہایت عزم اور استقلال کے ساتھ ان تمام خطرات کا سامنا کیا۔

مدینے کی حفاظت کے لیے گشتی عملہ تعینات کر دیا گیا۔ حضرت سلمہؓ بن اسلم الاوسی کو دو سو افراد کے ایک دستے کا امیر مقرر کیا گیا اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کو تین سو افراد کے دستے کی امارت سپرد کی گئی۔ یہ حفاظتی دستے شہر کے گرد گشت کرتے اور بلند آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے۔ گشت کا مقصد یہ تھا کہ بنو قریظہ اس بات سے خبردار ہو جائیں کہ مسلمان وہاں موجود ہیں اور چوکس بھی ہیں، تاکہ وہ قلعے میں موجود مسلمان عورتوں اور بچوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکیں۔ (۴۲)

جب قریش نے خندق کھدی ہوئی دیکھی تو وہ حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے، اور جب انہوں نے اسے عبور کرنے کی کوشش کی تو سخت منہ کی کھائی۔ جب بھی وہ خندق کے قریب آتے، مسلمان ان کے اوپر تیروں کی بارش کر دیتے۔ محاصرے نے شدت اختیار کر لی جو ۱۴ روز تک جاری رہا۔ (۴۳) اس دوران میں کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں ہوئی، بلکہ صرف تیروں کا تبادلہ ہوا۔ قتادہ کا کہنا ہے کہ یہ محاصرہ ایک ماہ جاری رہا (۴۴) اور موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ یہ محاصرہ ۲۰ روز پر محیط تھا۔ (۴۵)

ابن اسحٰق اور ابن سعد نے کسی سند کے بغیر کچھ روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند مشرکین خندق عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان مصنفین نے ان میں سے پانچ

کے نام بھی نقل کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ قریش کا قوی ترین شہ سوار عمرو بن عبدوُد حضرت علیؓ کے مقابلے پر آیا تو حضرت علیؓ نے پہلے ہی حملے میں اس کا کام تمام کر دیا۔ دوسرا مشرک نوفل مخزومی تھا، اسے حضرت زبیرؓ نے قتل کیا اور باقی تین مشرکین فرار ہو گئے، جنہوں نے اپنے خیموں میں جا کر پناہ لی، (۴۶) تاہم اس کے باوجود مشرکین کے حملے وقتاً فوقتاً ہوتے رہے، حتیٰ کہ کئی روز تک رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نمازِ عصر بروقت ادا نہ کر سکے اور انہوں نے سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر ادا کی۔ اس وقت تک صلاۃ الخوف (وہ نماز جو خوف کے زمانے میں ادا کی جائے) کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ (۴۷) یہ حکم بعد میں غزوۃ الرقاع کے دوران میں نازل ہوا۔ (۴۸)

محاصرے کی طوالت کے باوجود صرف آٹھ مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ (۴۹) ان میں سے ایک حضرت سعدؓ بن معاذ تھے جو قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ ان کے بازو میں گہرا زخم آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے مسجد میں ایک خیمہ نصب کرا دیا تھا تاکہ آپؐ آسانی کے ساتھ ان کے پاس آمدورفت رکھ سکیں۔ جب بنو قریظہ کے خلاف مہم کا آغاز ہوا، اس زمانے میں حضرت سعدؓ بن معاذ کے زخم سے بہت زیادہ خون بہہ گیا، جس کے سبب ان کی وفات ہو گئی۔ (۵۰) وہ ایک عظیم المرتبت صحابی تھے اور غیر معمولی صفات کے حامل تھے۔ انہوں نے اسلام کے راستے میں بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ (۵۱) مشرکوں کے چار افراد مارے گئے۔ غزوۂ خندق وہ غزوہ ہے جس میں سب سے کم جانی نقصان ہوا، حالانکہ دونوں طرف فوجوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، لیکن فریقین کے درمیان خندق حائل رہی اور دو بدو لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

محاصرے کی طوالت کے باعث اتحادیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تمام اتحادی افواج ایک مقصد پر قائم نہیں تھی۔ قریش مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے، تاکہ ان کے لیے تجارتی راستے کھل جائیں اور وہ مسلمانوں سے انتقام بھی لے لیں۔ بدو فوری طور پر فتح کے خواہاں تھے، تاکہ مدینے پر قبضہ کر سکیں اور یہودی معاہدہ توڑنے

کے باوجود لڑائی میں حصہ لینے میں متردد تھے۔ وہ اس بات سے خائف تھے کہ اگر کسی وقت اتحادی فوجیں محاصرہ ختم کر کے واپس روانہ ہوگئیں تو وہ مدینے میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جنگ میں حصہ لینے سے پہلے قریش سے یہ مطالبہ کیا کہ چند لوگوں کو ان کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ انہیں یرغمال بنا کر رکھ سکیں۔

ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے حضرت نعیمؓ بن مسعود الغطفانی کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ انہیں اسلام قبول کیے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اور قریش، یہودی اور بدو سب کے سب اس حقیقت سے نا آشنا تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حضرت نعیمؓ بن مسعود نے اتحادی قبائل کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف شکوک وشبہات کے بیج بونا شروع کر دیے۔ انہوں نے یہودیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ قریش سے یرغمال کا مطالبہ کریں، ایسا نہ ہو کہ قریش یکدم محاصرہ ختم کر دیں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے رحم وکرم پر تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس کے بعد وہ قریش کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ یہودی تم لوگوں سے یرغمالیوں کا مطالبہ اس لیے کر رہے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیں اور اس طرح اپنی معاہدہ شکنی کا تدارک کر سکیں۔ یہ روایات فنِ حدیث کے نقطۂ نگاہ سے تو ثابت نہیں ہوتیں، تاہم کتبِ سیر میں معروف ہیں (۵۲) اور شرعی اصول سیاسیات سے اس لیے متعارض نہیں ہیں کہ جنگ چال چلنے اور جُل دینے سے عبارت ہے۔ (۵۳)

محاصرے کی طوالت اور تند وتیز اور سرد ہواؤں کے باعث اتحادیوں کے جذبے ماند پڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یوں مدد فرمائی کہ ہوا کا رخ مشرقی جانب تھا، (۵۴) جس کی شدت سے مشرکین کے خیمے اکھڑ گئے، دیگچیاں الٹ گئیں، چولھوں کی آگ بجھ گئی اور ان کی خورجیاں ریت میں دب گئیں۔ ابوسفیان نے گھبرا کر لشکر کو روانگی کا حکم دے دیا اور اس جنگ میں بھاری اخراجات اور مشقت کے سوا کچھ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ قرآن کریم کا بیان ہے: ''اے ایمان والو! اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو، جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے۔ پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج بھیجی جو تم کو دکھائی نہ دیتی تھی اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتے

تھے'' (الاحزاب ۳۳:۹)۔

حضرت حذیفہؓ بن یمان اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اتحادیوں کی صورتِ حال معلوم کرنے کی غرض سے ان کی طرف روانہ کیا تھا۔ ان کا بیان ہے:

غزوۂ احزاب کے موقع پر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا۔ ایک رات سخت سردی کی لہر اور تند ہواؤں نے ہمیں گھیر لیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''سنو! جو شخص اس وقت دشمن کی طرف جائے گا اور دشمن کی خبریں معلوم کر کے مجھ تک پہنچائے گا، وہ قیامت کے روز میرے ساتھ ہو گا''۔ ہم سب لوگ خاموش رہے اور کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات کو دو مرتبہ دہرایا، مگر مجمع پر خاموشی چھائی رہی۔ تیسری بار آپؐ نے فرمایا: ''حذیفہ اٹھو! اور دشمن کی خبریں لا کر مجھے دو''۔ جب آپؐ نے میرا نام لے کر پکارا تو اب میرے پاس تعمیلِ حکم کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ آپؐ نے مزید ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: ''جاؤ اور دشمن کی خبریں لے کر میرے پاس آؤ، لیکن ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جو انہیں میرے خلاف مشتعل کر دے''۔ جب میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے روانہ ہوا تو مجھے اپنا جسم اتنا گرم محسوس ہو رہا تھا جیسے میں گرم حمام میں ہوں۔ اسی حالت میں، میں دشمن کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے ابوسفیان کو دیکھا کہ وہ آگ تاپ رہا تھا، میں نے تیر کمان میں رکھا اور اسے نشانہ بنانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے: ''کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے وہ میرے خلاف مشتعل ہو جائیں''۔ اگر میں نے وہ تیر چلا دیا ہوتا تو ابوسفیان یقیناً زخمی ہو جاتا، لیکن میں وہاں سے پلٹ گیا اور اسی کیفیت میں چلتا ہوا جیسے میں گرم حمام میں چل رہا ہوں، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دشمن کے بارے میں تمام خبریں آپؐ کو پہنچا دیں۔ جب میرا کام مکمل ہو گیا تو مجھے سردی لگنا شروع ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مجھے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھا تو اپنا ایک کمبل مجھے اوڑھا دیا۔

یہ کمبل رسول اللہ ﷺ کی ضرورت سے زائد تھا اور آپؐ نماز ادا کرتے وقت اسے اوڑھا کرتے تھے۔ میں کمبل اوڑھ کر صبح تک سوتا رہا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ نے مجھے جگایا اور فرمایا: ''اے گھوڑے بیچ کر سونے والے! اٹھ جا''۔ (۵۵)

بزار کی روایت یہ ہے کہ جب حضرت حذیفہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آئے تو عرض کیا: ''یا رسول اللہ! لوگ ابوسفیان سے علیحدہ ہو کر منتشر ہو گئے ہیں، صرف ایک مختصر سا گروہ ہے جو ابوسفیان کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ مل کر آگ جلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی اتنی ہی شدید سردی میں گرفتار کر رکھا ہے، جتنی میں ہم لوگ گرفتار ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے امید لگائے ہوئے ہیں اور انہیں کوئی امید نہیں''۔ (۵۶)

موسم کی شدت کی وجہ سے اتحادی افواج میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ مدینے سے فرار ہو گئیں۔ مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا: ''اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو غصے میں بھرا ہوا لوٹا دیا، کیونکہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے کافی ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے'' (الاحزاب ۳۳: ۲۵)۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی وہ دعا قبول فرمائی جو آپؐ نے محاصرے کے دوران میں کی تھی: ''اے اللہ! آپ نے کتاب نازل فرمائی ہے اور آپ حساب لینے میں تیز ہیں، اتحادیوں کو شکست سے دو چار کر دیجیے۔ اے ہمارے مالک! انہیں شکست فاش دیجیے اور ان کے اوپر لرزہ طاری کر دیجیے''۔ (۵۷) اگرچہ اتحادی قبائل نے اس جنگ میں اپنی بھرپور قوت کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن ان کی ناکامی کے جو اہم نتائج نکلے، ان کا اظہار کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: ''اب ہم ان پر حملہ کریں گے اور وہ کبھی ہمارے اوپر حملہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے اور ہم ان کے علاقے میں جا کر ان سے جنگ کریں گے''۔ (۵۸) آپ کے اس ارشاد مبارک سے پتہ چلتا ہے کہ اس جنگ کے ساتھ ہی مسلمانوں کی جنگی حکمت عملی میں تبدیلی آئی اور بجائے دفاعی جنگ لڑنے کے اب حملہ کرنے میں پہل کرنے کے قابل ہو گئے۔ اب حق و باطل کا میدانِ کارزار مدینے اور اس کے گرد و نواح سے مکے اور طائف اور اس کے بعد

تبوک منتقل ہونے والا تھا جو مسلمانوں کے مرکز، یعنی مدینے سے بہت زیادہ فاصلے پر تھا۔

غزوۂ خندق کے بعد پیش آنے والی مہمات

خبط یا سیف البحر کی مہم

اتحادی قبائل کو جس ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، مسلمانوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور قریش کی اقتصادیات پر اپنا شکنجہ سخت تر کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سربراہی میں تین سو افراد پر مشتمل ایک دستہ ساحلِ سمندر کی جانب روانہ کیا۔ اس دستے نے قریشی قافلے کے انتظار میں وہاں پڑاؤ ڈالا۔ پڑاؤ کے دوران میں انہیں شدید بھوک کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ایک کانٹے دار صحرائی درخت، جسے خبط کہتے ہیں، کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دستے کو جیش الخبط کا نام دیا گیا، یعنی خبط کھانے والی فوج۔ انہوں نے پہلے تو کھانے کے لیے اونٹ ذبح کرنا شروع کیے، لیکن پھر حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا، کیوں کہ اونٹ جنگ میں کام آتے تھے۔ اس اثناء میں ایک عظیم الجثہ وہیل مچھلی سمندر کے کنارے آ لگی، مسلمان فوج نے اس کا گوشت تقریباً دو ہفتے تک کھایا۔ جب مسلمان مدینے واپس آئے تو اس مچھلی کا گوشت بھی ساتھ لیتے آئے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس میں سے تناول فرمایا۔ (۵۹)

غالباً یہ آخری لشکر کشی تھی جو مکے کی تجارت کو دھمکانے کی خاطر کی گئی تھی۔ بعد میں معاہدۂ حدیبیہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس قسم کے سرایا کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا، لیکن اس وقت تک مکے کی تجارت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ ابو سفیان نے اس حقیقت کے متعلق اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''اس جنگ نے ہمارے اوپر ایک کاری ضرب لگائی ہے''۔ (۶۰)

حواشی

۱۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۴: ۹۳؛ واقدی، مغازی، ۲: ۴۰۰

۲- ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۴:۹۳؛ صحیح بخاری، ۵:۴۴۔ یہاں وہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت نقل کرتے ہیں۔ فساوی، یوسف بن سفیان، المعرفة والتاریخ، ۳:۲۵۸

۳- ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۳

۴- ابن حزم، جوامع السیرة، ۱۸۵

۵- صحیح بخاری، ۵:۸۹

۶- بیہقی، دلائل النبوة، ۱۲۲-ب؛ ابن حجر، فتح الباری، ۵:۲۷۸

۷- ابن ہشام، سیرة، ۳:۳۱۴، ایک "صحیح" سند کے ساتھ جس کا سلسلہ عروہ تک جاتا ہے، لیکن یہ ان کی "مرسل" احادیث میں سے ایک ہے۔

۸- ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۳

۹- موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے بغیر کسی سند کے۔

۱۰- ابن ہشام، سیرة، ۲:۲۱۹-۲۲۰۔ ابن اسحٰق کی روایت سے بغیر سند کے۔ انھوں نے موسیٰ بن عقبہ سے ایک روایت میں بنواسد کا ذکر کیا (فتح الباری، ۷:۳۹۳)۔

۱۱- ابن تیمیہ، السیاسة الشرعیة، ص۱۳۴

۱۲- قدیم ترین مصنف جس نے بغیر سند کے اس کا حوالہ دیا ہے وہ ابومعشر السندھی (متوفی ۱۷۱ھ) ہیں (فتح الباری، ۷:۳۹۳)۔ واقدی، مغازی، ۲:۴۴۵ (بغیر سند کے)؛ ابن ہشام، سیرة، ۲:۲۲۴

۱۳- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲:۶۶-۶۷

۱۴- اس کے متعلق کوئی روایت ایسی نہیں ہے جو حدیث کے نقطۂ نظر سے صحیح ثابت ہو، لیکن چند کمزور روایات (آثار) نقل کی گئی ہیں جنہیں ان موضوعات میں قابل غور گردانا جا سکتا ہے۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶:۱۳۰؛ طبری، تفسیر، ۲۱:۳۳؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۷

۱۵- ایضاً

۱۶- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲:۶۶-۶۷؛ سفارینی، محمد بن احمد نابلوی، ثلاثیات مسند احمد، ۱:۱۹۹-۲۰۰

۱۷- صحیح بخاری، ۵:۴۵؛ ابن حجر؛ فتح الباری، ۷:۳۹۵

۱۸ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۲-۳۹۳، بخاری کے ایک "صحیح" متن سے

۱۹- ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۴:۹۹۔ ان کا کہنا ہے کہ ابن اسحٰق نے اسے بیان کیا ہے، مگر یہ منقطع

ہے۔

۲۰- ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۵، صحیح بخاری سے

۲۱- صحیح بخاری، ۵:۴۷؛ مسلم، صحیح، ۳:۱۴۳۰؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۵

۲۲- صحیح بخاری؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۵

۲۳- ایضاً؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷:۳۹۹

۲۴- صحیح بخاری، ۵:۴۷

۲۵- علی بن عبداللہ سمہودی، وفاء الوفاء، ۴:۱۲۰۸-۱۲۰۹

۲٦- صحیح بخاری، ۵:۴٦؛ مسلم، صحیح، ۳:۱٦۱۰

۲۷- مسلم، صحیح، ۴:۲۲۳۵

۲۸- احمد اور نسائی کی روایت سے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ان کی سندیں "حسن" ہیں اور حضرت براء بن عازب تک جاتی تھیں جو عینی شاہد تھے (فتح الباری، ۷:۳۹۷)۔ طبرانی نے بھی اسے روایت کیا ہے (المعجم الکبیر، ۱۱:۳۷٦)۔ ہیثمی کہتے ہیں: "اس کے افراد صحیح ہیں، سوائے عبداللہ بن احمد اور نعیم عنبری کے" (مجمع الزوائد، ٦:۱۳۱)۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل "ثقہ" ہیں، لیکن ہمیں نعیم کی سوانح دستیاب نہیں ہو سکی۔ دیکھیے: احمد، مسند، ۴:۳۰۳، ان کی سند میں میمون بصری شامل ہیں، جو "ضعیف" ہیں، لیکن حافظ ابن حجر اس سند کو "حسن" سمجھتے ہیں۔

۲۹- مسلم، صحیح، ۴:۱۸۷۹

۳۰- طبرانی نے روایت کیا (ہیثمی، مجمع الزوائد، ٦:۱۳۳)۔ انہوں نے کہا: "اس کے افراد ثقہ نہیں"۔ اس میں طبرانی کے شیخ اور ان کے شیخ شامل ہیں، لیکن ان کی سوانح ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ اسی طرح ہریر انصاری اس میں شامل ہیں جو "مقبول" ہیں، چنانچہ سند "ضعیف" ہے، لیکن یہ قلعے کے بیان سے متعلق ہے، اس لیے اس کو ذرا نرمی کے ساتھ پرکھا جا سکتا ہے۔ ابن اسحٰق نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (طبری، تاریخ الرسل والملوک، ۲:۵۷۰-۵۷۱)

۳۱- مجدالدین محمد بن یعقوب سفارینی، شرح ثلاثیات مسند احمد ۱:۱۹۹-۲۰۰؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۲۲۰؛ فیروز آبادی، المغانم المطابۃ، ص۱۳۴۔ اس سے ابن اسحٰق کے لفظ زغابہ کی تردید نہیں ہوتی جو انہوں نے غابہ کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ غابہ، زغابہ کے شمال میں واقع ہے اور اس سے بہت قریب ہے (ابن ہشام، سیرۃ، ۲۳:۲۱۵)۔

۳۲- طبری، تفسیر، ۲۱:۱۲۹-۱۳۰، عروہ اور دیگر کی "مرسل" روایت سے۔

۳۳- ابن ہشام، سیرۃ، ۲۱۶:۲، بغیر سند کے: طبری، تفسیر، ۱۲۹:۲۱-۱۳۰۔ عروہ اور دوسروں کی ''مرسل'' سے۔ ابن حجر، فتح الباری، ۳۹۳:۳ ابن اسحٰق اور ان کی سندوں سے۔

۳۴- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۶۶:۲

۳۵- ابن جوزی، وفاء الوفاء باخبار المصطفیٰ، ص ۲۹۲

۳۶- ابن ہشام، سیرۃ، ۲۲۰:۲، بغیر سند کے

۳۷- ابن حزم، جوامع السیرۃ، ص ۱۸۷

۳۸- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۶۷:۲

۳۹- ہیثمی، کشف الاستار، ۳۳۲:۱۔ بزار نے ''حسن'' سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا۔ طبرانی نے بھی اسے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ ذکر کیا ہے جس میں محمد بن عمرو لیثی شامل ہیں، یہ ''صدوق'' ہیں، لیکن غلطیاں کرتے ہیں اور دونوں روایات ان پر اعتماد کرتی ہیں۔ طبرانی کے متن میں دونوں سعد، یعنی حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کا ذکر ملتا ہے اور ان دونوں کے متعلق روایات متفق ہیں۔ وہ سعدؓ بن ربیع، سعدؓ بن خیثمہ اور سعدؓ بن مسعود کا بھی ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ ایک غلطی کا ارتکاب ہے۔ ابن ربیع اُحد میں اور ابن خیثمہ بدر کے موقع پر شہید ہو چکے تھے، تاہم اگر روایت صحیح ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ابن مسعود سے مشورہ کیا گیا تھا (الاصابۃ، ۳۶:۲)۔

۴۰- ابن حجر، فتح الباری، ۵۲:۶، ۸۰:۷، بخاری کے متن سے۔

۴۱- ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۰۳:۴۔ محمد بن اسحٰق اور موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے بغیر سندوں کے۔ بنو قریظہ کی غداری ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔

۴۲- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۶۷:۲، بغیر سند کے

۴۳- ایضاً، ۷۳:۲۔ ایسی سند کے ساتھ جس کے افراد ''ثقہ'' ہیں۔ سعید بن مسیب کی ''مراسیل'' سے جو مضبوط شمار ہوتی ہیں۔ یہ وہ مضبوط ترین روایت ہے جو اس محاصرے کے متعلق بیان کی گئی ہے۔ ابن اسحٰق نے ۲۰ طاق راتوں کا خیال ظاہر کیا ہے، لیکن انہوں نے کوئی نپی تلی تعداد نہیں بتائی۔ ابن ہشام، سیرۃ، ۲۲۴:۳

۴۴- طبری، تفسیر، ۱۲۸:۲۱۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ، لیکن یہ قتادہ کی ''مراسیل'' میں سے ہے اور ابن قیم نے اسے اختیار کیا ہے (زاد المعاد، ۱۳۱:۲)۔

۴۵- ابن حجر، فتح الباری، ۳۹۳:۷، بغیر سند کے

۴۶- ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۲: ۲۲۴؛ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲: ۶۸۔ طبری نے عمرو بن عبد وُد کی حضرت علیؓ کے ساتھ لڑائی کو زُہری کی ''مراسیل'' سے روایت کیا ہے۔ زُہری کی ''مراسیل'' کمزور ہیں، اور عکرمہ کی ''مرسل'' سند کے ساتھ جس کے افراد ''ثقہ'' ہیں (تاریخ الامم والملوک، ۳: ۴۸؛ کنز العمال، ۱۰: ۴۵۵)۔ اس واقعے کو حدیث کے نقطۂ نظر سے ''صحیح'' ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ لڑائی کا مشاہدہ ہزاروں لڑنے والوں نے کیا ہو گا اور اس قسم کی روایات مشہور و معروف ہوں گی۔

۴۷- ابن حجر، فتح الباری، ۲: ۶۸، ۷: ۲، ۱۲۳، ۴۳۴؛ ۵: ۹۲

۴۸- ایضاً، ۷: ۴۲۱-۴۲۴

۴۹- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۲۵۳

۵۰- صحیح بخاری، ۵: ۵۱

۵۱- ان کی وفات سے عرش ہل گیا اور جنت میں ان کے رومال ریشم سے بہتر ہیں (بخاری، صحیح، مناقب الانصار، ۱۲؛ مسلم، صحیح، ۴: ۱۹۱۵-۱۹۱۶)۔

۵۲- ابن ہشام، السیرۃ، ۲: ۲۲۹-۲۳۰۔ ابن اسحٰق کی روایت سے بغیر سند کے۔ واقدی، مغازی، ۲: ۴۸۵؛ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۴: ۱۱۳

۵۳- صحیح بخاری، الجھاد، ۱۵۷؛ مسلم، صحیح، الجھاد ۱۸

۵۴- صحیح بخاری، ۵: ۴۷؛ مسلم، صحیح، ۲: ۲۱۷

۵۵- مسلم، صحیح، ۳: ۲۷۴-۲۷۵

۵۶- ہیثمی، کشف الاستار، ۲: ۳۳۵-۳۳۶

۵۷- مسلم، صحیح، ۳: ۱۳۶۳

۵۸- صحیح بخاری، ۵: ۴۸

۵۹- بخاری اور مسلم (زاد المعاد، ۲: ۱۵۸۸)۔ ابن قیم نے ابن سید الناس کی اس غلطی کی نشاندہی کی ہے کہ یہ سریہ رجب ۸ھ کو روانہ کیا گیا تھا، حالانکہ محترم مہینوں کے دوران میں نہ کوئی غزوہ پیش آتا تھا اور نہ کوئی سریہ ہی روانہ کیا جاتا تھا۔ صلح حدیبیہ کی وجہ سے مسلمانوں نے قریشی قافلوں کا راستہ روکنا چھوڑ دیا تھا۔ سریۃ الخبط یقیناً معاہدۂ صلح سے قبل اور غزوۂ خندق کے فوراً بعد پیش آیا ہو گا جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔

۶۰- ابن حجر (فتح الباری، ۱: ۳۴، ۸: ۷۹) نے ایک اور امکان کا ذکر کیا ہے کہ وہ قافلے پر قبضہ کرنے

کی غرض سے نہیں، بلکہ اسے جہینہ سے بچانے کے لیے باہر گئے۔ ہم اس امکان کو قبول نہیں کرتے، کیوں کہ جہینہ اس سے قبل ہی اسلام قبول کر چکے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ معاہدے میں شریک تھے۔ اسلام قبول کرنے سے قبل وہ قریشی قافلوں کو روکا نہیں کرتے تھے، بلکہ مسلمانوں اور قریش دونوں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے، اور طرفین کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ تھے (دیکھیے: احمد، مسند، ۱: ۱۷۸؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۱: ۵۹۵)۔ حافظ ابن حجر یہ وضاحت کرتے ہیں کہ یہ واقعہ فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے کا ہے (فتح الباری، ۸: ۹۷)۔

۸

صلح حدیبیہ

حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے جو مکے کے شمال مغرب میں ۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آج کل اس کنویں کو الشمیسی کا نام دیا گیا ہے، یہی حدیبیہ کے باغات اور مسجدِ رضوان کی جائے وقوع ہے۔(۱) حدیبیہ کے کنارے حرمِ مکہ کی پرلی طرف تک نکلے ہوئے ہیں، لیکن اس کا اکثر حصہ حرم کی پشت پر ہے۔ اس غزوے کو حدیبیہ کا نام اس لیے دیا گیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں قریش نے مسلمانوں کو شہر مکہ میں داخل ہونے سے روکا تھا۔(۲)

رسول اللہ ﷺ، ذوالقعدہ ۶ ھ کے اوائل میں، پیر کے روز حدیبیہ کی جانب روانہ ہوئے۔(۳) اس مہم کا مقصد عمرہ ادا کرنا تھا(۴)، نیز ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں خانۂ کعبہ کے لیے جو سچے جذبات موجزن ہیں اور اس کے لیے تقدس و احترام کے جو احساسات پائے جاتے ہیں، ان کا کھل کر اظہار ہو جائے اور قریش کی اس غلط بیانی کا توڑ بھی ہو جائے کہ مسلمانوں کے دلوں میں کعبے کا احترام موجود نہیں ہے اور مسلمان کعبے کی حرمت کو تسلیم نہیں کرتے۔

مسلمانوں کے اس اقدام نے جزیرہ نمائے عرب پر ان کی قوت و شوکت کی دھاک بٹھا دی، بالخصوص اتحادیوں کے ناپاک عزائم کی ناکامی کے بعد اس دھاک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ قریش نے جب مسلمانوں کو شہر مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روکا تو انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وہ ایک غیر معمولی قدم اٹھا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی سے اس بات کی توقع تھی کہ قریش نہ صرف آپ کا راستہ روکیں گے، بلکہ لڑنے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنے ہمراہ لے کر نکلنا چاہتے تھے۔

آپؐ نے صحرائی بدوؤں کو بھی طلب کیا تھا اور انہیں دعوتِ جہاد دی تھی، لیکن وہ آخر وقت تک نہ آئے اور رسول اللہ ﷺ انصار اور مہاجرین کو اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہو گئے۔ قرآن کریم نے بدوؤں کے کمزور رویے کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں کیا ہے:

جو دیہاتی پیچھے رہ گئے، وہ عنقریب آپ سے کہیں گے کہ ہم کو ہمارے مال اور عیال نے فرصت نہ لینے دی، سو ہمارے لیے معافی کی دعا کر دیجیے۔ یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو، اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال پر مطلع ہے (الفتح ۴۸:۱۱-۱۲)۔

مجاہد کا بیان ہے کہ قرآنی آیات میں جن دو قبائل کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مدینے کے رہنے والے جہینہ اور مزینہ تھے۔ (۵) مسلمانوں کو اس بات کا قوی امکان تھا کہ قریش ان کا مقابلہ کریں گے، اس لیے مسلمانوں نے اپنے ساتھ ہتھیار لے لیے تھے اور پیش آمدہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ (٦) اس سے واقدی کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ مسلمان اپنے ساتھ ہتھیار لے کر نہیں گئے تھے۔ (۷)

حدیبیہ کے اس سفر میں مسلمانوں کی تعداد پندرہ سو کے قریب تھی۔ متعدد صحابہ کرامؓ نے یہ تعداد ذکر کی ہے۔ جو صحابہ کرامؓ حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے، ان کے نام یہ ہیں: حضرات جابرؓ بن عبداللہ، براءؓ بن عازب، معقلؓ بن یسار، سلمہؓ بن اکوع (۸) اور مسیّبؓ بن حزن۔ (۹) حضرت جابرؓ نے ایک روایت میں کہا ہے کہ وہ پندرہ سو تھے۔ (۱۰) عبداللہؓ بن اوفی کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد تیرہ سو تھی، پانچ چشم دید گواہوں کا اتفاق ہے کہ تعداد تیرہ سو تھی، (۱۱) اسی وجہ سے یہ روایت سب سے زیادہ مستند قرار پاتی ہے، تاہم مختلف روایات کے درمیان جو تعارض پایا جاتا ہے، وہ اتنا زیادہ نہیں ہے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں نے ذوالحُلیفہ میں نماز ادا کی اور عمرے کے لیے احرام زیب تن کیے۔ (۱۲) قربانی کے لیے ان کے پاس ستر جانور تھے۔ (۱۳) رسول اللہ ﷺ نے حضرت

بُسرؓ بن سفیان الخزاعی الکعبی (۱۴) کو جاسوس کی حیثیت سے مکے روانہ کیا۔

جب مسلمان روحاء کے مقام پر پہنچے جو مدینے سے ۷۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوقتادہ انصاریؓ کو جو حالت احرام میں نہیں تھے، غیقہ کی طرف روانہ کیا جو بحیرۂ احمر کے ساحل پر واقع ہے۔ آپؐ نے ان کے ہمراہ صحابہؓ کی ایک جماعت بھی روانہ کی، کیوں کہ آپؐ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں مشرکوں کی ایک تعداد موجود ہے۔ آپ کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں وہ مسلمانوں پر اچانک حملہ آور نہ ہو جائیں۔ حضرت ابوقتادہؓ نے اپنی جماعت کے لیے ایک زیبرے کا شکار کیا۔ جماعت کے لوگوں کو شکار کرنے کی اجازت نہیں تھی، کیوں کہ وہ حالتِ احرام میں تھے، لیکن وہ اس کے کھانے میں شریک ہو گئے۔ بعد میں انہیں اس امر میں شک ہونے لگا کہ آیا یہ کھانا ان کے لیے حلال تھا یا نہیں؟ پھر جب ان کی رسول اللہ ﷺ سے سقیا (مدینے سے ۱۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع مقام) میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپؐ سے اس بارے میں استفسار کیا۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے اس گوشت کھانے کو درست قرار دیا، بشرطیکہ انہوں نے شکار میں حصہ نہ لیا ہو۔ (۱۵)

مسلمانوں نے اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ وہ عسفان پہنچ گئے جو مکے سے ۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حضرت بسرؓ بن سفیان الکعبی نے مسلمانوں کو یہ خبریں پہنچا دی تھیں کہ قریش کو مسلمانوں کی آمد کی خبر ہو گئی ہے اور انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک فوج جمع کر لی ہے تاکہ مسلمانوں کو مکہ شہر میں داخل ہونے سے روکا جا سکے۔ خالد بن ولید ایک رسالے کے ہمراہ بطور ہراول دستہ کراع الغمیم تک نکل آئے تھے جو مکے سے ۶۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے اس سلسلے میں مشورہ فرمایا کہ آیا انہیں ان لوگوں کے علاقے پر حملہ کرنا چاہیے یا نہیں، جنہوں نے قریش کی مکمل حمایت کا ثبوت دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''لوگو! مجھے مشورہ دو! کیا تم مجھے یہ رائے دیتے ہو کہ جو لوگ بھی ہمیں خانۂ کعبہ میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں، ہم ان کے خاندانوں اور ان کی اولاد کو تباہ کر دیں۔ اگر وہ ہمارے پاس امن کی خاطر آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایک جاسوس کو نقصان پہنچائے گا، یا ہم

انہیں خراب حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھیں گے''۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپؐ زیارتِ کعبہ کے ارادے سے یہاں آئے ہیں اور آپؐ کسی کے ساتھ جنگ کرنا یا کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے، لہٰذا خانۂ کعبہ کی طرف بڑھیے اور جو شخص بھی ہمیں اس کام سے روکنے کی کوشش کرے گا، ہم اس سے لڑیں گے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: ''پھر اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو''۔ (۱۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

عسفان کے مقام پر مسلمانوں کو پتہ چلا کہ مشرکوں کا دستہ ان کے قریب ہی موجود ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو صلوٰۃ الخوف (خوف کے وقت کی نماز) کی امامت کرائی۔ (۱۷) یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ الخوف ادا کی۔ (۱۸) یہ رائے ان لوگوں کی ہے جن کے خیال میں غزوۂ ذات الرقاع خیبر کے بعد پیش آیا، اور یہی رائے مستند ہے۔ (۱۹) یہ رائے ابن اسحٰق، واقدی اور اس معاملے میں ان کی تائید کرنے والوں کی رائے سے مختلف ہے (۲۰)۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ فتح خیبر سے پہلے نہیں، بلکہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان دونوں صحابہ کرامؓ نے غزوہ ذات الرقاع (۲۱) میں حصہ لیا تھا، اس لیے یہ غزوہ لازمی طور پر فتح خیبر کے بعد پیش آیا ہوگا۔ صلوٰۃ الخوف کا واقعہ لازمی طور پر حدیبیہ میں عسفان کے مقام پر ہی پیش آیا ہوگا، کیوں کہ اس کے فوراً بعد ہی معاہدۂ حدیبیہ عمل میں آ گیا اور اس کے بعد فتح مکہ تک مکے اور اس کے گرد و نواح میں کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثنیۃ المرار کے پار ایک مشکل راستے کا انتخاب فرمایا۔ ثنیۃ المرار حدیبیہ میں ایک نشیبی علاقے کا نام ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص اس پہاڑ پر چڑھے گا (آپؐ کی مراد مرار نامی پہاڑ سے تھی)، اس کے گناہ اس طرح معاف کیے جائیں گے، جس طرح بنی اسرائیل کے معاف کیے گئے تھے''۔ جو لوگ سب سے پہلے اس پہاڑ پر چڑھے، وہ بنوخزرج کے شہ سوار تھے۔ (۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ سے بچنا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے خالد بن ولید اور ان

کے دستے سے احتراز کی خاطر اپنی فوج کا راستہ تبدیل کر دیا۔ جب خالد کو یہ معلوم ہوا تو وہ مکے واپس چلے گئے۔ قریش اپنی فوج لے کر نکلے اور بلدح (۲۳) میں مسلمانوں سے پہلے پانی کے ایک چشمے پر خیمہ زن ہو گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ پہنچے تو آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ صحابہ کرامؓ نے خیال ظاہر کیا کہ اب یہ اونٹنی نہیں اٹھے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس اونٹنی نے نہ تو چلنے سے انکار کیا ہے اور نہ یہ اس کی عادت ہی ہے، البتہ جس ہستی نے ہاتھیوں کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا تھا، اسی ہستی نے اسے اپنی جگہ پر روکا ہوا ہے''۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، کعبے کے اس تقدس اور حرمت کے سلسلے میں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے، آج قریش مجھ سے جو مطالبہ کریں گے، میں اسے قبول کروں گا''۔ (۲۴) پھر آپؐ نے اپنی سمتِ سفر تبدیل فرما دی اور مکے میں داخل ہونے کے بجائے حدیبیہ کے بعید ترین مقام پر تشریف لے گئے اور ایک کنویں کے قریب خیمہ زن ہوئے۔ کنویں میں پانی کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں نے پیاس کی شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ اسے کنویں میں رکھ دیا جائے۔ تیر کا رکھنا تھا کہ کنویں میں زور شور کے ساتھ پانی ابلنے لگا اور اس وقت تک نہ تھما، جب تک سب نے اپنی پیاس (۲۴) نہ بجھا لی (۲۵)۔ یہ رسول ﷺ کا ایک معجزہ تھا جو اس مہم کے دوران میں پیش آیا۔

رسول اللہ ﷺ قریش کی زندگی چاہتے تھے، کیوں کہ آپؐ کو یہ امید تھی کہ اگر یہ مسلمان ہو گئے تو اسلام کے لیے بہترین سرمایہ ثابت ہوں گے۔ آپؐ کا فرمان ہے: ''لوگ دھاتوں کی مانند ہیں، ان میں جو زمانۂ جاہلیت میں بہترین تھے، وہ حالتِ اسلام میں بھی بہترین ثابت ہوں گے، بشرطیکہ اسلام کو اچھی طرح سمجھ لیں''۔ اہل عرب میں قبیلۂ قریش کے لوگ سب سے زیادہ فصیح البیان اور ذہین و فطین سمجھے جاتے تھے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھتے تھے، اور زندگی کے گوناگوں تجربات کے حامل تھے۔ ان کے قبولِ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے انہیں باقی رکھنے کی جو حکمت عملی اپنائی گئی تھی، اس سے اسلامی ریاست اور اسلام کے پیغام کو کثیر فوائد حاصل ہونے کی توقع تھی، بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ توقعات بالکل درست تھیں۔

رسول اللہ ﷺ بعض اوقات قریش کی ہٹ دھرمی سے اور اس حقیقت سے پریشان ہو جایا کرتے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مسلسل جنگیں برپا کر کے اپنے آپ کو تھکا مارا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

افسوس ہے قریش پر! جنگ نے انہیں بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کا کیا نقصان تھا، اگر وہ مجھے اور اہل عرب کو تنہا چھوڑ دیتے کہ ہم جو راستہ چاہیں اختیار کریں۔ اگر وہ مجھے قتل کر دیں (جیسا کہ ان کی شدید خواہش ہے)، یا اللہ تعالیٰ مجھے ان پر فتح نصیب فرمائے، پھر وہ حلقۂ اسلام میں جوق در جوق داخل ہوں گے۔ اگر وہ یہ نہیں کرتے، تو جب تک ان کے پاس طاقت ہے، وہ جنگ کریں گے۔ قریش اب کس سوچ میں ہیں؟ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے مجھے جس کام پر مامور کیا ہے، میں اس کی خاطر لڑنے سے اس وقت تک ہرگز باز نہ آؤں گا، جب تک اللہ تعالیٰ فتح یاب نہ کر دے، یا پھر میں اس راستے میں مارا جاؤں۔ (۲۶)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعدد نمائندے اور غیر جانبدار اصحاب کو قریش کے پاس بھیجا جنہوں نے قریش کو یہ یقین دہانی کرائی کہ رسول اللہ ﷺ کسی جنگ کے ارادے سے تشریف نہیں لائے، بلکہ آپؐ کا مقصد محض خانۂ کعبہ کی زیارت اور طواف ہے۔ بدیل بن ورقہ الخزاعی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپؐ پر یہ بات واضح کر دی کہ قریش مسلمانوں کو مکے میں داخل ہونے سے روکنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے بدیل پر اپنا موقف واضح کر دیا اور بدیل نے آپؐ کا موقف قریش تک پہنچا دیا۔ (۲۷) قریش نے رسول اللہ ﷺ کا موقف جاننے کے باوجود واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ ''ہوسکتا ہے کہ وہ جنگ کے ارادے سے نہ آئے ہوں، مگر خدا کی قسم! وہ ہماری مرضی کے بغیر مکے میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ہم کبھی عربوں کو یہ کہنے کا موقع دیں گے کہ ہم نے انہیں داخلے کی اجازت دے دی تھی''۔ (۲۸)

اس موقع پر مسلمانوں کو بہر صورت سیاسی فتح حاصل ہونا تھی، خواہ وہ شہر میں داخل ہوتے اور عرب اس بارے میں چہ میگوئیاں کرتے اور خواہ وہ نہ داخل ہوتے۔ اہل عرب پر یہ

حقیقت کھل جاتی کہ جو لوگ کعبے کا ادب و احترام کا اظہار کرنے جاتے ہیں، قریش انہیں محروم واپس کر دیتے ہیں اور قریش کے اس دعوے کی بھی قلعی کھل جاتی کہ مسلمان کعبے کا احترام نہیں کرتے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش کے پاس پے در پے قاصد بھیجے اور بار بار ان پر یہ ارادہ ظاہر کیا کہ آپؐ کا مقصد محض کعبۃ اللہ کی زیارت اور طواف ہے۔ آپؐ کے قاصدوں میں سے ایک حضرت خراشؓ بن امیہ الخزاعی بھی تھے جنہیں قریش نے قتل کر دیا ہوتا، اگر احابیش اس میں رکاوٹ نہ بنے ہوتے۔ (۲۹) آپؐ حضرت عمرؓ بن خطاب کو بھی سفیر بنا کر بھیجنا چاہتے تھے، لیکن بعد میں آپؐ نے اپنی رائے تبدیل فرمالی اور اس کام کے لیے حضرت عثمانؓ بن عفان کا انتخاب فرمایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے دل میں قریش کے خلاف غیر معمولی جذبات موجزن تھے اور آپؐ نے یہ محسوس کیا کہ قریش بھی اس حقیقت سے واقف ہیں اور حضرت عمرؓ کے اپنے لوگ، یعنی بنو عدی بھی حضرت عمرؓ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیں گے، (۳۰) چنانچہ حضرت عثمانؓ بن عفان قریش کی جانب روانہ ہو گئے اور ابان بن سعید بن العاص نے انہیں اس وقت تک امان دی، جب تک انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا پیغام نہیں پہنچا دیا۔ قریش نے حضرت عثمانؓ کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو خانۂ کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں، لیکن انہوں نے حضور ﷺ سے پہلے طواف کرنا پسند نہیں کیا اور انکار کر دیا۔ قریش نے انہیں کچھ عرصے اپنے ہاں نظر بند رکھا جس سے ان کی واپسی میں تاخیر ہو گئی اور مسلمانوں نے سمجھا کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیے گئے۔ (۳۱) رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام صحابہؓ کو دعوت دی کہ وہ آپؐ کے دستِ مبارک پر وفاداری کا عہد (بیعت) کریں، چنانچہ ان سب نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ یہ بیعت ایک خار دار درخت کے سائے میں لی گئی۔ جد بن قیس واحد شخص تھا جو اس بیعت میں شامل نہیں تھا، (۳۲) وہ منافق تھا اور یہ ایک ایسا عہد تھا جسے موت تک نباہنا تھا۔ (۳۳) دیگر روایات کے مطابق صحابہ کرامؓ نے اس بات پر قسم کھائی کہ اگر انہیں اہل مکہ سے مقابلہ کرنا پڑا تو وہ میدان جنگ سے منہ نہ موڑیں گے، لیکن ان کی قسم میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ وہ جنگ میں

اپنی جان کی بازی لگا دیں گے،(۳۴) تاہم ان روایات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا، کیوں کہ بیعت سے یہی مراد تھی کہ وہ میدانِ جنگ سے رخ نہ موڑیں گے۔(۳۵)

جو صحابی سب سے پہلے آگے بڑھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی، وہ حضرت ابو سنانؓ عبداللہ بن وہب الاسدی تھے۔(۳۶) اس کے بعد تمام صحابہؓ نے یکے بعد دیگرے بیعت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے طرز عمل کو سراہا اور وفاداری کا عہد کرنے پر ان کی توصیف فرمائی: "تم لوگ دنیا کے بہترین لوگ (۳۷) ہو اور ان شاء اللہ وہ تمام لوگ جنھوں نے اس درخت کے نیچے عہد کیا ہے (اصحاب الشجرہ) دوزخ کی آگ سے محفوظ اور مامون رہیں گے"۔(۳۸) چونکہ حضرت عثمانؓ کو قریش نے نظر بند کر لیا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور فرمایا: "یہ عثمان کا ہاتھ ہے"، پھر آپؐ نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ساتھ ملایا اور فرمایا: "یہ بیعت عثمان کی طرف سے ہے"۔(۳۹) اس طرح حضرت عثمان غنیؓ کا شمار بھی ان اصحاب میں ہو گیا جنھوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا تھا، لیکن اس بیعت کے فوراً ہی بعد حضرت عثمانؓ مسلمانوں سے آ ملے۔ اس بیعت کو بیعت رضوان بھی کہا جاتا ہے، یعنی رضا مندی کی بیعت۔

قریش نے مسلمانوں سے گفت و شنید کرنے کی غرض سے اپنے متعدد نمائندے روانہ کیے۔ ان کا سب سے پہلا نمائندہ عروہ بن مسعود الثقفی تھا۔ اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کا بے انتہاء اعزاز اور اکرام کرتے ہیں، آپؐ سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہیں اور آپؐ کی اطاعت و فرماں برداری کے ہمہ وقت مشتاق رہتے ہیں۔ جب وہ قریش کے پاس واپس گیا تو بولا: "اے میری قوم! میں نے بادشاہوں کے دربار بھی دیکھے ہیں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں، لیکن خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایسا بادشاہ کوئی نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی زیادہ عزت کرتے ہوں جتنی محمد (ﷺ) کے ساتھی ان کی عزت کرتے ہیں"۔(۴۰)

اس کے بعد قریش نے احابیش کے سردار حُلیس بن علقمہ الکنانی کو روانہ کیا۔ جب

رسول اللہ ﷺ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ قربانی کے اونٹ باہر نکالیں اور ان پر تلبیہ پڑھیں، کیوں کہ حُلیس بن علقمہ ان لوگوں میں سے تھا جو ایسی چیزوں کو بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب حلیس نے یہ منظر دیکھا تو قریش کے پاس لوٹ کر گیا اور ان سے کہنے لگا: ''میں ان کے اونٹ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں جن کے گلے میں قلادے پڑے ہوئے ہیں اور وہ قربانی کے لیے تیار ہیں، میری رائے میں ان لوگوں کو زیارتِ کعبہ سے روکنا مناسب نہیں ہے''۔(۴۱) قریش نے اس کی بات کے جواب میں کہا: ''تم بدو ہو اور جاہل مطلق بھی، تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہیں بیٹھ جاؤ''۔ (۴۲) اس کے بعد قریش نے مکرز بن حفص کو روانہ کیا اور اس کے بعد سہیل بن عمرو کی سفارت آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے سہیل کو آتے دیکھ کر پرامید لہجے میں فرمایا: ''سہیل کا آنا تمہارے لیے خوش آئند ہے، اب تمام معاملات آسان ہو جائیں گے (۴۳)، کیوں کہ لفظ سہیل، **سھل** سے مشتق ہے جس کے مفہوم میں آسانی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''لوگ امن چاہتے ہیں، اسی لیے انہوں نے سہیل کو روانہ کیا ہے''۔ قریش کا اصرار تھا کہ جو معاہدہ بھی طے پائے، اس میں یہ شرط ضرور ہونا چاہیے کہ مسلمان امسال عمرہ کیے بغیر لوٹ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طویل گفت و شنید ہوتی رہی، یہاں تک کہ وہ معاہدہ طے پا گیا جسے صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۴۴)

معاہدے کو جب تحریری شکل دی جا رہی تھی، اس وقت اس کے ابتدایے کے بارے میں چند اختلافات پیدا ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ اس معاہدے میں اسلامی رنگ کی جھلک نمایاں ہو، لیکن سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب معاہدے کی دستاویز قلم بند کر رہے تھے (۴۵)۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں لکھوانا شروع کیا اور ان سے فرمایا کہ ''لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحیم ہے)'' تو سہیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: ''خدا کی قسم! میں کسی رحمٰن کو نہیں جانتا، بلکہ یوں لکھو: **باسمک اللھم** (اے اللہ تیرے نام کے ساتھ)، جیسا کہ تم لوگ پہلے

لکھا کرتے تھے''۔ مسلمانوں نے یہ سنتے ہی زور دے کر کہا کہ ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے علاوہ کچھ نہیں لکھیں گے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ہدایت کی: ''لکھو: باسمک اللّٰھم''۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو مزید املا کراتے ہوئے فرمایا: ''لکھو! یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد رسول اللہ (ﷺ) نے اتفاق کیا ہے''۔ سہیل نے دوبارہ مداخلت کرتے ہوئے کہا: ''خدا کی قسم! اگر ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مان لیا ہوتا تو ہم نہ تو آپؐ کو زیارتِ کعبہ سے روکتے اور نہ آپؐ سے کبھی جنگ ہی کرتے، بہتر ہے کہ آپؐ محمد بن عبداللہ لکھیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! میں یقیناً اللہ کا رسول ہوں، چاہے تم مجھے مانو یا نہ مانو''، پھر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ محمد بن عبداللہ ہی لکھیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہمیں زیارت اور طواف کی اجازت دی جائے''۔ سہیل نے جواب دیا: ''خدا کی قسم! تم لوگ اس سال مکہ شہر میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے، ہاں! البتہ آئندہ برس داخلے کی اجازت ہوگی''۔ اس بات کو بھی معاہدے کی ایک شق کے طور پر قلم بند کر دیا گیا۔

سہیل بن عمرو نے مزید کہا کہ تم لوگوں کو آئندہ برس مکہ شہر میں داخل ہونے کی اجازت بھی اس شرط پر دی جائے گی کہ ہمارے پاس سے جو شخص بھی فرار ہو کر تمہارے پاس جائے گا، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، تم اسے ہمیں واپس کرنے کے پابند ہو گے۔ مسلمانوں نے اس بات پر احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''سبحان اللہ! ہم ایسے شخص کو کیسے مشرکوں کے حوالے کر سکتے ہیں جو مسلمان کی حیثیت سے ہمارے پاس آیا ہو''؟ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ سہیل بن عمرو کا اپنا بیٹا ابو جندلؓ جو مسلمان ہو چکا تھا، وہاں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور مکے کے زیریں علاقے سے فرار ہو کر مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونے کی خاطر وہاں پہنچا تھا۔ سہیل نے اسے دیکھتے ہی کہا: ''محمد [ﷺ]! یہ پہلا شخص ہے، میں کہتا ہوں، اسے ہمارے حوالے کر دو''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابھی تو ہمارے درمیان معاہدے کی دستاویز بھی مکمل نہیں ہوئی''۔ سہیل نے جواب دیا: ''خدا کی قسم! میں نے تمہارے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار پھر فرمایا: ''ابو جندلؓ کو میرے پاس رہنے دو''۔ سہیل نے درشتی سے کہا: ''میں اسے ہرگز آپ کے پاس نہیں چھوڑوں گا''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا کرلو''! سہیل نے سختی سے جواب دیا: ''میں ایسا بالکل نہیں کروں گا''۔ یہ مکالمہ سن کر مکرز نے کہا: ''ہم اسے آپ کو دے دیں گے''۔ (۴۶)

اس کے بعد مندرجہ ذیل شرائط پر معاہدہ طے پا گیا:

--- دس سال تک فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے۔ اس عرصے میں لوگ امن وامان کے ساتھ رہیں گے اور ہر قسم کی جارحانہ سرگرمیوں سے اجتناب برتا جائے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر محمد [ﷺ] کے پاس آ جائے گا تو محمد [ﷺ] اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر محمد [ﷺ] کا کوئی ساتھی قریش کے پاس چلا جائے گا تو قریش کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی کہ وہ اسے محمد [ﷺ] کو واپس کریں۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف کسی دشمنی کا اظہار نہیں کریں گے اور نہ اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی خفیہ کارروائی ہی کی جائے گی۔ (۴۷) جو شخص محمد [ﷺ] کے ساتھ معاہدے میں شامل ہونا چاہے، وہ ان کے ساتھ شامل ہو جائے اور جو قریش کے ساتھ معاہدے کا شریک بننا چاہے، وہ ان کے ساتھ شریک بن سکتا ہے۔ (۴۸)

یہ سن کر قبیلہ خزاعہ نے فی الفور کہا: ''ہم محمد [ﷺ] کے ساتھ اس معاہدے میں شریک ہیں''، اور بنو بکر نے فوری طور پر قریش کے ساتھ شمولیت کا اعلان کر دیا۔

اس سال تم لوگوں کو لازماً واپس جانا پڑے گا اور تم ہماری خواہش کے بغیر مکہ شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اگلے سال تمہیں ہماری طرف سے اجازت ہو گی کہ تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکے آؤ اور تین راتیں قیام پذیر رہو، مگر اس شرط پر کہ تمہاری تلواریں نیام میں ہوں گی، اور ان کے علاوہ کوئی چیز لانے کی اجازت نہ ہو گی۔ (۴۹)

اس طرح یہ معاہدہ دس سال کے لیے طے ہو گیا۔ معاہدے کی شرائط یہ تھیں کہ مسلمان اگلے سال تک شہر مکہ میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ اگلے سال صرف تین روز قیام کر سکیں گے اور اپنی تلواریں نیام سے باہر نہیں رکھیں گے۔ معاہدے میں یہ شرط بھی طے کی گئی تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائی اور مخالفانہ نشر و اشاعت سے گریز کریں گے۔ فریقین کو یہ حق حاصل ہو گا کہ عرب قبائل کے ساتھ حلیفانہ روابط قائم کریں، نیز مسلمان ہر اس مسلمان کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے جو قریش سے بھاگ کر مسلمانوں کے پاس گیا ہو گا، مگر قریش کے اوپر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی، یعنی اگر کوئی شخص مسلمانوں سے فرار ہو کر ان کے پاس آئے تو وہ اسے مسلمانوں کے حوالے کریں۔

مسلمانوں کو اس معاہدے پر اطمینانِ قلبی حاصل نہیں تھا، بالخصوص اس وقت مسلمانوں کے جذبات سخت مجروح ہوئے جب معاہدے کی دستاویز سے توحید اور رسالت کے اظہار کو مٹایا گیا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے، جو اس دستاویز کو قلم بند کر رہے تھے، اس میں تأمل کیا کہ لفظ "رسول اللہ" کو اپنے ہاتھ سے مٹائیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہاتھ سے دستاویز لے لی اور کسی اور کو حکم دیا کہ وہ دستاویز میں وہی الفاظ لکھ دیں جو سہیل بن عمرو لکھوانا چاہتا تھا۔(۵۰) مسلمانوں کو اس بات کا بھی شدت سے ملال تھا کہ قریش کے مظالم سے تنگ آ کر جو مسلمان بھاگ کر ان کے پاس آ جائے گا، اسے واپس قریش کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا: "یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا آپؐ معاہدے کی اس شق پر راضی ہیں"؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: "ہاں! کیوں کہ جو شخص ہم سے بھاگ کر قریش کے پاس جائے گا، اس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور جو شخص قریش سے بھاگ کر ہمارے پاس آئے گا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ ضرور کوئی راستہ نکالے گا"۔(۵۱)

حضرت عمرؓ بن خطاب شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں جا پہنچے اور معاہدے کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: "میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپؐ اللہ کے سچے پیغمبر نہیں ہیں! آپؐ نے فرمایا 'ہاں'۔ پھر عرض کیا 'کیا ہم حق پر اور

ہمارا دشمن باطل پر نہیں ہے!' آپؐ نے فرمایا: 'ہاں بے شک'۔ میں نے عرض کیا۔ 'پھر ہم اپنے دین کو نیچا کیوں کریں؟' رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: 'بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا، وہی میرا کارساز حقیقی ہے'۔ میں نے پوچھا: 'کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم خانۂ کعبہ کی زیارت اور طواف کریں گے؟' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'ہاں یقیناً میں نے ایسا کہا تھا، مگر کیا میں نے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال طواف کرو گے؟' میں نے جواب دیا: 'نہیں، آپؐ نے یہ تو نہیں کہا تھا'۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'بلاشبہ تم ضرور ایک دن کعبے کی زیارت کرو گے اور اس کے گرد طواف بھی کرو گے۔'' (۵۲) حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے پوری تسلی نہیں ہوئی اور وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے اور ان کے سامنے یہی سوالات رکھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے تمام باتیں سننے کے بعد فرمایا: ''عمر! جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، اس پر خاطر جمع رکھو اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں''۔ (۵۳) حضرت عمرؓ نے یہ سن کر جواب دیا: ''بخدا میں بھی یہی یقین رکھتا ہوں''۔ (۵۴)

حضرت عمرؓ کہتے ہیں: ''اس روز میں نے رسول اللہ ﷺ کی جناب میں جس انداز سے گفتگو کی، اس کا خوف ہمیشہ اپنے دل میں پاتا ہوں اور اس کی تلافی کے لیے مسلسل صدقہ کرتا ہوں، غلام آزاد کرتا ہوں اور روزے رکھتا رہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ شاید اس کے ذریعے میرا معاملہ سدھر جائے''۔ (۵۵)

حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کے ساتھ جو بحث کی، اس کا مقصد دراصل اس حکمت کا پتا لگانا تھا جو ان کڑی شرائط کی قبولیت کے اندر پوشیدہ تھی۔ وہ مشرکوں کو ہر حال میں کمزور دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا اور کیا، اس کی ٹھوس وجوہ تھیں اور وہ اپنی ہر سعی پر عند اللہ ماجور ہوں گے، کیوں کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ حالات کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ (۵۶)

مسلمان جس وقت روانہ ہوئے تھے تو مکہ شہر میں داخل ہونے کے لیے پُر جوش اور پُرعزم تھے، لیکن جب معاہدے کی شرائط طے پانے لگیں تو ان پر یاس والم کی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ مایوسی اور رنج کی شدّت سے ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ اس وقت

کی بات ہے جب حضرت ابوجندلؓ کو قریش کے حوالے کیا جا رہا تھا اور وہ مسلمانوں سے تڑپ تڑپ کر التجا کر رہے تھے کہ "اے مسلمانو! کیا تم مجھے دوبارہ مشرکوں کے ظالمانہ شکنجے میں کسوا رہے ہو، تاکہ وہ مجھے میرے دین سے ورغلائیں"؟ رسول اللہ ﷺ نے ان کی التجا سن کر فرمایا: "ابوجندلؓ! صبر کرو اور اپنے اوپر قابو رکھو، اللہ تعالیٰ تمہیں اور تم جیسے تمام بے یار و مددگار لوگوں کو اس تکلیف سے ضرور نجات عطا فرمائے گا"۔ (۵۷) حضرت عمر فاروقؓ ابوجندل کے قریب گئے اور انہیں باپ کے خلاف اکساتے ہوئے ان کی تلوار ان کے باپ کے سر پر لہرا دی، لیکن حضرت ابوجندلؓ نے کوئی کارروائی نہیں کی اور انہیں قریش کے حوالے کر دیا گیا۔ (۵۸)

جنگِ صفین کے موقع پر حضرت سہلؓ بن حنیف نے جو بات کہی وہ مسلمانوں کے ان جذبات کی ہو بہو ترجمانی کرتی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت ان کے دلوں میں موجزن تھے۔ انہوں نے کہا: "ہمیں اس واقعے کے ذریعے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، کیوں کہ میں پوری طرح اس بات پر مائل تھا کہ ابوجندلؓ کے معاملے میں اپنی رائے پر عمل کروں، اگر مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا تو میں ضرور کر گزرتا (اور کافروں سے جنگ کرتا)"۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کرام اپنی اس سوچ پر ہمیشہ نادم اور پشیمان رہے جو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے خلاف ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ بعدازاں وحی کے ذریعے بھی یہ بات واضح کر دی گئی کہ اس موقع پر حضور ﷺ کی رائے ہی درست اور صائب تھی۔ جونہی صحابہ کرامؓ کے علم میں یہ بات آئی کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے تو ان سب نے بلاتفریق سرِ تسلیم خم کر دیا: "اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں ہے، جبکہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو اپنے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے" (الاحزاب ۳۳:۳۶)۔

قریش نے مذاکرات کے دوران میں اور معاہدے کی تکمیل کے بعد بھی مسلمانوں کو اشتعال دلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ کارروائی سردارانِ قریش کے اشارے پر ہو رہی تھی، یا ناپختہ ذہن کے نوجوان لڑکے ان سرگرمیوں میں ملوث تھے، بہرحال مسلمانوں

نے ان حالات کا مقابلہ نہایت نظم وضبط کے ساتھ کیا۔ ۸۰ اشخاص ایسے تھے جن کا تعلق مکے سے تھا اور وہ مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کے درپے تھے، انہیں موقع پر گرفتار کر لیا گیا اور حضور ﷺ نے انہیں معاف فرما کر رہا کر دیا۔ (۵۹) مزید براں جب معاہدے کی دستاویز لکھی جا رہی تھی، قریش کے ۳۰ افراد ایسے تھے جو اس وقت مسلمانوں کی چھاؤنی پر حملہ کرنے کے ارادہ سے آگے بڑھے۔ مسلمانوں نے انہیں موقع پر ہی گرفتار کر لیا، بعد میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں بھی رہا کر دیا۔ (۶۰)

مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان معاہدۂ امن طے ہونے اور آپس میں میل ملاقات شروع ہو جانے کے باوجود مشرکین کے چار افراد ایسے تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر بہتان تراشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپؐ کے ایک صحابی حضرت سلمہؓ بن اکوع نے ان چاروں افراد کو گرفتار کیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپؐ نے ان لوگوں کو بھی اسی جذبۂ رحمت کے ساتھ معاف فرما دیا جس جذبے سے آپؐ نے اس سے قبل ان ۸۰ مشرکوں کو معاف فرما دیا تھا جنہیں مسلمانوں نے معاہدے کی تکمیل کے بعد گرفتار کیا تھا۔ اس واقعے کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: ''اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے عین مکہ میں روک دیے، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا'' (الفتح ۴۸:۲۴)۔ (۶۱)

مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ معاہدے کی شرائط ان کے حق میں نہیں ہیں، وہ اس پر اتنے زیادہ افسردہ اور ملول تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے جانور قربان کریں اور سر منڈوائیں تو ایک مسلمان بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اپنا حکم دہرایا، مگر تمام مسلمان اپنی جگہ اس طرح ساکت وصامت بیٹھے رہے جیسے آخری لمحات میں بھی انہیں یہ امید ہو کہ معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں نے دیکھا کہ حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کی تجویز پر رسول اللہ ﷺ خود اٹھے کہ قربانی کریں اور سر منڈوائیں تو سارا مجمع اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی اپنی قربانیاں کرنے اور سر منڈوانے میں مشغول ہو گیا، لیکن ان پر یاس والم کی ایسی شدید کیفیت طاری تھی کہ ایک دوسرے کا سر مونڈتے

ہوئے قریب تھا کہ ان کے ہاتھ بے قابو ہو جائیں اور سر زخمی ہو جائیں۔(۶۲) جن لوگوں نے اپنے سر منڈوائے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان سب کے حق میں تین مرتبہ دعائے خیر کی اور جن لوگوں نے محض بال ترشوا لیے تھے، ان کے لیے صرف ایک مرتبہ دعا فرمائی۔(۶۳) مسلمانوں نے کل ۷۰ اونٹ قربان کیے(۶۴) جن میں سے ہر اونٹ میں سات حصے دار تھے۔(۶۵)

رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر وہ اونٹ ذبح فرمایا جو ایک زمانہ میں ابوجہل کی ملکیت میں تھا اور مسلمانوں کو بدر کے موقع پر مالِ غنیمت میں ہاتھ لگا تھا۔ مشرکینِ مکہ اس اونٹ کو قربان ہوتے دیکھ کر غصے سے بے تاب ہو گئے۔(۶۶) یہ تمام قربانیاں حدیبیہ کے مقام پر کی گئیں جو حرم کی پشت پر واقع ہے،(۶۷) لیکن حضرت ناجیہؓ بن جندب قربانی کے چند جانور حدودِ حرم کے اندر لے گئے اور انہیں وہاں ذبح کیا۔(۶۸) اس طرح مسلمان حالتِ احرام سے باہر آ گئے۔ وہ احرام جو انہوں نے عمرے کی نیت سے باندھا تھا، اتار دیا گیا اور ہمیشہ کے لیے یہ قانون تشکیل پا گیا کہ جس شخص کو عمرہ ادا کرنے سے روکا جائے گا، وہ عمرہ ادا کیے بغیر بھی حالت احرام سے باہر آ سکتا ہے۔

حدیبیہ میں ۲۰ روز(۶۹) قیام کرنے کے بعد صحابہ کرامؓ نے مدینے واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس پورے سفر میں تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ صرف ہوا۔(۷۰)

سفرِ حدیبیہ کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت کعبؓ بن عجرہ کو ان کی علالت کے سبب سر منڈوانے کی اجازت دے دی تھی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ فدیے کے طور پر ایک عدد بھیڑ ذبح کریں، یا تین دن کے روزے رکھیں، یا چھ محتاجوں کو کھانا کھلائیں۔ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ''البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو، یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو فدیہ دے دے روزے سے، صدقے سے، یا قربانی سے'' (البقرۃ ۲:۱۹۶)۔(۷۱)

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ اجازت بھی دی کہ بارش کے دوران میں وہ اپنے خیموں کے اندر نماز ادا کر سکتے ہیں۔(۷۲)

اسی مہم کے دوران میں ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے

شوریٰ کا اصول اختیار فرمایا، مثال کے طور پر آپؐ نے مسلمانوں سے اس معاملے میں مشورہ فرمایا کہ آیا مشرکوں کے علاقے پر حملہ کرنا اور ان کے بچوں کو گرفتار کرنا چاہیے یا نہیں، پھر اس معاملے میں آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو اختیار فرما لیا۔ اسی سفر کے دوران میں وہ موقع بھی آیا جب آپؐ نے حضرت ام سلمہؓ سے مشاورت فرمائی کہ آپؐ نے لوگوں کو قربانی کرنے اور سر منڈوانے کا حکم دیا، لیکن لوگوں میں کوئی جنبش نہیں ہوئی، پھر آپؐ نے حضرت ام سلمہؓ کے دیے ہوئے مشورے پر عمل فرمایا۔

حدیبیہ ہی کی مہم سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کفار کے ساتھ امن کے معاہدے کی زیادہ سے زیادہ مدت کتنی ہوتی ہے، کیوں کہ اب تک مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات امن کے بجائے جنگ کی بنیاد پر تھے۔ اسی طرح ہمیں اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ کفار کے ساتھ امن کا ایسا معاہدہ کرنے کی اجازت ہے جس میں یہ شرط لگا دی جائے کہ مسلمان ہر اس شخص کو واپس بھیج دیں گے جو اسلام کی حالت میں ان کے پاس آئے گا۔

اسی سفر میں رسول اللہ ﷺ نے چند ایسے نکات کی وضاحت بھی فرمائی جن کا تعلق اسلامی عقائد اور اصولوں سے تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''جس کسی نے یہ کہا کہ فلاں فلاں ستارے کی بدولت ہم پر بارش نازل کی گئی ہے، وہ دراصل اللہ پر ایمان رکھنے والا نہیں ہے، بلکہ ستارے پر ایمان رکھتا ہے''۔ (۷۳) آپؐ کے عمل سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ آدمی کو پُر امید اور رجائیت پسند ہونا چاہیے، کیوں کہ جب آپؐ نے قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کے نام کی مناسبت سے پُر امید لہجے میں فرمایا: ''اب حالات سہل [یعنی آسان] ہو جائیں گے''۔ (۷۴)

اس مہم کے دوران میں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کی استعمال کردہ کسی چیز کو برکت کی خاطر استعمال کرنا جائز ہے، مثال کے طور پر اسی پانی سے وضو کرنا جس سے رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا ہو، لیکن یہ اجازت محض رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس تک ہی محدود ہے اور امت کے صلحاء اور متقین اس میں شامل نہیں ہیں۔ (۷۵)

مدینے واپس جاتے ہوئے ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمان اتنی گہری نیند سو گئے کہ فجر کی نماز بھی قضا ہوگئی۔ لوگوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج اپنی تمازت بکھیر رہا تھا، حضرت بلالؓ بن رباح جو پہرہ دینے پر مامور تھے، وہ بھی بے خبر سو گئے۔ اس روز مسلمانوں نے مقررہ وقت گزر جانے کے بعد نمازِ فجر ادا کی۔ اسی وقت سے یہ سنت قائم ہوگئی کہ اگر کوئی شخص نیند یا بھول کی وجہ سے وقت پر نماز ادا نہ کر سکے تو وقت گزرنے کے بعد اسے ادا کر لے۔ (۷۶)

مدینے واپسی کے دوران میں رسول اللہ ﷺ کا یہ معجزہ بھی سامنے آیا کہ خوراک اور پانی میں غیر معمولی برکت پیدا ہوگئی۔ حضرت سلمہؓ بن اکوع کہتے ہیں:

ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مہم پر روانہ ہوئے۔ تھکن اور بھوک سے ہمارا بُرا حال تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اپنے چند اونٹ ذبح کر لیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہم سب کو یہ حکم دیا کہ جس کے پاس جتنا کھانا ہو، سب لے کر آ جائے، چنانچہ ہم نے چمڑے کا ایک دسترخوان بچھایا اور اس پر تمام کھانا لا کر جمع کر دیا۔ میں نے گردن بڑھا کر دسترخوان کی طرف دیکھا تا کہ یہ معلوم کروں کہ کتنا کھانا جمع ہوگیا ہے تو میں نے دیکھا کہ کھانے کا ڈھیر اتنا اونچا لگا ہے جتنا بیٹھی ہوئی ایک بھیڑ کا حجم ہوتا ہے۔ ہم سب لوگ مل کر ۱۴۰۰ کی تعداد میں تھے۔ ہم سب نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور اپنے اپنے برتن بھی کھانے سے بھر لیے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا وضو کے لیے پانی موجود ہے''؟ ایک شخص ایک مشکیزہ لے کر حاضرِ خدمت ہوا جس میں چند قطرے پانی تھا۔ اس نے اس پانی کو ایک برتن میں انڈیل دیا۔ ہم سب لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا اور خوب کثرت سے استعمال کیا، اور ہماری تعداد ۱۴۰۰ تھی۔ (۷۷)

واپسی کے وقت دورانِ سفر میں سورۃ فتح نازل ہوئی: ''بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی'' (الفتح ۴۸:۱)۔ (۷۸)

رسول اللہ ﷺ نے اس سورۃ کے نزول پر گہری خوشی کا اظہار کرتے ہوئے

فرمایا: ''آج رات مجھ پر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے جو مجھے ان تمام اشیاء سے زیادہ عزیز ہے جن کے اوپر سورج طلوع ہوتا ہے، (یعنی دنیا و مافیھا)''۔ (۷۹)

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت ''بے شک ہم نے آپ کو کھلی فتح دی''، صلح حدیبیہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (۸۰) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اس میں آپ کا تو بھلا ہو گیا، مگر ہمارا کیا ہوگا؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایسی بہشت میں داخل کرے جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی'' (الفتح ۴۸:۵)۔

آیت ربانی سنتے ہی لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑ پڑے۔ اس وقت آپؐ اپنے اونٹ پر سوار تھے۔ آپؐ نے لوگوں کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''بے شک ہم نے تمہیں کھلی فتح سے نوازا ہے''۔ ایک شخص نے سوال کیا: ''یا رسول اللہ! کیا یہ ہماری فتح ہے''؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں، بے شک! قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یقیناً یہ ہماری فتح ہے''۔ (۸۱) مسلمانوں کا حسرت و ملال یکدم فرحت و شادمانی سے تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ اس معاہدے کی حکمتوں اور اس کے ممکنہ نتائج کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے اور حکمِ خداوندی کی اطاعت ہی ان کے اور دعوت اسلامی کے حق میں بہتر ثابت ہوگی۔

بعد کے واقعات نے بھی اس امر کی تصدیق کر دی کہ اس معاہدۂ امن کے اندر کتنی گہری حکمتیں پوشیدہ تھیں اور اس مہم کے نتائج کس قدر عالی شان اور شاندار ثابت ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کھلی فتح کا نام دیا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ اسی موقع پر قریش نے پہلی بار مسلمانوں کے وجود کو تسلیم کیا اور ان سے مساوی سطح پر معاملات طے کیے۔ اس سے قبل وہ لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی بدترین تصویر پیش کیا کرتے تھے۔ نہ صرف شہر مکہ، بلکہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر اس معاہدے کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس کا پہلا اظہار یہ ہے کہ قبیلہ خزاعہ نے قریش سے بے خوف ہو کر مسلمانوں سے اتحاد کا اعلان کر دیا۔ یہ نیا طرزِ عمل تاریخ میں گہری جڑیں بنا رہا

تھا، کیوں کہ خزاعہ اور کنانہ کے بنو بکر کے درمیان پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ قریش کے رویے نے، جو بنو بکر کے ساتھ جانبداری برتتے تھے، خزاعہ کو اس پر مجبور کیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کرلیں۔ یہی وہ معاہدہ ہے جس کا حوالہ عمر بن سالم نے اپنے قصیدے میں ''ہمارے آباء واجداد کے مابین قدیم حلیفانہ تعلقات'' کے الفاظ سے دیا ہے، جس میں انہوں نے فتح مکہ سے قبل رسول اللہ ﷺ سے مدد طلب کی تھی۔ (۸۲)

ریاستِ مدینہ کے قیام کے آغاز سے ہی قبیلہ خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر اس نے مسلمانوں کے ساتھ کھلم کھلا اپنے معاہدے کا اعلان کر دیا۔ ''مسلمانوں کے ساتھ ساتھ خزاعہ کے مشرکین بھی مکے میں رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے اور خفیہ مشورے بھی دیتے تھے''، (۸۳) تاہم خزاعہ نے مسلمانوں کے بارے میں اپنے جذبات اور احساسات کو اس وقت تک قریش سے پوشیدہ رکھا جب تک مسلمانوں کے ساتھ علی الاعلان اتحاد کا اظہار نہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خزاعہ اتنے طویل عرصے تک مسلمانوں کے ساتھ اپنے تعلقات برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے مشرکین کی جانب سے امن حاصل ہو گیا۔ اس دوران میں انہوں نے اپنی تمام تر توجہ خیبر کے یہودیوں پر مرکوز کر دی جو مسلمانوں کے خلاف مسلسل اشتعال انگیزی میں مصروف تھے۔

اس عرصے میں مسلمانوں کو اسلام کی نشر واشاعت کا بھی خوب موقع ملا۔ زہری کہتے ہیں: ''اس سے پہلے اسلام کو اتنی بڑی فتح نصیب نہ ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا مشرکوں سے، جب بھی واسطہ پڑا، نتیجہ جنگ کی شکل میں نکلا تھا، لیکن اب دونوں گروہوں نے آپس میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا تھا۔ سب لوگ امن کی حالت میں ایک دوسرے سے ملتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا تھا جو سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اسلام کے متعلق گفتگو نہ کرتا اور اس میں داخل ہوئے بغیر رہ جاتا۔ دو سال کے قلیل عرصے میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ان تمام مسلمانوں سے دو چند ہو گئی جو اب تک مسلمان ہوئے تھے''۔ (۸۴) ابن ہشام کہتے ہیں: ''زہری کی رائے کی تائید

اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کی جانب روانہ ہوئے تو آپؐ کے ساتھیوں کی تعداد ۱۴۰۰ تھی، لیکن جب آپؐ دو سال بعد فتحِ مکہ کے ارادے سے نکلے تو آپؐ کے ہمراہ دس ہزار مسلمانوں کا جمِ غفیر تھا''۔(۸۵)

اس معاہدے میں جو حکمتیں پنہاں تھیں، وہ بہت سے مواقع پر ظاہر ہوئیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینے واپس پہنچ گئے تو ایک مسلمان حضرت ابو بصیرؓ قریش سے فرار ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے۔ قریش نے فوراً دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس روانہ کیے تاکہ معاہدے کی رو سے حضرت ابو بصیرؓ کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد کا پاس کرتے ہوئے حضرت ابو بصیرؓ کو ان کے حوالے کر دیا۔ جب وہ لوگ حضرت ابو بصیرؓ کو لے کر مکے جا رہے تھے تو حضرت ابو بصیرؓ نے نہایت مستعدی سے کام لیتے ہوئے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرے شخص نے جب اپنے ساتھی کا یہ انجام دیکھا تو وہ مدینے کی طرف فرار ہو گیا اور حضرت ابو بصیرؓ اس کے تعاقب میں مدینے پہنچے۔ جب یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے تو حضرت ابو بصیرؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہؐ! آپؐ نے اپنا عہد پورا کر دیا، اب آپؐ کے اوپر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ آپ نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے ان لوگوں کے حوالے کر دیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان لوگوں سے نجات دی''۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: ''خدا اِس کا بھلا کرے! اگر اس کے ساتھ اور لوگ ہوتے تو یہ ضرور جنگ کی چنگاری کو بھڑکا دیتا''۔ حضرت ابو بصیرؓ یہ جملہ سن کر سمجھ گئے کہ انہیں دوبارہ قریش کے حوالے کر دیا جائے گا، لہٰذا وہ مدینے سے فرار ہو گئے اور سیف البحر نامی مقام پر جا کر سکونت اختیار کر لی۔(۸۶)

مکے میں جو مسلمان مشرکوں کے مظالم کا نشانہ بن رہے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سن کر یہ سمجھ گئے کہ حضرت ابو بصیرؓ کو ساتھیوں کی ضرورت ہے، اس لیے انہوں نے بھی مکے سے فرار کا راستہ اختیار کیا اور حضرت ابو بصیرؓ کے پاس سیف البحر پہنچ گئے۔ بعد میں سہیل بن عمرو کے بیٹے حضرت ابو جندلؓ بھی انہی لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان سب نے مل کر اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ اس گروہ نے قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ روک کر ان کی دولت کو لوٹنا

شروع کر دیا۔ آخر قریش نے تنگ آ کر رسول اللہ ﷺ کے نام پیغام بھیجا اور اللہ کا واسطہ اور اپنی رشتے داری کا حوالہ دے کر آپؐ سے التجا کی کہ حضرت ابو بصیرؓ کے گروہ کو اپنے پاس بلا لیں۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ جو مسلمان بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینے چلا جائے گا، وہ قریش سے محفوظ ہو جائے گا، (یعنی قریش اب اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے)، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بصیرؓ کی جماعت کو مدینے بلا بھیجا۔ (۸۷) یہ لوگ العیث کے علاقے میں پناہ گزیں تھے، آپؐ کے طلب کرنے پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ان کی تعداد ساٹھ ستر کے لگ بھگ تھی۔ (۸۸)

حضرت ابو جندلؓ اور حضرت ابو بصیرؓ نے اپنے ایمان کی خاطر بے حد مصائب برداشت کیے تھے، لیکن انہوں نے غیر معمولی استقامت، خلوصِ نیت اور پختہ عزم کا مظاہرہ کیا، اور اس وقت تک اپنی جدو جہد جاری رکھی جب تک مشرکین کو نیچا نہیں دکھا دیا اور انہیں اس بات پر مجبور نہیں کر دیا کہ حدیبیہ میں انہوں نے مسلمانوں پر جو کڑی شرط لگائی تھی، اسے واپس لے لیں۔ یہ واقعہ اس بات کی ایک روشن مثال ہے کہ ایمان کے ساتھ دلی وابستگی کیا چیز ہے اور پھر اس کی خاطر کس طرح جدو جہد کی جاتی ہے۔ اسی واقعے سے یہ اصول بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک فرد وہ کام کر سکتا ہے جو پورا معاشرہ نہیں کر سکتا۔ حضرت ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے مشرکوں کو اس وقت نقصان پہنچایا، جب پوری اسلامی ریاست ایسا کرنے سے قاصر تھی، کیوں کہ وہ مشرکین کے ساتھ صلح اور امن کی شرائط طے کر چکے تھے۔ حضرت ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھی کم از کم ظاہری طور پر ریاستِ مدینہ کی عملداری سے خارج تھے، لیکن انہوں نے اور مکے کے تمام مظلوم مسلمانوں نے یہ تمام کارروائی محض اپنی صوابدید پر نہیں کی، بلکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی رضا بھی شامل تھی۔ اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو ابتداء ہی میں حضرت ابو بصیرؓ کو اس بات سے منع کر دیتے کہ وہ قریشی قافلوں پر حملے نہ کریں اور مکے واپس چلے جائیں، لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا، اور یہ آپؐ کی رضا مندی کی علامت تھی۔ حضرت ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا، وہ عین دانش مندی تھی۔ انہوں نے مکے میں رہ کر مظالم سہنا گوارا نہ کیا اور نہ یہ برداشت کیا

کہ انہیں ان کے دین سے ورغلانے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ انہوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے انہیں ایک طرف اہل مکہ کے مظالم سے رہائی مل گئی اور دوسری طرف ان کی ان کارروائیوں سے ریاستِ مدینہ کو مدد ملی، کیوں کہ ان کارروائیوں سے قریش کی اقتصادیات کو زک پہنچی تھی۔ ان کارروائیوں کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ قریش کو امن کے اس معاہدے کے دوران میں بھی اپنے تحفظ کی فکر لاحق رہی، بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے پر بالواسطہ ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، کیوں کہ آپؐ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ ''اگر ابوبصیرؓ کے ساتھ اور لوگ بھی ہوتے تو یہ ضرور مشرکین کے خلاف جنگ برپا کر دیتا''۔

متذکرہ تمام وجوہ کی بناء پر، نیز اس وجہ سے بھی کہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا، سپاہیوں اور ان کے سربراہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی، اعتماد اور تعاون موجود تھا، اس واقعے کا مسلمانوں پر مدینے میں، یا بیرونِ مدینہ کوئی منفی اثر نہیں پڑا، بلکہ اس کے ثمرات سے تمام مسلمان مستفید ہوئے۔

معاہدے کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے صرف ان مسلمان مردوں کو قریش کے حوالے کیا تھا جو مکے سے فرار ہو کر آئے۔ آپؐ نے کسی ایسی خاتون کو مکے واپس نہیں بھیجا تھا جو ہجرت کر کے مدینے آ گئی ہو۔ حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ بن ابی معیط وہ خاتون تھیں جو ایک مہاجر کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ان کے اہل خاندان نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں واپس نہیں بھیجا۔ اس ضمن میں یہ قرآنی آیت نازل ہو گئی تھی:

جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان کر لیا کرو۔ ان کے ایمان کو اللہ ہی خوب جانتا ہے، پس اگر ان کو مسلمان سمجھو تو ان کو کفار کی طرف واپس مت کرو۔ نہ تو وہ عورتیں ان کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافران عورتوں کے لیے حلال ہیں (الممتحنہ ۶۰:۱۰)(۸۹)

رسول اللہ ﷺ مکے سے آنے والی خواتین کا امتحان لیا کرتے تھے۔ جب آپؐ یہ دیکھتے کہ ان خواتین نے اپنا دین بچانے کی خاطر مکے سے مدینے ہجرت کی ہے تو آپؐ انہیں مدینے میں قیام کرنے کی اجازت دیتے اور ان کے شوہروں کو ان کے مہر کی رقوم ادا کر دیتے تھے، جب کہ صلح حدیبیہ سے قبل رسول اللہ ﷺ مہر کی یہ رقوم ادا نہیں فرمایا کرتے تھے۔ (۹۰)

مسلم خواتین کو قریش کے حوالے نہ کرنے کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ معاہدے کی شرائط میں خواتین شامل نہ تھیں، بلکہ یہ صرف مردوں سے مخصوص تھا۔ صحیح بخاری میں اس معاہدے کا جو متن نقل کیا گیا ہے، اس میں یہ شرط ان الفاظ کے ساتھ درج ہے: ''ہمارے کسی مرد کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ آپؐ لوگوں کے پاس آئے اور آپؐ کے ساتھ رہنے لگے''۔ (۹۱) دوسری وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم کی ایک آیت ایسی تمام شرائط کو منسوخ کر دیتی ہے جو خواتین کے متعلق ہوں: ''جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان کر لیا کرو---'' (الممتحنه ۶۰: ۱۰)۔ (۹۲)

اس آیت کے ذریعے مسلمان خواتین کو مشرک مردوں سے شادی کی ممانعت کر دی گئی، اگرچہ ابتدائے اسلام میں انہیں ایسا کرنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح مسلمان مردوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مشرک خواتین کے ساتھ شادی کے بندھن کو توڑ دیں: ''اور کافر عورتوں کی ناموس کو اپنے قبضہ میں نہ رکھو'' (الممتحنه ۶۰: ۱۰)۔ (۹۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن عاص نے، جو مکے کے دو نامور اصحاب تھے، اس وقت اسلام قبول کیا اور مدینے ہجرت کی، جب قریش اپنی یہ شرط ختم کرنے کا اعلان کر چکے تھے جس کی رو سے مکے سے مدینے جانے والے مسلمانوں کی واپسی ضروری تھی۔ یہ استنباط اس لیے ہے کہ قدیم مآخذ میں ایسا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ قریش نے ان اصحاب کی واپسی کا مطالبہ کیا ہو۔

فریقین کے درمیان ہتھیاروں کے استعمال کی پابندی تقریباً ۱۷ یا ۱۸ ماہ جاری رہی، ایک روز قریش نے یہ پابندی توڑ دی۔ ہوا یوں کہ مکے کے نزدیک الوتیر کے مقام پر بنو بکر

نے ، جو قریش کے حلیف تھے، مسلمانوں کے حلیف خزاعہ پر حملہ کر دیا، اور اس حملے میں قریش بھی شریک ہو گئے۔ (۹۴) خزاعہ نے مسلمانوں سے مدد طلب کی۔ اس طرح صلح کا یہ معاہدہ کالعدم ہو گیا۔ اس معاہدے کے کالعدم ہونے کا نتیجہ فتح مکہ کی شکل میں سامنے آیا۔

حواشی

۱- بلدی، عتیق بن غیث، **نسب حرب**، ص ۳۵۰

۲- ابن قیم، **زاد المعاد**، ۳: ۳۸۰

۳- بیہقی، **دلائل النبوۃ**، ۴: ۲۱۲۔ یعقوب بن سفیان کی روایت سے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ مروی ہے، لیکن یہ حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافع کی ''مراسیل'' میں سے ہے۔ اس تاریخ پر یہ تمام علمائے کرام متفق ہیں: نووی، **المجموع**، ۷: ۷۸؛ ابن کثیر، **البدایۃ والنھایۃ**، ۴: ۱۶۴؛ ابن حجر، **التلخیص الحبیر** ۴: ۹۰۔ پہلے علماء جنھوں نے واضح طور پر اس دن کو پیر لکھا ہے، وہ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد ہیں۔ واقدی، مغازی، ۲: ۵۷۳؛ ابن سعد، **الطبقات الکبری**، ۲: ۲۹۵

۴- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۱۷۷۸)

۵- طبری، **تفسیر**، ۲۶: ۷۷، ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ مروی روایت جو مجاہد تک جاتی ہے اور ''مرسل'' ہے۔

۶- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۴۱۷۹)

۷- واقدی، **مغازی**، ۲: ۵۷۳

۸- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۴۱۵۱)؛ مسلم، **صحیح**، **کتاب الامارۃ**، ص ۷۶، **کتاب الجھاد و السیر**، ص ۱۳۲

۹- یحیی بن معین، **تاریخ**، ۱: ۳۲۱؛ بیہقی، **دلائل النبوۃ**، ۲: حصہ ۲: ۴۔ اس میں قتادہ کا ''عنعنہ'' شامل ہے، لیکن اس سے روایت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، کیوں کہ اس کی اصل **صحیح** میں ہے۔

۱۰- بخاری، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۱۴۵۳، ۳۵۷۶)؛ مسلم، **صحیح**، **کتاب الامارۃ**، ص ۷۳

۱۱- مسلم، **صحیح**، **کتاب الامارۃ**، ص ۷۵

۱۲- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۱۶۹۴- ۱۶۹۵)۔ اس سے غزوے سے قبل

میقات کی حدود کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

۱۳- احمد، مسند، ۴: ۳۲۳۔ ''حسن'' سند کے ساتھ روایت ہے۔ ابن اسحٰق نے **سیرۃ ابن ہشام** (۳: ۳۰۸) میں صاف طور پر سماع بیان کیا ہے۔

۱۴- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۴۱۷۹)؛ احمد، **مسند**، ۴: ۳۲۳، ایسی سند کے ساتھ جس کے افراد ''ثقہ'' ہیں اور جس میں ابن اسحٰق کا ''عنعنہ'' شامل ہے۔ انہوں نے یہ بات واضح کی ہے کہ انہوں نے تحدیث کا اصول استعمال کیا، نیز **سیرۃ ابن ہشام**، ۳: ۳۰۸

۱۵- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۱۸۲۱-۱۸۲۲، ۱۹۲۴)۔ بزّار نے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ روایت کیا کہ زیبرے کے شکار کا واقعہ عسفان میں پیش آیا۔ یہ واقعہ **صحیح** سے متضاد ہے اور اس حقیقت سے بھی متضاد ہے کہ ابوقتادہ کو صدقات جمع کرنے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ محمد زکریا کاندھلوی نے مطابقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ کامیاب نہیں؟ کیوں کہ تضاد اتنا زیادہ واضح ہے کہ دو روایتوں میں سے کسی ایک کو مسترد کرنے کی ضرورت ہے (دیکھیے: **اوجز المسالک الی موطأ امام مالک**، ۶: ۳۵۲)۔

۱۶- **صحیح بخاری**، (**فتح الباری**، حدیث ۴۱۷۹)۔ انہوں نے عسفان کے بجائے غدیر الاشطاط کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن یہ اس سے متصل ہی ہے۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۵: ۳۳۴۔ اس حصے سے قطع نظر جس میں حضرت خالدؓ بن ولید کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ''حسن'' سند کے ساتھ **مسند احمد** میں موجود ہے (۴: ۳۲۳)۔ ابن اسحٰق کا واضح بیان ہے کہ انہوں نے اس کا سماع کیا ہے۔ کراع الغمیم کے محل وقوع کے لیے دیکھیے: بلادی، **معجم المعالم الجغرافیہ**، ص ۲۴۶

۱۷- ابوداؤد، **معالم السنن**، **کتاب الصلوۃ**، ص ۲۱۵۔ حاکم نے اسے بیان کیا اور ذہبی نے اسے ''صحیح'' سمجھا ہے اور حاکم کے ساتھ متفق ہیں (**مستدرک**، ۳: ۳۳۸)۔ بیہقی اور ابن کثیر نے اس کو ''صحیح'' سمجھا ہے (بیہقی، **السنن الکبری**، ۳: ۲۵۷؛ ابن کثیر، **تفسیر**، ۱: ۵۴۸)۔ ابن حجر اس کے متعلق کہتے ہیں: ''سند جید ہے'' (**الاصابۃ**، ۷: ۲۹۴)، لیکن حدیث میں کسی خاص غزوے کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ ابن حجر کا خیال ہے کہ غالباً یہ غزوۂ حدیبیہ تھا (**فتح الباری**، ۷: ۴۲۳)۔ اس خیال کو مزید تقویت اس حقیقت سے بھی ملتی ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید یہ ذکر کرتے ہیں کہ وہ عسفان کے نزدیک تھے اور عسفان غزوۂ حدیبیہ میں تھا۔

۱۸- حافظ محمد حکمی، **مرویات غزوہ الحدیبیہ**، ص ۱۱۵-۱۳۳

۱۹- ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۴۱۲۵، ۴۱۲۸؛ ابن قیم، **زاد المعاد**، ۳: ۲۵۳؛ ابن کثیر، **البدایۃ**

والنهاية،۴: ۸۳؛ ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۴۱۹-۴۲۰

۲۰- ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۳۰۳-۳۰۴؛ واقدی، مغازی، ۱: ۳۹۶

۲۱- ابن حجر، فتح الباری، حدیث ۴۱۲۹، ۴۳۳۳؛ ابوداؤد؛ سنن. معالم السنن، کتاب الصلوٰۃ، ص ۱۲۴۰-۱۲۴۱؛ احمد، مسند، ۲: ۳۴۵، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ

۲۲- مسلم، صحیح، کتاب صفات المنافقین و احکامھم، ص ۱۲

۲۳- بلدح مکے کی ایک وادی کا نام ہے جو وادی العشر سے شروع ہوتی ہے اور الظاہر (جس نام سے یہ جگہ آج کل معروف ہے) سے گزرتی ہوئی مرالظہران پر ختم ہوتی ہے۔ مرالظہران حدیبیہ کے شمال میں واقع ہے (بلادی، معجم معالم الجغرافیہ، ص ۴۹)۔ قریش کا بلدح جانا کسی ''صحیح'' سند سے ثابت نہیں ہے، لیکن اسے بیہقی کی دلائل النبوۃ میں روایت کیا گیا ہے، (۲: ۲۱۹-۲۲۰) اور یہ عروہ کی ''مرسل'' روایت سے ایک کمزور سند کے ساتھ آئی ہے۔ واقدی (مغازی، ۲: ۵۸۲) اور ابن سعد (الطبقات الکبریٰ، ۲: ۹۵) نے اسے ذکر کیا ہے۔

۲۴- صحیح بخاری؛ (ابن حجر، فتح الباری، ۵: ۳۲۹، حدیث ۲۷۳۱)۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پانی کے لیے دعا فرمائی اور کنویں میں اپنا لعاب ڈالا (صحیح بخاری؛ ابن حجر، فتح الباری، حدیث ۳۵۷۷)۔ کیوں نہ ہم دونوں اعمال میں یہ کہہ کر مطابقت پیدا کر دیں کہ آپؐ نے دونوں کام کیے۔

۲۵- ایضاً

۲۶- احمد، مسند، ۴: ۳۲۳، ''حسن'' سند کے ساتھ۔ ابن اسحٰق نے واضح طور پر تحدیث کا ذکر کیا ہے۔ سیرۃ ابن ھشام، ۳: ۳۰۸

۲۷- صحیح بخاری، (ابن حجر، فتح الباری، حدیث ۲۷۳۱-۲۷۳۲)

۲۸- احمد، مسند، ۴: ۳۲۴؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۳-۳۰۸۔ اس روایت کی سند ''حسن'' ہے۔

۲۹- ایضاً

۳۰- ایضاً

۳۱- احمد، مسند، ۴: ۳۲۴، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

۳۲- مسلم، صحیح، کتاب الامارۃ، ص ۶۹۱، حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی حدیث سے جو ایک عینی شاہد تھے۔

۳۳- صحیح بخاری، (ابن حجر، فتح الباری، حدیث ۴۱۶۹)؛ مسلم، صحیح، کتاب الامارۃ،

۸۱

۳۴- مسلم،صحیح، کتاب الامارۃ،٦٧-٦٨،٦١،٧٧؛ صحیح بخاری،(ابن حجر،فتح الباری، حدیث ۲۹۵۷)

۳۵- ابن حجر،فتح الباری،٦:١١٨

۳٦- ابن حجر،الاصابۃ،١١:١٧١

۳۷- صحیح بخاری،(ابن حجر،فتح الباری ،حدیث۴۱۵۴)

۳۸- مسلم،صحیح، کتاب فضائل الصحابہ،۱٦۳

۳۹- صحیح بخاری،(ابن حجر،فتح الباری،حدیث ۲٦۹۸)

۴۰- ایضاً ، حدیث ۲۷۳۱-۲۷۳۲۔ مزید دیکھیے : احمد، مسند،۳: ۳۲۴، ابن اسحق کی روایت سے ''حسن'' سند کے ساتھ

۴۱- ایضاً، فتح الباری،حدیث۲۷۳۱-۲۷۳۲

۴۲- احمد، مسند،۴:۳۲۴،''حسن'' سند کے ساتھ

۴۳- صحیح بخاری، (ابن حجر،فتح الباری،حدیث۲۷۳۱-۲۷۳۲)

۴۴- ایضاً

۴۵- عبدالرزاق ، المصنف،۵: ۳۴۳۔حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ''صحیح'' سند کے ساتھ اور زہری کی ایک اور ''مرسل'' روایت ہے۔

۴٦- صحیح بخاری، (ابن حجر، فتح الباری، حدیث ۲۷۳۱-۲۷۳۲)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہیل نے مکرز کی بات کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا، کیوں کہ وہ حضرت ابو جندلؓ کو واپس لے کے گیا۔

۴۷- ابن اثیر،مجدالدین ابوالسعادۃ،النہایۃ فی غریب الحدیث،۳: ۳۲۷

۴۸- ایضاً،۲:۳۹۲،۳:۳۸۰۔

۴۹- احمد، مسند،۴: ۳۲۵۔ ابن اسحق سے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ مروی ہے۔ یہاں وہ واضح طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کا سماع کیا ہے(سیرۃ ابن ھشام،۳:۳۰۸)۔

۵۰- صحیح بخاری، (ابن حجر، فتح الباری، حدیث ۲٦۹۹)۔ ابن اسحق کہتے ہیں،'' اگرچہ وہ اچھی طرح لکھنا نہیں جانتے تھے،لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھا'' (فتح الباری، حدیث ۴۲۵۱)۔ ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے مٹا دیا'' (فتح الباری، حدیث ۲٦۹۸، بخاری کے متن سے)۔ دونوں صورتوں میں رسول اللہ ﷺ نے

لفظ رسول اللہ پڑھا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپؐ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے جیسا کہ ابو ولید الباجی اور ان کے متبعین کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ ان الفاظ اور اپنے نام کو مٹانے پر اس لیے قادر تھے کہ آپؐ نے اس دستاویز کے قلم بند ہونے سے قبل بھی اپنا نام بارہا تحریری شکل میں دیکھا تھا، لیکن اس سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوتی کہ آپؐ ان پڑھ تھے، جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے۔ یہ نبوت کی علامات میں سے ایک ہے۔ علماء کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ ان الفاظ ''آپؐ نے لکھا'' سے دراصل یہ مراد ہے کہ ''آپؐ نے لکھنے کا حکم دیا''۔ یہی توجیہ صائب ہے اور اسی سے ہر قسم کے شکوک وشبہات اور غلط تعبیرات سے نجات ملتی ہے۔

۵۱- **صحیح مسلم، کتاب الجهاد**، ۹۳

۵۲- **صحیح بخاری**؛ (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۲۷۳۱-۲۷۳۲)

۵۳- احمد، **مسند**، ۴: ۳۲۵، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ جس میں ابن اسحٰق واضح طور پر تحدیث کا اعلان کرتے ہیں، **سیرۃ ابن هشام**، ۳: ۳۰۸۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ سے اس سلسلے میں گفتگو کی، پھر یہی گفتگو حضور ﷺ کے سامنے دہرائی (ابن حجر، **فتح الباری**، ۵: ۳۴۶)۔

۵۴- احمد، **مسند**، ۴: ۳۲۵، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ

۵۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۵: ۳۴۶-۳۴۷

۵۶- احمد، **مسند**، ۴: ۳۲۵، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ

۵۷- ایضاً

۵۸- **صحیح بخاری**؛ (**فتح الباری**، حدیث ۳۱۸۱، ۴۱۸۹)

۵۹- ایضاً

۶۰- احمد، **مسند**، ۴: ۸۶، ایسی سند کے ساتھ جس کے افراد ''صحیح'' ہیں، جیسا کہ ہیثمی نے کہا (**مجمع الزوائد**، ۶: ۱۴۵)۔ حاکم نے کہا: ''شیخین کی شرائط کے مطابق یہ 'صحیح' ہے'' (**مستدرک**، ۲: ۴۶۰)۔

۶۱- مسلم، **صحیح**، کتاب الجهاد، ص ۱۳۲

۶۲- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۲۷۳۱-۲۷۳۲)؛ احمد، **مسند**، ۴: ۳۲۶

۶۳- احمد، **مسند**، ۲: ۳۴، ۱۵۱۔ ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ

۶۴- ایضاً، ۴: ۳۲۴، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ

۶۵- مسلم، **صحیح**، کتاب الحج، ۳۵

۶۶- ابو داؤد، **معالم السنن**، کتاب المناسک، حدیث۱۷۴۹؛ **صحیح ابن خزیمہ**، ۴: ۲۸۶-۲۸۷؛ حاکم، **مستدرک**، ۱: ۴۶۷۔ انہوں نے کہا: ''مسلم کی شرائط کے مطابق یہ صحیح ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا''۔

۶۷- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث۳۰۷۱)؛ مسلم، **صحیح**، کتاب الجهاد و السیر، ص۹۷

۶۸- طحاوی، **شرح معانی الآثار**، ۲: ۲۴۲، ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ۔

۶۹- واقدی، **مغازی**، ۲: ۶۱۶؛ ابن سعد، **الطبقات الکبری**، ۲: ۹۸

۷۰- ابن سید الناس، **عیون الاثر**، ۲: ۱۳۳، ابن عائذ کی روایت سے

۷۱- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۱۸۱۶-۱۸۱۸، ۴۱۹۰)؛ مسلم، **صحیح**، کتاب الحج، ۸۰، ۸۲-۸۴، ۸۶

۷۲- ابن ماجہ، سنن، اقامة الصلوة، ۹۳۶، ''صحیح'' سند کے ساتھ

۷۳- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، کتاب الاذان، ۸۴۶)

۷۴- ابن قیم، **زادالمعاد**، ۳: ۳۰۵۔ مزید دیکھیے، **فتح الباری**، کتاب الطب، حدیث۵۷۵۵-۵۷۵۶

۷۵- شاطبی، **الاعتصام**، ۲: ۸

۷۶- ابوداؤد، **معالم السنن**، کتاب الصلوٰۃ، ۴۴۷؛ نسائی، **السنن الکبریٰ**، حصہ۱۱۹۔ ہیثمی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس میں عبدالرحمٰن بن علقمہ شامل ہیں جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ ابن حبان واحد شخص ہیں جن کا کہنا ہے کہ وہ ''ثقہ'' ہیں، کسی نے انہیں مجروح نہیں سمجھا۔ **مجمع الزوائد**، ص۱۳۱۹؛ ثقہ ابن حبان، ۵: ۲۰۶؛ ابن حجر، **تهذیب التهذیب**، (۶: ۲۳۳)۔ خیبر کے واقعات کی سلسلہ وار ترتیب کے لیے دیکھیے: یہی مصنف، **فتح الباری**، ۱: ۴۴۹

۷۷- مسلم، **صحیح**، کتاب اللقطه، ۹۷؛ **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۴۱۵۲)۔ غریابی، **دلائل النبوۃ**، کھانے میں برکت کے بارے میں حضرت عمرؓ کی حدیث؛ احمد، **مسند**، ۳: ۴۱۷-۴۱۸۔ ابوعمرہ انصاری سے روایت ہے۔ بیہقی، **دلائل النبوۃ**، ۲: ۲۲۲-۲۲۳

۷۸- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۴۱۷۷)

۷۹- ایضاً

۸۰- ایضاً، حدیث ۲۷۱۴۔ قتادہ نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ حدیبیہ کے بیان والی حدیث حضرت انسؓ کی ہے اور یہ کہ **صحیح** کا کہنا یہ ہے کہ یہ الفاظ ''خدا کرے کہ یہ تمہارے لیے بھلا ثابت ہو'' حضرت عکرمہؓ کے ہیں۔

۸۱- ابوداؤد، **معالم السنن، کتاب الجهاد**، ۲۷۳۶؛ احمد، **مسند**، ۳: ۴۲۰؛ حاکم، **مستدرک**، ۲: ۴۵۹۔ انہوں نے کہا: ''صحیح سند کے ساتھ، ایک طویل حدیث جسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت نہیں کیا''۔ ذہبی ان سے متفق ہیں۔

۸۲- ابن ہشام، **سیرة**، ۲: ۳۹۴، ابن اسحٰق کی روایت سے۔ واقدی، **مغازی**، ۲: ۷۸۹؛ طبری، **تاریخ**، ۴: ۴۵؛ ابن زنجویہ، **الاموال**، ۱: ۴۰۱

۸۳- ابن ہشام، **سیرة**، ۷۴۳؛ طبری، ۱۴۲۸،

۸۴- ابن ہشام، **سیرة**، ۳: ۳۲۲

۸۵- ایضاً

۸۶- **صحیح بخاری**، (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۲۷۳۱-۲۷۳۲)

۸۷- ایضاً

۸۸- بیہقی، **السنن الکبریٰ**، ۹: ۲۲۷، ایک ایسی سند کے ساتھ جس میں یونس بن بکیر شامل ہیں، یہ ''صدوق'' ہیں، لیکن غلطیاں کرتے ہیں۔ حدیث ''حسن'' ہے، کیوں کہ اس کے بہت سے متابعات ہیں۔ ابن اسحٰق کے ذریعے سے تحریری شکل میں آئی ہے۔ بیہقی نے اسے زہری سے ''مرسل'' روایت کیا ہے۔ وہ ذکر کرتے ہیں کہ العیص میں اس گروہ کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی تھی اور ابو بصیرؓ کو رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک اس وقت موصول ہوا جب اول الذکر بستر مرگ پر تھے۔ حضرت ابو بصیرؓ اس حالت میں فوت ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک ان کے ہاتھ میں تھا اور حضرت ابو جندلؓ نے انہیں وہیں سپرد خاک کر دیا۔ حضرت ابو جندلؓ باقی ماندہ اصحاب کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ آ گئے (**دلائل النبوة**، ۲: ۳۴۳-۳۴۴)۔ اس سے ملتی جلتی ایک ''مرسل'' روایت عروہ سے بھی مروی ہے (**دلائل النبوة**، ۲: ۳۴۵)۔ ''مرسل'' روایت ''ضعیف'' ہوتی ہے، لیکن مآخذ کی ایک بڑی تعداد موجود ہو تو اسے قوی کہا جا سکتا ہے۔ عروہ زہری کے استاد ہیں اور زہری وہ شخص ہیں جنہوں نے عروہ سے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ روایت کا ایک ہی مخرج ہو، اور اسے قوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

۸۹- **صحیح بخاری**؛ (ابن حجر، **فتح الباری**، حدیث ۲۷۱۱-۲۷۱۲)

۹۰- ابن ہشام، **سیرۃ**،۳:۳۲۶۔عروہ کی ''مرسل'' روایت ہے۔بیہقی ،**السنن الکبری**،۹:۲۹۹۔ زہری اورعبداللہ بن ابی بکر بن حزم کی ''مرسل'' روایت ہے۔

۹۱- **صحیح بخاری**؛(ابن حجر،**فتح الباری**،۱۱-۲۷۱۲-۲۷۱۲)،لیکن ۶:۲۴۰میں،یہ لیث کے ذریعے عقیل سے بجائے لفظ رجل (کوئی مرد) کے، لفظ احد (کوئی شخص) کے ساتھ ہے۔اگر مختلف روایات کا موازنہ کر کے اور یہ غور کر کے کہ مختلف مخارج کے باوجود لفظ وہی ہے، یہ فیصلہ کرنا ممکن ہوتا کہ زیادہ قرین قیاس کیا ہے تو ہم بلاتامل یہ فیصلہ کر سکتے تھے کہ خواتین اس میں شامل نہیں تھیں۔

۹۲- **صحیح بخاری**؛ **فتح الباری**،۱۱-۲۷۱۲-۲۷۱۲

۹۳- ایضاً؛بیہقی، **السنن الکبری**،۹:۲۲۸؛ابن کثیر، **تفسیر**،۴:۳۵۱

۹۴- ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**،۴:۲۷۸،ایک ''حسن'' سند کے ساتھ۔ہیثمی، **موارد الظمان الی زوائد ابن حبان**،۴:۱۴؛ہیثمی ،**مجمع الزوائد**،۶:۱۶۲؛ہیثمی ، **کشف الاستار عن زوائد البزّاز**،۲:۳۴۲۔بزاز کی سند کی بابت ابن حجر کا کہنا ہے کہ ''یہ ایک حسن موصول سند ہے'' (فتح الباری،۷:۵۲۰)۔

۹

حکمرانوں کے نام رسول اللہ ﷺ کے خطوط

حدیبیہ کے مقام پر صلح کا جو معاہدہ طے پایا تھا، اس نے مسلمانوں کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ نہ صرف تمام جزیرہ نمائے عرب میں، بلکہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو وسعت دیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت دحیہؓ بن خلیفہ الکلبی کو قیصر روم ہرقل کے دربار میں، حضرت عبداللہؓ بن حذافہ السہمی کو شاہ فارس کسریٰ کے دربار میں، حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری کو شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں، حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو مقوقس کے اور حضرت سلیطؓ بن عمرو العامری کو شاہ یمامہ ہوزہ بن علی الحنفی کی طرف سفیر بنا کر بھیجا۔(۱)

واقدی اور طبری نے ان سفراء کی روانگی کی جو تاریخ رقم کی ہے، اس کے مطابق یہ سفراء ذوالقعدہ ۶ھ میں اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔(۲) ابن سعد نے سفیروں کی محرم ۶ھ (۳) میں روانگی لکھی ہے اور ابن قیم (۴) بھی یہی نقل کرتے ہیں۔ ابن سعد کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ گرامی کسریٰ کے دربار میں اس کے قتل سے ایک شب پہلے ہی روانہ کیا گیا تھا۔ تاریخ منگل ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ (۵) تھی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ کسریٰ کے نام رسول اللہ ﷺ کے خطِ مبارک بھیجے جانے کی درست تاریخ ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے بعد کی ہے(۶)۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ امام بخاری نے اپنی **صحیح** کی جمع وترتیب میں تاریخ اور زمانے کی اہمیت کو زیادہ ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ غالباً ان کے پیش نظر یہ اشارہ دینا مقصود تھا کہ یہ نامۂ گرامی واقعۂ تبوک کے بعد روانہ کیا گیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، لیکن یہ محض ایک اندازہ ہے جسے ایک ٹھوس حقیقت کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔(۷) ہمارے اس خیال کی تائید

اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ ابن ہشام کے نزدیک سفیروں کو بادشاہوں کی جانب ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے بعد روانہ کیا گیا تھا، اگرچہ متن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد ارسال کیے گئے۔ (۸) **سیرت ابن ھشام** کی تاریخی ترتیب **صحیح بخاری** کی تاریخی ترتیب سے زیادہ مسلّم ہے۔ حافظ ابن حجر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ **صحیح بخاری** کے راویوں نے اپنی چند روایات کی زمانی ترتیب کو خلط ملط کر دیا ہو، مثال کے طور پر انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی روانگی برائے حج کو ۹ھ میں، یعنی وفود کی روانگی سے قبل کا واقعہ بیان کیا ہے، اور اسی طرح حجۃ الوداع کو غزوۂ تبوک سے پہلے کا واقعہ قرار دیا ہے۔ (۹) حافظ ابن حجر نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ امام بخاری نے ان تمام مہمات، غزوات اور وفود کے بارے میں روایات تو قلم بند کر لیں جو ان کی شرائط پر پوری اتریں، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ یہ تمام واقعات مختلف زمانوں میں پیش آئے تھے۔ (۱۰)

دو تاریخیں ایسی ہیں جن کے درمیان فرق بہت تھوڑا ہے۔ ابن حجر نے ان کے درمیان تطابق اس طرح پیدا کیا ہے کہ حضرت دحیہ کو ۶ھ کے اواخر میں حدیبیہ سے واپسی کے بعد ہرقل کے پاس بھیجا گیا تھا اور جب وہ ہرقل کے دربار میں پہنچے تو محرم ۷ھ (۱۱) شروع ہو چکا تھا۔ ایک صحیح حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک ہرقل کے دربار میں اس وقت پہنچا جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کی مہم پر تھے، اور ابن حجر کے خیال میں یہ ۶ھ کی بات ہے۔ (۱۲)

حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے ہر ظالم اور سرکش کو خطوط روانہ فرمائے اور ان سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف آنے کی دعوت دی''۔ انہوں نے کسریٰ، قیصر اور نجاشی کے نام گنوائے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ وہ نجاشی نہیں ہے جو اسلام قبول کر چکا تھا۔ (۱۳)

بلاشبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر بادشاہوں کو خطوط روانہ کرنا دراصل اس حقیقت کا عملی اظہار تھا کہ اسلام ایک آفاقی پیغام ہے۔ مکی دور میں قرآن کریم کی ایسی متعدد آیات نازل

ہو چکی تھیں جن میں اس دین کی عالمگیر اہمیت کو اجاگر کیا گیا تھا، مثال کے طور پر: ''اور ہم نے آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا، مگر دنیا جہاں کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لیے'' (الانبیاء ۲۱:۱۰۷)۔

مذکورہ بالا قرآنی آیت اس عام نظریے کو بھی باطل قرار دیتی ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی تبلیغی اور دعوتی سرگرمیوں کا دائرہ آہستہ آہستہ مقامی سطح سے بڑھ کر بین الاقوامی سطح تک اس لیے پھیل گیا کہ آپ کا سیاسی اثر ورسوخ روز بروز بڑھ رہا تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی عالمی حیثیت اسی وقت مستحکم کی جا چکی تھی، جب مسلمان مکے میں ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے اور ان پر ہمہ وقت یہ خوف طاری تھا کہ ''---لوگ نوچ کھسوٹ لیں'' (الانفال ۸:۲۶)۔

امام بخاری نے اپنی **صحیح** میں رسول اللہ ﷺ کے اس خط کا متن نقل کیا ہے جو آپؐ نے حضرت دحیہؓ کے ہاتھ بصرے کے گورنر کو بھیجا تھا اور گورنر نے یہ خط ہرقل تک پہنچا دیا تھا۔ یہ وہ متن ہے جو محدثین کی شرائط کے مطابق ان تمام خطوط میں سب سے زیادہ مستند ہے جو مختلف بادشاہوں اور امراء کو لکھے گئے، اس لیے دوسرے تمام خطوط کو تاریخی ثبوت کے طور پر قبول کرنے سے پہلے ان کی اسناد اور متون کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ انہیں قانون سازی کے سلسلے میں دلائل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خط کا متن درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحیم ہے، محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے ہرقل قیصر روم کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جو سیدھے راستے کی پیروی کرے۔ میں تمہیں اسلام کی جانب دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو امن میں ہو جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں دوگنا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم نے انکار کر دیا تو تم پر اپنی قوم کے گناہوں کا بوجھ ہوگا۔ ''اے اہل کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں،

اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے سوا اپنے درمیان کوئی معبود اور سرپرست نہ کھڑے کریں۔ اس پر بھی اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہو! گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں'' (۱۴) (آل عمران ۳:۶۴)۔

بعد کے علماء خط میں سورۃ آل عمران کی آیت مذکور ہونے کی وجہ سے سخت الجھن کا شکار رہے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ آیت نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو ۹ھ میں مدینے (۱۵) آیا تھا، لیکن اس آیت کا متن اس خط میں نقل کیا گیا ہے جو ۶ھ کے اواخر میں روانہ کیا گیا تھا۔ (۱۶) بعض علماء نے مختلف روایات میں تطابق پیدا کرنے اور یہ الجھن دور کرنے کی کوشش کی۔ اس بارے میں انہوں نے میں مختلف آراء پیش کیں، مثال کے طور پر ایک رائے یہ تھی کہ شاید یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو (بعد میں علماء نے خود ہی اس خیال کی تردید کر دی)۔ (۱۷) دوسری رائے یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نامۂ مبارک میں یہ بات لکھ دی ہو اور پھر جب اس بارے میں آیت نازل ہوئی تو انہی الفاظ کے ساتھ ہوئی جو رسول اللہ ﷺ نے استعمال فرمائے تھے۔ (۱۸) تیسری رائے یہ تھی کہ یہ آیت ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی۔ ایک اور رائے کے مطابق یہ آیت یہودیوں کی بابت نازل ہوئی ہے، وغیرہ۔ (۱۹)

بلاشبہ یہ الجھن اسی وقت دور ہو سکتی ہے، جب ہم اس آیت کے سببِ نزول کا کھوج لگائیں۔ ایسی کوئی صحیح مستند روایت نہیں پائی جاتی جو اس بات کو ثابت کرتی ہو کہ یہ آیت نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابن اسحٰق نے یہی کچھ محمد بن جعفر بن زبیر کے حوالے سے روایت کیا ہے جو ثقہ راوی ہیں۔ طبری کے سلسلۂ سند میں جو ابن اسحٰق سے جا ملتا ہے، محمد بن حمید رازی بھی شامل ہیں جو ''ضعیف'' ہیں۔ سدی بھی یہی رائے پیش کرتے ہیں کہ یہ آیت وفدِ نجران کے بارے میں نازل نہیں ہوئی اور طبری کی سند جو سدی تک جاتی ہے اسباط کو شامل کرتی ہے جو ''صدوق'' ہے، لیکن بہت سی غلطیاں اور مبالغہ کرنے سے متہم ہے۔ علی بن زید بن جدعان نے بھی ایک ''مرسل'' روایت میں یہی رائے پیش کی ہے، مگر وہ کمزور ہے۔ یہ تینوں روایات ''مرسل'' ہیں اور ان سب کی اسناد میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔

تفسیر طبری (۲۰) کی ایک روایت ان تینوں روایات کی نفی کرتی ہے۔اس روایت کی ایک سند ''حسن مرسل'' ہے جس کا سلسلہ قتادہ سے جا کر مل جاتا ہے، دوسری سند ''مرسل'' ہے جس میں چند کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور وہ جا کر ابن جریج سے ملتی ہے، اور ایک اور ''مرسل'' سند ہے جس میں چند کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور یہ سند ربیع بن خثیم سے جا ملتی ہے۔ان تینوں مرسل روایات کے مطابق قرآن کی یہ آیت قل یا اھل الکتاب---(آل عمران ۳:۶۴) مدینے کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جس میں ان کو برابری کی سطح پر دعوت دی گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ آیت یہودیوں کی جلاوطنی سے قبل نازل ہوئی اور یہودیوں کی آخری جلاوطنی غزوۂ خندق کے بعد ۵ ھ میں عمل میں آئی تھی۔اس بات سے اس رائے کی بھی تائید ہو جاتی ہے کہ یہ آیت قیصرِ روم ہرقل کو خط بھیجنے سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔**صحیح بخاری** میں خط کے متن کی موجودگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انہوں نے ان روایات کی تائید کی ہے جن کے مطابق یہ آیت ہجرت کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی، بصورت دیگر امام بخاریؒ نے اس خط کا متن اپنی **صحیح** میں درج نہ کیا ہوتا۔

اس آیت کو اس خط میں نقل کیا گیا ہے جو ۶ ھ میں لکھا گیا تھا۔ یہ اس بات کا مضبوط ترین ثبوت ہے کہ یہ آیت وفدِ نجران کی مدینے آمد سے قبل نازل ہوئی تھی۔خط کے متن سے بھی اس رائے کی تائید ملتی ہے جس کا ذکر پچھلی آراء کے ساتھ کیا گیا ہے اور بظاہر ایسی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جس کی بناء پر خط کے متن کو مشکوک اور مشتبہ قرار دیا جائے۔

امام بخاریؒ نے رسول اللہ ﷺ کے ایک نامۂ گرامی کا حوالہ دیا ہے جو کسریٰ کو ارسال کیا گیا تھا، لیکن اس میں خط کے متن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، تاہم انہوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن حذافہ السہمی کو یہ خط دے کر روانہ فرمایا اور انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ یہ خط بحرین کے گورنر منذر بن ساوی العبدی کے حوالے کر دیا جائے۔منذر نے یہ خط لے کر کسریٰ کو پہنچا دیا۔کسریٰ نے خط پڑھنے کے بعد چاک کر دیا، اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا فرمائی کہ ''اے اللہ! تو اسی

طرح اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دے"۔(۲۱) اللہ تعالیٰ نے کسریٰ کی حکومت کو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اس کے تخت پر قابض ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطنتِ فارس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے کسریٰ کے نام جو نامۂ مبارک تحریر فرمایا، اس کا متن کسی "صحیح" روایت میں دستیاب نہیں ہے، البتہ طبری اور چند دیگر مصنفین نے اسے "ضعیف" اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

صحیح مسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط نجاشی کے نام بھی تحریر فرمایا تھا، لیکن اس کے ساتھ امام مسلم نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ یہ وہ نجاشی نہیں ہیں جو اسلام قبول کر چکے تھے۔(۲۲) خط کا مضمون ثابت نہیں ہو سکا، لیکن ابن اسحٰق نے بغیر سند کے اسے روایت کیا ہے۔(۲۳)

حاکمِ مصر مقوقس کے نام بھیجے گئے دو خطوط، اور ان کے جواب میں جو خطوط موصول ہوئے، ان کے متون کسی "صحیح" روایت میں دستیاب نہیں ہوئے۔ اسی طرح حاکم دمشق حارث بن ابو شمر الغسانی، حاکم یمامہ ہوذہ بن علی الحنفی اور عمان کے حکام جیفر اور عبد ابنیہ الجلندی کے نام بھیجے گئے خطوط کے متون بھی حدیث کے نقطۂ نگاہ سے "صحیح" ثابت نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ خطوط سرے سے روانہ ہی نہیں کیے گئے اور نہ اس سے یہ مراد ہے کہ ان خطوط کو تاریخی نقطۂ نظر سے بھی غلط ثابت کر دیا جائے۔ جہاں تک ان خطوط کے مضامین اور ہیئت کا تعلق ہے تو عین ممکن ہے کہ یہ "صحیح" ہوں، تاہم یہ اس معیار پر یقیناً پورے نہیں اترتے جس پر انہیں قانون سازی کے معاملات میں ثبوت کے طور پر لیا جا سکے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کا وہ خط جو ہرقل کے نام لکھا گیا تھا، اس کا متن وہ واحد متن ہے جو حدیث کے معیار کے مطابق "صحیح" ثابت ہو چکا ہے اور اس خط کی روشنی میں دوسرے تمام خطوط پر بھی ان کی تاریخی حیثیت سے تنقید کی جا سکتی ہے۔

یہی فیصلہ دورِ نبوی کی ان دوسری دستاویزات پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے جو حدیث

کے معیار کے مطابق ''صحیح'' ثابت نہیں ہوتیں، صحاح ستہ کے مرتبین نے ان خطوط کو روایت نہیں کیا، سوائے اس خط کے جو ہرقل کو لکھا گیا تھا اور صحیح بخاری میں مذکور ہے(۲۴)۔ اس کے علاوہ ایک خط جو عمیر ذومران کو لکھا گیا، وہ سنن أبی داؤد میں مذکور ہے۔ اگرچہ بہت سے خطوط تاریخی معیار سے تو ضرور صحیح ثابت ہوتے ہوں گے، مگر اس کے باوجود وہ صحت کے اعتبار سے اس مقام تک نہیں پہنچتے جہاں انہیں شریعت اور عقیدے کے میدان میں شہادت کے طور پر قبول کیا جا سکے۔(۲۵)

یہ بات بھی مستند ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے رومی حکومت کو خطاب کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ کو بتایا گیا کہ رومی حکومت کسی ایسے خط کو قابل اعتناء نہیں سمجھتی جو مہر شدہ نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی اور اس پر محمد رسول الله(۲۶) کے الفاظ کندہ کرائے۔ اسی طرح آپؐ نے اپنے عمل سے یہ بات ثابت فرما دی کہ اسلامی سیاست میں اتنی لچک پائی جاتی ہے کہ دورِ جدید کے رسم و رواج اور طور طریقوں سے اس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ اسلامی قوانین اور شریعت کی روح سے متصادم نہ ہوں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہرقل کے نام جو خط تحریر کیا گیا، اس میں اسلام کے تمام امتیازی اوصاف اور خصائص موجود تھے۔ اس کا آغاز بسم الله سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نہایت سادہ انداز میں توحید و رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس خط میں پُرخلوص نصیحت کے لیے حکمت کا خیال رکھا گیا ہے، اور مخاطب کی عزت و وقار کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اسے اپنی قوم میں جو مقام اور مرتبہ حاصل تھا، اس کے شایان شان الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے ''شاہ روم'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد اسلام قبول کرنے کی صورت میں اسے جو اجر ملنے والا تھا، اس کی خوش خبری سنا کر اس کے حوصلے بلند کیے گئے، نیز اس کی اور اس کی قوم کی اسلام سے دوری کی بناء پر جو عذاب مقدر ہونے والا ہے، اس سے بھی اسے متنبہ کر دیا گیا۔

حواشی

۱- طبری، تاریخ، ۲: ۲۸۸؛ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۴: ۲۷۹۔ انہوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کو جلندی کے بیٹوں جیفر اور عیاض کی طرف روانہ کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ابن ہشام کی سند ''منقطع'' ہے۔ ان کے اور اس شخص کے درمیان جس نے روایت بیان کی ہے، ایک راوی مجہول ہے۔ وہ راوی ابوبکر ہذلی ہے، یہ ایک اخباری ہے اور حدیث میں متروک ہے (**تقریب**، ۲: ۴۰۱)۔ ابن سعد، **طبقات**، ۱: ۲۵۸۔ واقدی کی روایت سے، جو چار صحابۂ کرامؓ تک جاتی ہے۔ محدثین کی رائے میں واقدی متروک ہے۔ ابن سعد کی ذکر کردہ بیشتر روایات اسی سلسلۂ اسناد سے ہیں۔ انہوں نے روایات میں ہم آہنگی پیدا کی، اور چاروں صحابہ کرامؓ کے الفاظ کو آپس میں ملا کر اس تمام مواد کو ایک متن کے طور پر پیش کر دیا۔

ابن سعد نے باقی قاصدوں اور خطوط کی ترسیل کے بارے میں ہشام الکلبی (یہ ''ضعیف'' ہیں) اور علی بن محمد المدائنی (یہ ''صدوق'' ہیں) کے واسطے سے چند روایات بیان کی ہیں۔ یہ روایات سفراء اور خطوط کی روانگی سے متعلق ہیں (**سیر اعلام النبلاء**، ۱۰: ۴۰۰)، تاہم ابن سعد نے ان دونوں ذرائع سے جو کچھ ذکر کیا ہے، وہ نقائص سے مبرا نہیں ہے، جیسا کہ اس کا ''مرسل'' ہونا یا اسی طرح کے دیگر نقائص۔

۲- ایضاً

۳- ابن سعد، **طبقات**، ۱: ۲، ۱۵

۴- ابن قیم، **زاد المعاد**، ۱: ۳۰۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ واقدی کی رائے ہے (**فتح الباری**، ۱: ۳۸)۔ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ خلیفہ نے اپنی تاریخ میں ہجرت کے پانچویں سال کو سفیروں کی روانگی کا سال قرار دیا ہے، درست نہیں۔ خلیفہ کہتے ہیں (تاریخ، ۷۹) کہ یہ ہجرت کا چھٹا سال تھا۔ عین ممکن ہے کہ حافظ ابن حجر نے کوئی مختلف نسخہ پڑھا ہو، یا ان سے نقل کرنے میں غلطی ہوگئی ہو۔

۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۲۷۔ مذکورہ تاریخ سے اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں خسرو کے قتل کی تاریخ متعین ہو جاتی ہے (ابن سعد، **طبقات**، ۱: ۲۶۰)۔

۶- ایضاً

۷-۹ [یہ حواشی اصل مآخذ میں درج نہیں ہو سکے]۔

۱۰- ایضاً، ۸: ۹۷

۱۱- ایضاً، ۱: ۳۸

۱۲- ایضاً، ۱: ۳۲، ۳۹

۱۳- مسلم، **صحیح**، ۳: ۱۳۹۷

۱۴- ابن حجر، **فتح الباری**، ۱: ۳۲، ۸: ۱۲۶

۱۵- ابن اسحٰق، بغیر سند کے (**سیرۃ ابن ھشام** ۲: ۲۰۷، ۲۱۵)

۱۶- ابن حجر، **فتح الباری**، ۱: ۳۹؛ قسطلانی، **المواھب اللدنیۃ**، ۱: ۲۲۳؛ زرقانی، **شرح مواھب**، ۳: ۳۳۸

۱۷- ابن حجر، **فتح الباری**، ۱: ۳۹؛ قسطلانی، **المواھب اللدنیہ**، ۱: ۲۲۳

۱۸- ایضاً

۱۹- ابن حجر، **فتح الباری**، ۱: ۳۹؛ صابونی، **مختصر تفسیر ابن کثیر**، ۱: ۲۸۷

۲۰- ان روایات کی سند کے لیے دیکھیے: **تفسیر طبری**، ۳: ۲۰۲-۲۰۴۔ پڑھنے والے کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی سند جو قتادہ تک جاتی ہے ''حسن'' ہے، اور ان کی وہ سند جو ربیع بن خثیم تک جاتی ہے، اس میں المثنیٰ شامل ہیں جن کا مستند ہونا معلوم نہیں اور اسی سند میں عبداللہ بن ابی جعفر بھی شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں، لیکن غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ سند جو عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج تک جاتی ہے، اس میں قاسم بن عیسیٰ واسطی شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں اور بدل گئے ہیں اور حسین بن بشر حمصی شامل ہیں جن پر کوئی جرح نہیں ہے۔ یہ ان روایات کی سندوں کی صورت حال ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ یہ آیت مدینے کے یہود کی بابت نازل ہوئی ہے۔ ان روایات کی وہ سند، جس کے مطابق یہ آیت نجران کے وفد کے متعلق نازل ہوئی، سدّی تک جاتی ہے، اس میں اسباط بن نصر شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں، بہت غلطیاں کرتے ہیں اور انوکھے خصائص کے مالک ہیں۔ وہ سند جو ابن اسحٰق تک جاتی ہے، اس میں محمد بن حمید رازی شامل ہیں جو حافظ ہیں، لیکن ''ضعیف'' ہیں۔ تیسری روایت علی بن زید بن جدعان تک جاتی ہے جو ''ضعیف'' ہیں۔

۲۱- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۲۶۔ بخاری کی روایت سے، لیکن انہوں نے بحرین کے گورنر کا نام نہیں دیا۔

۲۲- ابن اسحٰق، **سیرۃ**، ۲۱۰۔ دیگر ذرائع سے دو مختلف متون کا ذکر ملتا ہے (دیکھیے: محمد حمید اللہ، **مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ**، نمبر ۲۱ مقابل ص ۴۵)۔ یہ روایات محدثین سے ثابت نہیں ہیں، کیوں کہ انہیں کسی صحیح سند کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا۔ یہی چیز ان دونوں خطوط پر بھی منطبق ہوتی ہے جو نجاشی نے

رسول اللہ ﷺ کو لکھے تھے (محمد حمید اللہ، **مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ**، نمبر ۲۳-۲۴)

۲۳- مسلم، **صحیح**، حدیث ۴۷۷۴

۲۴- ابوداؤد، **سنن** ۲: ۳۸-۳۹

۲۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۱۰: ۳۲۴

۲۶- فرانسیسی مستشرق بارتھ لیمی کو ۱۸۵۰ء میں مصر کے بالائی حصے میں واقع اخمیم نامی علاقے سے رسول اللہ ﷺ کا ایک مکتوب گرامی ملا جو آپؐ نے مقوقس کو لکھا تھا (یہ مکتوب چمڑے کے ایک پرانے ٹکڑے پر تحریر شدہ ہے)۔ اس نے اس نامۂ مبارک کو ۱۸۵۴ء میں Journal of the Royal Asiatic Society میں شائع کر دیا۔ آج کل یہ خط استانبول کے توپ کاپی میوزیم میں محفوظ ہے۔ چمڑے کا ٹکڑا جس پر خط تحریر کیا گیا ہے، گہرے رنگ کا اور مہین ہے اور اس کے درمیان میں ایک دراڑ پڑی ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس پر تحریر پڑھی جا سکتی ہے۔ ایم بلن نے اس کی تصدیق کی ہے اور نولڈکے نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

۱۸۶۳ء میں جرمنی کے ڈاکٹر بش نے اعلان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا خط دریافت کیا ہے جو آپؐ نے منذر بن ساوی کے نام تحریر کرایا تھا، لیکن اس کی پوری طرح تصدیق نہیں ہو سکی۔ ۱۹۴۰ء میں انگریز مستشرق ڈنلپ نے Journal of the Royal Asiatic Sociecty میں یہ اعلان کیا کہ انہیں چمڑے کا ایک ٹکڑا دستیاب ہوا ہے جس پر رسول اللہ ﷺ کا خط نجاشی کے نام تحریر ہے، لیکن وہ اس کے مستند ہونے میں متردد تھے۔ ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے بیروت کے روزنامہ **الحیاۃ** میں یہ بیان دیا کہ انہیں خسرو کے نام رسول اللہ ﷺ کا خط ملا ہے اور اس کے ساتھ ہی خط کے مستند ہونے کا یقین بھی ظاہر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی ایک اور (پانچویں) دستاویز ۱۹۷۳ء میں دریافت ہوئی، یہ ایک ہزار برس سے زیادہ پرانی ہے، لیکن ابھی تک اس کے مستند ہونے، یا نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔

مستشرقین کی اکثریت اس شک میں مبتلا ہے کہ ان میں سے کوئی خط واقعی بھیجا بھی گیا تھا؟ انگریز مستشرق، ولیم میور نے The Caliphate اور The Life of Muhammad میں، اطالوی مستشرق، ایل کائتانی نے Annali del Islam میں، اور یہودی مستشرق مارگولیتھ نے Muhammad میں ان شکوک کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے استرداد کی بنیاد اپنے اس خیال پر رکھتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب تھا جو محض عربوں کے لیے مخصوص تھا، اسلامی ریاست ایک کمزور ریاست تھی اور اس کے اندر اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ اپنے وقت کی عالمی طاقتوں کو انتباہ کر سکتی۔

ابن اسحق نے ان خطوط کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ یہ روایتی تفصیلات پر مشتمل ہیں اور چند ایک خطوط ایسے ہیں جن میں ایک ایسی قرآنی آیت شامل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خطوط بھیجنے کی تاریخ سے دو برس بعد نازل ہوئی، لیکن یہ تبصرے اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ان دستاویزات کی تاریخی حقیقت کا انکار کیا جائے جو خطوط دریافت ہوئے ہیں، ان کا کسی تجربہ گاہ میں کیمیائی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ مستند ہیں یا نہیں۔

اس حاشیہ میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کے لیے ملاحظہ فرمایے: ڈاکٹر عزالدین ابراہیم کا مقالہ بعنوان: **الدراسات المتعلقه برسائل النبیؐ الی الملوک فی عصره** جو **بحوث المؤتمر العالمی الثالث للسیرة و السنة النبویة** (قطر) میں شامل ہے۔

۱۰

بدوؤں کو نظم وضبط کا پابند کرنا

صلح حدیبیہ کے نتیجے میں امن کا جو زمانہ نصیب ہوا، اس میں بدوؤں نے کئی بار خلل ڈالنے کی کوشش کی، تاہم ان کی یہ کوششیں زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکیں، اور نہ اسلام کی نشر واشاعت میں مسلمانوں کو جو آزادی حاصل ہوئی تھی، اس پر ان کا کچھ اثر پڑ سکا۔ اس دوران میں جو مہمات پیش آئیں، وہ درج ذیل ہیں۔

غزوۂ ذات القرد

یہ مہم غزوۂ خیبر سے تین روز قبل پیش آئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن عیینہ بن حسن الفزاری رسول اللہ ﷺ کے چند اونٹ لے کر فرار ہو گیا۔ حضرت سلمہؓ بن اکوع نے اسی وقت تمام مسلمانوں کو چوکنا کر دیا اور خود اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ باہر نکلے تو دیکھا کہ حضرت سلمہؓ بن اکوع نے حملہ آوروں سے اونٹ واپس لے لیے ہیں اور انہیں دور تک مار بھگایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ذات القرد تک تشریف لے گئے اور پھر مدینے لوٹ آئے۔(۱)

عُکل اور عُرینہ نامی قبائل کے افراد کا واقعہ

غزوۂ ذات القرد کے بعد عُکل اور عُرینہ نامی قبائل کے چند افراد مدینے آئے اور اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا۔ اس کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مدینے کے مضافات میں اقامت اختیار کرنے کی اجازت طلب کی، کیوں کہ ان کے بقول مدینے کا موسم ان کے لیے قابلِ برداشت نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو یہ ہدایت کی کہ ان لوگوں کے لیے

چند دودھ دینے والی اونٹنیوں اور ایک چرواہے کا بندوبست کر دیا جائے۔ اس انتظام کے ساتھ انہیں روانہ کر دیا گیا، لیکن جب وہ حرہ پہنچے تو سب کے سب مرتد ہو گئے۔ انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹنیوں کو دور ہانک دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپؐ نے چند لوگوں کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ان مجرموں کو گرفتار کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے ان کی آنکھوں پر لوہے سے داغ لگوائے، ان کے ہاتھ کٹوا دیے گئے اور انہیں حرہ میں چھوڑ دیا گیا، حتیٰ کہ انہیں موت نے آ لیا، لیکن بعد میں رسول اللہ ﷺ نے مثلہ کرنے کی ممانعت فرما دی۔ (۲)

غزوۂ ذات الرقاع

اس غزوے کی تاریخ کے تعین میں سیرت نگاروں کے درمیان اختلاف ہے۔ امام بخاری اس رائے کے حق میں ہیں کہ یہ غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا۔ ابن اسحٰق نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ غزوہ ۶ ھ میں غزوۂ خندق سے پہلے اور بنونضیر کی جلاوطنی کے بعد پیش آیا۔ ابن سعد اور ابن حبان کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ محرم ۵ ھ کا ہے۔ ابو معشر نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ، غزوۂ بنوقریظہ اور غزوۂ خندق کے بعد وقوع پذیر ہوا۔ امام بخاری اور ابو معشر کی رائیں زیادہ دل کو لگتی محسوس ہوتی ہیں، کیوں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بذات خود اس مہم میں حصہ لیا ہے اور وہ خیبر کی فتح کے فوراً بعد حبشے سے واپس آئے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی اس غزوے میں حصہ لیا ہے اور وہ اس وقت مسلمان ہوئے تھے جب خیبر فتح ہوا تھا۔ اس غزوے کو ذات الرقاع کا نام دیا جاتا ہے، نیز یہ غزوۂ نجد اور غزوہ بنومحارب و بنی ثعلبہ من غطفان (یعنی غطفان کے بنومحارب اور بنوثعلبہ کے خلاف مہمات) کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا غطفان کے لوگوں سے سامنا تو ہوا، لیکن لڑائی کی نوبت نہیں آئی، تاہم کچھ مسلمانوں پر خوف کی کیفیت طاری ہوئی، چنانچہ انہوں نے نخل نامی جگہ پر صلوٰۃ الخوف ادا کی جو مدینے سے دو روز کی مسافت پر ہے۔ اس کے بعد مسلمان مدینے واپس آ گئے۔

اس بات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس غزوے کو ذات الرقاع کا نام کیوں دیا

گیا تھا؟ اس بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت یہ ہے کہ اس غزوے میں لوگوں کے جوتے پھٹ گئے تھے اور انہوں نے اپنے پیروں کے گرد چیتھڑے (رقاع) باندھ لیے تھے، اس لیے اس غزوے کو یہ نام دیا گیا۔ جوتے پھٹنے کی نوبت اس لیے آئی تھی کہ چھ چھ افراد پر مشتمل جماعت کے حصے میں صرف ایک اونٹ آیا تھا جس پر سب لوگ باری باری سفر کرتے تھے [اور زیادہ تر سفر پیدل کیا گیا تھا]۔ (۳)

قدیم مؤرخین نے ان واقعات پر اس لیے زیادہ توجہ نہیں دی کہ بادشاہوں اور امراء کو اسلام کی دعوت دینا، (۴) فتح خیبر اور مسلمانوں کا عمرۃ القضا کے لیے مکے جانا، ان کے بالمقابل عظیم الشان واقعات تھے، جن کے سامنے چھوٹے اور معمولی واقعات ماند پڑ گئے تھے۔

بہر حال خیبر کی تسخیر سے مسلمانوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ شام کی سرحد پر شمالی علاقوں میں اپنی قوت مضبوط کر لیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع جو غطفان کے خلاف تھا، وہ دراصل اسی منصوبے کا ایک حصہ تھا، کیوں کہ اس علاقے میں خیبر کے یہودیوں کے بعد دوسرا مضبوط ترین گروہ غطفان ہی کا تھا۔ اس کے فوراً بعد اس سمت میں ایک اور مہم جوئی کی گئی جسے موتہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن مسلمان کعبے کی زیارت کرنے اور عمرۃ القضا (وہ عمرہ جو حدیبیہ کے موقع پر قضا ہو گیا تھا) ادا کرنے کے لیے اس قدر بے چین ہو رہے تھے کہ موتہ کی طرف فوج روانہ کرنے میں معمولی سی تاخیر پیش آ گئی۔

حواشی

۱۔ ابن حجر، فتح الباری، ۸: ۴۲۰؛ مسلم، صحیح، ۳: ۱۴۲۲۔ ابن اسحٰق اور دیگر سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ یہ غزوہ ہجرت کے چھٹے سال حدیبیہ سے قبل پیش آیا (فتح الباری، ۷: ۴۲۰)۔

بیہقی کہتے ہیں: ''ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ غزوۂ ذات قرد حدیبیہ اور خیبر کے بعد پیش آیا اور حضرت سلمہؓ بن اکوع کی حدیث میں واضح طور پر یہ بات بیان کی گئی ہے (ابن حجر، فتح الباری ۷: ۴۲۰-۴۲۱)۔ اسی غزوے میں صلوٰۃ الخوف پڑھی گئی، لیکن اس کو شرعی حیثیت خندق کے بعد دی گئی۔ خلیفہ بن خیاط لکھتے ہیں کہ اونٹوں پر جن صاحب نے حملہ کیا، وہ عبدالرحمٰن

نہیں، بلکہ اس کے والد عیینہ بن حسن تھا (تاریخ خلیفہ، ص ۷۷)۔

۲۔ ابن حجر، فتح الباری، ۷: ۴۵۸

۳۔ ایضاً، ۷: ۴۱۶-۴۲۱

۴۔ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی حدیبیہ سے واپسی کے فوراً بعد پیش آیا۔ ابن سعد نے ان کی روانگی کی تاریخ یکم محرم ۷ھ دی ہے، اور کل چھ افراد بھیجے گئے تھے (طبقات، ۱: ۲: ۱۵، مطبوعہ یورپ)۔ ابن قیم نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے (زاد المعاد ۱: ۳۰)، جبکہ طبری نے اس تاریخ کو تھوڑا سا آگے بڑھاتے ہوئے ذوالحجہ ۶ھ بیان کیا ہے (تاریخ طبری، ۲: ۲۸۸)۔

عمرۃ القضا

ذوالقعدہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکے کی جانب روانہ ہوئے، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے تحت قریش سے طے ہوا تھا: (۱) ''تم اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لے کر مکے نہیں آ سکتے، سوائے ایک تلوار کے۔ وہ بھی نیام میں ہونا چاہیے اور یہ کہ مکے کا کوئی باشندہ شہر چھوڑ کر نہیں جائے گا''۔ (۲) اس کے ساتھ انہوں نے یہ شرط بھی عائد کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ مکے میں صرف تین روز قیام کریں گے جس کے بعد انہیں واپس جانا پڑے گا۔ (۳)

موسیٰ بن عقبہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے ساتھ ہتھیار لے لیے تھے، مگر انہیں حرم کے باہر چھوڑ دیا تھا، کیوں کہ مسلمانوں کو قریش سے بدعہدی کا اندیشہ تھا۔ (۴) جن مسلمانوں نے عمرۃ القضا ادا کیا، ان کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، خواتین اور بچے ان کے علاوہ تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر حاضر تھے۔ (۵) جب رسول اللہ ﷺ مکہ شہر میں داخل ہوئے تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ آپؐ کے سامنے سے یہ رجز پڑھتے ہوئے گزرے:

اے کافرو! راستہ دو، ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ، ہم تم سے جنگ کریں گے اور ایسی کاری ضرب لگائیں گے کہ سر کندھوں سے جدا ہو جائیں گے اور دوست دوست کو بھول جائے گا۔ (۶)

مسلمانوں نے کعبے کے گرد طواف کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ طواف کرتے وقت ان کی جسمانی قوت اور طاقت کا اظہار ہونا چاہیے، تاکہ قریش کی یہ افواہ

بے بنیاد اور باطل ثابت ہو جائے کہ مدینے میں بخار پھیلنے کی وجہ سے مسلمانوں کی جسمانی توانائی ماند پڑ گئی ہے، چنانچہ مسلمانوں نے طواف کرتے وقت پہلے تین چکر دوڑ کر پورے کیے۔ (۷) قریش شہر سے باہر قعیقان نامی پہاڑ پر جا کر بیٹھ گئے تھے اور وہاں سے مسلمانوں کو طواف کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ (۸) وہ مسلمانوں کی قوت اور طاقت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ پہاڑ جس پر قریش فروکش تھے، کعبے کے دوکونوں کے مدمقابل واقع تھا۔

جب تین روز گزر گئے تو مشرکینِ مکہ حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنے ساتھیوں سے کہیں کہ مقررہ میعاد گزر چکی ہے، اب واپس جائیں۔ رسول اللہ ﷺ مکے سے واپس روانہ ہو گئے۔ (۹) عمرۃ القضا کے بارے میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا جو مطابق واقعہ کے ہے کہ تم لوگ مسجد حرام میں اِن شاء اللہ ضرور جاؤ گے امن و امان کے ساتھ، کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا اور کوئی بال کتراتا ہوگا، تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا، سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں، پھر اس سے پہلے لگتے ہاتھ ایک فتح دے دی (الفتح ۴۸:۲۷)۔

اس عمرے کے دوران میں جو احکام جاری کیے گئے، ان میں سے ایک حکم وہ ہے جو ایسے شخص کے بارے میں ہے جس نے عمرہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہو، مگر اسے کعبے کی زیارت سے زبردستی روک دیا گیا ہو۔ علماء کی اکثریت اس رائے پر متفق ہے کہ اسے قربانی تو لازماً کرنا پڑے گی، مگر وہ عمرے کی قضا کرنے کا پابند نہ ہوگا۔ علماء کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا یہ عمرہ اس عمرے کی قضا کے طور پر ادا کیا گیا تھا جو حدیبیہ کے موقع پر ادا نہ ہو سکا تھا، یا اسے از سرِ نو ادا کیا گیا ہے؟

اس کے علاوہ ایک اور حکم جو اس موقع پر جاری کیا گیا، وہ بچے کی پرورش اور پرداخت سے متعلق تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیگر مسلمانوں کے ساتھ مکے سے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی بیٹی عمارہ چھوٹی سی بچی تھیں۔ حضرت علیؓ نے انہیں

گود لے لیا اور حضرت فاطمہؓ کے حوالے کر دیا تا کہ وہ ان کی پرورش کر سکیں۔ حضرت فاطمہؓ ان کی چچا زاد بہن تھیں [حضرت حمزہؓ، رسول اللہؐ کے رضاعی بھائی تھے]۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ نے حضرت علیؓ کو اس بارے میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ وہ (مواخاۃ کی رو سے) حضرت حمزہؓ کے بھائی ہیں اور حضرت جعفرؓ [خالو ہونے کی وجہ سے]، عمارہؓ کے محرم ہیں اور مسلمان مرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی خاتون اور اس کی خالہ کو بیک وقت نکاح میں رکھے، [لہٰذا عمارۃؓ کی پرورش حضرت جعفرؓ کے گھر میں ہوگی]۔(۱۰)

حواشی

۱- ابن حزم، **جوامع السیرہ**، ۲۱۹۔ ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور یعقوب بن سفیان نے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ ابن عمرؓ سے روایت کیا (ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۵۰۰)۔

۲- بخاری نے روایت کیا (ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۴۹۹)۔

۳- ایضاً

۴- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۴۹۹۔ موسیٰ بن عقبہ اس روایت کی کوئی سند پیش نہیں کرتے۔

۵- حاکم نے الاکلیل میں اسے بغیر سند کے ذکر کیا ہے (ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۵۰۲)۔

۶- ترمذی، انہوں نے کہا: ''یہ ایک حسن غریب حدیث ہے'' (**فتح الباری**، ۷:۵۰۲)۔

۷- بخاری نے روایت کیا۔ ابن حجر، **فتح الباری** ۷:۵۰۸-۵۰۹۔ مزید دیکھیے: احمد، **مسند**، حدیث ۳۵۳۶، ایک صحیح سند کے ساتھ

۸- ایضاً

۹- بخاری نے روایت کیا۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۴۹۹

۱۰- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷:۵۰۵

۱۲

غزوۂ موتہ

واقدی واحد مؤرخ ہیں جنھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ غزوۂ موتہ کا محرک اور سبب کیا تھا؟ واقدی کے نزدیک سبب یہ تھا کہ شرحبیل بن عمرو الغسانی نے حضرت حارثؓ بن عمیر الازدی کو قتل کروا دیا۔ یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کا نامۂ گرامی شاہ بُصریٰ کے دربار میں لے کر گئے تھے۔ چونکہ سفیروں کا قتل ناجائز ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر سن کر سخت ناگواری ہوئی اور آپؐ نے موتہ کی طرف فوج روانہ فرمائی، (۱) لیکن واقدی ایک ''ضعیف'' راوی ہیں اور قابل اعتماد نہیں، بالخصوص اس صورت میں جب کہ کسی واقعے کی روایت میں وہ اکیلے ہوں۔

تاہم یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ان اسباب اور عوامل کا پتا لگایا جائے جو شام کی سرحدوں پر عرب قبائل کے خلاف مہمات کا محرک بنے تھے، کیوں کہ اسباب جو بھی ہوں، بہر حال وہ نفسِ واقعہ پر بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ جہاد کے قانونی نفاذ کے لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ عرب قبائل کو زیرنگین کرنے کی حکمتِ عملی میں ایک تسلسل اور دوام برقرار رہے اور اسلامی ریاست کی سرحدیں وسیع ہوں، قطع نظر اس کے کہ ان مہمات کے کیا محرکات تھے۔

مسلمانوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی متبادل راستہ نہیں تھا کہ وہ ان تمام مسیحی عرب قبائل کو زیرنگین کر لیں جو بازنطینی مملکت کے زیر تسلط تھے۔ مسلمان چاہتے تھے کہ از خود پہل کر کے اس علاقے میں پھیلے ہوئے بازنطینی اثرات پر کاری ضرب لگائیں، اس سے پہلے کہ بازنطینی مملکت ان کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کے خلاف کوئی بڑا اقدام کرے۔

عمرۃ القضا سے واپسی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جمادی الاولیٰ ۷ھ تک مدینے ہی

میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک فوج شام(۲) کی طرف روانہ فرمائی۔(۳) آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو فوج کا امیر مقرر کیا اور یہ ہدایت جاری فرمائی کہ اگر وہ شہید ہو جائیں تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کمان سنبھال لیں اور اگر وہ بھی جام شہادت نوش کر لیں تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ ان کی جگہ لے لیں۔(۴) ان متبادل شخصیات کے انتخاب سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ امیر کے تقرر کو مشروط کرنا بھی جائز ہے اور یکے بعد دیگرے کئی امراء کا تقرر بھی بیک وقت مستحسن ہے۔(۵) یہ پہلا موقع تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ مہم خطرات سے پُر ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سفر طویل اور مسافت زیادہ تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل مسلمانوں کو بازنطینی سلطنت جیسی طاقتور ریاست سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور شام کے سرحدی علاقوں پر بسنے والے تمام قبائل کا اس ریاست سے سیاسی الحاق بھی تھا۔

جب اسلامی فوج معان کے مقام پر پہنچی تو اسے یہ خبر ملی کہ ہرقل اپنی فوج لے کر معاب (البلقاء) پہنچ گیا ہے، اور اس کی فوج میں ایک لاکھ بازنطینی سپاہی اور ایک لاکھ عیسائی عرب شامل ہیں جن کا تعلق لخم، جذام اور قضاعہ (عذرا، بلی اور بلقین) سے ہے۔ مسلمانوں نے دو راتیں معان میں قیام کیا۔ اس دوران میں انہوں نے آپس میں نئی صورت حال کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ چند لوگوں نے یہ رائے پیش کی کہ رسول اللہ ﷺ کو خط کے ذریعے تازہ ترین صورتِ حال اور دشمن کی طاقت وقوت کے بارے میں مطلع کیا جائے تاکہ آپؐ تازہ کمک روانہ فرما دیں اور اپنے تازہ ترین احکام بھی صادر فرما دیں۔ اس موقع پر حضرت ابورواحہؓ نے فوج کے حوصلے بلند کرتے ہوئے یہ تقریر کی: ''لوگو! جس چیز سے تم اس وقت گھبرا رہے ہو، وہی تو ہے جس کی تلاش میں تم نکلے ہو، یعنی شہادت۔ ہم تعداد، قوت یا اسباب کی بناء پر دشمن سے جنگ کرنے کے لیے نہیں نکلے، بلکہ اس دین کی بنیاد پر مقابلہ کرنے کے لیے نکلے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ پس آگے بڑھو! ہمارے لیے دونوں راستے بہترین ہیں: فتح یا شہادت''۔(۶)

ان الفاظ کے ساتھ ہی پوری فوج میں جوش وخروش کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور جو لوگ حملہ کرنے سے جھجک رہے تھے، ان کی جھجک دور ہو گئی۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ فوج کو موتہ کے مقام پر لے گئے جو الکرک سے قدرے جنوب کی جانب ہے اور بازنطینی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر کس لی۔ دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ چھڑ گئی اور تینوں امرائے لشکر نے غیر معمولی جرأت اور عظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اسلام کا بطلِ جلیل ثابت کر دکھایا اور یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ نے اپنے دشمن کے ہاتھوں سے خنجروں کے اتنے زیادہ زخم کھائے کہ ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے علم سنبھالا، اچک کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور علم ہاتھ میں بلند کیے ہوئے جنگ کرنا شروع کر دی۔ دشمن نے ان کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا تو انہوں نے چابک دستی سے اسلامی فوج کا علم بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جب بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا تو انہوں نے بڑی مستعدی سے علم کو اپنے کٹے ہوئے دونوں بازوؤں کے ذریعے سنبھال لیا اور اسی طرح علم کو سینے سے لگائے اس وقت تک لڑتے رہے جب تک شہادت کو گلے نہیں لگا لیا۔ ان کے شہید ہوتے ہی حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے علم بلند کیا، ایک لمحے کے لیے جھجکے (شاید اس لیے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے نامزد کردہ آخری امیر تھے)، لیکن پھر فوراً آگے بڑھے اور دشمن کی فوج پر پل پڑے۔ لڑتے لڑتے آخر وہ بھی شہادت کے اعلیٰ ترین مقام پر سرفراز ہو گئے۔ ان کے گرتے ہی حضرت ثابتؓ بن ارقم نے فوراً اسلامی جھنڈے کو اونچا کر دیا اور چیخ کر پکارے کہ ''اے مسلمانو! اپنا امیر منتخب کر لو''۔ تمام مسلمانوں نے حضرت خالدؓ بن ولید کو امیر منتخب کر لیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے صورت حال کی سنگینی بھانپ لی، انہوں نے فوراً اپنی فوج کی تنظیم نو کی، میمنے اور میسرے کو ایک دوسرے کی جگہ پر بدل دیا اور ایک دستہ عقب سے لا کر اسے سامنے کر دیا تاکہ بازنطینیوں کو یہ تاثر ملے کہ نئے اور تازہ دم فوجی دستوں نے جگہ سنبھال لی ہے۔ اس طرح حضرت خالدؓ بن ولید بہترین منصوبہ بندی کر کے اپنی فوج کو دشمن کے نرغے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس حکمت عملی کی وجہ سے مسلمانوں کا بہت کم جانی نقصان ہوا۔ مستند ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ

شہداء کی تعداد صرف ۱۲ تھی۔(۷)

دشمن کے نرغے سے اسلامی فوج کو بخیر وخوبی نکال لانا حضرت خالدؓ بن ولید کی عظیم الشان کامیابی تھی۔ مسلمانوں کا بہت کم نقصان ہوا، جبکہ بازنطینیوں کو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا، ان کے زخمیوں اور مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بلاشبہ مسلمانوں کی بے مثال شجاعت، بلند حوصلگی اور شہادت کی تڑپ، اس پر مستزاد حضرت خالدؓ بن ولید کی غیر معمولی عسکری صلاحیت وہ امور تھے جن کی وجہ سے مسلمان اس پُر خطر اور پُر آزمائش مرحلے سے سرخ رو نکلے۔

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی لاش پر تیروں اور (۸) نیزوں کے ۹۰ سے زیادہ زخم پائے گئے، اس کے باوجود وہ آخری سانس تک لڑتے رہے تھے۔ اس معرکے میں حضرت خالدؓ بن ولید نے یکے بعد دیگرے ۹ تلواریں استعمال کیں، اور ہر ایک ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہی۔(۹)

اسی موقع پر رسول اللہ ﷺ کا یہ معجزہ بھی ظاہر ہوا کہ آپؐ نے مدینے میں اپنے ساتھیوں کو اشک آلود چہرے کے ساتھ یہ خبر دی کہ لشکر کے تینوں سپہ سالار شہید ہو گئے ہیں، حالانکہ اس وقت تک میدانِ جنگ سے کوئی خبر رساں نہیں پہنچا تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو یہ خبر بھی سنائی کہ اب حضرت خالدؓ بن ولید نے فوج کی کمان سنبھال لی ہے اور علم ان کے ہاتھ میں ہے، پھر آپؐ نے فتح کی خوشخبری بھی سنائی۔(۱۰) اس صحیح حدیث میں فتح سے مراد یہ ہے کہ مسلمان نہ صرف کامیاب منصوبہ بندی کر کے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو گئے، بلکہ انہوں نے بازنطینیوں کو بھاری نقصان بھی پہنچایا، اس کے باوجود کہ ان کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔

اسلامی فوج کے صحیح سلامت پیچھے ہٹنے کی کامیاب کوشش کے باوجود جب وہ مدینے واپس آئے تو مدینے کے لوگوں نے ان کے اوپر مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر پھینکیں اور ان الفاظ میں ان کے اوپر برس پڑے: ''تم بھاگے ہوئے لوگ ہو۔ تم اللہ کے راستے سے بھاگ کر آئے ہو''! رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ''یہ لوگ بھاگے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ اگر اللہ نے چاہا تو یہ لڑنے کے لیے جییں گے''۔(۱۱) عام مسلمانوں کے اس ردعمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس زمانے

میں لوگوں کے دلوں میں اسلام کا شعور کتنا اجاگر ہو چکا تھا۔

شہدائے موتہ کو اللہ تعالیٰ کی نظر میں جو مقام اور مرتبہ حاصل ہوا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ اب کبھی دنیا میں رہنا پسند نہ کریں گے، کیوں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انہیں شہادت کے بعد عظیم الشان رتبے سے نوازا ہے''۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے بچوں کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپؐ کچھ دیر ان کے ساتھ کھیلتے رہے، ان کی حجامت بنوانے کا حکم دیا اور ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ آپؐ نے بچوں کی والدہ کو جو بچوں کے یتیم ہونے پر غمزدہ تھی، تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''کیا تمہیں یہ ڈر ہے کہ یہ بچے محتاج ہو جائیں گے، جبکہ میں دنیا اور آخرت میں ان کا کفیل ہوں''۔ (۱۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے بازنطینی فوج کے ساتھ اپنے اس مقابلے میں بہت کچھ سیکھا، انہیں بہت سے نئے تجربات حاصل ہوئے اور بے شمار ایسی معلومات حاصل ہوئیں جن کی روشنی میں انہوں نے جہاد کے بارے میں آئندہ اپنا لائحۂ عمل طے کیا۔ اس معرکے میں انہوں نے نہ صرف دشمن کی طاقت وقوت، تعداد اور جنگی طور طریقوں اور منصوبہ بندی کا پتا لگایا، بلکہ اس خطۂ زمین کی نوعیت سے بھی واقف ہو گئے۔

حواشی

۱- ابن سعد، **طبقات**، ۱-۲: ۱۷؛ ابن حجر، **الاصابة**، ۱: ۵۹؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۷: ۵۱۱

۲- ابن اسحٰق، سند کے ساتھ (**سیرة ابن هشام**، ۳: ۴۲۷)۔

۳- عروہ بن زبیر کی ''مرسل'' سے (**سیرة ابن هشام**، ۳: ۴۲۷)۔ ابن اسحٰق کی سند جو عروہ تک جاتی ہے، ''حسن'' ہے۔

۴- **صحیح بخاری**؛ (ابن حجر، **فتح الباری**، ۷: ۵۱۰)۔ ابن اسحٰق، عروہ کی ''مرسل'' سے (**سیرة ابن هشام**، ۳: ۴۲۷)

۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۷: ۵۱۳

۶- ابن اسحٰق، بغیر سند کے (**سیرة ابن هشام**، ۳: ۴۲۰)۔

۷- ابن ہشام، **سیرۃ**،۳: ۴۳۰ - ۴۴۷؛ ابن حزم، **جوامع السیرۃ**، ص۲۲۰-۲۲۲۔ ابن اسحٰق نے اس واقعے کی کوئی سند نہیں دی سوائے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے اپنے گھوڑے کو ناکارہ کرنے کے، اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے آگے بڑھنے میں تأمل اور جھجک کے۔ ابن اسحٰق نے ان دونوں واقعات کا تذکرہ تو ایک ''حسن'' سند کے ساتھ کیا ہے جس میں صحابی کا نام معلوم نہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۸- **صحیح بخاری**؛ (ابن حجر، **فتح الباری**، ۷: ۵۱۰)

۹- ایضاً، ۷: ۵۱۵

۱۰- ایضاً، ۷: ۵۱۲

۱۱- ابن اسحٰق ، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ جس کا سلسلہ عروہ سے ملتا ہے، لیکن یہ ''مرسل'' اور ''ضعیف'' ہے۔ (**سیرۃ ابن ھشام**، ۳: ۴۳۸)۔

۱۲- احمد، **مسند**، حدیث ۱۷۵۰ (**مطبوعہ شاکر**) ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ۔

۱۳

غزوۂ ذات السلاسل

موتہ سے اسلامی فوج کی مدینے واپسی کے چند روز بعد رسول اللہ ﷺ نے ذات السلاسل کی طرف روانگی کے لیے حضرت عمروؓ بن العاص کی سربراہی میں ایک فوج تیار کی۔ اس لشکر کشی سے آپؐ کے پیش نظر یہ تھا کہ قبیلہ قضاعہ کو ہمیشہ کے لیے سبق سکھا دیا جائے، جس نے غزوۂ موتہ میں بازنطینی فوج کا ساتھ دیا تھا، اور [اپنی طاقت کے بارے میں] غلط فہمی کا شکار تھا۔ اب قبیلہ قضاعہ کے لوگ مدینے پر چڑھائی کرنے کی غرض سے اپنی فوجوں کو حرکت میں لا رہے تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے تین سو مہاجرین اور انصار پر مشتمل فوج کے ہمراہ ان کے علاقے کی طرف پیش قدمی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ قبیلہ قضاعہ کی چند شاخوں، یعنی بلی، عذرہ اور بلقین سے قبیلہ قضاعہ کے خلاف مدد طلب کریں۔ جب حضرت عمروؓ بن العاص کو قبیلہ قضاعہ کی فوج کی کثرت کا علم ہوا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مدد طلب کی۔ رسول اللہ ﷺ نے دو سو افراد پر مشتمل ایک دستہ جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، حضرت ابوعبیدہ عامرؓ بن جراح کی سربراہی میں ان کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔

عامر بن شعبی (متوفی ۱۰۳ھ) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو مہاجرین پر اور حضرت عمروؓ بن العاصؓ کو بدوؤں پر سپہ سالار مقرر کیا تھا، اور دونوں کو یہ تاکید کی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ فوج قبیلہ بنی بکر کے مقابلے میں روانہ کی گئی تھی، جبکہ حضرت عمروؓ بن العاص قضاعہ پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔(۱)

جب اسلامی فوج قضاعہ کی فوجوں کے درمیان آگے تک پیش قدمی کرتی چلی گئی تو قضاعہ بھاگنے اور منتشر ہونے لگے۔ اس کارروائی کے بعد اس علاقے میں مسلمانوں کی ساکھ

دوبارہ بحال ہوگئی جو غزوۂ موتہ کے بعد قدرے متزلزل ہوگئی تھی۔

اس مہم کے دوران میں حضرت عمروؓ بن العاص نے تیمّم کے ساتھ مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور امامت کے فرائض انجام دیے۔ وہ ناپاکی کی حالت میں تھے، لیکن انہوں نے اس لیے غسل نہ کیا کہ سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے وہ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس ذاتی اجتہاد کا علم ہوا تو آپؐ نے اس کی توثیق فرمائی۔ (۳)

حضرت عمروؓ بن العاص کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اوپر امیر مقرر کرنے سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ کسی شخص کو اس سے زیادہ اولوالعزم اور عظیم المرتبت لوگوں پر امیر مقرر کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اول الذکر اپنے عہدے کی مناسبت سے بھرپور صلاحیتوں کا مالک ہو۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کی تمام تر فوجی کارروائیوں کا رخ شمال کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس وجہ سے جنوبی اور جنوب مغربی سمت میں مسلمانوں کی فوجی نقل وحرکت ختم ہو چکی تھی، کیوں کہ صلح کی شرائط کے تحت مکے اور اس کے گردونواح کے علاقے محفوظ اور پرامن تھے، تاہم امن وامان کی یہ صورت حال زیادہ عرصے باقی نہ رہ سکی۔ قریش کو سلامتی اور تحفظ کی یہ فضا کچھ زیادہ راس نہ آئی، انہوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ اس طرح مکے اور اس کے گردونواح میں مسلمانوں کی فوجی سرگرمیاں دوبارہ جاری ہوگئیں۔

حواشی

۱- امام احمد نے ''صحیح'' سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے جو عامر الشعبی سے جا کر ملتی ہے۔ یہ وہ شخصیت ہیں جنہیں مغازی کے ساتھ اس حد تک دلی وابستگی تھی کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے (**تهذيب التهذيب**، ۵:۶۷)۔

۲- ابن قیم، **زاد المعاد**، ابن سعد سے بغیر سند کے نقل کرتے ہیں (ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۷۴-۷۵)۔

۳- اس ''صحیح'' حدیث کو ابوداؤد، دارقطنی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا (البانی: **صحيح سنن ابی داؤد**، حدیث ۳۶۰-۳۶۱)

امام احمد نے بھی اسے بیان کیا: **مسند**، ۴:۲۰۳، ایک سند کے ساتھ جس میں ابن لہیعہ شامل ہیں۔

۱۴

فتحِ مکہ

قریش نے اس وقت فاش غلطی کی، جب انہوں نے مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے خلاف اپنے حلیف بنوبکر کی حمایت کی اور سپاہیوں، گھوڑوں اور اسلحے کے ذریعے ان کی مدد کرتے ہوئے بنوخزاعہ کو بھرپور نقصان پہنچایا۔ یہ واقعہ الوتیر نامی ایک چشمے کے قریب پیش آیا تھا جو خزاعہ کے علاقے میں واقع تھا۔ خزاعہ نے مسلمانوں سے مدد طلب کی۔ اس مقصد کے لیے قبیلہ خزاعہ کا ایک فرد عمرو بن سالم مدینے گیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے کچھ اشعار پڑھے جن میں مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے سن کر فرمایا: ''عمرو بن سالم! تمہاری مدد ضرور کی جائے گی''۔(۱)

ابن اسحٰق لکھتے ہیں کہ بنوبکر نے خزاعہ کو پہلے حرم میں داخل ہونے پر مجبور کیا اور پھر حرم کے اندر ان سے جنگ کی۔(۲) واقدی کا بیان ہے کہ اس جنگ میں خزاعہ کے ۲۰ افراد مارے گئے تھے۔(۳) موسیٰ بن عقبہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قریش کے جن سرداروں نے خزاعہ کے خلاف بنوبکر کی حمایت کی، ان میں صفوان بن امیہ، شیبہ بن عثمان اور سہیل بن عمرو شامل تھے اور انہوں نے ہتھیاروں اور غلاموں کے ذریعے بنوبکر کو امداد بہم پہنچائی تھی''۔(۴)

قریش کا یہ طرزِ عمل کھلم کھلا عہد شکنی پر مبنی تھا اور مسلمانوں کے اتحادی قبیلے کے خلاف ایک واضح جارحانہ اقدام تھا، اور قریش کو خود بھی اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کریں، یا بنوبکر کے ساتھ معاہدہ ختم کریں، بصورتِ دیگر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ قریش نے ان تمام پیشکشوں کو مسترد کر دیا اور جنگ کرنا قبول

کرلیا۔ اگرچہ بعد میں وہ اپنے اس فیصلے پر پچھتائے اور ابوسفیان کو اس درخواست کے ساتھ مدینے روانہ کیا کہ صلح حدیبیہ کی تجدید کر دی جائے، لیکن ابوسفیان کو اپنی اس درخواست میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ (۵)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا، لیکن آپؐ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کس سمت میں روانہ ہونے والے ہیں۔ اس اخفا سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ قریش کو کسی قسم کی جنگی تیاری کا موقع نہ مل سکے۔ (۶)

رسول اللہ ﷺ نے مدینے کے گردونواح میں بسنے والے تمام قبائل کو جہاد کی دعوت دی۔ ان میں اسلم، غفار، مزنیہ، جہینہ، اشجع اور سلیم نامی قبائل شامل تھے۔ ان میں سے بعض قبائل مدینے آ کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور بعض راستے میں آپؐ کے ساتھ شریک ہوتے گئے۔ اس طرح اسلامی لشکر میں شامل مجاہدین کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی (۷)۔ اس موقع پر تمام مہاجرین اور انصار رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پابہ رکاب تھے اور ان میں سے کوئی شخص بھی پیچھے نہیں رہا۔ (۸) اس سے عسکری طور پر متحرک ہونے میں مسلمانوں کی اعلیٰ استعداد اور صلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ اس لشکر جرار میں قبیلہ مزنیہ کے ایک ہزار افراد اور قبیلہ سلیم کے گیارہ سو (یا سات سو) افراد شامل تھے۔ (۹) مجاہدین کی اس تعداد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ کے درمیانی دور میں مسلمانوں کی فوجی طاقت میں کتنی وسعت پیدا ہو چکی تھی!

اس موقع پر حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے، جو غزوۂ بدر میں شریک تھے، قریش کے نام ایک خط لکھا کہ مسلمان ان پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ یہ خط ایک معمر خاتون کے ذریعے مکے بھیجا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو جونہی اس واقعہ کا علم ہوا، آپؐ نے فوراً حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو اس خاتون کے تعاقب میں روانہ فرما دیا، اور ان لوگوں نے روضۃ خاخ کے مقام پر جو مدینے سے تقریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے، اس خاتون کو جا لیا۔ انہوں نے اسے دھمکی دی کہ خط ان کے حوالے کر دے، ورنہ اس کی تلاشی لی جائے گی۔ خاتون نے فوراً ہی خط ان کے حوالے کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے

فرمایا:''حاطب! یہ کیا معاملہ ہے''؟ انہوں نے جواب دیا:''یا رسول اللہ(ﷺ)! میرے معاملے میں جلد بازی نہ فرمایئے، دراصل قصہ یہ ہے کہ قریش سے میرا کوئی قرابتی تعلق نہیں ہے، بس جان پہچان کا رشتہ ہے۔ دیگر مہاجرین کے رشتہ دار مکے میں موجود ہیں جو ان کے اہل خانہ اور ان کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگہبانی کرتے ہیں۔ چونکہ میرا کوئی رشتہ دار مکے میں موجود نہیں ہے، لہٰذا میں نے یہ کوشش کی کہ میں قریش کے ساتھ احسان کا معاملہ کروں تاکہ میرے اہل خانہ کو بھی مکے میں تحفظ حاصل ہو جائے۔ بخدا میری نیت بری نہیں تھی۔ میں نہ کافر ہوا ہوں اور نہ اپنا دین ہی برباد کرنا چاہتا ہوں''۔ رسول اللہﷺ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس (حاطب) نے یقیناً سچ کہا ہے''۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا:''یا رسول اللہ(ﷺ)! اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑا دوں''؟ رسول اللہﷺ نے فرمایا:''حاطبؓ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا اور تمہیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ بدر کے بارے میں کیا فرمایا ہے، یعنی 'تم جو چاہو سو کرو، میں نے تمہیں بخش دیا ہے''۔

اس کے بعد یہ آیاتِ قرآن نازل ہوئیں:

> اے ایمان والو، تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو، حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آ چکا ہے وہ اس کے منکر ہیں۔ رسول کو اور تم کو اس بناء پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، شہر بدر کر چکے ہیں۔ اگر تم میرے راستے پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضا مندی ڈھونڈنے کی غرض سے نکلے ہو، تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو، حالانکہ مجھے سب چیزوں کا خوب علم ہے، تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا، وہ راہ راست سے بھٹکے گا (الممتحنہ ۶۰:۱)۔(۱۰)

اس اعلان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ مسلمانوں کو کفار سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو سختی سے ممانعت کر دی کہ وہ کفار کو نہ تو اپنا

جگری دوست بنائیں اور نہ اپنا خیر خواہ ہی سمجھیں۔

اسی واقعے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ معجزہ بھی ظاہر ہوا کہ آپ ؐ کو حضرت حاطب ؓ کے خط بھیجنے کا علم ہو گیا اور جس خاتون کے ذریعے بھیجا گیا تھا، اس کا بھی پتا چل گیا۔ اس موقع پر بہت سے دوسرے قوانین بھی وضع ہوئے۔ مثال کے طور پر جاسوس کے ساتھ برتاؤ، جاسوس کی جامہ تلاشی کا جواز اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ حضرت حاطب ؓ نے ایک فاش اور مہلک غلطی کی تھی، لیکن اس کے باوجود انہیں کافر نہیں سمجھا گیا۔

رسول اللہ ﷺ رمضان ۸ ھ میں مدینے سے روانہ ہوئے۔ مسلمان روزے کی حالت میں تھے۔ جب وہ کدید نامی ایک چشمے پر پہنچے جو مکے سے ۸۶ کلومیٹر اور مدینے سے ۳۰۱ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا تو وہاں انہوں نے روزہ افطار کیا۔ (۱۱)

رسول اللہ ﷺ نے اپنی غیر موجودگی میں ابارہم کلثوم بن حسین الغفاری کو مدینے کا حاکم مقرر کیا۔ (۱۲)

مسلمانوں کا لشکر مرالظہران تک پہنچ گیا تھا اور قریش کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ لشکر ۱۰ رمضان کو مدینے سے روانہ ہوا تھا اور ۱۹ رمضان کو شہر مکہ میں داخل ہو گیا۔ یہ مغازی کی معروف ترین روایت ہے، (۱۳) البتہ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مکہ کس تاریخ کو فتح ہوا۔ ۱۳ رمضان کو، ۱۶ کو، ۱۷ کو یا ۱۸ رمضان کو، لیکن تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ فتح مکہ رمضان ۸ ھ میں ہوئی۔ (۱۴)

ابھی مسلمان مکے کے راستے ہی میں تھے کہ بہت سے مشرک سرداروں نے آ کر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ ابواء کے مقام پر حضرت ابوسفیان ؓ بن حارث جو رسول اللہ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے اور حضرت عبداللہ ؓ بن ابی امیہ المغیرہ سامنے آئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ابوسفیان ؓ بن حارث وہ شخص تھے جو مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور مسلسل ۲۰ سال تک اسلام کے خلاف برسرِ پیکار رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو اسلام کی روشنی سے منور کیا اور ان کے ایمان کو اتنا مضبوط کر دیا کہ حنین کے موقع پر وہ ان چند اصحاب میں شامل تھے

جو رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں اس وقت سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈھال بن گئے تھے جب بقیہ تمام لوگ منتشر ہو گئے تھے۔(۱۵) حضرت عبداللہ بن ابی امیہ کا شمار بھی اسلام کے بدترین مخالفوں میں ہوتا تھا، وہ حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہؓ کے باپ شریک بھائی تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے اس وقت ملے جب آپ السیفا اور العرج کے درمیان تھے۔ یہ وہ مقامات ہیں جو مدینے سے مکے جاتے ہوئے راستے میں آتے ہیں۔ انہوں نے دل و جان سے اسلام قبول کیا اور فتح مکہ میں شریک ہوئے۔ بعد میں طائف کے محاصرے کے دوران میں وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔(۱۶)

جحفہ کے مقام پر حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ایک مہاجر کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔(۱۷) وہ فتح خیبر سے قبل اسلام قبول کر چکے تھے۔(۱۸) بعض کمزور روایات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے معرکۂ بدر(۱۹) یا ہجرتِ مدینہ(۲۰) سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن ان کمزور روایات کی نفی اس حقیقت سے ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے اس وقت فدیے کا مطالبہ کیا جب وہ بدر کے موقع پر قیدی کی حیثیت سے مدینہ منورہ لائے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے اپنے قبولِ اسلام سے پہلے بھی اسلام کی معتد بہ خدمات انجام دی تھیں، وہ قریش کی خبریں رسول اللہ ﷺ کو بھیجا کرتے تھے اور مکے میں مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی خبرگیری بھی کرتے تھے۔

مسلمانوں کی فوج مرالظہر ان میں خیمہ زن ہوئی۔ قریش ابھی تک مسلمانوں کی اس لشکر کشی سے بے خبر تھے۔ مشرکینِ مکہ میں سے ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ مسلمانوں کی سن گن لینے کے لیے شہر سے باہر نکلے تو ان کی ملاقات حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے ہوئی۔ وہ قریش کو یہ پیغام بھیجنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ وہ باہر آئیں اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلح کی بات چیت کر لیں، قبل اس کے کہ آپؐ طاقت کے ذریعے شہر میں داخل ہوں۔ ابوسفیان اور ان کے ساتھی آپس میں اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ مرالظہر ان میں کون خیمہ زن ہے؟ بعض کہتے تھے کہ یہ خزاعہ کی فوج ہے۔ ان کی اس گفت و

شنید سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کس کامیابی کے ساتھ مکے کی جانب اپنی پیش رفت کو پوشیدہ رکھا تھا۔

جب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے انہیں یہ بتایا کہ یہ مسلمان فوج ہے جو یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو ان لوگوں نے حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے ابوسفیان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ان کی امان میں مسلمانوں کے خیموں تک چلیں۔ ابوسفیان راضی ہو گئے۔ حضرت عباسؓ انہیں اپنی امان میں رسول اللہ ﷺ کے خیمے میں لے آئے۔ آپ ﷺ نے ابوسفیان کو اسلام کی دعوت دی۔ ابوسفیانؓ نے نہایت نرمی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی، لیکن اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ کو ہدایت کی کہ ابوسفیان کو اپنے خیمے میں لے جائیں اور اگلی صبح دوبارہ آپ ﷺ کے پاس واپس لائیں۔ حضرت عباسؓ نے ایسا ہی کیا اور اگلے روز ابوسفیانؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ مسلمانوں کے فوجی دستے ابوسفیانؓ کے سامنے سے گزرے تو انہیں مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اب قریش مسلمانوں کو زیر نہیں کر سکتے۔ اسی دوران میں مہاجرین اور انصار پر مشتمل سپاہیوں کا ایک دستہ پرچم لہراتا ہوا ابوسفیانؓ کے سامنے سے گزرا۔ اسی دستے میں حضور ﷺ بھی رونق افروز تھے۔ ابوسفیانؓ نے یہ منظر دیکھ کر حضرت عباسؓ سے کہا: ''خدا کی قسم! آج تمہارے بھتیجے کو بڑی بادشاہت ملی ہے''۔ حضرت عباسؓ نے جواب دیا: ''ابوسفیان! خدا تمہیں ہدایت دے، یہ بادشاہت نہیں، نبوت ہے''۔ اس کے بعد ابوسفیانؓ مکے کی طرف روانہ ہو گئے اور قریش کو مسلمانوں کی شان و شوکت اور طاقت و قوت سے مطلع کرتے ہوئے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کا راستہ روکنے کی کوشش نہ کریں۔ (۲۱)

جب فوجی دستے شہرِ مکہ میں داخل ہو رہے تھے تو حضرت سعدؓ بن عبادہ انصار کا پرچم بلند کیے ہوئے ابوسفیان کے سامنے سے گزرے تو یہ الفاظ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گئے: ''آج لڑائی کا دن ہے، آج کعبے کی حرمت حلال کر دی جائے گی''۔ ابوسفیانؓ نے یہ سن کر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ سعدؓ نے غیر مناسب الفاظ کہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: ''سعدؓ نے غلط کہا ہے، بلکہ آج اللہ تعالیٰ کعبے کو سر بلند کرے گا اور آج کعبے کو عزت اور احترام کی چادر اوڑھائی جائے گی''۔(۲۲) آپ ﷺ نے یہ فرمانے کے بعد حضرت سعدؓ بن عبادہ سے پرچم لے کر ان کے صاحبزادے حضرت قیسؓ کو دے دیا۔ حضرت سعدؓ نے یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی کہ ان کے بیٹے سے پرچم واپس لے لیا جائے، انہیں یہ خدشہ ہے کہ کہیں ان کے بیٹے سے بھی کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بیٹے سے بھی پرچم واپس لے لیا۔(۲۳)

جب رسول اللہ ﷺ نے مکے میں داخل ہونے کا ارادہ فرمایا تو فوج کو مختلف — دائیں، بائیں اور مرکزی — حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہر حصے پر ایک سپہ سالار مقرر کر دیا۔ دائیں حصے کی کمان حضرت خالدؓ بن ولید سنبھالے ہوئے تھے، بائیں بازو کے سالار حضرت زبیرؓ بن عوام تھے۔ پیدل فوج حضرت ابوعبیدہؓ کی زیر نگرانی تھی۔ حضور ﷺ کا پرچم سیاہ رنگ کا اور علم سفید تھا۔(۲۴)

پرچموں کی تقسیم کی بابت واقدی نے خاصا تفصیلی مواد فراہم کیا ہے۔ انہوں نے مجاہدین کی تعداد کے بارے میں جو تفصیل بیان کی ہے، اس کے مطابق مہاجرین کے ۷۰۰، انصار کے ۴۰۰۰، بنوسلیم کے ۴۰۰، جہینہ کے ۸۰۰، بنوکعب بن عمر کے ۵۰۰ افراد تھے، اس طرح مجاہدین کی کل تعداد ۶۴۰۰ ہو گئی تھی۔ ان مجاہدین کے پاس کل ۹۸۰ گھوڑے تھے(۲۵)، تاہم واقدی نے جو تعداد بیان کی ہے وہ اس تعداد سے مختلف ہے جو ''صحیح'' روایات کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ واقدی کی روایت کو ''متروک'' (مسترد) سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ قابل اعتماد نہیں ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ دوسرے ان سے اختلاف کرتے ہوں۔

قریش نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کی خاطر مختلف قبائل کے فوجی دستے جمع کر لیے تھے اور اس اقدام کے ذریعے انہوں نے اپنا تحفظ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر انہیں فتح ہو گئی تو وہ ان قبائل کی مدد کریں گے، بصورتِ دیگر وہ مسلمانوں سے صلح کر لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اگر یہ قبائل مسلمانوں کا راستہ روکنے کی کوشش

کریں تو ان سے جنگ کی جائے۔ مسلمانوں کی فوجیں مکے میں داخل ہوگئیں اور کوہ صفا تک پہنچ گئیں، جس نے بھی مزاحمت کی، وہ مارا گیا۔ رسول اللہ ﷺ شہر کے بالائی حصے، یعنی کداء (۲۶) کی سمت سے مکے میں داخل ہوئے اور حضرت خالدؓ بن ولید شہر کے زیریں حصے سے داخل ہوئے۔ (۲۷) قریش زیادہ دیر تک مدافعت نہ کر سکے۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید کی خندمہ کے مقام پر کچھ مشرکوں سے جھڑپ ہوئی جس میں ۱۲ مشرک مارے گئے، (۲۸) جبکہ صرف تین مسلمان شہ سوار کام آئے۔ موسیٰ بن عقبہ لکھتے ہیں کہ مرنے والے مشرکوں کی تعداد ۲۴ تھی (۲۹)۔ واقدی نے یہ تعداد ۲۸ بتائی ہے (۳۰)۔ طبرانی کی ایک کمزور روایت کے مطابق ۷۰ مشرکین مارے گئے تھے۔ (۳۱)

ان تمام روایات میں مضبوط ترین روایات ابن اسحٰق اور موسیٰ بن عقبہ کی ہیں جو مغازی کے سب سے زیادہ قابل اعتماد راوی ہیں۔ مجموعی طور پر موسیٰ بن عقبہ کی مغازی، سیرت ابن اسحق سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ حضرت ابوسفیانؓ کی ایک گفتگو میں قریش کے مرنے والوں کی بڑی تعداد کا حوالہ ہے جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ممکن ہے موسیٰ بن عقبہ کی خبر زیادہ قرین قیاس ہو۔ حضرت ابوسفیانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''یا رسول اللہ! قریش کا خون بہت سستا ہو گیا ہے، آج کے بعد قریش کا وجود باقی نہیں رہے گا''۔ اس گفتگو سے پتا چلتا ہے کہ قریش کے بے شمار افراد مارے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان یہ تھا کہ جو شخص حضرت ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو جائے گا، وہ محفوظ ہے، اور جو شخص اپنے گھر کے دروازے بند کر لے گا، وہ بھی محفوظ ہے، چنانچہ کچھ لوگ حضرت ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو گئے اور باقی لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔

انصار کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش کو تحفظ کی جو یقین دہانی کرائی ہے، وہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کے اندر اپنی قوم کے لیے بے اندازہ جذبۂ ترحم پایا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ مکے میں مستقل قیام کا ارادہ فرما لیں، لیکن پھر فوراً ہی انہیں آپ ﷺ کا یہ فرمان یاد کر کے تسلی ہو گئی: ''میں تمہارے ساتھ ہی جیوں گا اور تمہارے ساتھ

ہی مروں گا''۔(۳۲)

رسول اللہ ﷺ نے اپنی فوج کو یہ حکم دیا تھا کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کریں جو ان کے راستے میں مزاحم ہوں، باقی تمام لوگوں کے لیے آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ دو خواتین اور چار مرد ایسے تھے جو عام معافی سے مستثنٰی تھے۔ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ جہاں بھی ملیں، قتل کر دیے جائیں، خواہ کعبے کا پردہ پکڑے ہوئے پائے جائیں۔ ان مردوں کے نام یہ ہیں: عکرمہ بن ابی جہل، عبداللہ بن خطل، مقیاس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ عبداللہ بن خطل (۳۳) کو اس وقت قتل کیا گیا جب وہ خانۂ کعبہ کے پردے سے چمٹا ہوا تھا۔ مقیاس بن صبابہ مکے کے بازار میں پایا گیا، اسے وہیں قتل کر دیا گیا۔ عکرمہؓ بن ابی جہل اور عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کسی نہ کسی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا، چنانچہ ان دونوں کی جانیں بخش دی گئیں۔ (۳۴)

حافظ ابن حجر نے مختلف روایات سے ان تمام ناموں کو یکجا کیا ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے سزائے موت سنائی تھی۔ یہ کل ۹ مرد اور آٹھ خواتین تھیں۔ (۳۵) یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور ان پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔ ان لوگوں کو موت کی سزا دینے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تمام لوگوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق مل جائے کہ اسلام کی صفتِ احسان اور اس کے متبعین کے جذبۂ ترحم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی ظلم و ستم کی جرأت نہیں کر سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے خزاعہ کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ فتح مکہ کے پہلے روز عصر کے وقت تک بنوبکر سے اپنا انتقام لے لیں، کیوں کہ فتح سے قبل بنوبکر نے خزاعہ کے ساتھ غداری کی تھی اور حدیبیہ میں معاہدہ کرنے کے باوجود وہ اس غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔

جب عصر کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مکے میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ اب مکہ ایک مقدس اور محترم مقام ہے۔ جب اس اعلان کے بعد خزاعہ نے ایک شخص کو انتقاماً قتل کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے خون بہا ادا کیا اور

اس بات پر زور دیا کہ اب اگر کوئی شخص مارا گیا تو اس کے خاندان کو اختیار ہو گا کہ منصفانہ طور پر بدلہ لے لے، یا دیت وصول کر لے۔(۳۶)

رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اہل مکہ کی اکثریت کو عام معافی دے دی گئی، حالانکہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے مشن کو ہر مرحلے پر شدید سے شدید نقصان پہنچانے کے لیے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دی تھیں اور آج مسلم افواج ان لوگوں کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ جس وقت مکے کے سپوت خانۂ کعبہ کے گرد جمع تھے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے، اس وقت آپ ﷺ کی زبان مبارک سے عام معافی کا فیصلہ صادر ہوا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا: ''تمہارے خیال میں اس وقت میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں''؟ لوگوں نے جواب دیا: ''آپؐ ایک شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں''۔ آپؐ نے جواب میں سورۂ یوسف کی یہ آیت پڑھی: لاتثریب علیکم الیوم... آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے(۳۷)(یوسف ۱۲: ۹۲)۔ اس کے بعد یہ قرآنی آیت نازل ہوئی: ''اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے''(النحل ۱۶: ۲۶)۔

رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر بے مثال بردباری اور تحمل کا مظاہرہ فرمایا، باوجودیکہ لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا، آپ ﷺ نے سب کو معاف کرنے ہی کا فیصلہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے کمال اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے محض اللہ کی خاطر لوگوں کو سزا دینے سے اجتناب کیا اور ارشاد فرمایا: ''ہم صبر سے کام لیں گے اور کسی کو سزا نہ دیں گے''۔(۳۸)

اس عام معافی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کی جانیں محفوظ ہو گئیں، وہ قید و بند کے خطرات سے آزاد ہو گئے اور تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیدادوں کی ملکیت بدستور ان کے مالکوں کے حق میں محفوظ رہی اور ان پر کسی قسم کے محصولات بھی عائد نہ کیے گئے۔ دیگر مفتوحہ علاقوں کے مقابلے

میں شہرِ مکہ کے بارے میں مختلف معاملہ کیا گیا، کیوں کہ یہ ایک مقدس اور محترم مقام تھا، ایک ایسا مقام جو دنیا بھر کے لوگوں کے لیے عبادت گاہ اور اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بابرکت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین اور متاخرین فقہاء کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ مکے کی زمین کو فروخت کرنا، یا اس شہر کے مکانات کو کرائے پر دینا جائز نہیں ہے۔(۳۹) یہ شہر ان لوگوں کی جاے سکونت ہے جو یہاں پہلے وارد ہوئے، وہ اپنی ضرورت کے مطابق جگہ استعمال کر سکتے ہیں اور اس کے بعد جو جگہ بچتی ہے، وہاں ان لوگوں کو رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے جو دور دور سے حج و عمرہ اور عبادت کی غرض سے وہاں آتے ہیں، تاہم بعض فقہاء کی رائے میں مکے کی زمین کو فروخت کرنا اور اس کے مکانات کو کرائے پر دینا جائز ہے۔ جو لوگ جواز کے قائل ہیں، ان کے دلائل مضبوط ہیں، اور جو عدمِ جواز کے قائل ہیں، ان کی بنیاد ''مرسل'' اور ''موقوف'' احادیث پر ہے۔(۴۰)

رسول اللہ ﷺ نے مکے میں اپنے گھر پر قیام نہیں فرمایا، بلکہ آپؐ کے لیے الحجون نامی ایک جگہ پر خیمہ نصب کیا گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قریش نے بنو ہاشم کا مقاطعہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ جب حضرت اسامہؓ بن زیدؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا: ''کیا آپ اپنے مکان پر قیام فرمائیں گے''؟ آپ نے جواباً فرمایا: ''عقیل نے کوئی مکان یا قطعۂ زمین چھوڑا ہی کب ہے''؟۔ پھر آپؐ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مسلمان غیر مسلم کا وارث نہیں ہو سکتا۔(۴۱) حضرت عقیلؓ، ابو طالب کے وارث تھے۔ انہوں نے اور ان کے بھائی طالب نے مل کر اپنے والد کے تمام مکانات فروخت کر دیے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ نے اپنے والد ابو طالب کی وراثت میں سے کچھ نہیں پایا تھا، کیوں کہ ابو طالب کا انتقال حالتِ کفر میں ہوا تھا۔(۴۲)

جب رسول اللہ ﷺ مکہ شہر میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو آپؐ کے روّیے میں تکبر اور فخر نام کی کوئی چیز نہ تھی، بلکہ آپؐ کا سرِ مبارک عاجزی اور انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکا ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اظہارِ تشکر آپؐ کے چہرۂ مبارک سے عیاں تھا۔ زبان مبارک پر سورۃ الفتح کی آیات جاری تھیں۔ آپؐ کی آواز میں ارتعاش تھا(۴۳)۔

آپؐ اونٹنی پر سوار تھے، اسی حالت میں آپؐ نے کعبے کا طواف کیا، اور اپنی چھڑی سے رکن یمانی کی طرف اشارہ کیا۔ اس عمل سے آپؐ کے پیش نظر ایک مقصد تو یہ تھا کہ آپؐ لوگوں کو دھکے دے کر اور زور آزمائی کر کے رکنِ یمانی کو چھونا نہیں چاہتے تھے، دوسرے اس عمل کے ذریعے اُمت کو بھی یہی سبق دینا مقصود تھا۔ (۴۴)

رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ مکہ ایک محترم مقام ہے اور اب فتح کے بعد اس پر کبھی حملہ نہیں کیا جائے گا۔ (۴۵) آپؐ نے قریش کو بھی اونچا مقام عطا کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا کہ فتح مکہ سے لے کر یومِ قیامت تک کسی قریشی کو نہ گرفتار کیا جا سکے گا اور نہ قتل ہی کیا جا سکے گا۔ (۴۶)

آپؐ نے یہ حکم بھی دیا کہ خانۂ کعبہ کے اندر موجود تمام بتوں کو توڑ کر کعبے کو پاک صاف کر دیا جائے۔ آپؐ نے بذات خود اس کام میں حصہ لیا۔ آپؐ ایک ایک بت کو زمین پر گرا کر توڑتے جاتے تھے اور یہ قرآنی آیت تلاوت کرتے جاتے تھے: ''اور کہہ دیجیے کہ حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا، واقعی باطل چیز تو یونہی آتی جاتی رہتی ہے'' (۴۷) (الاسراء ۱۷:۸۱)۔

خانۂ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت تھے۔ (۴۸) رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہم السلام کی تصاویر کو زعفران سے ڈھک دیا۔ یہ تصاویر کعبے کے اندر بنی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں فال کے تیر تھمائے گئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ انہیں (کفار کو) غارت کرے، ابراہیمؑ نے کبھی فال کے تیر نہیں اٹھائے''۔ (۴۹) ایک روایت کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ خانۂ کعبہ کے اندر حضرت مریم صدیقہ کی تصویر بھی موجود تھی۔ (۵۰) رسول اللہ ﷺ اس وقت تک خانۂ کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوئے، جب تک ان تصاویر کو ضائع نہیں کر دیا گیا۔ (۵۱) اس کے بعد آپؐ اندر داخل ہوئے، پھر آپؐ نے سامنے کے دو ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی۔ کعبے کو چھ ستونوں کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا۔ آپؐ نے اس طرح نماز ادا کی کہ آپؐ کی پشت خانۂ کعبہ کے دروازے کی طرف تھی، دو ستون آپؐ کے بائیں جانب، ایک ستون آپؐ کے دائیں جانب اور تین ستون آپؐ کی پشت پر تھے۔ (۵۲) نماز ادا

کرنے کے بعد آپؐ خانۂ کعبہ سے باہر تشریف لائے، حضرت عثمانؓ بن طلحہ کو آواز دی اور کعبے کی کنجی انہیں دے دی۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی کعبے کی تولیت بنو شیبہ کے پاس تھی اور اب بھی انہی کے پاس رہنے دی گئی۔ (۵۳)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور خانۂ کعبہ کا طواف کرنا شروع کیا۔ آپؐ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی تکبیر اور تہلیل کر رہے تھے **لا اله الا الله و الله اکبر**۔ اس وقت آپؐ احرام کی حالت میں نہیں تھے۔ آپؐ نے سر پر ایک خود پہنی ہوئی تھی، پھر آپ نے ایک سیاہ عمامہ زیب تن فرمایا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی شخص حج کا عمرہ ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ مکہ شہر میں بغیر احرام کے داخل ہو جائے۔ (۵۴)

اس طرح کعبۃ اللہ شرک کی ہر آلائش اور جاہلیت کے ہر شرمناک فعل سے پاک صاف ہو گیا، اور ایک بار پھر اسی حالت میں واپس آ گیا جو خداوند ذوالجلال کو مطلوب تھی اور جس کی تمنا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اس کی تعمیر کے وقت کی تھی کہ یہ گھر خدائے واحد کی پرستش کا مرکز بن جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک صاف کرنا دراصل جزیرہ نمائے عرب میں بت پرستی پر کاری ضرب لگانے کے مترادف تھا، کیوں کہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں خانۂ کعبہ بت پرستی کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا۔

فتح مکہ کے بعد سب سے پہلے خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو نخلہ کی طرف روانہ کیا، تاکہ وہاں کے بڑے بت العزیٰ کو توڑا جا سکے۔ یہ وہ بت تھا جسے قبیلہ مضر کے لوگ بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے اس بت کو توڑنے کا فریضہ انجام دیا۔ (۵۵) اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو سواع روانہ کیا تاکہ اس علاقے کے بڑے بت ہذیل کو توڑا جا سکے، حضرت عمروؓ بن العاص نے اسے اپنے ہاتھ سے توڑا۔ (۵۶) اسی طرح حضرت سعدؓ بن زید الاشہلی کو مشلّل کا بت ریزہ ریزہ کرنے کی مہم پر روانہ کیا گیا (مشلل ایک علاقہ ہے جو مکے اور مدینے کے درمیانی راستے میں قدید کے نزدیک واقع ہے)۔ انہوں نے

اس بت کو توڑ دیا۔ (۵۷) اس طرح بت پرستی کے تمام بڑے بڑے مراکز ملیا میٹ کر دیے گئے جن کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا ہے: ''بھلا تم نے لات اور عزیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے''؟ (النجم ۵۳:۱۹-۲۰)

سورۃ النصر قرآن کریم کی وہ سورۃ ہے جو فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئی:

جب خدا کی مدد اور فتح آ پہنچے اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین، یعنی اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجیے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجیے۔ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے (النصر ۱۱۰:۱-۳) (۵۸)

عرب کے عام لوگ، گویا اس بات کے منتظر تھے کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان جو نزاع پایا جاتا ہے، وہ ختم ہو۔ جونہی مکہ فتح ہوا، لوگ بڑی تعداد میں آگے بڑھ کر اسلام قبول کرنے لگے۔ (۵۹) حضرت عمروؓ بن سلمہ الجرمی کہتے ہیں: ''عرب اسلام قبول کرنے میں اس وقت تک متأمل تھے، جب تک انہوں نے یہ نہیں دیکھ لیا کہ جیت کس کی ہوگی۔ وہ لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ابھی انتظار کرو اور دیکھو کہ کون جیتتا ہے؟ اگر محمد (ﷺ) نے قریش کو شکست دے دی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سچے پیغمبر ہیں' چنانچہ جونہی فتح ہمارا مقدر بنی، چاروں طرف سے تمام قبائلِ عرب اسلام قبول کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے''۔ (۶۰)

ابن اسحٰق فتح مکہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عرب، اسلام کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے اس وقت تک جھجکتے رہے، جب تک رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان دوٹوک فیصلہ نہیں ہو گیا۔ یہ جھجک اس وجہ سے تھی کہ قریش کو تمام لوگوں کی سرداری حاصل تھی، وہ کعبے کے متولی اور نگران تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں شامل تھے اور عرب کے تمام سرداروں نے اس بات کو قبول کر رکھا تھا۔ قریش وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا۔ جب مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سرِ تسلیم خم کر کے اسلام قبول کر لیا تو عرب قبائل نے یہ محسوس کیا کہ ان کے اندر اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کریں، یا ان کے خلاف

کسی قسم کی جارحیت کا مظاہرہ کریں تو انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہونے کا اعلان کر دیا جیسا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ خود فرماتے ہیں: ''چاروں طرف سے لوگ فوج در فوج رسولؐ کی طرف آ رہے ہیں۔'' (۶۱)

رسول اللہ ﷺ نے مکے میں متعدد خطبات ارشاد فرمائے۔ پہلا خطبہ آپؐ نے خانۂ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔ اس خطبے میں آپؐ نے قتلِ عمد پر واجب الادا خون بہا کی تشریح فرمائی۔ آپؐ نے جاہلیت کی تمام رسوم کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا جس میں انتقام کی رسم بھی شامل تھی، لیکن آپؐ نے دو چیزوں کو برقرار رکھنے کا حکم دیا: ''حجاج کرام کو پانی پلانے کا فریضہ اور کعبے کی تولیت کی ذمہ داری''۔ (۶۲)

دوسرے خطبے میں آپؐ نے وہ تمام معاہدے کالعدم کیے جانے کا اعلان کیا جو زمانۂ جاہلیت میں کیے گئے تھے، سوائے ان معاہدوں کے جو اصلاح کی خاطر کیے گئے ہوں، یا حق کا بول بالا کرنے کے لیے، یا ان کا مقصد اہلِ قرابت کی اعانت ہو۔ (۶۳)

تیسرے خطبے میں آپؐ نے اعلان فرمایا کہ مکہ ایک محترم علاقہ ہے، جہاں شکار کھیلنا، جنگلی پودے اکھاڑنا، درخت کاٹنا اور گری پڑی چیز کو اٹھانا اور لینا حرام ہے۔ مکے کی حدود کے اندر جنگ کی ممانعت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے فتحِ مکہ کے موقع پر بہت تھوڑی مدت کے لیے آپؐ کو جنگ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ (۶۴) آپؐ نے مزید وضاحت فرمائی کہ فتحِ مکہ کے بعد مدینے کی جانب ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی، صرف جہاد اور اس کی نیت باقی ہے۔ (۶۵) اگرچہ مدینے کی جانب ہجرت کرنا اب فرض نہیں رہا، تاہم ایک کافر ملک سے اسلامی مملکت میں ہجرت کرنے کا حکم قیامت تک برقرار رہے گا۔ (۶۶) مدینے کی طرف ہجرت کرنا اس وقت اس لیے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ مسلمان امن اور سکون کے ساتھ اپنے مالک کی عبادت کر سکیں، مدینے کو ایک مضبوط اسلامی ریاست کی شکل دے سکیں، اور اس ریاست کی نہ صرف حفاظت کریں، بلکہ جہاد کے ذریعے اس کی سرحدوں کو وسعت دینے کے بھی قابل ہوں۔ فتحِ مکہ کے بعد ہجرتِ مدینہ کی

ضرورت اس لیے باقی نہیں رہی تھی کہ اب اسلام طاقت ور ہو چکا تھا اور اب مسلمانوں کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اپنے گھروں میں رہ کر عبادات انجام دیں اور دنیا کے گوشے گوشے کو اسلام کے نور سے منور کردیں۔ جہاد کو قیامت تک باقی رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ مسلمانوں سے اسلام، ایمان اور جہاد پر بیعت لیا کرتے تھے، ہجرت پر نہیں۔ (۶۷) ابن عمرؓ نے اس بات کی وضاحت اپنے اس قول سے کی ہے: ''فتحِ مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم منسوخ کر دیا گیا، مگر جب تک جہاد جاری رہے گا، ہجرت بھی باقی رہے گی''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دنیا میں کوئی نہ کوئی کافر علاقہ موجود ہے، ہر اس شخص پر ہجرت فرض رہے گی جو اس علاقے میں رہتے ہوئے اسلام قبول کرے اور اسے یہ خوف ہو کہ اسے اس کے دین سے ورغلایا جائے گا۔ (۶۸)

اپنے چوتھے خطبے میں آپؐ نے یہ وضاحت فرمائی کہ اگر کسی کا رشتے دار ناحق مارا جائے تو اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو قصاص لے لے اور چاہے تو دیت۔ (۶۹)

فتح مکہ کے موقع پر شریعت کے بہت سے احکام جاری ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:

- مسافر کو یہ اجازت دی گئی کہ اگر وہ چاہے تو سفر کے دوران میں رمضان کا روزہ رکھے اور اگر نہ چاہے تو نہ رکھے، اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، کیوں کہ جس وقت مسلمان فوج نے مدینے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تو کدید کے مقام تک رسول اللہ ﷺ نے روزے رکھے، اس کے بعد آپؐ نے روزہ نہیں رکھا۔ (۷۰)
- اسی سفر میں رسول اللہ ﷺ نے صلوٰۃ الضحٰی ادا فرمائی جو آٹھ رکعات پر مشتمل تھی۔ (۷۱) یہ نماز سنت مؤکدہ ہے۔
- جس شخص کو قرآن زیادہ یاد ہو، اسے نماز کی امامت کرنے کا حق زیادہ ہے۔ (۷۲)
- اسی سفر کے دوران میں اس طویل ترین مدت کا بھی تعین ہو گیا جس میں ایک مسافر اپنی نماز قصر کر سکتا ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے مکے میں ۱۹ دن قیام فرمایا اور اس دوران میں آپؐ نے اپنی نمازیں قصر کیں''۔ (۷۳)

- خواتین کی طرف سے امان دینا جائز قرار دیا گیا۔ ام ہانی نے دو مردوں کو جوان کے سسرالی رشتے دار تھے، امان دی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی دی ہوئی امان پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔ (۷۴) فقہائے کرام اس پر متفق ہیں کہ خواتین کو امان دینے کا حق حاصل ہے۔ (۷۵)
- متعہ حرام قرار دیا گیا۔ اس موقع پر تین دن کے لیے متعہ حلال کیا گیا تھا، اس کے بعد ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیا گیا۔ (۷۶) دراصل متعے کی حرمت اور حلت دو مرتبہ واقع ہوئی۔ فتح خیبر سے پہلے متعہ حلال تھا اور خیبر کے روز حرام کیا گیا۔ اس کے بعد فتحِ مکہ کے روز حلال کیا گیا اور تین روز گزرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیا گیا اور اب یہ حرمت قیامت تک باقی رہے گی۔ (۷۷)
- اس قانون کی توضیح بھی ہوئی: ''بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زنا کار کے لیے سنگساری ہے''۔ یہ قانون جس پس منظر میں وضع ہوا، وہ ایک باندی کے بچے کا واقعہ ہے۔ باندی کا نام زمعہ تھا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبدؓ بن زمعہ کے درمیان بچے کی ولدیت پر جھگڑا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبدؓ بن زمعہ کے حق میں فیصلہ دیا، کیوں کہ بچہ حضرت عبدؓ بن زمعہ کے باپ کے بستر پر پیدا ہوا تھا۔ (۷۸)
- اسی زمانے میں وہ قانون بھی وضع ہوا جو صفوانؓ بن امیہ اور عکرمہؓ بن ابی جہل جیسے مشرکین کے بارے میں تھا جن کی بیویاں ان سے پہلے مسلمان ہوگئی تھیں۔ اس سلسلے میں ان مشرکوں کا نکاح اپنی مومنہ بیویوں کے ساتھ برقرار رکھا گیا، کیونکہ بیویوں کی عدت گزرنے سے قبل ہی ان کے شوہروں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ (۷۹)
- وصیت کا قانون: کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی ایک تہائی میراث سے زیادہ کے بارے میں وصیت کرے۔ اس قانون کا علم ہمیں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے واقعے کے ذریعے ہوتا ہے۔ جب وہ بیمار پڑے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک تہائی مال سے زیادہ کے بارے میں وصیت کرنے کی ممانعت کردی۔ (۸۰)
- عورت کو یہ حق حاصل ہوا کہ اگر اس کا شوہر اسے ضرورت کے مطابق رقم نہ دیتا ہو تو وہ اپنی

اور بچوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے شوہر کے مال میں سے لے سکتی ہے۔ یہ اجازت حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہند بنت عتبہ کے واقعے کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ (۸۱)

- شراب، مردار اور بت فروخت کرنے کی ممانعت ہوئی۔ (۸۲)
- مہندی یا صفرہ کے ذریعے سفید بال رنگنے کی اجازت دی گئی۔ اس حکم کی وضاحت حضرت ابوقحافہؓ کے واقعے سے ملتی ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے سفید بالوں کو خضاب کرلیں۔ (۸۳)
- اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے بارے میں سفارش کرنے کی ممانعت ہوئی، جب کہ سربراہ مملکت کے علم میں کوئی معاملہ آ چکا ہو، جیسا کہ اس مخزومی عورت کے بارے میں پیش آیا جس کا ہاتھ چوری کی سزا کے طور پر کاٹ دیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ پر بہت ناراض ہوئے، جب انہوں نے اس خاتون کو معاف کرنے کی سفارش کی۔ آپؐ نے فرمایا:

> لوگو! تم سے پہلی قومیں اسی لیے تباہ و برباد ہوگئیں کہ ان لوگوں میں جب اونچے طبقے کا کوئی شخص چوری کرتا تو اسے معاف کر دیا جاتا تھا اور جب کوئی نچلے درجے کا شخص چوری کرتا تو اس کے اوپر سزا نافذ کر دی جاتی تھی۔ اس خدا کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ (۸۴)

مذکورہ بالا حدیث سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شریعت کے قوانین کے سامنے تمام لوگ برابر ہیں، اور یہ حدیث امرائے مملکت کو یہ تنبیہ کرتی ہے کہ حدود کا نفاذ کمزور اور قوی دونوں پر یکساں اور مساوی بنیادوں پر ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ کسی بھی ریاست یا معاشرے کی بقا کا دارومدار انصاف کے قیام پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی ریاست ظلم کی بنیاد پر قائم ہے تو اس کے دشمن اس کی تباہی کے لیے راستہ نکال لیتے ہیں، کیوں کہ ریاست کا ظلم مظلوموں کو یہ موقع فراہم کر دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں اور ریاست کو زوال و انتشار سے

دو چار کرنے کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

فتحِ مکہ کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کی قیادت قریش سے نکل کر دو قبائل ہوازن اور ثقیف میں منتقل ہو گئی۔ ان دونوں قبائل نے فوری طور پر مشرکین کی قیادت سنبھال کر اس خلا کو پر کرنا چاہا جو قریش کی شکست سے پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کر دی جو غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف پر منتج ہوئی۔

حواشی

۱- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۴: ۲۷۸۔ ابن اسحٰق سے ایک ایسی سند کے ساتھ روایت ہے جو ''حسن لذاتہ'' ہے۔ ابن اسحٰق نے واضح طور پر تحدیث کا اعلان کیا ہے۔ طبرانی کی روایت میں یحییٰ بن سلیمان خزاعی ایک کمزور شاہد ہے، (**المعجم الصغیر**، ۲: ۷۳)۔ مسند ابو یعلیٰ الموصلی میں ایک اور شاہد بھی ہے (۴: ۴۰۰)۔ اس کی سند میں حزام بن ہشام الخزاعی شامل ہیں، یہ وہ شیخ ہیں جن کی حیثیت ''صدوق'' کی ہے، ان کے والد گرامی تابعی تھے، جن کے اوصاف نامعلوم ہیں۔ ابن حبان نے ان دونوں کو ''ثقہ'' قرار دیا ہے (ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۶: ۱۶۲)

۲- ابن ہشام، **السیرة النبویة**، ۲: ۳۸۹، بغیر سند کے

۳- واقدی، **مغازی**، ۲: ۷۸۴، ایک بہت کمزور سند کے ساتھ۔

۴- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۴: ۲۸۱، موسیٰ بن عقبہ کی ایک روایت سے بغیر سند کے۔

۵- ابن حجر، **المطالب العالیة**، ۴۲۴۳۔ محمد بن عباد بن جعفر کی ''مرسل'' سے ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ جس کا سلسلہ واپس ان کی طرف جاتا ہے۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۶: ۸۔ ابن عمر کی حدیث سے اور محمد بن عائذ دمشقی کی روایت سے۔ (ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۴: ۲۸۳؛ واقدی، **مغازی**، ۲: ۷۸۶)۔

۶- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۴: ۲۸۳، ابن اسحٰق کی روایت سے ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ۔

۷- ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۳۹۷، بغیر سند کے

۸- ابن اسحٰق، ایک ایسی سند کے ساتھ جو ''حسن لذاتہ'' ہے (**سیرة ابن هشام**، ۲: ۳۹۹)۔

۹- ایضاً

۱۰- **صحیح بخاری**،۴:۲،۷۲،۷۹،۹۹:۵،۹۹:۹،۲۳؛ مسلم، **صحیح**،۲:۱۷۰

۱۱- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۸۵؛ ابن حجر، **فتح الباری**،۴: ۱۸۰-۱۸۱؛ نووی، **المنهاج شرح صحیح مسلم ابن حجاج**،۳:۱۷۳۔ انہوں نے فاصلے کا اندازہ مرحلوں اور میلوں میں لگایا۔

۱۲- ابن ہشام، **سیرۃ**،۲: ۳۹۹۔ ابن اسحٰق کی ایک روایت سے ایک ایسی سند کے ساتھ جو ''حسن لذاتہٖ'' ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسے صحیح قرار دیا ہے(**المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة**،۴: ۲۴۸)۔ حاکم نے اسے ''صحیح'' سمجھا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مسلم کی شرائط کے مطابق ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا(**مستدرک**،۳:۴۴)۔ ذہبی ان سے متفق ہیں، لیکن ابن اسحٰق، بخاری اور مسلم کی شرائط پر نہیں چلتے، اور مسلم نے صرف متابعات میں روایت کیا ہے۔

۱۳- نووی، **شرح مسلم**،۳:۱۷۶

۱۴- مسلم، **صحیح**،۱:۴۵۲-۴۵۳؛ ابن سعد، **طبقات**،۲: ۱۳۸

۱۵- حاکم، **مستدرک**،۳: ۴۴۳-۴۵۴؛ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ۔ حاکم نے کہا ہے کہ مسلم کے مطابق یہ حدیث ''صحیح'' ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا، اور ذہبی ان سے متفق ہیں۔ مزید دیکھیے، **سیرۃ ابن ہشام**،۲: ۴۰۰؛ طبری، **تاریخ**،۳: ۵۰۔ نیز دیکھیے: **صحیح مسلم** (۲:۳۹۵) میں ان کے اسلام لانے کے متعلق ان کا قصیدہ۔

۱۶- ابن عبدالبر، **الاستیعاب**، (**اصابة** کے حاشیے پر)،۲:۲۶۳

۱۷- ابن ہشام، **السیرۃ النبویة**،۲: ۴۰۰، بغیر سند کے زہری سے نقل کیا۔

۱۸- عبدالرزاق ، **المصنف**،۵: ۴۶۶؛ احمد، **مسند**، ۲۱: ۲۲؛ فساوی، **المعرفة والتاریخ**، ۱:۵۰۷-۵۰۹۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ ''شیخین (بخاری اور مسلم) کی شرائط کی رو سے یہ سند صحیح ہے، لیکن صحاح ستہ کے کسی مصنف نے اسے نقل نہیں کیا، سوائے نسائی کے'' (**البداية والنهاية**، ۴: ۲۱۷)

۱۹- ابن سعد، **طبقات** ،۴: ۱۰، یہاں اس کی سند میں حسین بن عبداللہ ہاشمی شامل ہیں جو ''ضعیف'' ہیں اور(**طبقات**۴: ۱۱) میں اس سند میں واقدی شامل ہیں جو 'متروک' ہیں، اور ابن ابی سبرہ ہیں جنہیں شہادت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۲۰- ابن سعد، **طبقات** ،۴: ۳۱۔ اس روایت کی سند میں واقدی شامل ہیں جو ''متروک'' ہیں، ابن ابو حبیبہ ہیں جو ''ضعیف'' ہیں اور سند ''منقطع'' ہے۔

۲۱- ابن حجر، **المطالب العالیة** ،۴: ۲۴۴، اسحٰق بن راہویہ کی روایت سے۔ ابن حجر نے کہا ہے: ''یہ ایک 'صحیح' حدیث ہے''۔ طحاوی (**شرح معانی الاثار** ،۳: ۳۲۲) نے کہا ہے: ''بخاری کے نزدیک یہ 'صحیح' ہے (۵: ۱۸۶)، لیکن زیادہ تفصیلات کے ساتھ ہے''۔

۲۲- **صحیح بخاری** ، ۵: ۱۸۶۔ کذب (جھوٹ بولا ہے)، اخطا (غلطی کی ہے) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲۳- ابن حجر، **مختصر زوائد البزار** ، ۲۴۸۔ انہوں نے کہا کہ یہ ''صحیح'' ہے۔

۲۴- ابن ماجہ، **سنن** ،۲: ۹۴۱، ایسی سند کے ساتھ جو ''حسن لذاتہ'' ہے۔

۲۵- واقدی، **مغازی** ،۲: ۷۹۹، ۸۰۱

۲۶- **صحیح بخاری** ،۵: ۱۸۹

۲۷- ابن حجر، **فتح الباری** ،۸: ۱۰

۲۸- **السیرة النبویة** ،۲: ۴۰۷، ابن اسحٰق کی روایت سے ''مرسل''، ان کے دو شیوخ سے جو ''ثقہ'' ہیں (حاکم، **مستدرک** ،۳: ۲۴۱)۔ بخاری نے صرف دو مسلمان شہداء کا ذکر کیا ہے۔

۲۹- بیہقی، **السنن الکبری** ،۹: ۱۲۰، ایک ایسی سند کے ساتھ جس میں ایک ایسا شخص شامل ہے جس کے حالات مجھے دستیاب نہیں ہو سکے۔ یہ موسیٰ بن عقبہ کی مراسیل میں سے ہے۔

۳۰- واقدی، **مغازی** ،۲: ۸۲۷-۸۲۹، بغیر سند کے۔

۳۱- ابن کثیر، **البدایة والنهایة** ،۴: ۲۹۷۔ اس کی سند میں شعیب بن صفوان ثقفی شامل ہیں جو ''مقبول'' ہیں، اس لیے یہ روایت ''ضعیف'' ہے۔

۳۲- مسلم، **صحیح** ،۲: ۹۵، ۶: ۲۹۶-۲۹۷

۳۳- ابن خطل نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن بعد ازاں اس نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور خود مرتد ہو گیا۔ یہ حقیقت کہ اسے اس وقت قتل کیا گیا جب وہ خانۂ کعبہ کے پردے سے چمٹا ہوا تھا، اس بات کی غماز ہے کہ کعبہ کسی ایسے گنہگار کو تحفظ نہیں دیتا جو شریعت کی سزا کا مستحق ہو چکا ہو۔ **سیرة ابن هشام** ، ۲: ۴۱۰، ابن اسحٰق سے بغیر سند کے۔

۳۴- نسائی، سنن (سیوطی، **زهر الربی** ، ۷: ۱۰۵)۔ اس کی سند میں کچھ کمزوری ہے۔ حدیث میں دو شاہد ہیں، دونوں کو بیہقی نے روایت کیا۔ ان میں سے ایک کا ذکر ابن کثیر کے ہاں ہے (**البدایة والنهایة** ،۴: ۲۹۹)۔ اس سند میں عبداللہ بن خطل کے بجائے حکم بن عبدالعزیٰ بن خطل (ان کے نام کے متعلق کچھ اختلاف ہے) اور عکرمہ کے بجائے ام سارہ شامل ہیں۔ دوسرے شاہد کا ذکر

السنن الکبریٰ (۹: ۱۲۰) میں ہے جن میں عمرو بن عثمان مخزومی شامل ہیں جو "مقبول" ہیں۔ وہ عکرمہ کے بجائے حویرث بن نقیذ کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ روایات "ضعیف" ہیں، لیکن وہ ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں جس کی وجہ سے حدیث تاریخی معیار پر پورا اترتی ہے۔ یہ روایت کہ ابن خطل کو قتل کیا جائے، خواہ وہ کعبے کے پردوں سے چمٹا ہوا پایا جائے، صحیحین میں موجود ہے (**صحیح بخاری** ۵: ۱۸۸؛ **صحیح مسلم**، ۱: ۵۷۰)

۳۵- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱-۱۲

۳۶- احمد نے اسے **مسند** میں روایت کیا اور اس کی سند "حسن لذاتہ" ہے (**الفتح الربانی**، ۲۱: ۱۵۹)، مزید دیکھیے: **مسند** کی روایت (۴: ۳۲) اس کی "حسن" سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ یہاں ابن اسحٰق نے واضح طور پر تحدیث بیان کی ہے۔ مزید دیکھیے: **مسند** میں ایک اور روایت (۴: ۳۱) جس میں مسلم بن یزید السعدی شامل ہیں جو "مقبول" ہیں، لیکن کچھ متابعات پائے گئے تھے، اس لیے روایت "حسن لغیرہ" کے درجے تک قوی ہو گئی ہے۔

۳۷- ابو عبید، **الاموال**، ۱۴۳، "حسن"، لیکن "مرسل" سند کے ساتھ روایت ہے۔ مزید دیکھیے: ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۱۲۔ ایک ایسی سند کے ساتھ ابن اسحٰق کی روایت ہے جس میں کچھ مجہول راوی شامل ہیں۔

۳۸- احمد، **مسند**، ۳: ۱۳۵؛ ترمذی، **سنن**، ۴: ۳۶۱-۳۶۲۔ دونوں سندیں ایک دوسری کی تائید کر کے اسے "حسن" کے درجے تک پہنچا دیتی ہیں۔ احمد کی سند میں ہدیہ المروزی شامل ہیں جو "صدوق" ہیں، لیکن ممکن ہے کہ کچھ بے ترتیبی کا شکار ہوئے ہوں۔ ترمذی کی سند میں ربیع بن انس شامل ہیں جو "صدوق" ہیں، لیکن بعض اوقات الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں اور عیسیٰ بن عبید الکندی شامل ہیں جو "صدوق" ہیں۔ حاکم کہتے ہیں "سند صحیح ہے، اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے روایت نہیں کیا"، اور ذہبی ان سے متفق ہیں (**مستدرک**، ۲: ۳۵۹)۔

۳۹- ابن قیم، **زاد المعاد**، ۲: ۱۹۴۔ اہل مکہ میں یہ مجاہد اور عطاء کا مذہب ہے، اہل مدینہ میں مالک کا اور اہل عراق میں ابو حنیفہ کا، اور سفیان ثوری، امام احمد اور اسحٰق بن راہویہ بھی یہی مذہب رکھتے ہیں۔

۴۰- ایضاً

۴۱- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۸۷؛ مسلم، **صحیح**، ۱: ۵۶۷

۴۲- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۵

۴۳- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۸۷

۴۴- ابو داؤد، **سنن**، ۱: ۴۴۴، ایسی سند کے ساتھ جو ''حسن لذاتہ'' ہے۔ ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۳: ۲۴۴،طبرانی سے مروی سند کے ساتھ جس کے افراد ''صحیح'' ہیں۔

۴۵- ترمذی، **سنن**، ۳: ۸۳۔ انہوں نے کہا، ''یہ حسن صحیح ہے''۔ احمد، **مسند**، ۴: ۴۱۲، ایسی سند کے ساتھ جو ''حسن لذاتہ'' ہے۔

۴۶- مسلم، **صحیح**، ۲: ۹۷؛ احمد، **مسند**، ۳: ۴۱۲، ایک صحیح سند کے ساتھ

۴۷- مسلم، **صحیح**، ۲: ۹۵-۹۶، ۲۹۶-۲۹۷

۴۸- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۸۸؛ مسلم، **صحیح**، ۲: ۹۷

۴۹- **صحیح بخاری**، ۵: ۸۸؛ احمد، **مسند**، ۱: ۳۶۵، ایک صحیح سند کے ساتھ۔ بصیری، **اتحاف الخیرۃ المحیرۃ**، جلد ۳، ایک ''حسن سند'' کے ساتھ

۵۰- **صحیح بخاری**، ۴: ۱۶۹

۵۱- ایضاً، ۵: ۱۸۸

۵۲- ایضاً، ۱: ۱۰۹-۱۱۰، ۵: ۲۲؛ **صحیح مسلم**، ۱: ۵۵۶

۵۳- اس کے متعلق متعدد ''مرسل'' اور ''منقطع'' روایات نقل کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب جب آپس میں ملتی ہیں تو قوی ہو جاتی ہیں (دیکھیے، عبدالرزاق، **مصنف**، ۵: ۸۳-۸۵؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۹)۔

۵۴- **صحیح بخاری**، ۳: ۲۱؛ **صحیح مسلم**، ۵۷۰؛ نووی، **شرح علی صحیح مسلم**، ۳: ۵۰۸

۵۵- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۳۶؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۴۵۔ اس کی تباہی کے متعلق کوئی روایت صحیح ثابت نہیں ہوئی۔

۵۶- ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۴۶

۵۷- ایضاً، ۲: ۱۴۶

۵۸- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۸۹

۵۹- ایضاً، ۵: ۱۹۱

۶۰- ابن سعد، **طبقات**، ۱: ۲: ۷۰

۶۱- **سیرۃ ابن ہشام**، ۲: ۵۶۰

۶۲- احمد، **مسند**، ۳: ۴۱۰، ایسی سند کے ساتھ جو ''حسن لذاتہ'' ہے۔ ابو داؤد، **سنن**، ۲: ۴۹۲،

ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ

۶۳- **صحیح مسلم**،۲:۴۰۹؛ احمد، **مسند**،۲:۲۱۵۔ ان کی سند میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عیاش شامل ہیں جو ''صدوق'' ہیں اور بعض اوقات معاملات کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

۶۴- **صحیح بخاری**،۳:۱۷؛ **صحیح مسلم**،۲:۵۶۸

۶۵- **صحیح بخاری**،۳:۱۸،۴:۲۸

۶۶- ابن حجر، **فتح الباری**،۴:۴۹، ۷:۲۷۰

۶۷- **صحیح بخاری**،۵:۷۲،۱۹۳؛ **صحیح مسلم**،۲:۲۶

۶۸- ابن حجر، **فتح الباری**،۷:۲۷۰

۶۹- **صحیح بخاری**،۱:۳۸؛ **صحیح مسلم**،۱:۵۶۹

۷۰- **صحیح مسلم**،۱:۴۵۱

۷۱- **صحیح بخاری**،۵:۱۸۹؛ **صحیح مسلم**،۱:۲۸۹

۷۲- **صحیح بخاری**،۵:۱۹۱

۷۳- ایضاً،۵:۱۹۰

۷۴- ایضاً،۴:۱۲۲

۷۵- خطابی نے یہ رائے دی ہے (**عون المعبود**،۷:۴۴)

۷۶- **صحیح مسلم**،۱:۵۸۶-۵۸۷

۷۷- نووی، **شرح صحیح مسلم**،۳:۵۵۳

۷۸- **صحیح بخاری**،۹:۱۹۱

۷۹- مالک بن انس، **المؤطا** (زرقانی، **شرح موطا**،۳:۱۵۶-۱۵۷)؛ ابن ہشام، **سیرۃ**،۲:۴۱۷

۸۰- ترمذی، **سنن**،۳:۲۹۱۔ ان کا کہنا ہے کہ ''یہ ایک 'حسن صحیح' حدیث ہے''۔ مزید دیکھیے: ابن حجر، **فتح الباری**،۵:۳۶۹

۸۱- **صحیح مسلم**،۲:۶۰

۸۲- **صحیح بخاری**،۳:۱۱۰؛ **صحیح مسلم**،۱:۶۸۹-۶۹۰

۸۳- **صحیح مسلم**،۲:۲۴۴

۸۴- **صحیح بخاری**،۵:۱۹۲؛ **صحیح مسلم**،۲:۴۷

۱۵

غزوۂ حنین

ہوازن شمالی عرب کا ایک معروف قبیلہ تھا جس کا تعلق عربوں کے مضری عدنانی سلسلے سے ہے۔ ہوازن کے بہت سے ذیلی قبائل تھے جن میں سے ایک ثقیف تھا۔ قبیلہ ثقیف کے لوگ طائف شہر کے اندر اور اس کے گردو نواح میں سکونت پذیر تھے، جب کہ ہوازن کی دیگر شاخیں تہامہ میں بحر احمر کے ساتھ ساتھ، شام کی جنوبی حدود سے یمن کی شمالی حدود تک پھیلی ہوئی تھیں (۱)

زمانۂ جاہلیت میں ثقیف کے علاقے میں عربوں کے بازار لگا کرتے تھے۔ ان بازاروں میں سے ایک مشہور عکّاظ کا بازار تھا جو نخلہ اور طائف کے درمیان لگا کرتا تھا۔ ان بازاروں میں جہاں تاجر خرید و فروخت کیا کرتے تھے، وہیں ادب اور شاعری کے مقابلے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ اسی قسم کا ایک اور بازار تھا جو ذوالمجاز کہلاتا تھا اور عرفہ کے قریب، یعنی طائف کی سمت میں عرفہ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر لگتا تھا۔ ان کے علاوہ ایک بازار کا نام مجنّہ تھا۔ یہ بازار مرالظہران میں لگتا تھا جو طائف کی نسبت مکے سے قریب پڑتا تھا۔ (۲)

ان بازاروں سے ثقیف کے لوگوں کو بہت زیادہ فوائد حاصل ہوتے تھے، وہ ان میں تجارتی اشیاء بیچتے تھے اور انہیں اپنی زرعی پیداوار فروخت کرنے کے لیے جگہ بھی میسر آجاتی تھی۔ ثقیف انگور اور انار کے باغوں، سبزیوں اور جڑی بوٹیوں پر مشتمل کھیتوں کے مالک تھے۔ اس موسمی میل جول کے نتیجے میں جو تمدنی اختلاط ہوتا، یہ لوگ اس سے مستفید ہوتے تھے۔ ان کے ادب کو جلا ملتی اور ان کا ذہنی افق وسیع ہوتا تھا۔ ایک طرف اگر یہ لوگ شام اور یمن کے کاروبار میں آڑھتی کی حیثیت رکھتے تھے تو دوسری طرف ان کا شمار صحرائی بدوؤں میں ہوتا تھا۔

ہوازن اور ثقیف کے مفادات قریش کے مفادات کے ساتھ اس لیے مشترک تھے کہ یہ قبائل ایک دوسرے کے اس قدر قریب قریب آباد تھے کہ ان کا درمیانی فاصلہ صرف ۹۰ کلومیٹر تھا۔ اہلِ قریش موسمِ گرما طائف میں بسر کرتے تھے۔ طائف میں ان کے مکانات اور باغات تھے، اور اس طرح طائف کو ''قریش کا باغ'' کہا جاتا تھا۔ (۳) قریش اور ہوازن کے درمیان یہ تعلقات اس بناء پر اور بھی مضبوط تھے کہ ان کے درمیان قدیم قرابتی تعلق بھی پایا جاتا تھا۔ اس تعلق کو مزید استحکام اس وقت حاصل ہوا، جب انہوں نے بعد میں ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے پیدا کر لیے۔ یہ دونوں قبائل مضر کی اولاد میں سے تھے اور قبیلہ ہوازن کے افراد اس وقت مضر کی چھٹی پشت میں تھے، اور قریش ساتویں یا پانچویں پشت میں تھے۔ (۴) (اس سلسلے میں ماہرینِ انساب کے درمیان معمولی اختلاف پایا جاتا ہے)۔

جب ہم ان کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں جو صحابہ کرامؓ کی سوانح پر مشتمل ہیں تو ہمیں فوراً محسوس ہوتا ہے کہ قریش اور ہوازن کے درمیان رشتوں کا ایک تانا بانا سا بُنا ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں قبائل نے آپس میں کثرت سے شادیاں کی تھیں۔ (۵) دونوں قبائل کے درمیان تعلقات میں جو استحکام پایا جاتا تھا، اس کی تصدیق و تائید اس واقعے سے ہوتی ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر قریش نے جس شخص کو مسلمانوں کے پاس اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، وہ عروہ بن مسعود الثقفی تھے۔ (٦)

قریش اور ہوازن کے تعلقات، جب اس قدر مضبوط بنیادوں پر مستحکم تھے، تو یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ ہوازن نے مکے میں مسلم برادری کے وجود میں آنے سے لے کر اس وقت تک، جب قریش کے ساتھ مسلمانوں کے تصادم کا آغاز ہوا، مسلمانوں کے بالمقابل ہمیشہ قریش کا ساتھ دیا اور اس میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں کہ فتح مکہ کے بعد اسلام کی مخالفت اور دشمنی کا علم قریش سے منتقل ہو کر ہوازن کے ہاتھ میں چلا گیا، اور جب عرب میں شرک کی قیادت قریش کے ہاتھ سے نکلی تو ہوازن نے فوراً آگے بڑھ کر اس خلا کو پر کیا۔

ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ طائف تشریف لے گئے تھے تاکہ قبیلہ

ثقیف کو اسلام کی دعوت دیں، لیکن انہوں نے نہایت درشتی کے ساتھ آپؐ کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے ان لوگوں سے یہ درخواست کی کہ طائف میں آپؐ کی آمد کو مخفی رکھا جائے، لیکن انہوں نے نہ صرف آپؐ کی ہر بات ٹھکرا دی، بلکہ آپؐ کے خلاف کھلی بدترین جارحیت کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ اپنے بچوں کو کہا کہ آپؐ کو پتھر ماریں۔ قریش اور ہوازن کے مفادات ایک جیسے تھے، جو کوئی قریش کے مذہب اور ان کے مفادات کے خلاف چلتا تھا، اسے لازماً ہوازن سے بھی ٹکر لینا پڑتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ قبیلہ ثقیف کا قبولِ اسلام حد درجے اہمیت کا حامل ہے، اس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ان کی فوجی اور معاشی حیثیت مستحکم تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ قریش کے ساتھ ان کے تعلقات مضبوط بنیادوں پر استوار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قبیلہ ثقیف کی طرف آپؐ نے جو سفر کیا، اگرچہ اس میں آپؐ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود آپؐ جلدی کر کے ان کے سرداروں سے ملے۔ جب آپ مختلف قبائل کے سرداروں کے سامنے اپنی دعوت رکھ رہے تھے تو آپؐ نے ان کے سردار عبد یالیل بن عبد کلال سے عقبہ میں ملاقات کی، لیکن عبد یالیل نے اسلام قبول نہ کیا۔ اس صورتِ حال سے آپؐ اتنے مایوس اور پریشان ہوئے کہ آپؐ مکے سے آگے نکل گئے اور واپسی کا راستہ بھول گئے۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں اور قریش میں تصادم کی جو زبردست آگ بھڑک اٹھی تھی، ہوازن اس سے ہمیشہ علیحدہ رہے۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ قریش خود ہی اس صورت حال سے نبٹ لیں گے۔ انہوں نے مسلمانوں اور قریش کے درمیان ہونے والی تمام جنگوں، یعنی بدر، احد اور خندق کو محض دور سے دیکھنے پر ہی اکتفاء کیا اور ان جنگوں میں کسی قسم کا حصہ لینے سے گریز کیا، البتہ اخنس بن شریق الثقفی نے جو بنو زہرہ کے حلیف تھے، بدر کے موقع پر قریش پر یہ زور دیا کہ وہ بدر سے لڑے بغیر واپس چلے جائیں، کیوں کہ ان کا تجارتی کاروبار محفوظ ہے۔ (۸) عروہ بن مسعود ثقفی نے قریش کو کہا تھا کہ وہ اس منصوبے کو قبول کر لیں جو رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا

ہے،(۹) تاہم ان افراد کے خیالات سے ثقیف کے چند افراد کی حکمت اور دانائی تو ظاہر ہوتی ہے، لیکن ثقیف اور ہوازن قبائل کا مجموعی طور پر ایسا کوئی رویہ سامنے نہیں آتا جو مسلمانوں کے ساتھ پرامن تعلقات پر مبنی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے کے واقعات میں ثقیف نے اس لیے حصہ نہیں لیا کہ اولاً وہ قریش پر انحصار کیے ہوئے تھے، اور ثانیاً مسلمانوں کی اصل طاقت اور قوت کے بارے میں ان کی معلومات ناکافی تھیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فتح مکہ سے قبل ہوازن کو مسلمانوں کے خطرے سے کوئی آگاہی نہیں تھی۔ قریش کو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا علم اس وقت سے تھا، جب انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کا معاہدہ کیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، اسلام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور قریش کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ فتح مکہ کے وقت تک قریش کے حوصلے بالکل پست ہو چکے تھے، ان کے ثقفی ہمسائے اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان کے کچھ لوگ واقعات کو قریب سے دیکھ بھی چکے تھے۔

ہوازن اور ثقیف کی طرف سے، قریش کی مدد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان اپنی فوجی نقل وحرکت کے مقاصد پوشیدہ رکھنے میں کامیاب تھے۔ جب مسلمانوں نے پیش رفت کی تو ہوازن کو اپنے گھروں کی فکر پڑ گئی، اس وجہ سے انہیں مکے کا دفاع کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ واقدی نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ انہوں نے یہ معلوم کرنے کے لیے ایک جاسوس روانہ کیا تھا کہ آیا مسلمان ہوازن پر حملہ آور ہونے کی نیت سے نکلے ہیں یا قریش پر؟ مسلمان جب مدینے سے نکلے تھے، اسی وقت سے ہوازن اپنے دستوں کو یکجا کر رہے تھے اور مسلمانوں سے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا ہدف وہی ہیں(۱۰)۔ ان کے اس خیال کو مزید تقویت اس طرح ملی کہ وہ صلح حدیبیہ کے بارے میں مسلمانوں کے طرزِ عمل سے متعلق کچھ غیر یقینی کیفیت کا شکار تھے۔

فتح مکہ اور قریش کی سرداری کے خاتمے کے بعد ہوازن شرک کے علمبردار بن کر کھڑے ہو گئے اور فوری طور پر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حرکت میں آ گئے، کیوں کہ رسول

اللہ ﷺ نے فتح کے بعد مسلمانوں کی عسکری سرگرمیوں کو ختم نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کی سربراہی میں ۳۰ سواروں پر مشتمل ایک دستہ نخلہ روانہ فرمایا تاکہ عزیٰ کو تباہ کر دیا جائے۔ (۱۱) یہ ایک گھر تھا جو ثقیف کے علاقے میں واقع تھا اور عرب اس کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ (۱۲) جب یہ مہم روانہ ہوئی تو رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ راتیں باقی تھیں۔ رمضان المبارک کے اختتام میں ابھی چھ راتیں باقی تھیں کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن زید الاشہلی کو ۲۰ سواروں پر مشتمل دستہ دے کر مشلل روانہ کیا تاکہ منات نامی بت کو توڑ دیا جائے۔ (مشلل وہی مقام ہے جو آج کل القدیدیہ کے نام سے معروف ہے)۔ منات عربوں کے نزدیک بڑا واجب التعظیم تھا اور بالخصوص انصار قبولِ اسلام سے پہلے اسے نہایت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ سعد الاشہلی بت کو توڑ کر مکے واپس آ گئے۔ (۱۳) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ وہ ہستی تھے جنہوں نے منات کو توڑا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس وقت وہاں روانہ کیا تھا، جب وہ فتح سے قبل مکے کے راستے میں تھے۔ (۱۴) حدیث کے معیار کے لحاظ سے یہ دونوں روایات کمزور ہیں۔ ابن سعد نے اسے بغیر سند کے اپنے استاد واقدی کے حوالے سے روایت کیا ہے جو ''ضعیف'' سمجھے جاتے ہیں، اور ابن کلبی کو بھی ''ضعیف'' گردانا جاتا ہے۔ ایک اور روایت میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ منات کو توڑنے کا فریضہ حضرت ابوسفیانؓ بن حرب نے انجام دیا، (۱۵) لیکن یہ روایت بھی دیگر دو روایات کے مقابلے میں قوی نہیں ہے، تاہم یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ منات کو توڑا گیا تھا، اور تاریخی اعتبار سے یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ جہاں تک ثبوت کی قطعیت کا تعلق ہے تو حدیث کا معیار تاریخ کی طرح کا نہیں۔

شوال ۸ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کی سربراہی میں ۳۵۰ مجاہدین پر مشتمل ایک دستہ بنو جذیمہ کی طرف یلملم روانہ کیا تاکہ انہیں اسلام کی دعوت پیش کی جا سکے۔ یلملم مکے سے جنوب کی طرف ۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جگہ ہے۔ حضرت خالدؓ بن ولید ان لوگوں کے پاس پہنچے، انہیں اسلام کی دعوت دی، مگر وہ لوگ اسلام قبول کرنے کا اظہار کھل کر

نہ کر سکے اور بجائے اسلمنا (یعنی ہم نے اسلام قبول کیا) کہنے کے بجائے صبعنا، صبعنا (یعنی ہم نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا) دہراتے رہے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کر دیا اور کچھ کو گرفتار کر لیا۔ جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا، بعد میں انہیں قتل کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔ حضرات عبداللہؓ بن عمرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور چند دیگر صحابہ کرامؓ نے قتل سے احتراز کیا۔ جب یہ لوگ حضورﷺ کی خدمت میں واپس آئے تو سارا واقعہ آپؐ کے گوش گزار کیا۔ رسول اللہﷺ نے ساری بات سن کر اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور التجا فرمائی: ''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا، میں اس سے بری الذمہ ہوں''۔(۱۶)

جب ان لوگوں نے صبعنا کا لفظ بولا تو حضرت خالدؓ بن ولید یہ سمجھے کہ وہ نہ صرف اسلام قبول کرنے سے انکاری ہیں، بلکہ اسلام کی تحقیر بھی کر رہے ہیں، اس لیے انہوں نے انہیں باقی نہ چھوڑا (۱۷)، جب کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے یہ محسوس کیا کہ وہ لوگ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر رہے ہیں اور یہ کہ انہیں درست الفاظ کا علم نہیں ہے، کیوں کہ اس وقت تک شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاحات عرب میں زبان زد عام و خاص نہیں ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کی اس کارروائی سے اظہار براءت تو کیا جو انہوں نے جلدی میں کر ڈالی تھی، مگر آپؐ نے نہ تو انہیں کوئی سزا دی اور نہ انہیں فوج میں ان کے عہدے سے معزول ہی کیا، کیوں کہ انہوں نے اپنی طرف سے اجتہاد کیا تھا، اگرچہ فاش غلطی کر بیٹھے تھے۔

اس سلسلے میں ایک روایت ملتی ہے جو ''منقطع'' ہے، اس لیے اسے ثبوت کے طور پر نہیں لیا جا سکتا۔ اس روایت کے مطابق رسول اللہﷺ نے نہ صرف تمام مقتولین کا خون بہا ادا فرمایا، بلکہ کچھ اضافی رقم بھی عطا فرمائی تاکہ سوگوار خاندانوں کی دلجوئی ہو سکے اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ آپؐ نے ان کے قتل کیے جانے کو پسند نہیں فرمایا۔(۱۸) قتلِ خطا کے معاملے میں آپؐ کا یہ عمل اسلامی قوانین کے مطابق ہے، تاہم اگر ہم اس ''منقطع'' روایت پر اعتماد کریں تو پھر ہمیں اسے پورے طور پر قبول کرنا ہو گا۔ روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب حضرت خالدؓ بن ولید

بنوجذیمہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ حضرت خالدؓ نے انہیں حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دیں اور اسلام قبول کرلیں۔ انہوں نے ہتھیار پھینک دیے، اس کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کی مشکیں کس لیں اور ان میں سے کئی لوگوں کو قتل کر دیا۔ ابن اسحٰق نے یہ اور اس جیسی دیگر روایات بیان کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے یہ سب کچھ اپنے چچا فاکہ بن مغیرہ کا انتقام لینے کے لیے کیا تھا، جنہیں بنوجذیمہ نے زمانۂ جاہلیت میں قتل کیا تھا۔ ابن کثیر نے ابن اسحٰق کی ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ 'مرسل' اور 'منقطع' روایات ہیں، اس لیے قابل اعتماد نہیں ہیں''۔ (۱۹)

اس معاملے میں سب سے اہم بات جس سے حضرت خالدؓ بن ولید کی بے گناہی معلوم ہوتی ہے، اور یہ ثبوت بھی مل جاتا ہے کہ انہوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ اجتہاد کیا تھا، لیکن ان سے غلطی سرزد ہوگئی، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو ان کے اس فعل پر کوئی سزا نہ دی اور محض یہی کافی سمجھا کہ ان کے اس فعل سے اظہارِ براءت کر دیا جائے۔

مختصر یہ کہ فتحِ مکہ کے بعد ہوازن اور ثقیف کے علاقے میں مسلمانوں نے دو مہمات سرانجام دیں۔ یہ مہمات ہوازن سے زیادہ عرصے چھپی نہ رہ سکیں، چنانچہ ہوازن نے فتحِ مکہ کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی مسلمانوں کے خلاف اپنی فوجیں اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ (۲۰) ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے حملے سے قبل ہی ان کے اوپر حملہ آور ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ انہوں نے اپنی افواج کے ساتھ اپنی تمام دولت، عورتوں اور بچوں کو بھی ایک جگہ جمع کر لیا تھا تاکہ کوئی شخص اپنی دولت اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر فرار نہ ہونے پائے۔ (۲۱) مالک بن عوف النصری فوج کا سردار تھا۔ غطفان کے دیگر قبائل نے بھی ہوازن کا بھرپور ساتھ دیا، لیکن کعب اور کلاب جن کا تعلق ہوازن سے تھا، اس معرکے میں پیچھے رہے۔ (۲۲)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مالک بن عوف نے اپنی فوج کو بڑے مؤثر انداز میں منظم کیا تھا۔ ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ سب سے آگے سرداروں کا دستہ تھا، اس کے بعد پیادہ

فوج، پھر خواتین اور سب سے اخیر میں بھیڑوں اور اونٹوں کی قطاریں تھیں۔(۲۳) مالک النصری تیس سال کا نوجوان تھا اور میدانِ جنگ میں غیر معمولی حوصلے اور بے مثال دلیری کا مالک سمجھا جاتا تھا۔(۲۴) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ درید بن الصمہ نے مالک النصری کے اس فیصلے سے اتفاق نہ کیا تھا کہ فوج کے ساتھ عورتوں، بچوں اور اسباب کو بھی باہر نکالا جائے۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اگر کسی کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ فرار ہونے پر تل گیا تو عورتوں یا اسباب کی موجودگی اسے نہ روک سکے گی، لیکن مالک النصری نے اس کی ایک نہ سنی۔(۲۵) واقدی واحد مصنف ہیں جنہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ ہوازن کی فوج کی تعداد بیس ہزار تھی (۲۶)۔ حافظ ابن حجر کا رجحان بھی اسی طرف ہے، ان کے خیال میں ہوازن کی فوج مسلمان فوج سے تعداد میں دگنی تھی۔(۲۷)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن ابی حدرد الاسلمیؓ کو ہوازن کی خفیہ معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ انہوں نے ایک دو روز ہوازن کے ہاں قیام کیا اور ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آ گئے۔(۲۸) اس کے بعد مسلمانوں نے مقابلے کی تیاری شروع کی۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ (۲۹) سے جو ہنوز مشرک تھا، ایک سو زرہیں مستعار لیں۔ صفوان نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ آیا وہ طاقت کے بل بوتے پر اس سے یہ زرہیں لے رہے ہیں، یا قرض کے طور پر؟ رسول اللہ ﷺ نے اسے بتایا کہ آپؐ یہ زرہیں اس سے بطور قرض لینا چاہتے ہیں۔ جنگ کے بعد آپؐ نے یہ زرہیں صفوان کو واپس کر دیں اور اس کی اس نوازش پر شکریہ ادا کیا۔(۳۰) ابن عبدالبر نے بغیر سند کے کچھ روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حویطب بن عبدالعزیٰ سے بھی ۴۰ ہزار درہم قرض لیے تھے اور نوفل بن حارث کی طرف سے تین ہزار نیزوں کی مدد بھی قبول کر لی تھی۔(۳۱) ہمیں ان معلومات کو درست تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آپؐ نے صفوان سے مدد طلب کی تھی، حالانکہ وہ ایک مشرک تھا۔ مزید براں اس وقت تک

اسلام کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں اور دوسروں سے مدد طلب کرنے میں اسلام کے تصورِ جہاد کو کوئی ٹھیس پہنچنے کا خدشہ باقی نہیں رہا تھا، بشرطیکہ مسلمانوں کی دینی لگن کی قیمت پر کسی قسم کی شرائط مسلط نہ کی جائیں۔

مسلمانوں کو جنگ کی تیاری میں زیادہ وقت نہ لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ فتح کرنے میں مسلمانوں کو کسی ایسی جنگ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جو تھکا دینے والی ہو، سوائے ایک آدھ معمولی جھڑپ کے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہوازن کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار اور تازہ دم تھے۔ ۵ شوال کو مسلمانوں نے حنین کی طرف کوچ کیا۔ انہوں نے مکہ فتح کرنے کے بعد پندرہ دن وہاں قیام کیا اور مکہ ۱۹ رمضان کو فتح ہوا تھا۔ ۱۰ شوال کی شام کو مسلمان حنین پہنچ گئے۔ (۳۲) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں مسلمان حنین کے قریب ہوتے چلے گئے، ان کی رفتار زیادہ مدھم اور محتاط ہوتی گئی، کیوں کہ حنین مکے کے مشرقی جانب صرف ۲۶ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ آج کل اس جگہ کو شراعی کہا جاتا ہے۔ (۳۳) جس وقت فوج مکے سے روانہ ہوئی تو اس کی رفتار تیز تھی۔ (۳۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غیر موجودگی میں حضرت عتابؓ بن اسید کو مکے کا امیر مقرر کیا۔ (۳۵) اس مرتبہ مسلمان فوج کی تعداد گزشتہ تمام مہمات کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان فوج دس ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی۔ (۳۶) حنین کے موقع پر دو ہزار کا مزید اضافہ ہو گیا۔ یہ مکے کے وہ باشندے تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور طلقاء (آزاد) کہلاتے تھے۔ تمام روایات اس پر متفق ہیں۔ اگرچہ مطالعۂ حدیث کے معیار کے مطابق یہ روایات صحیح نہیں ہیں جن میں طلقاء کی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے، جنہوں نے فوج میں شمولیت اختیار کی تھی، تاہم ان روایات کو ایک تاریخی ثبوت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ فوج کی سب سے زیادہ تعداد ہونے کے سبب جنگِ حنین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں لڑی جانے والی سب سے شدید اور بڑی جنگ قرار دی جاتی ہے۔ (۳۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی فوج کی حفاظت کا پورا پورا خیال تھا۔ جب وہ لوگ دشمن کی چھاؤنی کے قریب پہنچے تو عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آپؐ نے اپنے ایک صحابیؓ کو حکم دیا کہ وہ

پہاڑ کے اوپر کھڑے ہو کر دشمن پر بھی نگاہ رکھیں اور مسلمان فوج کا پہرہ بھی دیں۔ صحابی نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ دشمن بہت بڑی فوج اور ساز و سامان کے ساتھ خیمہ زن ہے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد اور بھرپور توکّل کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر اللہ نے چاہا تو کل یہ سب تمہیں غنیمت میں مل جائے گا''۔ اس کے بعد حضرت انسؓ ابن ابی مرثد نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس کام پر مامور فرما دیا کہ وہ فجر کی نماز تک مسلمان فوج کا پہرہ دیتے رہیں اور اس اثناء میں فوج اپنی نیند پوری کر لے گی۔ حضرت انس نے حسن و خوبی کے ساتھ اس ذمہ داری کو پورا کیا اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں جنت کی بشارت سنائی۔ (۳۸)

مسلمان فوج میں طلقاء کی شمولیت کے کچھ منفی اثرات بھی مرتب ہوئے، کیوں کہ وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور ان کے دل و دماغ سے جاہلی اثرات ابھی پوری طرح نکلنے نہ پائے تھے۔ حنین کے راستے میں ایک درخت تھا جس کا نام ذات انواط تھا اور مشرکین اس درخت کے اوپر اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں سے بعض نے جب یہ درخت دیکھا تو بولے: ''یا رسول اللہ! کیا آپ ہم لوگوں کے لیے بھی ایک ایسا ہی ذات انواط بنوا دیں گے، جیسا ان لوگوں کے پاس ہے''؟ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ''سبحان اللہ! تم لوگوں نے وہی بات کی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہی تھی۔ ہمیں بھی ایک ایسا ہی خدا بنا دو جیسا خدا ان لوگوں کے پاس ہے۔ قسم اس خدا کی! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم لوگ بھی وہی کرو گے جو تم سے پہلوں نے کیا تھا''۔ (۳۹)

ان کی اس خواہش کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود عقیدۂ توحید پوری طرح ان کے دل دماغ میں راسخ نہیں ہوا تھا، تاہم رسول اللہ ﷺ نے ان کی مشرکانہ سوچ پر انہیں تنبیہ تو کی، لیکن انہیں سزا دینے سے گریز کیا، کیوں کہ آپ کو معلوم تھا کہ وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں۔

ان کی ایک اور منفی سوچ یہ سامنے آئی کہ مسلمانوں میں اپنی تعداد پر فخر و غرور کا

احساس پیدا ہوا۔ ان میں سے ایک نے کھلم کھلا اظہار بھی کیا کہ (۴۰) ''آج ہمیں کون شکست دے سکتا ہے''۔ یہ سن کر کچھ اور لوگوں کے دل میں بھی اپنی کثرتِ تعداد پر بے جا اعتماد کا احساس پیدا ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو سرزنش کرتے ہوئے انہیں یہ بات یاد دلائی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی چیز پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے، ورنہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا: ''اور حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرّہ ہو گیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کار آمد نہ ہوئی اور تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگی کرنے لگی، پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے'' (التوبۃ ۹:۲۵)۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں کی اس کمزوری سے بخوبی آگاہ تھے اور آپؐ نے اپنی دعاؤں کے ذریعے لوگوں پر یہ چیز اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ آپؐ صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں اور اسی کی پناہ چاہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! تیری ہی مدد کے ذریعے میں ہر کوشش کرتا ہوں اور تیری ہی مدد سے میں حملہ کرتا ہوں اور تیری ہی مدد سے میں جنگ میں حصہ لیتا ہوں''۔ آپؐ نے لوگوں کو وہ واقعہ بھی سنایا، جب ایک نبی کے دل میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کا احساس پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت بھیج دی۔ (۴۱) رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ آپؐ تمام مسلمانوں پر مسلسل نظر رکھتے تھے اور جونہی ان کے خیالات یا طرزِ عمل میں معمولی سا بھی انحراف محسوس کرتے تو فوراً ان کی اصلاح فرماتے تھے، چاہے آپؐ سخت ترین دشمن کے ساتھ کتنی ہی پُر خطر مبارزت میں ہی گرفتار کیوں نہ ہوں۔ آپؐ کو پورا یقین تھا کہ فتح کا انحصار اور دارومدار اس شرط پر ہے کہ: ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا'' (**محمد** ۴۷:۷)۔

لیکن کیا اتنی بڑی جماعت کو تعلیم دینا اور اس کے دل و دماغ سے جاہلیت کے اثرات کو یکسر ختم کر دینا جس میں انہوں نے اپنی پوری زندگی گزاری تھی، ممکن تھا؟ یہ اپنی تعداد کی کثرت پر ان کا فخر و غرور ہی تھا جو جنگ کے آغاز میں ان کے فرار کا سبب بنا، لیکن فرار اور جنگ کی ہولناکی کا احساس ہوتے ہی وہ بہت جلد اپنے حواس میں واپس آ گئے اور انہوں نے اخلاص

کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد اور بھروسا کیا۔ اس کے بعد وہی مسلمان تھے جنہوں نے اس جنگ کے دوسرے دور میں فیصلہ کن فتح حاصل کی۔

اسلامی فوج میں بدوؤں اور طلقاء کی شمولیت کا ایک اور منفی اثر یہ ظاہر ہوا کہ ان کی اکثریت کا مقصد مالِ غنیمت کا حصول تھا۔ انہیں یہ احساس تک نہیں تھا کہ وہ کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر اصولی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور انہوں نے تاحال نہ تو ایمان کی حلاوت چکھی تھی اور نہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی خاطر جہاد کرنے کے ذوق و شوق سے ہی آشنا تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے کہ ان کے دلوں میں ایمان ابھی جاگزین ہی نہیں ہوا تھا۔ (۴۲) یقیناً ان میں سے بہت سے راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھے، اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کہ وہ غنیمت پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جنگ کے آغاز میں وہ نہ صرف خود غنیمت کی طرف جھپٹے، بلکہ دوسرے مجاہدین کو بھی اس کی ترغیب دی، لیکن جنگ کے پہلے دور میں جب کچھ مسلمانوں نے میدانِ جنگ چھوڑا تو ان میں سے ایک شخص نے اپنی بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔ صفوان بن امیہ کے بھائی کلدہ بن امیہ نے کہا: ''بلاشبہ آج جادوگری لاحاصل ہے''۔ صفوان نے جو اس وقت مشرک تھے، کہا: ''خاموش ہو جاؤ! خدا تمہارے چہرے کو مسخ کرے، خدا کی قسم! قریش کا کوئی فرد مجھ پر حکومت کرے، وہ میرے لیے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ہوازن کے کسی آدمی کو مجھ پر اقتدار حاصل ہو''۔ (۴۳)

موسیٰ بن عقبہ روایت کرتے ہیں کہ ابوسفیان، صفوان اور حکیم بن حزام جو مکے کے نامور سردار تھے، جنگ کے کنارے کھڑے ہو کر اس نظارے میں مشغول تھے کہ کون فاتح ہوگا۔ عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ صفوان بن امیہ نے اپنے ایک غلام کو میدانِ جنگ کی جانب روانہ کیا تاکہ وہ جنگ کی تازہ ترین صورت حال معلوم کر کے آئے۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق جب ابوسفیان نے مسلمانوں کو میدانِ جنگ خالی کرتے دیکھا تو کہا: ''اب یہ اس وقت تک بھاگتے رہیں گے جب تک سمندر ان کے راستے میں نہیں آجاتا''، اور یہ کہ اس کے ترکش میں فال کے تیر موجود تھے، (۴۴) لیکن موسیٰ بن عقبہ، عروہ اور ابن اسحٰق کی یہ روایات ''صحیح'' نہیں

ہیں اور حدیث کے معیار کے مطابق ''مرسل'' ہیں، لیکن اس مہم کے متعلق ان تینوں مصنفین کی روایات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور تاریخی اعتبار سے ایک مکمل تصویر پیش کرتی ہیں جس میں ہمیں مکے کے سرداروں کے چہرے صاف نظر آتے ہیں اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کی سوچ کیا تھی۔ ان سرداروں میں صفوان بھی شامل تھے جو اس وقت تک مشرک تھے اور ابوسفیان بھی شامل تھے جو اس وقت ایک نومسلم تھے اور جن کا ''دل حال ہی میں حق کی طرف مائل ہوا تھا'' (التوبة ۹:۶۰)۔

جنگ کا آغاز

ہوازن مسلمانوں سے پہلے ہی وادی حنین پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہیں سنبھال لی تھیں اور اپنی فوج کے مختلف دستوں کو اہم ترین گھاٹیوں اور درختوں پر تعینات کر دیا تھا۔ انہوں نے بہت اچھی منصوبہ بندی کی تھی۔ ان کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں پر اس وقت اچانک اور بے خبری میں تیروں کی بارش کر دیں گے، جب وہ حنین کی ڈھلوان وادی کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔ (۴۶) ہوازن کے حوصلے بہت بلند تھے، کیوں کہ ان کے سردار مالک النصری نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ مسلمان آج تک ہوازن جیسی کسی قوم سے نہیں لڑے جو جنگی مہارت رکھتی ہو، بہادر ہو اور تعداد میں بھی اتنی زیادہ ہو۔ (۴۷) مسلمانوں نے پو پھٹنے سے قبل ہی وادی کی طرف پیش قدمی کی۔ سب سے پہلے سواروں کا دستہ آگے بڑھا۔ اس دستے کی قیادت حضرت خالدؓ بن ولید کر رہے تھے۔ اس کے بعد بنوسلیم سامنے آئے اور ان کے پیچھے تمام فوج آگے بڑھی جسے مختلف صفوں میں مرتب کیا گیا تھا۔ (۴۷)

جنگ کا آغاز ہوتے ہی ہوازن کے اوّلیں دستے الٹے پیروں بھاگے اور مسلمان سپاہی ان کی چھوڑی ہوئی غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ (۴۸) مسلمان اس وقت یہ سمجھے کہ ہوازن کو مکمل شکست ہوگئی ہے، لیکن ہوازن نے اچانک وادی کے چاروں طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی۔ کچھ مسلمان جنگ کیے بغیر میدان چھوڑ گئے، کچھ مسلمان ننگے سر تھے اور کچھ ایسے تھے جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ (۴۹) ان لوگوں نے صورت حال کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ اس پر

مستزاد یہ کہ ہوازن نے بے خبری میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کو اچانک سخت دھچکا لگا۔ ان کے تیر انداز اس قدر ماہر تھے کہ بقول حضرت براءؓ بن عازب، جو اس جنگ کے عینی شاہد تھے، ''شاید ہی کوئی تیر خطا گیا ہو، کم و بیش ہر تیر نشانے پر لگا''۔(۵۰) مسلمان فوج میں سواروں اور پیادوں سب کو حملے کا حکم دے دیا گیا۔ بدوؤں اور طلقاء نے میدان جنگ سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے باقی فوج بھی میدان چھوڑ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں صرف ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھڑی رہ گئی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ بذاتِ خود کوہِ استقامت بنے اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔

پہلے مرحلے میں جو لڑائی ہوئی تھی، وہ فجر سے لے کر عشاء تک چلی اور پھر تمام رات جاری رہی۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں کو عام حملے کا حکم دے دیا گیا۔ دن کے وقت دھوپ کی تپش بہت زیادہ تھی۔ جنگ شروع ہونے سے قبل تو مسلمانوں نے کچھ دیر درختوں کے سائے میں پناہ لی، لیکن جنگ کے دوران میں وہ مکمل طور پر تپتے سورج کی زد میں رہے۔ اس کے ساتھ زمین ریتلی تھی اور ریت اڑ کر مجاہدین کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی، جیسا کہ ایک مجاہد نے کہا کہ ''آنکھوں میں ریت پڑ جانے کے سبب ہماری بینائی متاثر ہوئی اور ہمیں اپنے چہروں کے آگے اپنے ہاتھ نظر نہیں آتے تھے''۔(۵۱) دوسری طرف ہوازن کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ ان کے سپاہی کھائیوں اور موڑوں پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے خچر پر سوار تھے جس کا نام دلدل تھا،(۵۲) حالانکہ آپ ﷺ گھوڑے کی بھی استطاعت رکھتے تھے۔ آپ نے خچر کی سواری کو اس لیے پسند فرمایا، تاکہ مسلمانوں کو آپؐ کے اس عمل سے یہ پیغام مل جائے کہ انہیں ہر قیمت پر مضبوط اور ثابت قدم رہنا ہے، کیوں کہ گھوڑے کے برعکس خچر اس کام کے لیے موزوں نہیں ہوتے کہ ان پر بیٹھ کر پیچھے ہٹا جا سکے، یا بھاگا جا سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مسلمانوں کو میدانِ جنگ چھوڑتے دیکھا تو انہیں آواز دی اور استقامت کی تلقین کی۔ اس دوران میں آپ ﷺ اپنے خچر کو آگے بڑھا رہے تھے اور فرما

رہے تھے: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں''۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیانؓ بن حارث آپؐ کے خچر کی لگام تھامے ہوئے تھے، اور اسے دشمن کے بیچوں بیچ جانے سے مسلسل روک رہے تھے۔(۵۳) چند مسلمان ایسے بھی تھے جو صرف ایک لمحے کے لیے پیچھے ہٹے تھے،(۵۴) لیکن مسلمانوں کی اکثریت وہ تھی جو مکمل طور پر میدان جنگ چھوڑ چکی تھی۔ صرف دس یا بارہ صحابہ کرامؓ تھے جو رسول اللہ ﷺ کو مسلسل گھیرے میں لیے ہوئے تھے اور ان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی تھی۔ ان لوگوں میں حضرت عباسؓ، حضرت ابوسفیانؓ بن حارث، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ شامل تھے۔(۵۵) رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو آواز دیں، کیوں کہ حضرت عباسؓ بلند آواز کے مالک تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے انصار کو آواز دی، خاص طور پر ان انصار کو جنہوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر وفاداری کا عہد کیا تھا اور اصحاب الشجرہ کہلاتے تھے۔ اس کے بعد بنو حارث بن خزرج کو آواز دی۔ وہ دونوں قبائل آواز سنتے ہی پلٹ پڑے اور باری باری رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع ہوتے گئے، یہاں تک کہ آپؐ کے چاروں طرف ۸۰ یا ۱۰۰ لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے بے جگری کے ساتھ ہوازن سے لڑنا شروع کر دیا۔(۵۶)

اب لڑائی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مسلمانوں نے ایک نئے جذبے کے ساتھ جنگ شروع کی جو خلوصِ نیت، عزمِ مصمم اور حوصلہ و ہمت سے بھرپور تھی۔ انہوں نے اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ یقین اور کامل اعتماد کو تازہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور فتح کے لیے دعا فرمائی۔ آپ ﷺ کے الفاظ یہ تھے: ''اگر آپ ہمیں نیست و نابود کر دیں گے تو آج کے بعد پھر آپ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا''۔(۵۷) جب دشمن نے حملے کا رخ آپ ﷺ کی طرف کر دیا تو آپ ﷺ خچر سے اتر پڑے اور پیدل آگے بڑھنا شروع کر دیا۔(۵۸) جنگ نے شدت اختیار کر لی تو صحابہ کرامؓ آپؐ کے گرد پناہ لینے لگے، کیوں کہ وہ آپ کو سب سے زیادہ استقامت اور برداشت والا پاتے تھے۔(۵۹) بھاگتے ہوئے مسلمانوں

نے جب یہ منظر دیکھا اور حضرت عباسؓ کی آواز بھی کانوں میں پڑی تو سارے لوگ چاروں طرف سے چھٹ چھٹ کر آپ کے گرد جمع ہونے لگے اور ساتھ ہی یہ الفاظ بھی دہرانے لگے: ''لبیک! لبیک! (میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!)''، یہاں تک کہ جو لوگ اونٹوں کو فوری طور پر واپس نہ موڑ سکے، انہوں نے اپنے اونٹوں پر سے چھلانگیں لگا دیں اور دوڑ کر حضور ﷺ کے قریب آ گئے۔(۶۰) جنگ نے دوبارہ شدت اختیار کر لی۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اب جنگ میں گرمی پیدا ہوئی ہے''،(۶۱) پھر آپؐ نے چند کنکریاں یا مٹھی بھر خاک اٹھائی اور کافروں کے چہروں کی طرف پھینک کر فرمایا: ''خدا تعالیٰ ان کی شکلیں بگاڑے، محمد ﷺ کے رب کی قسم! یہ شکست کھا چکے ہیں''۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:(۶۲)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور دوسرے مومنین پر تسلی نازل فرمائی اور ایسے لشکر نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو سزا دی اور یہ کافروں کی سزا ہے (التوبة: ۹:۲۶)۔(۶۳)

جنگ کے دوسرے دور میں ہوازن اور ثقیف مسلمانوں کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ میدانِ جنگ میں وہ بے شمار مقتولین اور دولت کے انبار چھوڑ گئے۔ انہوں نے اتنے بے ہنگم انداز میں واپسی کا راستہ اپنایا کہ اپنی فوج کے کئی گروہوں کو میدان جنگ میں ہی چھوڑ گئے جنہیں مسلمانوں نے بعد میں تیروں کا نشانہ بنایا۔(۶۴) بھاگتے ہوئے انہوں نے اپنا جو نقصان کیا، وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو جنگ کے دوران میں انہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ بھاگتی فوج کا تعاقب کریں اور کسی کو زندہ نہ چھوڑیں تاکہ دشمن اتنا کمزور ہو جائے کہ دوبارہ یکجا ہونے اور حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔(۶۵) ہر شخص کو یہ اجازت دی گئی تھی کہ وہ جس مشرک کو بھی قتل کرے گا، اس کے مال و متاع کا مالک ہوگا،(۶۶) تاہم جب رسول اللہ ﷺ کی نظر ایک خاتون کی لاش پر پڑی تو آپ ﷺ نے خواتین کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے اندر اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ تم سے جنگ کر سکے''(۶۷)۔ اسی طرح جب آپ کو معلوم ہوا کہ

بعض مجاہد بچوں کو بھی قتل کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے بچوں کو قتل کرنے سے منع فرما دیا۔ جب لوگوں نے سوال کیا: ''کیا وہ مشرکوں کے بچے نہیں ہیں''؟ آپ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے بہترین لوگ مشرکوں کے بچے نہیں ہیں؟ قسم اس خدا کی! جس کے قبضۂ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے، ہر بچہ بے داغ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اسی حالت پر رہتا ہے، حتیٰ کہ بولنا نہ سیکھ لے''۔(۶۸)

رسول اللہ ﷺ نے میدان جنگ سے فرار ہونے والوں کو کوئی سرزنش نہ کی۔ جب حضرت ام سلیم انصاریہؓ نے آپ ﷺ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ طلقاء کو بھاگنے کے جرم میں سزائے موت ملنا چاہیے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مجھے اس کی ضرورت سے مستغنی رکھے''۔ جنگ کے دوران میں حضرت ام سلیمؓ نے اپنے دفاع کی خاطر ایک خنجر ہاتھ میں اٹھایا ہوا تھا۔(۶۹)

ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق اس جنگ کے دوران میں صرف بنو مالک کے ۷۲ لوگ مارے گئے۔ بنو مالک کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا۔(۷۰) ثقیف کے اتحادیوں میں سے صرف دو افراد مارے گئے، وہ بھی اس لیے کہ انہوں نے میدان جنگ چھوڑنے میں عجلت سے کام لیا تھا۔(۷۱) بنو مالک کے ۳۰۰ لوگ راستے میں اوطاس کے مقام پر حضرت زبیرؓ بن عوام کی سرکردگی میں مسلمانوں کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچے۔(۷۲) ایک اور بڑی تعداد ایسی تھی جو اوطاس میں انجام کو پہنچی۔(۷۳) حضرت ابوطلحہؓ نے تن تنہا ۲۰ لوگ قتل کیے اور ان کا اسباب قبضے میں کر لیا۔(۷۴) بنو نصر بن معاویہ کے بھی سینکڑوں لوگ ختم ہوئے۔ ہوازن کی اہم ترین شاخ بنو رعاب کو بھی بھاری نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔(۷۵)

زخمیوں کے علاوہ ہوازن اور ثقیف کو بہت زیادہ نقصان ہوا۔ سعید بن مسیّب کی روایت کے مطابق ان کے قیدیوں کی تعداد چھ ہزار تھی۔(۷۶) عروہ کی رائے کے مطابق اس تعداد میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے،(۷۷) اور ابن اسحٰق کی بھی یہی رائے ہے۔(۷۸) زہری نے قیدیوں کی بہت بڑی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مکے کے تمام سایہ دار درختوں کے نیچے قیدی پھیلے ہوئے تھے''۔(۷۹) اس غزوے میں جو دولت مسلمانوں کے ہاتھ

گئی اس میں چار ہزار اوقیہ چاندی،(۸۰) چوبیس ہزار اونٹ(۸۱) اور چار ہزار سے زیادہ بھیڑیں شامل تھیں(۸۲)۔کافروں کی فوج میں گھوڑے، مویشی اور گدھے بھی شامل تھے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان میں سے کتنے جانور مسلمانوں کو غنیمت کے طور پر ہاتھ آئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ تمام مال غنیمت اس وقت تک الجعرانہ میں محفوظ رکھا جائے، جب تک آپؐ طائف کے محاصرے سے واپس نہ آجائیں۔

اس موقع پر مسلمانوں کی جانب سے جو قربانیاں دی گئیں، ان میں چار شہداء ہیں جن کے نام ابن اسحٰق نے نقل کیے ہیں۔(۸۳) اس کے علاوہ زخمی ہونے والوں میں حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہؓ بن ابی اوفی اور خالدؓ بن ولید کے نام شامل ہیں۔(۸۴)

مسلمانوں کے بہت معمولی جانی نقصان کی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے پہلے دور میں، جس میں مسلمان پیچھے ہٹ گئے تھے صرف تیروں کا تبادلہ ہوا، البتہ دوسرے دور میں دو بدو مقابلہ ہوا اور جنگ شدت اختیار کر گئی، لیکن اس مرتبہ ہوازن اور ثقیف پر کڑا وقت پڑا اور انہیں بڑی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کو جو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا، وہ یہ تھا کہ ان کے لوگ زخمی ہوئے اور زخمی بھی ایسے کہ جلد ہی صحت یاب ہوگئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں مسلمان فوج بالکل محفوظ اور صحیح و سالم رہی۔ اس کا پتا یوں چلتا ہے کہ اولاً مسلمانوں نے حنین سے بہت دور تک شکست خوردہ دشمن کا تعاقب کیا، اور ثانیاً اس فیصلہ کن جنگ کے ختم ہوتے ہی آرام کیے بغیر ہی وہ طائف کے محاصرے پر نکل گئے۔ یہ غزوہ بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ غزوۂ بدر۔ مسلمانوں نے اس جنگ میں اپنے تمام وسائل اسی طرح داؤ پر لگا دیے تھے جس طرح ہوازن نے۔ اہل عرب اسلام کے بارے میں آخری فیصلہ کرنے سے قبل یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ اس جنگ میں کون فریق بازی جیتے گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہوازن کو شکست فاش ہوگئی ہے تو بے شمار وفود جوق در جوق آکر حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔

نخلہ اور اوطاس کی جانب بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب

ہوازن کی قوت تہس نہس ہوگئی اور وہ مختلف پہاڑوں اور وادیوں میں منتشر ہوگئے۔

مالک بن عوف النصری طائف میں محصور ہوگیا، جب کہ بقیہ فوج اوطاس میں خیمہ زن ہو گئی۔ اوطاس ایک وادی ہے جو طائف اور حنین کے درمیان واقع ہے۔ قبیلہ ثقیف کے بنو غیرہ نے نخلہ میں خیمے نصب کیے جو سبواحہ اور الشرائع (حنین) کے درمیان ہے۔ (۸۵)

مسلمان سواروں نے نخلہ تک ہوازن کا تعاقب کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو عامر اشعریؓ کو اوطاس روانہ فرمایا، انہوں نے وہاں جنگ کی اور درید بن الصمہ (۸۶) کو قتل کیا۔ اسی دوران میں آپ کو ایک تیر لگا اور آپ زخمی ہو گئے اور خون کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے، لیکن شہادت سے قبل آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو اپنا قائم مقام مقرر فرمایا اور ان سے یہ گزارش کی کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کا سلام اور دعائے مغفرت کی درخواست پہنچا دی جائے۔ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے رسول اللہ ﷺ کو ان کا یہ پیغام پہنچایا تو آپ نے ہاتھ بلند کر کے ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ (۸۷)

دشمن کے جو قیدی گرفتار ہو کر آئے، ان میں شیما بھی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن تھیں۔ ابن اسحٰق اور دیگر مصنفین کی ''مرسل'' روایات اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ اس واقعہ کا تاریخی جواز موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے شیما کے ساتھ انتہائی عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ شیما نے اپنا مکمل تعارف کراتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو زخم کا وہ نشان بھی دکھایا جو بچپن میں آپ ﷺ کے کاٹنے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ ﷺ بنو سعد میں شیما کی والدہ کے گھر پرورش پا رہے تھے۔ (۸۸) اس کے علاوہ چند روایات ایسی ہیں جو بذات خود قوی نہیں ہیں، لیکن ایک دوسری کو اس طرح تقویت پہنچاتی ہیں کہ انہیں ایک تاریخی ثبوت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ ان روایات کی رو سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ محترمہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں اور آپ ﷺ نے ان کے ساتھ انتہائی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا اور ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر مبارک کھول کر بچھا دی تھی۔

حواشی

۱- یاقوت، معجم البلدان، ۲:۱۳۷، ۳:۲۰۴، ۴:۲۱۶-۲۱۷، ۵:۵۵، ۲۱۶-۲۶۲؛ حربی، کتاب المناسک، ص ۵۳۲-۵۳۸، بلاذری، نسب حرب، ص ۳۴۹-۳۵۰

۲- ایضاً

۳- واقعاتِ سیرت میں ربیعہ کے دو بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا باغ مشہور ہے، الوہت عمرو بن عاص کا باغ تھا اور ذوالحرم ابوسفیان کی دولت کا نام تھا۔ یاقوت، معجم البلدان، ۵:۳۸۶؛ واقدی، مغازی، ۳:۹۷۱؛ سیرۃ ابن ھشام، ۱:۴۰۹؛ ازرقی، اخبار مکۃ، ص ۸۰؛ بلاذری، فتوح، ص ۵۶

۴- ابن ہشام، سیرۃ، ۱:۱۳۴؛ ابن سعد، طبقات، ۱:۵۵؛ ابن قتیبہ، المعارف، ص ۳۱، ۵۱؛ طبری، تاریخ، ۲:۲۶۲؛ نویری، نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب، ص ۳۹۷

۵- میمونہ بنت حارث، لبابہ الصغریٰ بنت حارث، صفیہ بنت حزم، ام جمیل بنت مجالد ہلالیہ، زینب بنت ابی سفیان اور ام حکم بنت ابی سفیان کے احوال کے لیے رجوع کیجیے: صحیح؛ علم انساب اور طبقات پر کتب۔

۶- صحیح بخاری، ۳:۱۷۰

۷- صحیح بخاری، ۴:۹۱، ۹:۹۵؛ صحیح مسلم، ۳:۱۴۲۰

۸- ابن حجر، الاصابۃ، ۱:۲۵

۹- صحیح بخاری، ۳:۱۷۰

۱۰- طبری، ۳:۷۰

۱۱- ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۴۳۶؛ ابن سعد، طبقات، ۲:۱۴۵؛ طبری، تاریخ، ۳:۶۵؛ مازی، تحفۃ الاشراف، ۲:۲۳۵، حدیث ۵۰۵۴، نسائی سے منقول ہے (السنن الکبریٰ). اس میں ولید بن جمع شامل ہیں جو "صدوق" ہیں، لیکن عدم اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عزیٰ کی تباہی کی بابت کوئی "صحیح" روایت ثابت نہیں۔

۱۲- بلاذری، نسب حرب، ص ۳۸۸

۱۳- ابن سعد، طبقات، ۲:۱۴۶-۱۴۷؛ واقدی، مغازی، ۲:۸۶۹-۸۷۰

۱۴- ابن کلبی، الاصنام، ص ۱۵

۱۵- ابن اسحٰق سے منسوب روایت، ابن ہشام، سیرۃ، ۱:۸۶؛ ابن حجر، الاصابۃ، ۲:۱۷۹

۱۶- صحیح بخاری، ۵:۱۳۱؛ ابن کثیر، تفسیر، ۴:۳۰۶۔ ابن عوف اور خالد کے درمیان توہین آمیز جملوں کے باہمی تبادلے کے لیے دیکھیے: صحیح مسلم، ۴:۱۹۶۷

۱۷- ابن حجر، فتح الباری، ۸:۵۷۔ جو شخص اسلام قبول کر لیتا تھا، اس کے لیے قریش صبئا کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے، یعنی اس نے اپنا دین تبدیل کر لیا اور یہ لفظ توہین آمیز انداز اختیار کرنے کی خاطر استعمال کیا جاتا تھا۔ خالد کا یہی عذر تھا، کیوں کہ وہ اس لفظ میں پوشیدہ مفہوم کو سمجھتے تھے، اور جس انداز سے یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا، اس سے بھی واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بنو جذیمہ اس لفظ کی معنویت سے بھی ناواقف تھے اور مسلمانوں پر اس لفظ کا جو اثر ہوتا تھا، اسے بھی نہیں جانتے تھے۔

۱۸- ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۴۳۰۔ یہ ابو جعفر محمد بن علی الباقر کی ''مراسیل'' سے ہے اور ''منقطع'' ہے، کیوں کہ ابن حجر کی تحقیق کے مطابق باقر کا زمانہ پیدائش ۴۰ھ سے ۵۶ھ کے درمیان کا ہے (تھذیب التھذیب، ۹:۳۵۱)۔

۱۹- ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۴۳۱؛ طبری، تاریخ، ۳:۶۶؛ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، ۴:۳۱۳-۳۱۴

۲۰- طبری، تاریخ الرسل والملوک، ۳:۷۰

۲۱- صحیح بخاری، ۵:۱۸۰-۱۸۱؛ مسلم، صحیح، ۲:۷۳۵

۲۲- سیرۃ ابن ھشام، ۲:۴۳۷

۲۳- مسلم، صحیح، ۲:۷۳۶؛ احمد، مسند، ۳:۱۵۷

۲۴- ابن حجر، الاصابۃ، ۳:۱۸۲، ۳۵۲

۲۵- ابن ہشام، سیرۃ، ۲:۴۳۷

۲۶- واقدی، مغازی، ۳:۸۹۳

۲۷- ابن حجر، فتح الباری، ۸:۲۹

۲۸- حاکم، مستدرک، ۳:۴۸-۴۹۔ ان کا کہنا ہے کہ ''سند صحیح ہے'' اور ذہبی ان سے متفق ہیں۔ جب تمام سندوں پر غور کیا گیا تو حدیث کے اندر ایسے شواہد پائے گئے جس نے شیخ البانی کو بھی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا کہ حدیث ''صحیح'' ہے (ارواء الغلیل، ۵:۳۴۴-۳۴۶)

۲۹- ایضاً

۳۰- ابن ماجہ، سنن، ۲:۸۰۹؛ نسائی، مجتبیٰ، ۷:۲۷۶۔ یہ ابراہیم بن عبداللہ بن ابی ربیعہ کے درمیان ''منقطع'' ہے۔ اس قول کو تاریخ کے حوالے سے پیش کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ اسلام کے اس حکم

کے مطابق ہے جو عاریت کی واپسی کا وعدہ پورا کرنے کے متعلق ہے۔

۳۱- ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، ۱:۳۸۵، ۳:۵۳۷

۳۲- ابن ہشام، سیرة، ۲:۴۳۷؛ بیہقی، السنن الکبریٰ، ۳:۱۵۱؛ ابن ترکمانی، الجوھر النقی بحاشیة سنن البیھقی؛ نسائی، سنن، ۳:۱۰۰؛ ابن حجر، فتح الباری، ۲:۵۶۲، ۸:۲۷

۳۳- حمد الجاسر، تعلیقات بر کتاب المناسک (حربی)؛ فواد حمزہ، قلب جزیرة العرب، ص ۲۶۸

۳۴- ابوداؤد، سنن، ۱:۲۱۰، ۲:۹؛ حاکم، مستدرک، ۱:۲۳۷، ۲:۸۳-۸۴۔ انہوں نے اسے ''صحیح'' سمجھا ہے اور ذہبی ان سے متفق ہیں۔

۳۵- ابن ہشام، سیرة، ۲:۴۴۰؛ خلیفہ، تاریخ، ۸۸؛ طبری، تاریخ، ۳:۷۳؛ حاکم، مستدرک، ۳:۲۷۰۔ اگرچہ یہ روایات حدیث کے معیار کے مطابق کمزور ہیں، لیکن انہیں تاریخی ثبوت کے طور پر لیا جا سکتا ہے، خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ وہ امیر کے تقرر کے متعلق اسلامی قوانین سے ہم آہنگ ہیں۔

۳۶- صحیح بخاری، ۵:۲۰؛ ابن ہشام، سیرة، ۲:۳۹۹-۴۰۰

۳۷- ابن ہشام، سیرة، ۲:۴۴۰؛ خلیفہ بن خیاط، تاریخ، ص ۸۸؛ ابن سعد، طبقات، ۲:۱۵۴-۱۵۵؛ طبری، تاریخ، ۳:۷۳؛ حاکم، مستدرک، ۲:۱۲۱۔ حاکم نے اسے ''صحیح'' سمجھا ہے اور ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے، لیکن ہیثمی نے اس میں اس نقص (علت) کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عبداللہ بن عیاض کو کوئی بھی ''ثقہ'' نہیں سمجھتا (مجمع الزوائد، ۶:۱۸۶)۔

۳۸- ابوداؤد، سنن، ۱:۲۱۰، ۲:۹۔ یہ حدیث اپنی سند میں ''صحیح'' ہے۔

۳۹- ترمذی، سنن، ۳:۳۲۱-۳۲۲۔ ان کا کہنا ہے کہ ''حسن صحیح'' ہے۔ نسائی، السنن الکبریٰ، تحفة الاشراف، ۱۱:۱۱۲ حدیث ۱۱۵۱۶؛ احمد، مسند، ۵:۲۱۷

۴۰- اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے کہ یہ کس کا قول ہے، چند روایات بیان کی گئی ہیں جو کمزور ہیں (واقدی، مغازی، ۳:۸۹۰؛ ہیثمی، کشف الاستار عن زوائد البزّار، ۲:۳۴۶-۳۴۷؛ ابن ہشام، سیرة، ۲:۴۴۴)

۴۱- دارمی، سنن، ۵:۱۳۵؛ احمد، مسند، ۴:۳۳۳، ۶:۱۶

۴۲- کہا جاتا ہے کہ مکے کے ۴۰ لوگ جو ابھی کافر ہی تھے، مکے سے باہر چلے گئے (قسطلانی، المواهب اللدنیة، ۱:۱۶۲؛ زرقانی، شرح المواهب، ۳:۵)

۴۳- ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶:۱۷۹-۱۸۰۔ انہوں نے کہا کہ احمد اور ابویعلیٰ نے اسے روایت کیا اور

احمد کے راوی ''صحیح'' کے راوی ہیں۔ ابن اسحٰق نے ابویعلیٰ کی روایت میں صاف طور پر لفظ سماع کا ذکر کیا ہے۔

۴۴- ابن ہشام، سیرۃ،۲: ۴۴۳-۴۴۴؛ بیہقی، دلائل النبوۃ،۲: ۴۵۔ اس کی سند میں ابوعلاثہ محمد بن عمرو بن خالد شامل ہیں جو مجہول ہیں۔ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ،۴: ۲۳۰

۴۵- ابن ہشام، سیرۃ،۲: ۴۴۲۔ جابر بن عبداللہ، صحابی کی حدیث سے ایک صحیح سند کے ساتھ روایت ہے جس میں ابن اسحٰق نے واضح طور پر لفظ سماع بیان کیا ہے۔ احمد نے بھی اس کو مسند میں روایت کیا ہے،۳: ۳۷۶؛ ابویعلیٰ، مسند،۲: ۲۰۰، حدیث ۳۰۲؛ ابن حبان، موارد الظمآن، ص ۴۱۷

۴۶- ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ،۴: ۲۳۰؛ واقدی، مغازی،۳: ۸۹۳

۴۷- واقدی، مغازی،۳: ۸۹۵-۸۹۷۔ اس میں وہ واحد شخص ہیں جو عرب قبائل کے تمام قبائل کے جھنڈوں اور ان کے اٹھانے والوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ حضرت انسؓ بن مالک کی ایک حدیث سے یہ ثابت ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید رسالے کے امیر تھے اور حضرت انسؓ بن مالک کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس جنگ کا عینی مشاہدہ کیا تھا (صحیح بخاری، ۵: ۱۳۰-۱۳۱؛ صحیح مسلم،۲: ۴۳۵)

۴۸- صحیح بخاری، ۴: ۲۵؛ صحیح مسلم،۳: ۲۶۱

۴۹- صحیح بخاری، ۴: ۳۵؛ صحیح مسلم، ۳: ۲۶۰-۲۶۱، حضرت براءؓ بن عازب کی حدیث سے، جو جنگ میں شریک تھے۔

۵۰- صحیح بخاری، ۴: ۳۵؛ صحیح مسلم،۳: ۲۶۰-۲۶۱

۵۱- احمد، مسند،۵: ۲۸۶؛ ابوداؤد، سنن،۲: ۹ ۶۷؛ بزاز، مسند (کشف الاستار،۲: ۳۵۰)؛ ابن سعد، طبقات،۲: ۱۵۶۔ ان کے اقتباس کی بنیاد ابوہمام عبداللہ بن یسار ہیں جو مجہول ہیں، کسی نے انہیں ثقہ نہیں سمجھا سوائے ابن حبان کے، لیکن ابوداؤد نے اس اقتباس کو ایک ''نبیل حدیث'' کے طور پر بیان کیا ہے اور ہیثمی نے اس کی سند کو ''ثقہ'' سمجھا ہے (مجمع الزوائد، ۶: ۱۸۲)؛ ابن حجر، مختصر زوائد مسند البزاز، ص ۲۵۱، حدیث ۸۱۶

۵۲- اس پر قسطلانی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے: المواھب اللدنیۃ،۱: ۱۶۳۔ واقدی واحد شخص ہیں جو یہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو زرہیں اور ایک خود زیب تن کیے ہوئے تھے (مغازی، ۳: ۸۹۵-۸۹۷)۔

۵۳- مسلم، صحیح، ۳: ۱۳۹۸؛ حاکم، مستدرک، ۳: ۲۵۵۔ وہ کہتے ہیں: ''شیخین کی شرائط کے مطابق یہ حدیث ''صحیح'' ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا''۔ ذہبی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ابویعلیٰ، مسند، ۳: ۳۳۸، حدیث ۳۰۳۔ اس کے افراد صحیح ہیں سوائے عمران بن داؤد کے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ابن اسحٰق، (سیرۃ ابن ھشام، ۲: ۴۴۲)، ایک صحیح سند کے ساتھ۔

۵۴- زرقانی، شرح المواھب اللدنیۃ، ۳: ۱۹-۲۰۔ ان مسلمانوں کی تعداد ۸۰ یا ۱۰۰ کے لگ بھگ تھی جو تھوڑا سا پیچھے ہٹے، لیکن فرار نہیں ہوئے۔

۵۵- ابن اسحٰق، (سیرۃ ابن ھشام، ۲: ۴۴۲)، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ جس کا سلسلہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے جا کر مل جاتا ہے۔ یہ وہ صحابی ہیں جنہوں نے جنگ کا مشاہدہ کیا تھا۔

۵۶- مسلم، صحیح، ۳: ۱۳۹۸؛ ابن ہشام، سیرۃ، ۲: ۴۴۴-۴۴۵؛ عبدالرزاق، المصنف، ۵: ۳۸۰-۳۸۱؛ ابن سعد، طبقات، ۴: ۱۸۔

۵۷- احمد، مسند، ۳: ۱۲۱۔ اقتباس مسند کی ''ثلاثیات'' سے لیا گیا ہے۔ ابن کثیر اور سفارینی نے اسے شیخین کی شرائط کے مطابق روایت کیا ہے (ابن کثیر، البدایۃ و النھایۃ، ۴: ۳۲۸؛ سفارینی، شرح ثلاثیات مسند احمد، ۲: ۲۸۶)۔

۵۸- صحیح بخاری، ۴: ۳۵، ۵۳؛ صحیح مسلم، ۳: ۲۶۰-۲۶۱

۵۹- صحیح مسلم، ۳: ۱۴۰۰-۱۴۰۱؛ نووی، شرح صحیح مسلم، ۴: ۴۰۱-۴۰۲

۶۰- مسلم، صحیح، ۳: ۱۳۹۸، ۲۶۰؛ ابن اسحٰق، سیرۃ ابن ھشام، ۲: ۴۴۴-۴۴۵

۶۱- صحیح مسلم، ۳: ۱۳۹۸، ۲۶۰

۶۲- صحیح مسلم، ۳: ۱۳۹۸، ۲۶۰، ۲۶۲

۶۳- شوکانی نے کہا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان تمام مسلمانوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس غزوے میں موجود تھے، وہ جنہوں نے فرار کا راستہ اختیار کیا اور وہ بھی جو فرار نہیں ہوئے، کیوں کہ بعد میں وہ بھی ثابت قدم ہو کر لڑے اور فتح یاب ہوئے'' (فتح القدیر، ۲: ۳۴۸)۔

۶۴- ہیثمی، کشف الاستار، ۲: ۳۴۶

۶۵- ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶: ۱۸۱؛ ہیثمی، کشف الاستار، ۲: ۳۴۹۔ ایک ایسی سند کے ساتھ جس کے افراد ''ثقہ'' ہیں۔

۶۶- ابو داؤد، سنن، ۲: ۶۵۔ انہوں نے کہا: ''یہ ایک حسن حدیث ہے''۔ حاکم، (مستدرک،

۲: ۱۳۰) نے کہا: ''مسلم کی شرائط کی رو سے یہ 'صحیح' ہے، لیکن نہ انہوں نے اور نہ بخاری ہی نے اسے روایت کیا ہے''۔ ذہبی نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔

۶۷۔ ابوداؤد، سنن، ۲: ۴۹-۵۰

۶۸۔ احمد، مسند، ۳: ۴۳۵۔ حسن اور اسود بن سریع کی دو سندوں سے جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا۔ حسن نے اسے اسود سے نہیں سنا۔ پہلی سند میں قتادہ کا ''عنعنہ'' شامل ہے جو مدلّس ہیں، لیکن دوسری سند میں قتادہ شامل ہیں اور یہ حسن اور اسود کے درمیان منقطع رہتی ہے۔

۶۹۔ **صحیح مسلم**، ۳: ۱۴۴۲

۷۰۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۵۰، بغیر سند کے روایت ہوئی ہے۔ طبری نے اسے اسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو ''معزل'' ہے، کیوں کہ یعقوب بن عتبہ کا شمار کم تر درجے کے تابعین میں ہوتا ہے۔ طبری، **تاریخ الرسل والملوک**، ۳: ۷۸

۷۱۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۵۰

۷۲۔ ہیثمی، **کشف الاستار**، ۲: ۳۴۶۔ اس کی سند میں علی بن عاصم شامل ہیں جنہیں کچھ لوگوں نے ''ثقہ'' قرار دیا ہے اور کچھ نے ''ضعیف''۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث ''حسن'' ہے (**فتح الباری**، ۷: ۴۲)۔ بخاری کی روایت سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ درید بن الصمہ اوطاس میں مارا گیا تھا اور زبیر نے اسے قتل کیا تھا (**صحیح**، ۵: ۱۲۸)۔

۷۳۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۵۷ بغیر سند کے

۷۴۔ ابوداؤد، سنن، ۲: ۶۵۔ وہ کہتے ہیں: ''یہ ایک 'حسن' **حدیث** ہے''۔ حاکم، **مستدرک**، ۲: ۱۳۰۔ وہ کہتے ہیں ''مسلم کی شرائط کی رو سے یہ 'صحیح' ہے، لیکن نہ انہوں نے اور نہ بخاری نے اسے روایت کیا ہے''۔ ذہبی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔

۷۵۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۵۵؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۵۲؛ واقدی، **مغازی**، ۳: ۹۱۶

۷۶۔ عبدالرزاق، **المصنف**، ۵: ۳۸۱؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۵۵؛ طبری، **تاریخ**، ۱۰: ۱۰۲

۷۷۔ طبری، **تاریخ**، ۳: ۸۲۔ اس کی سند ''حسن'' ہے جو عروہ تک جاتی ہے۔

۷۸۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۸۸، بغیر سند کے روایت ہے، لیکن طبری نے ابن اسحٰق سے روایت کیا ہے کہ ۶۰۰۰ اونٹ تھے اور خواتین اور بچوں کی ایک بڑی تعداد تھی (**تاریخ**، ۳: ۸۶)۔

۷۹۔ ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۴: ۳۴۷؛ ابن اثیر، **النہایۃ**، ۳: ۲۰۷-۲۰۸۔

۸۰۔ ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۵۲، بغیر سند کے

۸۱- ایضاً

۸۲- ایضاً

۸۳- ابن ہشام، سیرۃ، ۴۵۹:۲ بغیر سند کے

۸۴- بخاری، صحیح، ۱۲۶:۵؛ حمیدی، مسند، ۳۹۸:۲ ایک صحیح سند کے ساتھ۔ بزار (کشف الاستار للهیثمی، ۳۴۶:۲)۔ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کی سند کو "حسن" کہا ہے، (۴۲:۸)، لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس کا متن "منکر" ہے۔ (مختصر زوائد مسند البزار، ص ۲۴۹-۲۵۰، حدیث ۸۱۶)۔ میں نے ان مآخذ سے زخمیوں کے نام جمع کیے ہیں، لیکن کسی ایک مآخذ میں بھی پورے نام نہیں دیے گئے۔

۸۵- ابن اسحٰق، سیرۃ ابن هشام، ۴۵۳:۲-۴۵۴، بغیر سند کے۔ محل وقوع کے تعین کے لیے دیکھیے: حربی، کتاب المناسک، حمد الجاسر کے حواشی، ۳۴۶، ۳۵۳، ۴۷۱، ۶۵۴

۸۶- ہم پہلے ہی اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جنگ حنین کے خاتمے پر حضرت زبیرؓ بن عوام نے درید بن الصمہ کو قتل کیا۔ یہ بیان بخاری کی روایت سے متفق ہے، کیوں کہ حضرت زبیرؓ اوطاس کی فوج میں شامل تھے۔

۸۷- بخاری، صحیح، ۲۸:۴، ۱۲۸:۵، ۶۹:۸؛ مسلم، صحیح، ۱۹۴۳:۴؛ ابن اسحٰق، بغیر سند کے (سیرۃ ابن هشام، ۴۵۴:۲)؛ واقدی، مغازی، ۹۱۵:۳

۸۸- ابن اسحٰق (سیرۃ ابن هشام، ۴۵۸:۲)، بنو سعد کے کچھ لوگوں سے۔ مزید دیکھیے: بیہقی، دلائل النبوۃ، ۵۶:۳، قتادہ کی "مراسیل" سے۔ اس کی سند میں ایک کمزور راوی بھی شامل ہے۔

۸۹- طبری، جامع البیان، ۱۰۱:۱۰، قتادہ کی "مراسیل" سے ایک "حسن" سند کے ساتھ مروی ہے۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ص ۴۴۰؛ ابو داؤد، سنن، ۶۳۰:۲، ابو طفیل کی حدیث سے، لیکن اس کی سند میں کچھ مجہول راوی شامل ہیں۔ حاکم، مستدرک، ۱۶۴:۴، ۶۱۸:۳۔ ان کا کہنا ہے کہ "اس کی سند صحیح ہے"۔ ابن کثیر (البدایة والنهایة، ۳۶۴:۴) کا خیال ہے کہ یہ حلیمہ نہیں، بلکہ آپ کی بہن شیما تھیں، کیوں کہ اس وقت ان کی عمر ۹۰ برس سے متجاوز ہو گی۔ ابو داؤد، المراسیل، ایک "معزل" سند کے ساتھ۔ (ابن کثیر، دیکھیے: حوالہ سابقہ)۔

۱۶

غزوۂ طائف

جب مسلمانوں نے ہوازن کو شکست فاش دے کر نخلہ اور اوطاس تک مار بھگایا تو انہوں نے طائف کا رخ کیا، جہاں قبیلہ ثقیف اور مالک بن عوف النضری قلعہ بند بیٹھے ہوئے تھے۔ طائف ایک پہاڑی علاقہ تھا جو مضبوط دیواروں اور دفاعی قلعوں سے گھرا ہوا تھا۔ شہر میں دروازوں کے علاوہ داخلے کا کوئی اور راستہ نہ تھا، اور ان دروازوں کو قبیلہ ثقیف نے بند کر رکھا تھا۔ انہوں نے اتنا غلہ اور ساز و سامان مہیا کر لیا تھا جو انہیں سال بھر کے لیے کافی تھا۔ جب مسلمان طائف پہنچے تو شوال کی ۲۰ تاریخ تھی، اور مسلمانوں کو حنین کی جنگ اور نخلہ اور اوطاس کے حملوں کے بعد آرام کا قطعاً کوئی موقع نہ ملا تھا۔ نخلہ اور اوطاس پر حملے ۱۰ شوال کو شروع ہوئے تھے جو تقریباً ایک ہفتے سے زیادہ روز تک جاری رہے تھے۔

عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ (۱) کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ۱۰ روز سے زیادہ عرصے تک طائف کا محاصرہ کیے رکھا۔ عروہ ہی کی ایک اور روایت سے پتا چلتا ہے کہ یہ محاصرہ نصف ماہ پر محیط تھا۔ (۲) اگرچہ یہ تمام روایات ''مرسل'' ہیں اور انہیں کسی ثبوت کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا، تاہم عروہ اور موسیٰ کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جن کی تحریریں مغازی پر بہترین اور قابل اعتماد تصور کی جاتی ہیں اور ان کی روایات واقعات کے تاریخی تسلسل سے بھی مطابقت رکھتی ہیں۔ دیگر روایات کے مطابق یہ محاصرہ ۲۵ روز، (۳) ایک ماہ (۴) یا ۴۰ روز (۵) جاری رہا تھا، لیکن ان روایات کی تائید تاریخی واقعات سے نہیں ہوتی، خاص طور پر اس روایت کی کہ یہ محاصرہ ۴۰ روز تک جاری رہا تھا۔ ذوالقعدہ کا مہینہ ختم ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے کہ رسول اللہ ﷺ مدینے واپس پہنچ گئے، (۶) اور آپؐ نے الجعرانہ میں ۱۰ راتوں سے زیادہ

قیام کیا تھا۔اس کے بعد آپؐ نے عمرہ ادا فرمایا۔ طائف کا محاصرہ اٹھا لینے کے بعد اس تمام کارروائی میں تقریباً ۱۸ دن لگ گئے ہوں گے۔

مسلمانوں نے طائف جانے والی وہ قدیم شاہراہ استعمال کی تھی جو شہر میں جنوب کی طرف سے داخل ہوتی ہے۔اس سفر کے دوران میں وہ لوگ نخلۃ الیمنیہ اور قرن المنازل سے گزرے جو مکے سے ۸۰ کلومیٹر اور طائف سے ۵۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔اس کے بعد مسلمان الملیح سے گزرے جو طائف کی ایک وادی ہے اور پھر بحرۃ الرغاء سے جو طائف کے جنوب میں ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔(۷) یہ طویل راستہ ہے جب کہ مکے سے طائف جانے والی جدید شاہراہ اس کے مقابلے میں مختصر اور صرف ۹۰ کلومیٹر ہے۔شمال کی جانب سے طائف پر حملہ کرنا اس لیے مشکل تھا کہ اس قطعۂ زمین پر بل کھاتے پیچیدہ راستوں نے شہر کو قدرتی طور پر ایک قلعے کی شکل دے دی تھی۔

مسلمان طائف کے قلعے کے نزدیک خیمہ زن ہوئے، وہ ثقیف سے اتنے نزدیک تھے کہ ان کے تیروں کی زد میں آ گئے تھے۔ جب ان کے کچھ تیر آ کر مسلمانوں کو لگے تو مسلمانوں نے اپنے خیمے وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ لگا لیے، بعد میں اس جگہ ایک مسجد تعمیر کر دی گئی۔(۸) یہ مسجد آج بھی مسجد حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔قدیم زمانے میں شہر طائف مسجد کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔(۹)

یہ جنگ تیروں کے تبادلے سے ہی لڑی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے بچاؤ کے لیے دبابے سے کام لیا تھا۔ دبابہ لکڑی سے بنائی گئی ایک گاڑی تھی جس کے اوپر چمڑا مڑھ دیا گیا تھا اور اسے پہیے لگا کر اونچا کیا گیا تھا۔ دبابے کی اوٹ لے کر تیروں سے بچتے ہوئے مسلمان قلعے کی دیوار تک پہنچ گئے۔ثقیف نے مسلمانوں کے دبابے پر لوہے کے تپائے ہوئے ٹکڑے پھینکے جن سے اسے آگ لگ گئی۔اب مجاہدین اس کی اوٹ سے باہر نکل آئے اور ثقیف کے تیروں کی زد میں آ گئے۔(۱۰) یہ پہلی جنگ تھی جس میں مسلمانوں نے کسی قلعے پر حملہ کرنے کے لیے اس قسم کی جنگی تدبیر اختیار کی تھی۔ جرش الیمانیہ جس کے کھنڈر آج بھی وادی بیشاہ (۱۱) کی

بلندیوں پر پائے جاتے ہیں، وہ علاقہ ہے جہاں اس قسم کے دبابے، منجنیقیں اور دیگر جنگی مصنوعات (۱۲) تیار کی جاتی تھیں۔ ابن اسحٰق لکھتے ہیں کہ ثقیف کے دوسرداروں نے جرش میں بطورِ خاص ان جنگی آلات کے بنانے اور انہیں استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا تاکہ ان کی مدد سے طائف کا دفاع کیا جاسکے۔ (۱۳)

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے قلعے پر حملہ کرنے کے لیے یہ جنگی مصنوعات کہاں سے حاصل کی تھیں؟ (۱۴) اس بارے میں ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت خالدؓ بن سعید بن عاص جرش سے دو منجنیقیں اور دو دبابے لائے تھے، جب کہ دوسری روایت کے مطابق حضرت سلمان فارسیؓ نے منجنیقیں خود تیار کی تھیں، (۱۵) تاہم یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں کے پاس جنگی سازوسامان بہت کم تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا تھا کہ طائف کے گردونواح میں انگوروں اور کھجوروں کے جتنے بھی باغات پائے جاتے ہیں، ان سب کو نذرِ آتش کر دیا جائے تاکہ ثقیف پر مسلمانوں کا دباؤ مزید بڑھ جائے، لیکن صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے درخواست کی کہ درختوں کو جلانے سے گریز کیا جائے۔ یہ سن کر آپؐ نے اپنا ارادہ بدل دیا، لیکن آپؐ کے اس ارادے کو بھانپ کر ہی ثقیف کے حوصلے پست ہو گئے۔ (۱۶)

رسول اللہ ﷺ نے طائف کے غلاموں کو پکار کر یہ نوید بھی سنائی کہ ان میں سے جو شخص بھی قلعے کی دیواروں سے اتر کر مسلمانوں کے پاس آ جائے گا، اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر ۲۳ غلام اتر کر نیچے آ گئے اور اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابوبکرہ ثقفی بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سب لوگوں کو رہا کر دیا (۱۷) اور انہیں اس وقت بھی ان کے سابق آقاؤں کے حوالے نہ کیا، جب ان کے آقاؤں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ (۱۸)

اگرچہ مسلمانوں نے جنت کے اعلیٰ مقام کے حصول کی تڑپ میں جس کا وعدہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کیا تھا، (۱۹) ثقیف پر تیروں کی بارش کر دی تھی، لیکن وہ حوصلے اور عزم کے ساتھ ڈٹے رہے۔ مسلمانوں نے اس محاصرے کے دوران میں بہت زخم کھائے (۲۰)، اور ان

کے ۱۲ افراد شہید ہو گئے تھے (۲۱)، لیکن مشرکوں کے صرف ۱۳ افراد مارے گئے، کیوں کہ وہ قلعہ بند تھے (۲۲)۔

ایک صحیح روایت سے پتا چلتا ہے (۲۳) کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا تو آپؐ کا مقصد اسے فتح کرنا نہیں تھا۔ آپؐ کا ارادہ صرف یہ تھا کہ ثقیف پر یہ واضح کر دیں کہ ان کا علاقہ ہمہ وقت مسلمانوں کی پہنچ میں ہے اور وہ جب چاہیں، اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ایک ایسے شہر کو فتح کرنے کے لیے جو قلعہ بند ہے، غیر ضروری مشکلات میں گرفتار ہوں اور ایسی صورت حال سے دو چار ہو جائیں جس میں انہیں زیادہ لوگوں کی شہادت کا نذرانہ پیش کرنا پڑے، جب کہ شہر کے چاروں طرف اسلام پھیل چکا ہے اور اہلِ شہر کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ جلد یا بدیر اسلام قبول کر لیں، یا ہتھیار ڈال دیں۔ رسول اللہ ﷺ ثقیف کے اسلام قبول کرنے کے اتنے ہی شدید خواہاں تھے جتنے اس سے پہلے قریش کے قبولِ ایمان کے خواہاں تھے۔ آپؐ سمجھتے تھے کہ وہ ایک ہوشیار اور زیرک قوم ہے اور دین اسلام کو ان کی شمولیت سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوں گے اور ان کے قبول اسلام کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے۔ آپؐ کو بڑے عرصے سے یہ تمنا تھی کہ ثقیف اسلام قبول کر لیں۔ اسلام کے پیغام کو ان لوگوں تک پہنچانے کی سعی اور جدوجہد آپؐ نے اس وقت سے شروع کر رکھی تھی جب آپؐ مکے میں تھے۔ آپؐ نے اس وقت ان کی ہدایت کے لیے دعا فرمائی تھی جب انہوں نے آپؐ کی دعوت کو حقارت سے مسترد کرتے ہوئے آپؐ کو زخمی کر دیا تھا۔ طائف کے محاصرے کے دوران میں بھی چند صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے گزارش کی کہ اہل طائف کو بد دعا دی جائے، جس کے جواب میں آپؐ نے ان کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی: ''اے اللہ! ثقیف کو ہدایت نصیب فرما''۔ (۲۴)

اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ امر چنداں باعث حیرت نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو طائف کا محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ ابتداء میں جب آپؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ صحابہ کرامؓ میں لڑنے کا جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے تو آپؐ نے انہیں چند جھڑپوں میں حصہ لینے کی

اجازت دے دی، لیکن ان پر جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ ان حالات میں لڑائی بے سود ہے، لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ نے دوسری مرتبہ محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا تو انہوں نے آپ کے اس دانش مندانہ فیصلے کی تائید کی۔(۲۵) اب مسلمان الجعرانہ کی طرف پلٹے، اور جب وہ وہاں پہنچے تو ذوالقعدہ کی ۵ تاریخ تھی۔

حنین سے کثیر مقدار میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا، اسے الجعرانہ میں جمع کر دیا گیا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی تقسیم کو طائف کے محاصرے سے واپسی تک کے لیے مؤخر کر دیا تھا، سوائے کچھ چاندی کے جو آپ نے اسی وقت تقسیم فرما دی تھی۔(۲۶)

آپ نے مزید دس روز انتظار فرمایا،(۲۷) کیوں کہ آپ کو امید تھی کہ ہوازن آپ کے پاس آئیں گے اور اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیں گے، لیکن جب وہ نہ آئے تو آپ نے مالِ غنیمت تقسیم فرما دیا۔ غنیمت کے بارے میں حکمِ خداوندی یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کا پانچواں حصہ قرآنی ہدایت کے مطابق صرف کریں گے: ''اور اس بات کو جان لو کہ جو شے بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ کل کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے اور آپ کے قرابت داروں کا ہے اور یتیموں کا ہے اور غریبوں کا ہے اور مسافروں کا ہے'' (الانفال ۸:۴۱)۔

مالِ غنیمت کے باقی ماندہ چار حصوں کے بارے میں یہ حکم تھا کہ قتال میں شریک مجاہدین کے درمیان مساوی تقسیم کر دیے جائیں۔ یہ تقسیم اس طرح عمل میں آئے گی کہ ہر پیادے کا ایک حصہ اور ہر گھڑ سوار کے تین حصے ہوں گے، ایک حصہ اس کے لیے اور دو اس کے گھوڑے کے لیے۔ یہ احکام اس مالِ غنیمت کے لیے ہیں جو اموالِ منقولہ پر مشتمل ہو۔ اموالِ غیر منقولہ کے بارے میں سربراہ مملکت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اسے تقسیم کر دے یا بچا کر رکھ لے۔ بچا کر رکھنے کی صورت میں ان اموالِ غیر منقولہ کو ریاست کی ملکیت تصور کیا جائے گا۔ وہ اموال جو مسلمانوں کو قتال کے ذریعے حاصل ہوں، غنیمت کہلاتے ہیں اور ان کی تقسیم اوپر بتائے گئے طریقے کے مطابق عمل میں آتی ہے، اور وہ تمام اموال جو دیگر طریقوں سے حاصل

ہوں، فئے کہلاتے ہیں اور سربراہ مملکت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ انہیں کسی بھی رفاہی مد میں صرف کر دے۔ اگر سربراہ مملکت چاہے تو ان مجاہدین کو خصوصی انعامات سے بھی نواز سکتا ہے جنہوں نے لڑائی میں فقید المثال کارنامے سرانجام دیے ہوں۔ یہ انعامات خمس نکالنے سے پہلے بھی دیے جاسکتے ہیں اور خمس نکالنے کے بعد بھی، اور خمس میں سے بھی دیے جاسکتے ہیں۔ مجاہدین کو یہ اجازت بھی دی گئی ہے کہ وہ جس مشرک کو قتل کریں، اس کی چیزوں پر قبضہ کر لیں۔

اس موقع پر مالِ غنیمت کی تقسیم جس طرح عمل میں آئی، کچھ صحابہؓ وقتی طور پر اس کی حکمتوں اور مصالح کا ادراک نہ کر سکے، کیوں کہ اس تقسیم میں طلقاء اور بدوؤں کو باقی مسلمانوں پر فوقیت دی گئی تھی، کیونکہ وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور ایمان ابھی ان کے قلوب میں پوری طرح راسخ نہ ہوا تھا۔ اس موقع پر ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی تالیفِ قلب کی جائے۔ ان اصحاب میں سے جن کو سو سو اونٹ عطا کیے گئے، وہ یہ تھے: عیینہ بن حصن (یہ قبیلہ غطفان کے سردار تھے)، الاقرع بن حابس (یہ تمیم کے سردار تھے)، علقمہ بن علاثہ، عباس بن مرداس، سہیل بن عمرو، حکیم بن حزام، ابوسفیان بن حرب، اور صفوان بن امیہ (آخر الذکر تمام کے تمام سردارانِ قریش تھے)۔ (۲۸) اس سلسلے میں ابن اسحٰق نے جو فہرست مرتب کی ہے، اس کی رو سے جن افراد کو ایک ایک سو اونٹ عطا کیے گئے تھے، ان کی تعداد ۱۲ ہے۔ ابن اسحٰق نے ۵ ایسے افراد کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں ایک سو سے کم اونٹ ملے۔ (۲۹) ابن ہشام نے ایسے ۱۲۹ افراد کا ذکر کیا ہے جن کی تالیفِ قلب (۳۰) کی گئی تھی، جب کہ بعض دیگر مصنفین نے یہ تعداد ۲۳ بتائی ہے۔ اس طرح یہ کل ۵۲ افراد ہیں۔

ان خطیر انعامات نے سردارانِ قریش اور ان کے متبعین کے دل جیت لیے، انہیں بھرپور خوشی اور اطمینانِ قلب کی دولت نصیب ہوئی۔ ان کی یہ تمنا تھی کہ اسلام کا دائرہ مزید پھیل جائے۔ ان کے اسلام میں استقامت اور ان کے ایمان میں استحکام پیدا ہوا اور آگے چل کر انہوں نے اسلام کی راہ میں اپنی جان و مال سے گراں قدر خدمات انجام دیں، لیکن ابن حزم کی روایت کے مطابق ان میں سے چند ایک ایسے تھے جو آخر تک کمزور رہے، مثلاً عیینہ بن حصن

الفزاری۔(۳۱)

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں: ''لوگ دنیاوی مال و دولت کی خاطر اسلام قبول کیا کرتے تھے، مگر جب اسلام قبول کر لیتے تھے تو پھر انہیں اسلام کی دولت دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہو جاتی تھی''۔(۳۲)

جن لوگوں کی تالیفِ قلب کی گئی تھی، ان میں سے چند ایک نے اپنے ان تاثرات اور جذبات کا اظہار بھی کیا جو اس موقع پر ان کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے۔ صفوان بن امیہ کہتے ہیں: ''جس وقت رسول اللہ ﷺ نے مجھے سب سے پہلے انعام سے نوازا تو آپؐ میری نظر میں دنیا کی مبغوض ترین ہستی تھے، لیکن جب آپ مجھے اپنے انعامات سے مسلسل نوازتے رہے تو آپؐ میری نگاہ میں دنیا کی محبوب ترین شخصیت ہو گئے''۔(۳۳)

صفوان بن امیہ وہ شخص تھے جن کی تالیفِ قلب کی جاتی رہی تھی، وہ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے انعام وصول کر کے بے حد خوشی محسوس کیا کرتے تھے اور جب بھی آپؐ نے انہیں کوئی چیز عطا فرمائی، انہوں نے مزید کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے، اسلام میں دولت کا صحیح تصور واضح کیا، جس کے بعد صفوان اس قدر محتاط ہو گئے تھے کہ بیت المال سے اپنا سالانہ وظیفہ لیتے ہوئے بھی جھجکتے تھے۔(۳۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تالیفِ قلب کی گئی تھی، ان کی سوچ میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی اور ان کی ذہنی سطح کس قدر بلند ہو گئی تھی، پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، ان پر اسلام کی حقانیت اور اس کی اہمیت زیادہ اجاگر ہوتی چلی گئی۔

چند مسلمان ایسے بھی تھے جنہیں اس بات پر ملال تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے انعامات سے محروم رکھا۔ آپؐ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اپنے فیصلے کی حکمت واضح کرتے ہوئے ان سے فرمایا:

خدا کی قسم! بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میں کچھ لوگوں کو مخصوص کر کے انہیں اپنے انعامات سے نوازتا ہوں، مگر جنہیں میں انعامات سے محروم رکھتا ہوں، ان سے ان

لوگوں کے مقابلے میں زیادہ محبت کرتا ہوں جنہیں میں عطا کرتا ہوں۔ بخدا! کچھ لوگوں کو میں اس لیے بخشتا ہوں کہ میں ان کے دل کی بے چینی اور گھبراہٹ سے واقف ہوں اور جنہیں میں نہیں دیتا، میں جانتا ہوں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قناعت رکھ دی ہے۔(۳۵)

آپؐ نے فرمایا: ''میں ان لوگوں کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں جو کفر کے بہت قریب ہیں، (یعنی اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں) اور انہیں تالیفِ قلب کی شدید ضرورت ہے''۔(۳۶) آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا: ''ہو سکتا ہے کہ میں کسی کو کچھ دوں، لیکن محبت کسی دوسرے سے کروں، کیوں کہ پہلے شخص کے بارے میں مجھے یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں وہ عذاب کا مستحق نہ ہو جائے''۔(۳۷)

رسول اللہ ﷺ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ انصار کے بعض لوگ اس بات کو دل سے لگا بیٹھے ہیں کہ انہیں کوئی انعام نہیں دیا گیا، اور ان کے چند نوجوان یہاں تک کہہ بیٹھے کہ ''جب کوئی مشکل گھڑی آن پڑتی ہے تو ہمیں بلایا جاتا ہے اور مالِ غنیمت دوسروں کو دیا جاتا ہے''، اور یہ کہ ''قریش کو عطا کیا جاتا ہے اور دوسروں کو محروم کیا جاتا ہے، جب کہ ہماری تلواروں سے ابھی تک قریش کا خون ٹپک رہا ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر تمام لوگوں کو ایک خیمے میں جمع کیا اور ان الفاظ میں ان سے خطاب فرمایا:

اہل قریش ابھی تک زمانۂ جاہلیت کے زیادہ قریب ہیں، اس لیے میں ان کی مدد کر کے ان کے دلوں کو اسلام پر مضبوطی کے ساتھ جمانا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ اس بات سے خوش نہیں ہو کہ لوگ دنیاوی مال و متاع لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر واپس جاؤ۔ اگر تمام لوگ کسی وادی سے گزریں اور انصار ایک درے سے، تو میں انصار ہی کا راستہ اختیار کروں گا۔

جب غنیمت کی تقسیم کی حکمت انصار پر پوری طرح واضح ہوگئی تو پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کے ایمان اور اسلام کے ساتھ ان کی وفاداری اور بے مثال قربانیوں کی تعریف فرمائی۔

جب انصار پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ کس بناء پر انہیں پیچھے رکھا گیا تھا تو انہیں تسلی ہوگئی اور انہوں نے اپنے بھرپور اطمینان کا اظہار کیا۔ (۳۸) انہیں یہ جان کر مکمل تسکین حاصل ہوئی کہ یہ سب کچھ اس اسلام کی خاطر کیا گیا ہے جس کی خاطر وہ اپنی دو محبوب ترین چیزوں، یعنی اپنی جان اور اپنے مال کی قربانیاں دے رہے تھے۔ بھلا یہ جان کر وہ کیوں خوش نہ ہوتے کہ رسول اللہ ﷺ جنہیں انہوں نے اپنا پیشوا اور رہنما تسلیم کیا تھا، سب سے زیادہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ایمان اور عقیدے کی پختگی کی تعریف فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنے لیے تعریفی الفاظ سن کر انصار شدتِ جذبات سے رو پڑے اور بے ساختہ پکار اٹھے: ''ہم اس پر بالکل خوش اور مطمئن ہیں کہ ہمارے حصے میں اللہ کے رسول آئیں''۔ (۳۹)

جس وقت الجعرانہ کے مقام پر مالِ غنیمت تقسیم کیا جا رہا تھا، ایک بدو (۴۰) جس نے غزوۂ حنین میں حصہ لیا تھا، گستاخانہ لہجے میں رسول اللہ ﷺ سے بولا: ''انصاف سے کام لو''۔ آپؐ نے تحمل سے جواب دیا: ''اگر میں بھی انصاف نہ کروں گا تو تم بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے''۔ (۴۱) بدو کے الفاظ سن کر حضرت عمرؓ بن خطاب غصے میں آ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ''اگر آپ مجھے اجازت دیں تو بدو کا سر قلم کر دوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ لوگ یہ کہنا شروع کر دیں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کروا رہا ہے''۔ (۴۲)

بدو نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا، اس پر ہمیں چنداں حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ بہت سے بدو مالِ غنیمت ہی کی طلب میں اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ جس وقت آپؐ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو ان سب نے آپؐ کو گھیر لیا اور ان میں سے ایک نے آپؐ کی چادر مبارک پکڑ کر کھینچ لی۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اگر میرے پاس ان درختوں کے برابر بھی مالِ غنیمت ہوگا، جو میرے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں تو میں وہ سب تم لوگوں کے درمیان تقسیم کر دوں گا اور تم لوگ مجھے کبھی بخیل، جھوٹا یا بزدل نہ پاؤ گے''۔ (۴۳) اس کے بعد آپؐ نے اونٹ کے کوہان سے ایک بال لیا اور فرمایا: ''خدا کی قسم! تمہارے مالِ غنیمت میں

میرا کوئی حصہ نہیں ہے، سوائے اُس کے پانچویں حصے کے، اور اس سے زیادہ اس بال کے برابر بھی میں نہیں لوں گا اور وہ پانچواں حصہ بھی میں تمہی کو لوٹا دوں گا''۔ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں پر یہ بات واضح فرما دی کہ جب تک مالِ غنیمت تقسیم نہ ہو، اس وقت تک اس میں سے کسی کا کوئی چیز بھی لینا قطعی طور پر حرام ہے۔ یہ سن کر ایک انصاری آگے بڑھا اور اونٹ کے بالوں کا ایک گولا غنیمت کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ (۴۴) اس اثناء میں رسول اللہ ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام کرکرہ کی موت واقع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: ''وہ آگ کے عذاب میں مبتلا ہے''۔ لوگوں نے اس کے مال اور اسباب کا جائزہ لیا تو اس میں سے ایک چادر برآمد ہوئی جو اس نے مالِ غنیمت میں سے چھپا لی تھی۔ (۴۵)

رسول اللہ ﷺ نے اجتماعی دولت کی حفاظت کے لیے جو ہدایات جاری فرمائی تھیں، وہ بڑی واضح تھیں اور انصار نے ان ارشادات کے جواب میں جس ردعمل کا اظہار کیا تھا، وہ ان لوگوں کے تقویٰ پر دلالت کرتا ہے اور اطاعتِ رسول کا ایک کھلا ثبوت ہے، حالانکہ اونٹ کے بالوں کا یہ گولا ایک حقیر اور معمولی سی چیز تھی، مگر انہوں نے یہ بھی واپس کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ بدوؤں کے ساتھ بے حد صبر و تحمل کے ساتھ پیش آئے اور آپؐ نے ان کے گستاخانہ رویے، دولت کی حرص اور دنیاوی لالچ کو کمال بردباری کے ساتھ برداشت کیا۔ آپؐ ایک مثالی معلم اور مربی تھے۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ ان کے ماحول نے ان پر کیا اثرات ڈال رکھے ہیں، آپؐ کو یہ بھی علم تھا کہ درشتی، بدتہذیبی اور بے ادبی وہ خصائص ہیں جو ان بدوؤں کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے ان سب لوگوں کے ساتھ نہ صرف انتہائی مہربانی اور نرمی کا مظاہرہ فرمایا، بلکہ انہیں بھرپور یقین دلایا کہ ان کے مفادات کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہ برتی جائے گی۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ان کی ذہنی سطح اور عقلی معیار کے مطابق ان سے معاملہ فرمایا۔ ان کے ساتھ ایک مصلح اور مربی کی طرح پیش آئے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان بدوؤں کے ساتھ جس قسم کا سلوک روا رکھا، وہ اس سے قطعاً

اور یکسر مختلف تھا جو اس زمانے کے بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ کیا کرتے تھے۔اس زمانے کا عام قاعدہ یہ تھا کہ بدو لوگ اپنے حکّام کے سامنے نہ صرف جھکا کرتے تھے، بلکہ سجدہ بھی بجالاتے تھے۔ جب انہیں اپنے بادشاہوں سے کچھ عرض کرنا ہوتا تھا تو اس طرح ان کی حمد و ثنا کیا کرتے تھے جس طرح کوئی بندہ اپنے معبود کی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اس حالت میں کیا کرتے تھے جب بادشاہ ان کے سامنے نہ ہوتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ برابری کا معاملہ فرمایا۔ آپ کبھی ان سے پوشیدہ نہ رہے۔ وہ جب چاہتے، آپؐ سے کلام کرتے اور بعض اوقات سخت الفاظ میں بھی گفتگو کرتے تھے، حالانکہ صحابہ کرامؓ کی عادت تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے نہایت مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے اور جب گفتگو کرتے تو لہجہ نرم اور آواز پست کر لیتے تھے۔ وہ اپنے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کے لیے شدید محبت رکھتے تھے۔ قرآن کریم میں بدوؤں کی بے ادبی اور گستاخی پر ملامت اور رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ان کی بلند آوازی پر زجر و توبیخ کی گئی ہے۔(۴۶)

جب مال غنیمت کی تقسیم مکمل ہوگئی تو قبیلہ ہوازن کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی کہ ان کے مال اور قیدی انہیں واپس کر دیے جائیں۔ آپ ﷺ نے انہیں یہ اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو مال واپس لے لیں اور اگر چاہیں تو اپنے قیدی واپس لے لیں، اس پر انہوں نے قیدیوں کی واپسی کو ترجیح دی۔(۴۷) رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یہ تمہارے بھائی تمہارے پاس تائب ہو کر آئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی انہیں واپس کر دوں، لہٰذا تم میں سے جو اپنے قیدی کو مفت آزاد کرنا چاہے، وہ مفت آزاد کر دے اور جو اپنا حصہ اس وقت تک باقی رکھنا چاہے، جب تک ہم اسے پہلی غنیمت میں سے حصہ دیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔

لوگوں نے جواب دیا: ''یارسول اللہؐ! ہم انہیں بے قیمت آزاد کرنا پسند کرتے ہیں''۔
رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''میں نہیں کہہ سکتا کہ تم میں سے کون اجازت دے رہا ہے اور کون نہیں، بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ اور اپنے سرداروں کو میرے پاس بھیجو تاکہ وہ اس معاملے میں میرے ساتھ تبادلۂ خیال کریں''۔ لوگ واپس گئے اور اس سلسلے میں اپنے سرداروں سے گفتگو کی۔ سردار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اس بات پر رضا مندی کا اعلان کیا کہ وہ اپنے قیدیوں کو بے مول رہا کر دیں گے۔ (۴۸)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجاہدین کی رضا مندی کے ساتھ ہوازن کے قیدی واپس کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ مالِ غنیمت ان کا حق تھا اور آپ ﷺ ان کی مرضی کے بغیر ان کا حق نہیں لے سکتے تھے۔ جو لوگ قیدیوں کو آزاد کرنے پر تیار نہیں تھے، ان سے آپؐ نے وعدہ فرمایا کہ آپؐ ان کے اس نقصان کی پوری پوری تلافی کر دیں گے۔ آپؐ نے یہ یقین دہانی ان کے سرداروں کے ذریعے کی، کیوں کہ وہی اپنے سپاہیوں کے تمام امور کے ذمہ دار تھے۔ سپاہیوں کی اکثریت قیدیوں سے دستبردار ہونے پر تیار تھی، سوائے قبیلہ تمیم کے جس کی طرف سے اقرع بن حابس اور قبیلہ فزارہ کے، جس کی طرف سے عیینہ بن حصن نے گفتگو کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں قبائل سے وعدہ فرمایا کہ ان کے اس نقصان کی تلافی کر دی جائے گی۔ (۴۹) ان تمام واقعات سے پتا چلتا ہے کہ ہوازن کا وفد غنیمت کی تقسیم کے بعد آیا تھا، پہلے نہیں، جیسا کہ ابن اسحٰق کی رائے ہے۔ (۵۰)

رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ ہوازن نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ آپؐ نے ان سے ان کے سردار مالک بن عوف النصری کی بابت دریافت فرمایا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ثقیف کے ہمراہ طائف میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مالک میرے پاس مسلمان ہو کر آئے تو میں اس کے اہلِ خانہ اور اس کا مال بھی اسے واپس کر دوں گا اور ایک سو اونٹوں پر مشتمل انعام بھی دوں گا۔ مالک مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انہیں اونٹوں کا انعام عطا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی قوم کا اور دیگر نواحی

قبائل کا امیر بھی مقرر کر دیا۔

حضرت مالکؓ بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔انہوں نے طائف میں ثقیف سے جنگ کی اور ان پر دباؤ بھی ڈالا،(۵۱) بالآخر ثقیف کے سرداروں نے خیال کیا کہ اب جب کہ اسلام طائف کے چاروں طرف پھیل ہی گیا ہے اور وہ اپنی تجارت جاری رکھنے کے قابل نہیں رہے ہیں تو اب اس ناگوار اور خطرناک صورت حال کو ختم ہی ہو جانا چاہیے۔ ان کے بعض سردار، مثلاً عروہ بن مسعود اسلام کی طرف مائل تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ عمرہ ادا کرنے، اور الجعرانہ میں غنیمت تقسیم کرنے کے بعد مدینے کی جانب روانہ ہوئے تو عروہ بن مسعود ثقفی بعجلت تمام رسول اللہ ﷺ سے آن ملے اور آپؐ کے مدینے پہنچنے سے قبل ہی آپؐ سے ملاقات کر کے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ طائف واپس چلے گئے۔ان کا شمار ثقیف کے مقبول ترین سرداروں میں ہوتا تھا۔انہوں نے قبیلہ ثقیف کو اسلام کی دعوت دی، وہ اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے۔ثقیف کے کچھ لوگوں نے ان پر تیر برسائے اور انہیں زخمی کر دیا۔انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ جب ان کی وفات ہو جائے تو انہیں ان لوگوں کے ساتھ دفن کریں جو طائف کے محاصرے کے دوران میں شہید ہوئے تھے۔(۵۲)

ثقیف کے سرداروں نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے یہ سوچا کہ انہیں اپنی جان اور اموال کا تحفظ کرنا چاہیے، چنانچہ رمضان ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ کی تبوک سے واپسی کے بعد قبیلہ ثقیف نے آپؐ کی خدمت میں ایک وفد روانہ فرمایا۔ یہ وفد بنو مالک کے دو افراد اور ان کے دو حلیفوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد کی قیادت عبد یالیل بن عمرو کر رہے تھے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے وادی قناۃ میں ان سے ملاقات کی جو مدینے سے قدرے شمال کی جانب ہے۔ جب حضرت مغیرہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی آمد کی اطلاع دی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ دوڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور آپ کو یہ خوشخبری سنائی۔اس اثناء میں حضرت مغیرہؓ نے وفد کے ارکان کو اسلام کے وہ طور طریقے اور آداب سکھائے جو انہیں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے وقت ملحوظ رکھنا تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسجدِ نبوی میں ان کے قیام کا بندوبست

فرمایا تا کہ وہاں وہ بآسانی قرآن سن سکیں اور مسلمانوں کو نماز ادا کرتے ہوئے بھی دیکھ سکیں۔
وفد نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے ایک معاہدہ طے فرمایا۔(۵۳) انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ التجا کی کہ آپؐ تین برس کے لیے ان کے بت لات کو توڑنا مؤخر کر دیں، کیوں کہ انہیں اپنی قوم کے غم اور غصے کا خدشہ لاحق تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار فرما دیا، تاہم آپؐ نے ان کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ انہیں اس کام پر مجبور نہیں کیا، بلکہ اس مقصد کے لیے حضرت ابوسفیانؓ بن حرب اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو روانہ فرمایا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ معذرت بھی پیش کی کہ وہ نماز ادا نہیں کر سکیں گے، کیوں کہ ان کے خیال میں یہ بات انہیں ذلیل اور خوار کر دینے کے مترادف تھی کہ جس سر کو وہ لات اور دیگر بتوں اور مختلف پتھروں کے سامنے جھکایا کرتے تھے، اسے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ بات بھی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ''اس دین میں کوئی خوبی نہیں جس میں سر نہ جھکایا جائے''۔(۵۴) اس کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ انہیں زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور آپؐ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جب یہ لوگ اسلام قبول کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ بھی کریں گے اور جہاد میں بھی حصہ لیں گے''۔(۵۵) انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ گزارش بھی کی کہ انہیں وضو کرنے سے معاف رکھا جائے، کیوں کہ وہ سرد علاقے سے تعلق رکھتے تھے، شراب کشید کرنے اور پینے کی اجازت دی جائے اور ابوبکرہ ثقفی کو واپس کیا جائے، تاہم رسول اللہ ﷺ نے ان کی ان تمام درخواستوں کو مسترد کر دیا۔(۵۶)

ان تمام لوگوں میں، حضرت عثمانؓ بن ابی العاص قرآن سیکھنے اور دین سمجھنے کے سب سے زیادہ مشتاق نظر آتے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے انہی کو اہلِ طائف کا امیر مقرر فرما دیا، اگرچہ وہ ان سب میں کم عمر تھے۔(۵۷)

اسلام قبول کرنے کے بعد ثقیف کے وفد نے رسول اللہ ﷺ سے دین کے بارے

میں متعدد سوالات کیے، انہوں نے صحابہ کرامؓ سے قرآن کریم کی تقسیم (احزاب) کے بارے میں پوچھا۔ان کا سوال تھا کہ "تم لوگ قرآن کی تقسیم کس طرح کرتے ہو"؟ صحابہ کرامؓ نے جواب دیا: "ہم نے قرآن کو مختلف احزاب میں تقسیم کیا ہوا ہے، پہلی حزب میں تین سورتیں، دوسری میں پانچ، تیسری میں سات، چوتھی میں ۱۱، پانچویں میں ۱۳ اور چھٹی حزب جو حزب المفصل کہلاتی ہے، سورۃ ق سے شروع ہو کر قرآن کے ختم تک چلتی ہے"۔(۵۸) قرآن کی یہ وہی ترتیب ہے جس سے آج ہم سب واقف ہیں۔ یہ وفد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک ہی ملاقات کر کے اور صحابہ کرامؓ سے مل کر اس قدر متاثر ہوا کہ انہوں نے سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر رمضان کے بقایا دنوں کے روزے بھی رکھے۔(۵۹)

اس وفد نے ۱۵ روز مدینے میں قیام کیا، اس کے بعد یہ لوگ طائف واپس چلے گئے۔ حضرت ابوسفیانؓ بن حرب اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ثقفی ان لوگوں کے ساتھ لات کو توڑنے کی مہم پر روانہ ہوئے۔ ابن اسحٰق نے لات کو توڑنے کی مفصل روایت نقل کی ہے۔ جس وقت حضرت مغیرہؓ نے اسے توڑنا شروع کیا، تمام ثقفی خواتین اس کے گرد جمع ہو گئیں اور رونا شروع کر دیا۔ حضرت مغیرہؓ نے اپنا کام جاری رکھا اور بت کو ریزہ ریزہ کر کے دم لیا۔ انہوں نے بت کے اندر نصب تمام سونا اور سنگِ سلیمانی اپنے قبضے میں کر لیا۔(۶۰) طائف کے لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ لات اپنا انتقام خود لے لے گا۔ حضرت مغیرہؓ نے تمسخرانہ انداز میں ہتھوڑے پھینک دیے اور وہاں سے روانہ ہو گئے، لیکن اہل طائف کو بہانہ ہاتھ آیا اور بولے: "شاید بت نے اپنا انتقام لے لیا ہے، اس لیے مغیرہ بت کو چھوڑ کر چلے گئے"۔ حضرت مغیرہؓ نے جب یہ سنا تو پلٹ کر آئے، ان کی جاہلانہ بات پر ہنسے اور بت کے ٹکڑوں کو مزید چکنا چور کر دیا۔ اس کے بعد آپؓ نے انہیں توحید کی تعلیم دی اور اس طرح حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے ہاتھوں وہ من گھڑت داستان ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی جو لات کے نام سے منسوب تھی اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کی پرستش ایک عرصے سے کی جا رہی تھی۔

اس مہم کے دوران میں پیش آمدہ واقعات کے ذریعے جو احکام جاری کیے گئے، ان

میں سے جو اہم ترین ہیں، ان کی وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے۔نسخ قرآن (ناسخ اور منسوخ) کو سمجھنے کے لیے یہ بے حد ضروری اور نہایت سود مند ہے کہ مختلف احکام کا اجراء جن تاریخوں میں ہوا، ان کی وضاحت کی جائے۔ اس طرح ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ جب مختلف روایات میں تضاد پایا جاتا ہو تو کون سی روایت زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہے۔ دوسرے کسی قانون سازی کے پیچھے جو حکمتیں کارفرما ہوتی ہیں، انہیں سمجھنے کے لیے ان حالات اور واقعات کا جاننا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے جن میں وہ قانون سازی کی گئی ہو۔

حنین اور طائف کی مہمات سے مستنبط کیے گئے احکام کی تفصیل

۱- اوطاس کے دن یہ قرآنی آیت نازل ہوئی: ''اور وہ عورتیں جو شوہر والیاں ہیں، مگر جو تمہاری مملوک ہو جائیں'' (النساء ۴:۲۴)۔اس میں شادی شدہ خواتین قیدیوں کے بارے میں احکام جاری کیے گئے ہیں۔قید کے نتیجے میں قانونی طور پر ان کی اپنے شوہروں سے علیحدگی عمل میں آ جاتی ہے۔آیت میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ان خواتین کے ساتھ ازدواجی تعلقات اس وقت جائز ہیں جب وہ اپنی عدت پوری کر چکی ہوں، خواہ وضعِ حمل کے ذریعے، یا اگر وہ حاملہ نہ ہوں تو پھر حیض کے ذریعے۔(۶۱)

۲- نامحرم خواتین کے سامنے ہیجڑوں کا آنا ممنوع قرار دے دیا گیا، جب کہ اس سے قبل ایسا کرنا جائز تھا، کیوں کہ ہیجڑوں کو خواتین کی طرف کوئی رغبت نہیں ہوتی۔اس ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ طائف کے محاصرے سے فوراً پہلے کی بات ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ایک ہیجڑے کو سنا جو علی الاعلان بادیہ بنت غیلان ثقفی کے حسن کا تذکرہ کر رہا تھا، چنانچہ اسلامی معاشرے کی اجتماعی عفت اور عصمت کی حفاظت کی خاطر حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ ممانعت کی گئی۔(۶۲)

۳- انہی مہمات کے دوران میں یہ ممانعت بھی کی گئی ہے کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور ان مزدوروں کو دانستہ قتل کرنا جو مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں حصہ نہیں لیتے، جائز نہیں۔(۶۳)

۴- یہ حکم بھی جاری کیا گیا کہ غیر مسلم علاقے (دارالحرب) میں بھی حد جاری کی جائے گی، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حنین کے موقع پر ایک شخص کے اوپر حد جاری فرمائی جو

شراب نوشی کا مرتکب ہوا تھا۔(۶۴)

۵- مشرکوں سے مدد طلب کرنا جائز قرار پایا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر صفوان بن امیہ سے کچھ ہتھیار ادھار لیے اور اسے یہ ضمانت دی کہ یہ ہتھیار اسے واپس کر دیے جائیں گے، لیکن مشرکوں سے مدد صرف اسی صورت میں طلب کی جا سکتی ہے جب ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہو، اور یہ یقین ہو کہ وہ اسے اپنے حق میں استعمال نہیں کریں گے۔(۶۵)

۶- غنیمت کا کچھ حصہ ان لوگوں کو دینا جائز ہو گیا، جن کے دلوں کو اسلام پر مضبوط کرنا مقصود ہو، جب کہ سربراہِ مملکت یہ سمجھتا ہو کہ اس طرح انہیں اسلام کے قریب لانے یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے روکنے میں مدد ملے گی۔ حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں کہ ''پہلے لوگ دنیاوی مال ومتاع کی خاطر اسلام قبول کیا کرتے تھے، مگر جب ایک مرتبہ اسلام قبول کر لیتے تھے تو پھر اسلام انہیں دنیا ومافیہا سے زیادہ عزیز ہوتا تھا''۔(۶۶)

۷- الجعرانہ سے عمرہ ادا کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔

حواشی

۱- بیہقی، **السنن الکبری**۹:۸۴؛ **دلائل النبوۃ**، ۳: ۴۷-ب۔ دونوں حوالے ''مرسل'' ہیں۔ بیہقی کی دو سندوں میں ایک ایسا شخص ہے جس کے حالات مجھے نہیں مل سکے۔ عروہ کی روایت میں وہ شخص ابو علاثہ محمد بن عمرو بن خالد ہے، اور موسیٰ بن عقبہ کی روایت میں وہ فرد محمد بن عبداللہ بن عتاب ہے۔

۲- طبری، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ جو عروہ تک جاتی ہے۔ روایت ''مرسل'' ہے (**تاریخ الرسل والملوک**، ۳:۸۲)۔

۳- بیہقی، **دلائل النبوۃ**، ۳: ۴۶- الف۔ **السیرۃ** میں ابن اسحٰق نے کہا: ''۲۰ طاق راتیں'' (**سیرۃ ابن ھشام**، ۲: ۴۷۸-۴۸۳)۔

۴- ابن اسحٰق اپنی ''مرسل'' روایت میں جو عبداللہ بن ابی بکر بن حزم اور عبداللہ بن مکرم سے ایک ''حسن'' سند کے ساتھ مروی ہے اور ان تک جاتی ہے (بیہقی، **دلائل النبوۃ**، ۳:۴۸)۔

۵- مسلم، **صحیح**، ۲: ۷۳۶؛ احمد، **مسند**، ۳: ۱۵۷۔ امام احمد سے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد ابن کثیر وضاحت کرتے ہیں کہ راوی، صامت اس بارے میں ابہام کا شکار تھا کہ محاصرے نے کتنے عرصے تک طول پکڑا تھا (**البدایة والنهایة**، ۴: ۳۵۶)۔

۶- ابن ہشام، **سیرة**، ۲: ۵۰۰؛ ابن حزم، **جوامع السیرة**، ص ۲۴۸۔ ابن حزم وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ محاصرہ ۱۳ سے ۱۸ راتوں کی درمیانی مدت تک قائم رہا (حوالہ ماقبل ص ۲۴۳، ۲۴۸)۔

۷- ابن اسحٰق، **سیرة ابن هشام**، ۲: ۴۷۸-۴۸۳۔ فاصلے کے تعین کے لیے دیکھیے: بلادی، **معجم المعالم الجغرافیة**، ص ۲۵۴؛ **نسب الحروب**، ص ۳۹، ۲۲۵؛ حربی، **کتاب المناسک**، حمد الجاسر کا حاشیہ، ص ۳۵۳

۸- ابن اسحٰق، **سیرة ابن هشام**، ۴: ۴۷۸، حاشیہ

۹- بلادی، **معجم المعالم الجغرافیة**، ص ۲۱۳-۲۱۴، ص ۳۱۶

۱۰- ابن اسحٰق، **سیرة ابن هشام**، ۲: ۴۷۸-۴۸۳۔ دبابہ کے متعلق دیکھیے: محمد شیث خطاب، **الرسول القائد**، ص ۲۵۴

۱۱- حربی، **کتاب المناسک**، حمد الجاسر کے حواشی، ص ۲۸۵

۱۲- منجنیق ایک طویل اور مضبوط شہتیر ہوتا تھا جسے دو پہیوں کی ایک گاڑی پر رکھا جاتا تھا۔ اس کے ایک سرے پر ایک چرخی ہوتی تھی جس کے گرد ایک رسا بندھا ہوتا تھا۔ رسے کے ایک سرے پر تھیلے کی شکل میں ایک جال لگا ہوتا تھا جس میں بڑے بڑے پتھر یا آتش گیر مادہ رکھا جاتا تھا، پھر انہیں شہتیر اور رسے کی مدد سے پھینکا جاتا تھا۔ جال میں جو گولے رکھے جاتے تھے، وہ پھٹ کر دیواروں کے اوپر گرتے تھے اور جس جگہ گرتے تھے، اسے جلا کر خاکستر کر دیتے تھے (محمد شیث خطاب، **الرسول القائد**)۔

۱۳- ابن اسحٰق، **سیرة ابن هشام**، ۲: ۴۷۸؛ طبری، **تاریخ**، ۲: ۳۵۳،

۱۴- ابو داؤد، **المراسیل**، ص ۳۷۔ ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ جو مکحول تک جاتی ہے۔ ابو داؤد کی ''مراسیل'' میں سے ایک اور سند سے جو عکرمہ (ابن عباسؓ کے غلام) تک جاتی ہے۔ امام شافعی نے اس واقعے کو ثبوت کے طور پر لیا ہے (**کتاب الأمّ**، ۴: ۱۶۱)۔

۱۵- واقدی، **مغازی**، ۳: ۹۲۳، ۹۲۷۔ انہوں نے روایت کیا ہے کہ طفیلؓ بن عمرو دوسی رسول ﷺ کے حکم پر ذوالکفین نام کے ایک بت کو توڑنے گئے تھے اور انہوں نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اس

کے بعد وہ اپنے ۴۰۰ ہمراہیوں کے ساتھ طائف میں مسلمانوں سے آ ملے اور اس وقت ان کے پاس ایک دبابہ اور منجنیق تھی۔

۱۶- بیہقی، **السنن الکبری**، ۹: ۸۴۔ موسیٰ بن عقبہ اور عروہ بن زبیر کی ''مراسیل'' سے، جن کی سند کا سلسلہ ان دونوں اصحاب کے ساتھ جا کر ملتا ہے۔ اس سلسلۂ سند میں ایک ایسے راوی شامل ہیں جن کے حالات مجھے دستیاب نہیں ہو سکے۔ ابن اسحٰق، عمرو بن شعیب کی ''مراسیل'' سے، مزید دیکھیے، شافعی، **الأم**، ۷: ۳۲۳

۱۷- عبدالرزاق، **المصنف**، ۵: ۳۰۱؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۴۶؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۵۸-۱۵۹؛ ہیثمی، **مجمع الزوائد**، ۲: ۲۴۵، انہوں نے کہا: ''اس کے راوی صحیح ہیں''۔ غلاموں کا نیچے اترنا اور ان کی تعداد **صحیح بخاری** سے ثابت شدہ ہے (۵: ۱۲۹)، لیکن بخاری میں یہ ذکر نہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

۱۸- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۴۸۵؛ ابن سعد، **طبقات**، ۲: ۱۵۹؛ احمد، **مسند**، ۱: ۲۳۶، ۲۴۳، ۲۴۸۔ یہ حجاج بن ارطہ کی روایت پر مبنی ہے، جو ''صدوق'' ہیں، لیکن ''مدلّس'' ہیں اور ''عنعنہ'' کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۱۹- آقائے دوجہاںؐ نے یہ الفاظ (''جو شخص ایک تیر چلاتا ہے، وہ جنت میں یقینی طور پر ایک درجہ حاصل کرے گا'') محاصرۂ طائف کے موقع پر فرمائے تھے۔ یہ ''صحیح'' حدیث ہے۔ احمد، **مسند**، ۴: ۱۱۳، ۳۸۴۔ قتادہ سے بیہقی کی **السنن الکبری** (۹: ۱۶۱) میں صاف طور پر اس کی تحدیث ہے۔

۲۰- **صحیح بخاری**، ۸: ۲۰، ۹: ۱۱۳

۲۱- ابن اسحٰق نے بغیر سند کے ان کے نام دیے ہیں، **سیرۃ ابن ھشام**، ۲: ۴۸۶-۴۸۷

۲۲- ابوداؤد، **المراسیل**، ۴۸، عکرمہ سے روایت ہے۔ واقدی، **مغازی**، ۳: ۹۲۶، ۹۲۹-۹۳۰

۲۳- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۲۸، ۹: ۱۱۳

۲۴- ترمذی، **سنن**، ۵: ۳۸۵-۳۸۶۔ انہوں نے کہا: ''یہ روایت 'حسن صحیح' غریب ہے''۔ البانی نے وضاحت کی ہے کہ مسلم کی شرائط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہوتی، اگر یہ ابوزبیر کے ''عنعنہ'' کے بغیر ہوتی۔ ابوزبیر نے اسے روایت کیا ہے اور وہ مدلّس ہیں۔ غزالی، **فقہ السیرۃ**، ص ۴۳۲

۲۵- **صحیح بخاری**، ۵: ۱۲۸، ۹: ۱۱۳،

۲۶- حاکم، **مستدرک**، ۲: ۱۲۱۔ انہوں نے کہا: ''مسلم کی شرائط کی رو سے یہ حدیث 'صحیح' ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا''۔ ذہبی نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔

۲۷- **صحیح بخاری**؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۳۲۔ ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ عرصہ ۱۳ راتوں پر محیط تھا۔

۲۸- مسلم، **صحیح**، ۲:۲۷۲؛ احمد، **مسند**، ۳:۲۴۶۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ "اس کی سند مسلم کی شرائط کے مطابق ہے" (**فتح الباری**، ۸:۵۰)۔ **صحیح بخاری**، ۲:۱۰۴، ۴:۵، ۷۳، ۸:۷۹

۲۹- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲:۴۹۲-۴۹۳، بغیر سند کے۔ زرقانی، **شرح المواھب اللدنیۃ**، ۳:۳۷؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۴۸

۳۰- ایضاً، ۲:۴۹۴-۴۹۶

۳۱- ابن حزم، **جوامع السیرۃ**، ۲۴۸

۳۲- مسلم، **صحیح**، ۴:۱۸۰۶

۳۳- ایضاً

۳۴- ابن حجر، **فتح الباری**، ۳:۳۳۶۔ مزید دیکھیے: **بخاری** میں حدیث، ۲:۱۰۴، ۴:۵، ۷۳، ۸:۷۹؛ **مسلم**، ۲:۷۱۷

۳۵- **صحیح بخاری**، ۲:۱۰، ۴:۷۴، ۹:۱۲۵-۱۲۶

۳۶- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۵۳، بخاری کی ایک روایت سے

۳۷- **صحیح بخاری**، ۱:۱۱، ۲:۱۰۵-۱۰۶؛ **صحیح مسلم**، ۱:۱۳۲-۱۳۳؛ ۲:۷۳۲-۷۳۳

۳۸- **صحیح بخاری**، ۴:۷۴، ۱۴۵؛ ۵:۲۶، ۲۸، ۱۳۰-۱۳۱؛ ۷:۱۳۳؛ ۸:۱۳۰، ۹:۱۰۶؛ **صحیح مسلم**، ۲:۷۳۳-۷۳۶

۳۹- ابن ہشام، **سیرۃ**، ۳:۶۷، ۷۶-۷۷۔ ابن اسحٰق سے ایک ایسی سند کے ساتھ جو "حسن لذاتہ" ہے۔

۴۰- ابن اسحٰق نے ایک "حسن سند" کے ساتھ۔ ایک روایت میں ان کا نام ذوالخوصرہ التمیمی دیا ہے (**سیرۃ ابن ھشام**، ۲:۴۹۶)۔

۴۱- **صحیح بخاری**، ۴:۷۲؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۶۸؛ ۱۲:۲۹۱-۲۹۳،

۴۲- مسلم، **صحیح**، ۲:۷۴۰، نیز ابن اسحٰق کی روایت (**سیرۃ ابن ھشام**، ۲:۴۹۶)۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے غنیمت دو بار تقسیم ہونے پر اعتراض کیا، ایک مرتبہ اس وقت، جب حنین کی غنیمت تقسیم ہوئی، اور دوسری مرتبہ اس وقت، جب اس سونے کی تقسیم عمل میں آئی جو حضرت علیؓ نے حنین کے بعد براہ راست بھیجا تھا"۔ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۶۹؛

۲۹۳،۲۹۱:۱۲

۴۳- **صحیح بخاری**،۴: ۱۹، ۷۵

۴۴- ابن اسحق، ایسی سند کے ساتھ جو "حسن لذاتہ" ہے(**سیرۃ ابن ھشام**،۲: ۴۸۸-۴۹۰)۔ غزالی، **فقہ السیرۃ**،ص ۴۲۶، شیخ البانی کے حواشی سے

۴۵- **صحیح بخاری**،۴: ۵۹

۴۶- ملاحظہ کیجیے: سورۃ التوبہ،۹: ۹۷-۹۸

۴۷- **صحیح بخاری**،۳: ۱۶۵

۴۸- ایضاً،۳: ۸۷

۴۹- ابن ہشام،۲: ۴۸۸-۴۹۰، ۴۹۲۔ ایک ایسی سند کے ساتھ جو "حسن لذاتہ" ہے۔ اس میں ابن اسحٰق نے واضح طور پر تحدیث بیان کی ہے۔ مزید دیکھیے: احمد، **مسند**،۲: ۱۸۴؛ ابوداؤد، **سنن**، ۷: ۳۵۹؛ نسائی، **سنن**،۶: ۲۲۰؛ ہیثمی **مجمع الزوائد**،۶: ۱۸۷-۱۸۸

۵۰- ابن کثیر، **البدایۃ والنھایۃ**،۴: ۳۵۴-۳۵۵؛ ابن حجر، **فتح الباری**،۸: ۳۳-۳۴

۵۱- ابن ہشام، **سیرۃ**،۲: ۴۹۰-۴۹۲

۵۲- ابن اسحٰق، بغیر سند کے(**سیرۃ ابن ھشام**،۲: ۵۳۷-۵۳۸)۔ موسیٰ بن عقبہ ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عروہ کا قبول اسلام اسی سال کا واقعہ ہے جس سال، یعنی ۹ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کے ہمراہ حج ادا کیا تھا۔ ابن کثیر کا خیال ہے کہ ابن اسحٰق کی روایت زیادہ قرین قیاس ہے۔ **البدایۃ والنھایۃ**،۵: ۲۹

۵۳- ابوعبید، **الاموال**، ۲۴۷؛ ابن زنجویہ، **الاموال**،۴۴۲۔ دونوں نے ایک طویل خط کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط رسول اللہ ﷺ نے ثقیف کو لکھا تھا۔ یہ بیان عروہ بن زبیر کی "مرسل" روایت سے لیا گیا ہے اور ابن لہیعہ کی وجہ سے اس کی سند میں کچھ کمزوری پائی جاتی ہے۔ ابن اسحٰق نے بغیر سند کے خط کے کچھ حصے کا ذکر کیا ہے، یہ خط وادیٔ وج کی حرمت کے متعلق ہے(**سیرۃ ابن ھشام**،۴: ۲۰۰)۔

امام احمد نے اسے مسند میں روایت کیا(۱: ۱۶۵)، اور ابوداؤد نے اسے اپنی سنن میں حضرت زبیرؓ بن عوام کی ایک حدیث کے طور پر روایت کیا ہے جو وادی وج کی حرمت سے متعلق ہے۔ حضرت زبیرؓ بن عوام نے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ تحریم محاصرۂ طائف سے قبل واقع ہوئی۔ بخاری نے یہ واضح کیا ہے کہ محمد بن عبداللہ بن انسان طائفی واحد شخص ہیں جنھوں نے اسے روایت کیا ہے۔

ابو حاتم نے بیان کیا: ''وہ قوی نہیں ہیں اور ان کی حدیث کو احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے''۔ ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقات میں کیا ہے (**تهذيب التهذيب** ۹: ۲۴۸)۔ **تقریب** میں حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ ''وہ نرم ہیں''۔ بخاری اپنے والد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ''ان کی احادیث صحیح نہیں ہیں''۔ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور کہا ہے کہ ''وہ غلطیوں کا ارتکاب کیا کرتے تھے''۔ ذہبی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''حافظ یہ بات اس راوی کے بارے میں کہتے ہیں جس نے بہت سی احادیث روایت کی ہوں، عبداللہ کے پاس صرف یہی حدیث ہے۔ اگر اس نے یہاں غلطی کی ہے تو پھر درست کہاں ہے؟'' (**تهذيب التهذيب**، ۴: ۱۴۹)۔ **الخلل في العلل** میں یہ ذکر ہے کہ احمد نے انہیں ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ شافعی نے ان کی حدیث کو صحیح سمجھا ہے اور اسے ثبوت کے طور پر استعمال بھی کیا ہے (ذہبی، **میزان الاعتدال**)۔ شیخ احمد شاکر نے اس حدیث کو ''صحیح'' سمجھا ہے (**مسند**، حدیث، ۱۷۶)، لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ کسی حدیث کو ''صحیح'' تسلیم کرنے میں نرم رویہ اختیار کرتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے یہ سوچ کر اعتماد کا اظہار کیا ہو کہ امام شافعی نے اس حدیث کو ''صحیح'' سمجھا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ امام بخاری، امام احمد اور ابو حاتم علم حدیث میں امام شافعی سے زیادہ اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی عظیم صلاحیت کے باوجود حدیث ''صحیح'' نہیں ہے۔ مزید یہ کہ امام شافعی نے اپنے قدیم مذہب میں اس حدیث پر اعتماد کیا ہے جب کہ اپنے جدید مذہب میں انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ ان کی رائے اکثریت کے ساتھ متفق تھی کہ وج کو حرم قرار نہیں دیا گیا تھا (زرقانی، **شرح المواهب اللدنية**، ۴: ۱۰)۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ حدیث کمزور ہے۔ خطابی کہتے ہیں: ''مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وج کو حرم قرار دیا گیا ہو، جب کہ یہاں مسلمانوں کو تحفظ اور فائدے کی کوئی صورت حاصل نہ ہو۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ تحریم کسی مخصوص اور محدود وقت کے لیے عمل میں آئی ہو، اور بعد میں منسوخ کر دی گئی ہو''۔ خطابی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ طائف کے محاصرے کے دوران میں مسلمانوں نے اس کے درختوں اور شکار سے فائدہ اٹھایا اور تمام سہولتوں سے استفادہ کیا۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ یہ جگہ حرم نہیں تھی (منذری، **مختصر سنن ابی داؤد**، ۲: ۴۴۲)۔

یہ طویل حاشیہ اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اہل تحقیق اسلام کے نظم سیاست کی توضیح میں رسول اللہ ﷺ کے اسی خط پر کہیں اعتماد نہ کر بیٹھیں۔ خاص طور پر یہ اس لیے بھی ضروری سمجھا گیا کہ چند جدید محققین نے اس دستاویز پر اعتماد کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وج

کی تحریم کے معاملے میں ثقیف کے ساتھ کوئی سمجھوتا کر لیا تھا، کیوں کہ وہ اس کی تعظیم کرتے تھے۔
عون شریف قاسم، **نشاۃ الدولۃ الاسلامیۃ**، ص ۱۳۷

۵۴۔ ابن اسحٰق، **سیرۃ ابن ھشام**، ۴: ۵۳۸-۵۴۰، ایک ''معضل'' سند کے ساتھ۔ غزالی، **فقہ السیرۃ**، البانی کے حواشی کے ساتھ، ص ۴۵۰

۵۵۔ ابوداؤد، **سنن**، ۲: ۱۴۶۔ اس کی سند ''حسن لذاتہٖ'' ہے۔

۵۶۔ احمد، **مسند**، ۴: ۱۶۸۔ ہیثمی نے کہا ہے کہ ''اس کے افراد ثقہ ہیں''۔ **مجمع الزوائد**، ۲: ۲۴۵

۵۷۔ احمد، **مسند**، ۴: ۲۱۸؛ ابن ماجہ، **سنن** ۱: ۳۱۶۔ مزید دیکھیے، **صحیح مسلم**، ۱: ۳۴۲۔ یہاں انہوں نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاص کو امیر منتخب کیا گیا تھا۔

۵۸۔ احمد، **مسند**، ۴: ۹، ۳۴۳؛ ابوداؤد، **سنن**، ۱: ۳۲۱-۳۲۲؛ ابن ماجہ، **سنن**، ۱: ۴۲۷-۴۲۸۔ یہ حدیث عثمان بن عبداللہ سے ہے جس کا انحصار عبداللہ بن عبدالرحمٰن طائفی کے اعتماد پر ہے۔ یہ متابعات کی محتاج ہے تاکہ ''حسن'' کے درجے تک مضبوط ہو سکے، کیوں کہ طائفی ''صدوق'' ہیں، لیکن غلطیاں کرتے ہیں اور گھبرا جاتے ہیں اور عثمان کو ابن حجر نے ''مقبول'' اور ذہبی نے ''صدوق'' سمجھا ہے۔ ابن حجر، **تقریب**، ۲: ۱۱؛ **میزان الاعتدال**، ۳: ۴۳

۵۹۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۵۴۰-۵۴۱۔ اس کی سند میں عیسٰی بن عبداللہ بن مالک شامل ہیں جو ابن حجر کی نظر میں ''مقبول'' ہیں (**تقریب**، ۲: ۹۹)۔

۶۰۔ ابن ہشام، **سیرۃ**، ۲: ۵۴۱-۵۴۲۔ ابن اسحٰق سے بغیر سند کے۔ ابن کثیر، **البدایۃ والنھایۃ**، ۵: ۳۳-۳۴، موسیٰ بن عقبہ سے بغیر سند کے۔

۶۱۔ سبب نزول کے لیے دیکھیے: **شرح نووی علی صحیح مسلم**، ۳: ۲۳۷؛ مبارک پوری، **تحفۃ الاحوذی**، ۴: ۳۸۲؛ **عون المعبود**، ۶: ۱۹۱، ۱۹۳؛ ابن کثیر، **تفسیر**، ۱: ۴۷۳

۶۲۔ **صحیح بخاری**، ۵: ۱۲۸؛ ۷: ۳۳، ۱۳۷؛ مسلم، **صحیح**

۶۳۔ احمد، **مسند**، ۳: ۴۸۸، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ (**ارواء الغلیل**، ۵: ۳۵)؛ حاکم، **مستدرک**، ۲: ۱۲۳؛ بیہقی، **السنن الکبریٰ** ۹: ۱۳۰۔ حاکم نے اسے ''صحیح'' سمجھا اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا۔ مزید دیکھیے: البانی، **ارواء الغلیل**، ۵: ۳۵-۳۶؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۶: ۱۴۷-۱۴۸

۶۴۔ ابوداؤد، **سنن**، ۱۲: ۱۹۶-۱۹۷؛ احمد، **مسند**، ۴: ۳۵۰، دارقطنی، **سنن**، ۳: ۱۵۷-۱۵۸؛ شوکانی، **نیل الاوطار**، ۷: ۱۴۵۔ اس کی سند میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ازہر شامل ہیں جو ''مقبول'' ہیں

(**تقریب**،۱: ۴۲۷)۔

۶۵- ابن قیم ، **زاد المعاد**،۳: ۴۷۹؛ قرطبی، **الجامع لاحکام القرآن**، ۸: ۹۷؛ ابن حجر، **التلخیص الحبیر**،۴: ۱۰۰-۱۰۱۔ابن حجر لکھتے ہیں: ''یہ بات دل کو زیادہ لگتی ہے کہ مشرکین سے مدد طلب کرنے کی ممانعت ہو بہ نسبت اجازت کے۔ یہ رائے امام شافعی کی ہے۔''

۶۶- مسلم، **صحیح**،۴: ۱۸۰۶

۱۷

غزوۂ تبوک

تبوک کی مہم محاصرۂ طائف کے تقریباً چھ ماہ بعد پیش آئی۔(۱) یہ رجب ۹ ھ کا واقعہ ہے اور یہ شدید گرمی کا موسم تھا۔ مؤرخین نے، جیسا کہ ان کی عادت ہے، اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے کہ اس مہم کا اصل محرک کیا تھا۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ہرقل نے بازنطینیوں اوران کے حلیف قبائل کے فوجی دستے جمع کر لیے تھے۔ جب مسلمانوں کواس کی خبر ملی تو وہ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے۔(۲) یعقوبی کہتے ہیں کہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کا قصاص دراصل اس مہم کا اصل سبب تھا،(۳) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مہم محض جہاد کے فریضے کی تکمیل تھی۔ حافظ ابن کثیر بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لیے بازنطینیوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ جغرافیائی طور پر قریب ترین تھے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں سے اس قربت کی بناء پر تمام انسانوں سے بڑھ کر اس کے حق دار تھے کہ انہیں حق کی دعوت دی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیے اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے ساتھ ہے(التوبۃ ۹:۱۲۳)۔(۴)

یہ بات بالکل غلط ہے کہ مسلمانوں کو مدینے سے نکال کر بازنطینیوں کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کی سازش یہودیوں نے کی تھی، اورانہوں نے ہی مسلمانوں کو تبوک کی طرف جانے کا مشورہ دیا تھا۔ تبوک وہ سرزمین ہے جہاں قیامت کے روز مُردوں کو زندہ کر کے جمع کیا جائے گا اور یہ سرزمین انبیاء کا مسکن رہی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ قرآن کی آیت (الاسراء

۶:۱۷) کا شان نزول یہی ہے۔ ایسے تمام بیانات ''مرسل'' اور ''ضعیف'' روایات کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی تردید کے لیے یہ حقیقت کافی ہے کہ مذکورہ آیت مکے میں نازل ہوئی تھی۔ (۵) تبوک کی مہم اس سے قبل انجام دی جانے والی موتہ کی مہم سے اس طرح مختلف ہے کہ یہ بازنطینی اور عیسائی عربوں کے خلاف تھی، جب کہ پہلی مہم کا ہدف یہودی اور عرب کے مشرک قبائل تھے۔

[اُس دور میں] عیسائیت کی اصل تعلیمات ناپید، اور اس کی روح مفقود ہو چکی تھی، عیسائی مذہب مختلف فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ان کے اختلافات کی جڑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا۔ عیسائیوں کی اکثریت تثلیث (یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس) کے عقیدے پر قائم تھی، اور اس کے ساتھ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بشریت اور الوہیت بیک وقت جمع ہیں۔ اس کے برعکس بعض عیسائیوں کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں محض الوہی صفات موجود تھیں۔ اس عقیدے کے حامل عیسائیوں کو یعقوبی کہا جاتا تھا جو شام اور مصر میں آباد تھے۔ عیسائیوں نے اسی مسئلے پر متعدد علمی مجالس منعقد کیں اور ہرقل نے سلطنتِ روما کے اتحاد اور یک جہتی کو برقرار رکھنے کی خاطر مختلف مذہبی فرقوں میں باہم مصالحت کرانے کی بھرپور کوششیں کیں، مگر سب بے سود اور لاحاصل ثابت ہوئیں۔ سلطنتِ روما نے شام اور مصر کے یعقوبی باشندوں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کے عظیم مذہبی رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا گیا اور عام لوگوں نے بھی فرار کا راستہ اختیار کیا۔

عیسائیوں میں تحریف کا یہ عمل صرف مذہبی عقائد تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبے روبہ زوال تھے۔ لوگوں پر روز بروز بڑھتے ہوئے بھاری محصولوں اور طبقاتی امتیاز نے انہیں آپس میں تقسیم کر کے رکھ دیا تھا اور یہ نظام قائم کر دیا تھا کہ ہر شخص کا مقام اس طبقے کے لحاظ سے متعین ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ یہ تصور اتنا پھیل چکا تھا کہ ایک عیسائی اور ایک مشرک کی عام زندگی میں کوئی بنیادی فرق باقی نہ رہ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہل کتاب سے جہاد کرنے کا بھی ایسے ہی حکم دیا تھا، جیسے اس نے مشرکوں کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم دیا تھا، تاہم

مسلمانوں کے سیاسی غلبے کی صورت میں عیسائیوں کو اپنی مذہبی آزادی برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، بشرطیکہ انہوں نے مسلمانوں کو فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہونے کا محصول (جزیہ) ادا کر دیا ہو۔ مشرکین سے کسی قسم کا جزیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا، کیوں کہ انہیں اس کے علاوہ کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ اگر وہ لڑائی سے بچنا چاہتے ہیں تو اسلام قبول کر لیں۔

جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے حرام بنایا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں (التوبة ۹:۲۹)۔

جزیرہ نمائے عرب میں بت پرستی پر کاری ضرب لگانے اور یہودی اہل کتاب کو جلا وطن کرنے کے بعد مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گئے تھے، اور یہ نیا دور عیسائی اہل کتاب کے ساتھ مقابلے کا دور تھا۔(۶) یہ تبدیلی اسلام کی فطرت اور اس کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھی اور تبوک کی مہم اسی حقیقت کا ایک ثبوت فراہم کرتی ہے۔

تبوک حجاز کے شمال میں واقع ہے اور جدید شاہراہ پر مدینے سے ۷۷۸ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ علاقہ اس زمانے میں بازنطینیوں کے زیر انتظام تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تبوک کا نام دیا،(۷) لیکن اس مہم کو غزوۃ العسرۃ کا نام بھی دیا جاتا ہے، یعنی وہ مہم جو سختیوں اور مشکلات سے بھرپور تھی، کیوں کہ اس مہم کے دوران میں مسلمانوں کو معاشی طور پر انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔(۸) قرآن کریم میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی، جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا'' (التوبة ۹:۱۱۷)۔

قتادہ اور مجاہد دونوں نے،(۹) جو اپنے زمانے کے ائمۂ تفسیر مانے جاتے ہیں، روایت کیا ہے کہ ''ایک ایک کھجور میں دو دو افراد شریک ہوتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ چند افراد کے درمیان ایک کھجور مشترک ہوتی تھی، پہلے ایک شخص اس کھجور کو تھوڑا سا چوستا

اور پھر اس کے اوپر پانی پی لیتا تھا، پھر دوسرا شخص اس کھجور کو لے لیتا تھا اور تھوڑا سا چوس کر پانی پی لیتا تھا"۔ (۱۰) البتہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس شدید مالی بحران کے اسباب کیا تھے؟ آیا یہ تنگ دستی اس وجہ سے پیش آئی تھی کہ یہ مہم اس زمانے میں واقع ہوئی تھی جب کھجور کی فصلیں نہ تو پکی تھیں اور نہ فروخت ہی ہوئی تھیں، یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس کے کوئی اور اسباب ہوں۔ (۱۱)

تبوک کی فوج کے لیے مالی ایثار کرنے والے صحابہؓ

رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر تمام مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اسلامی لشکر کی تیاری کے لیے زیادہ سے زیادہ خرچ کریں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اجرِ عظیم کی بشارت دی۔ اس مقصد کے لیے تمام صحابہ کرامؓ نے خرچ کرنے میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور امیر و غریب کی کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ حضرت عثمانؓ بن عفان وہ ہستی تھے جنھوں نے اس لشکر کی تیاری میں سب سے زیادہ دولت قربان کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "جو شخص اس لشکر کو ساز و سامان سے آراستہ کرے گا، وہ جنت میں داخل ہوگا"۔ (۱۲) حضرت عثمانؓ بن عفان نے جب یہ فرمان سنا تو ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ ﷺ کی جھولی میں ڈال دیے اور اس طرح لشکر کی تیاری میں بھرپور حصہ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آج کے بعد حضرت عثمانؓ بن عفان کو ان کا کوئی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا"۔ آپؐ نے یہ جملہ کئی مرتبہ دہرایا۔ (۱۳) اس سلسلے میں کچھ اور روایات بھی ملتی ہیں جو اگرچہ "ضعیف" ہیں، لیکن ان سے پتا چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے کچھ اور طریقوں سے بھی اسلامی لشکر کی مدد کی تھی، مثلاً یہ کہ انہوں نے سامان سے لدے پھندے اونٹ فراہم کر دیے تھے۔ (۱۴) صحابہ کرامؓ کے ہاں بھی یہ ایک معروف اور تسلیم شدہ بات تھی کہ حضرت عثمانؓ نے لشکر کی تیاری میں بھرپور حصہ لیا تھا اور ان کے اس عمل کے بارے میں کسی قسم کا سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ لشکرِ جرار تیس ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا اور یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنا ذاتی مال خرچ کر کے تمام فوج کو ضروری ساز و سامان مہیا کیا تھا۔

طبری متعدد اسناد کے حوالے سے کہتے ہیں، جو اگرچہ "ضعیف" ہیں، لیکن ایک

دوسرے کی مؤید ہیں، اس لیے اس روایت کو تاریخی معیار سے ایک مضبوط روایت سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بھی لشکر کی تیاری پر دو سو درہم (اپنی تمام دولت کا نصف حصہ) خرچ کیے تھے۔(۱۵)

غریب مسلمان اس موقع پر معمولی رقوم ہی خرچ کر سکے اور انہیں اس وقت شدید خفت محسوس ہوئی، جب منافقوں نے ان کا مذاق اڑایا، مثال کے طور پر حضرت خیثمہ انصاریؓ ایک غریب صحابی تھے۔ جب وہ ایک صاع کھجور لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو منافقوں نے ان کا تمسخر اڑایا۔(۱۶) حضرت عقیلؓ صرف نصف صاع کھجوریں لے کر آئے تو منافقوں نے اس پر یہ جملہ کسا: ''خدا کو اس شخص کے صدقے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے اس شخص نے صرف دکھاوے کی خاطر خرچ کیا ہے''۔ اس موقع پر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

یہ (منافقین) ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جن کو بجز محنت اور مزدوری کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا، اُن سے تمسخر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو اس تمسخر کا بدلہ دے گا اور اِن کے لیے دردناک سزا ہوگی'' (التوبة ۹:۷۹)۔(۱۷)

منافقوں نے امیروں کے خرچ کرنے پر ریاکاری کا الزام لگایا اور غریبوں کے خرچ کا مذاق اڑایا۔

تبوک کی مہم کے دوران میں منافقین کا رویہ

اس مہم کے دوران میں منافقوں کا نفاق روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔ جونہی رسول اللہ ﷺ نے فوج کی تیاری کا حکم دیا، منافقین مخالفانہ کارروائیوں پر کمربستہ ہوگئے۔ انہوں نے یہ خوف دلا کر مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی کوششیں شروع کر دیں کہ ''گرمی میں نہ نکلو''۔ یہ گرمی کا موسم تھا اور لوگ درختوں کا سایہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ منافقوں نے گرمی کی شدت سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے درمیان کم ہمتی پھیلانا شروع کر دی۔ کچھ منافقین نے جھوٹے

اور بے بنیاد عذر تراش کر رسول اللہ ﷺ سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ انہیں اس مہم میں شریک ہونے پر مجبور نہ کیا جائے اور انہیں پیچھے رہنے دیا جائے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس قسم کی اجازت دینے سے گریز فرمائیں: ''اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معاف کر دیا، (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دے دی تھی جب تک آپؐ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے اور جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے'' (التوبۃ ۹:۴۳)۔(۱۸)

قرآن کریم کے بیان کے مطابق بدوی منافق اپنے کفر و نفاق میں مدینے کے منافقوں سے کہیں بڑھے ہوئے تھے، بدوؤں کے دل بھی زیادہ سخت تھے اور انہیں اسلام کا علم بھی نہ ہونے کے برابر تھا: ''دیہاتی لوگ کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور ان کو ایسا ہونا ہی چاہیے کہ ان کو احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں'' (التوبۃ ۹:۹۷)۔

منافق صرف مدینہ شہر تک ہی محدود نہیں تھے، بلکہ صحرا میں بھی پھیلے ہوئے تھے: ''اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق کی حدِ کمال پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ان کو نہیں جانتے، ان کو ہم ہی جانتے ہیں'' (التوبۃ ۹:۱۰۱)۔

قرآن کریم کی ایک آیت کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو اس بات سے منع کر دیا گیا کہ منافقوں کا کوئی عذر قبول کیا جائے، یا ان پر یقین کیا جائے:

> یہ لوگ تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے۔ آپ کہہ دیجیے کہ یہ عذر پیش مت کرو۔ ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری خبر دے چکے ہیں اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہاری کارگزاری دیکھ لیں گے۔ پھر تم اس کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے، پھر وہ تم کو بتلا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے (التوبۃ ۹:۹۴)۔

قرآن کی ایک آیت میں منافقوں کو نجس قرار دیا گیا ہے (التوبۃ ۹:۹۵)۔ اس طرح مومنوں اور منافقوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک خط کھینچ دیا گیا ہے، اور دونوں کے

درمیان معاملات میں تعاون کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں۔دونوں کے معاملات میں فرق واضح ہوکر سامنے آ گیا۔قرآن نے ان کے تمام عیوب کا پردہ چاک کر دیا۔رسول اللہ ﷺ نے اُس مسجد ضرار میں نماز ادا کرنا ترک کر دیا تھا جو منافقوں نے تعمیر کی تھی،اور آپ ﷺ نے اس مسجد کو نذرِ آتش کرا دیا تھا۔علاوہ ازیں آپؐ نے ان کے مردوں کی نمازِ جنازہ پڑھانا بھی چھوڑ دی تھی، اگرچہ آپؐ اس سے پہلے،تبوک سے واپس آنے پر عبداللہ بن ابی بن سلول کی نمازِ جنازہ پڑھا چکے تھے،اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا تھا:''اور ان میں کوئی مر جائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوئیے''(التوبة ۹:۸۴)۔(۱۹)

مسلمانوں کے خلاف پخت و پز اور سازشیں کرنے کی خاطر منافقوں نے تبوک کی مہم سے فوراً پہلے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی سہولت کی خاطر یہ مسجد بنا رہے ہیں تاکہ انہیں نماز ادا کرنے کے لیے زیادہ کھلی جگہ میسر آ سکے،لیکن ان کا اصل مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمان جو یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز ادا کرتے ہیں، وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں۔منافقوں نے اپنی اس گھناؤنی سازش کو کامیاب بنانے کی خاطر رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ آپؐ ان کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز ادا کریں،لیکن قرآن کریم میں نہ صرف یہ کہ اس کی ممانعت نازل ہوگئی، بلکہ اسے مسجد ضرار،یعنی فساد پیدا کرنے والی مسجد قرار دیا گیا:

اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے ان اغراض کے لیے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور ایمان داروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا اور رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں ہے اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپؐ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہ اس لائق ہے کہ آپؐ اس میں کھڑے ہوں۔اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند

کرتا ہے(التوبة ۹: ۱۰۷-۱۰۸)

منافقوں کی اکثریت نے غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پیچھے رہنے کو ترجیح دی، لیکن چند ایک منافق مسلمانوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے تاکہ انہیں مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی کرنے اور افواہیں پھیلانے کا موقع مل سکے۔

واقدی واحد مصنف ہے جس کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب قبائل کی طرف اپنے نمائندے بھیجے تھے تاکہ وہ تبوک کی مہم کے لیے نکلیں، تاہم یہ بیان اس حقیقت کا مخالف نہیں کہ تمام قبائل کو اس غزوے میں شرکت کے لیے دعوتِ عام دی گئی تھی۔ قرآن کریم سے اشارہ ملتا ہے کہ اس موقع پر تمام عرب قبائل کی فوجیں جمع ہو گئیں تھیں، اور اندرونِ مدینہ اس مہم کی منادی کر دی گئی تھی: ''اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جائے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو۔ کیا تم نے آخرت کے عوض دنیاوی زندگی پر قناعت کر لی، سو دنیاوی زندگی کا تمتع تو کچھ بھی نہیں، بہت قلیل ہے'' (التوبة ۹: ۳۸)۔

مجاہد کا کہنا ہے کہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب فوجوں کو جمع ہونے کا حکم دیا جا رہا تھا، (۲۰) اور یہ وہ زمانہ تھا جب فصلیں کٹنے والی تھیں، پھل پک کر تیار ہو چکا تھا اور لوگ گرمی کی شدت اور دھوپ کی تمازت میں سائے کی تلاش میں تھے۔ یہ سفر پر جانے کے لیے مشکل ترین وقت تھا۔ (۲۱) مجاہد کہتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن کریم نے ہر امیر و غریب اور پیر و جوان کو خدا کی راہ میں نکلنے کا حکم دیا: ''نکل پڑو تھوڑے سامان سے اور زیادہ سامان سے اور اللہ کی راہ میں اپنے جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو'' (التوبة ۹: ۴۱)۔

جب کچھ لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت طلب کی تو ان کے بارے میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

اگر کچھ لگے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی سا ہوتا تو یہ لوگ ضرور آپؐ کے ساتھ ہو لیتے، لیکن ان کو تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی اور ابھی خدا کی قسم کھا

جائیں گے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ضرور ہم تمہارے ساتھ چلتے ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں (التوبة ۹:۴۲)۔

اس مہم میں شرکت کرنے میں کم ہمتی کی چند وجوہ یہ تھیں کہ تبوک مدینے سے طویل فاصلے پر واقع تھا، سفر مشکل تھا، اور مالِ غنیمت کے حاصل ہونے کی امید کم تھی ۔ (۲۲) اس غزوے میں پیچھے رہ جانے والوں میں بدو، منافق اور چند ایک صحابہ کرامؓ شامل تھے ۔ ان تمام صحابہ کرامؓ کے پاس جائز عذر موجود تھے سوائے ان میں سے تین کے، جنھیں اس مہم میں شرکت کرنے سے کوئی عذر مانع نہ تھا۔

مسلمانوں نے جہاد کی دعوت پر جوش وخروش سے لبیک کہا۔

سفر کی طوالت اور دشمن فوج کی کثرت کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو منزل سے آگاہ کر دیا تھا، تاکہ وہ اپنی مناسب تیاری کر سکیں، حالانکہ عام طور پر آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ اپنی منزل کو عام لوگوں سے خفیہ رکھا کرتے تھے تاکہ دشمن چوکنا نہ ہو جائے۔

دوسری طرف مسلمان اس عظیم الشان مہم پر نکلنے کے لیے بے تاب تھے، جوش وخروش اور جذبات کا ایک عجیب عالم تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو یہ حکم دیا کہ وہ آپؐ کے اہل خانہ کی نگہداشت کے لیے مدینے ہی میں قیام کریں تو انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں''؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے لیے تمہارا وہی مقام ومرتبہ ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد نبوت ختم ہے''۔ (۲۳) مسلمانوں کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطمحِ زندگی محض پھل دار درخت اور ان کا سایہ ہی نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر گرمی، بھوک اور پیاس کو اپنے لیے پسند کیا۔ یہی ان کے لیے مالِ غنیمت کا درجہ رکھتا تھا جسے انہوں نے اپنے لیے آخرت کا سرمایہ بنا کر محفوظ کر لیا تھا۔

حضرت ابوخیثمہ انصاریؓ کہتے ہیں: ''جس وقت رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو میں پیچھے رہ جانے والوں میں شامل تھا۔ میں اپنے باغ میں معمول کی نشست وبرخاست کی جگہ گیا۔ میری بیوی نے چھڑکاؤ کر کے فرش خوب ٹھنڈا کیا ہوا تھا۔ میں نے دل میں کہا: ''یہ بات تو بالکل نامناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو گرمی اور لُو میں گھر سے باہر نکلے ہوئے ہوں اور میں یہاں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھا دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں''۔ میں نے چند کھجوریں اور کچھ گوشت اپنے ہمراہ لیا اور اسی وقت نکل کھڑا ہوا۔ میں نے فوراً ہی اسلامی لشکر کو جالیا۔ لوگوں نے جب مجھے آتے ہوئے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''یہ ابوخیثمہ ہوں گے''۔ جب میں نزدیک آیا تو رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے دعائے خیر فرمائی۔ (۲۴)

غریب صحابہؓ کو اس بات کا بے حد رنج اور ملال تھا کہ وہ اپنی کم مائیگی کی وجہ سے جہاد پر جانے کے قابل نہ ہو سکے۔ انہی میں ایک صحابی حضرت علابہؓ بن زید بھی تھے جن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ان الفاظ میں الحاح و زاری کرتے تھے: ''اے اللہ! آپ نے ہمیں جہاد کا حکم دیا ہے اور اس میں شرکت کرنے کی ترغیب دی ہے، مگر ہمیں اتنے وسائل نہیں دیے کہ ہم آپ کے نبی کے ساتھ جہاد میں حصہ لے سکتے۔ اے اللہ! میرا صدقہ یہ ہے کہ میں ہر اس مسلمان کو معاف کرتا ہوں جس نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو، خواہ اس نے مجھے جسمانی اذیت دی ہو، یا میری عزت کو تار تار کیا ہو''۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر انہیں خوش خبری دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرما دی ہے۔ (۲۵)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی سرکردگی میں چند اشعری صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے یہ درخواست کی کہ ان کے لیے سواریوں کا بندوبست کر دیا جائے تاکہ وہ بھی جہاد کے سفر پر روانہ ہو سکیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی سواری موجود نہیں تھی، لیکن بعد میں آپ کے پاس تین اونٹ آ گئے۔ (۲۶)

وہ لوگ جو کسی کمزوری، جسمانی معذوری یا مالی مجبوری کی وجہ سے شاملِ جہاد نہ

ہوسکے تھے، بے چینی کے عالم میں روتے تھے اور جہاد میں حصہ لینے کے لیے تڑپتے تھے۔ پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان کے چہروں پر پشیمانی اور شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ ان کی اس کیفیت کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں:

کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسر نہیں، جب کہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ خلوص رکھیں۔ ان نیکو کاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے اور بڑی رحمت والے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں پر کہ جس وقت وہ آپ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ انہیں کوئی سواری دے دیں اور آپ کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کروں تو وہ اس حالت میں واپس چلے جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں، اس غم میں کہ ان کو خرچ کرنے کو کچھ بھی میسر نہیں (التوبۃ ۹:۹۱-۹۲)۔ (۲۷)

رسول اللہ ﷺ نے ان اصحاب کی خصوصی طور پر نشاندہی فرمائی جو کسی جائز عذر کی بناء پر اس غزوے سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی نیت صالح تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ”مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو مستقلاً تم لوگوں کے ساتھ ہیں، جہاں کہیں بھی تم لوگ گئے اور جو وادی بھی تم نے پار کی، وہ تمہارے ساتھ تھے“۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا: ”لیکن یا رسول اللہ! وہ تو مدینے میں ہیں“؟ آپؐ نے جواب دیا: ”بے شک وہ مدینے میں ہیں، لیکن وہ معقول عذر کی بناء پر ہمارے ساتھ شامل ہونے سے رہ گئے“۔ (۲۸) حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ مدینے میں صرف وہی لوگ باقی بچے تھے جو منافق تھے، یا جسمانی طور پر کمزور تھے۔ (۲۹)

فوج کی تعداد

فوج کی تعداد کے بارے میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایات ظاہری طور پر ایک دوسرے سے متعارض معلوم ہوتی ہیں، لیکن انہیں آسانی سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت سے

مسلمان ایسے بھی تھے جن کے نام تاریخ محفوظ نہ کر سکی''۔(۳۰) حضرت کعبؓ ہی کی ایک اور روایت ہے:''اس موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی''۔(۳۱)

الاکلیل میں حاکم کی یہ روایت ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار سے زائد تھی، اور ابن اسحٰق بھی یقین کے ساتھ یہی تعداد بتاتے ہیں۔ واقدی کہتے ہیں کہ آپؐ کے ساتھ دس ہزار سوار تھے۔ غالباً حضرت کعبؓ نے صرف سواروں کے دستے کا حوالہ دیا اور انہوں نے پیادہ فوج کو اس تعداد میں شامل نہیں کیا۔ ابوزرعہ الرازی روایت کرتے ہیں کہ فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی (۳۲) اور حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ یہ تعداد تیس ہزار تھی۔(۳۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مورخین کی اکثریت اسی بات کی قائل ہے کہ فوج کی تعداد تیس ہزار تھی۔ اس بھاری جمعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نامساعد حالات کے باوجود کس قدر جوش وخروش اور جذبے کے ساتھ جہاد کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ اگرچہ گرمی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی اور چاروں طرف سے مشکلات کا سامنا تھا۔ یہ وہ عظیم ترین فوج تھی جس کی رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں قیادت فرمائی۔ واقدی کہتے ہیں کہ جب تمام فوج ایک جگہ جمع ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ اسے لے کر مدینے سے ذوخشب کے راستے نکلے جو شام کی طرف مدینے سے کوئی چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے آپؐ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر علقمہ بن الفغوی الخزاعی راستہ بتانے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔(۳۴)

تبوک پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے سب سے بڑا علم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کیا اور سب سے بڑا جھنڈا حضرت زبیرؓ کو اور قبیلہ خزرج کا جھنڈا حضرت ابودجانہؓ کو دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خزرج کا جھنڈا حضرت حبابؓ بن منذر کو دیا گیا تھا۔(۳۵) آپؐ نے انصار کی ہر شاخ کو یہ ہدایت کی کہ ان کے پاس ایک علم اور ایک جھنڈا ضرور ہونا چاہیے۔ اسی طرح تمام عرب قبائل کے ہاتھوں میں مختلف جھنڈے اور علم موجود تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت، بنو مالک بن نجار کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ حضرت ابوزیدؓ کے ہاتھ میں بنوعمرو بن عوف کا اور حضرت معاذؓ بن جبل کے ہاتھ میں بنوسلمہ کا جھنڈا تھا۔(۳۶) واقدی واحد مصنف ہیں جنہوں نے اس

لشکر کے راستوں اور جھنڈوں کی تقسیم کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ اگرچہ واقدی ''متروک'' ہیں، لیکن ان کے ہاں سیرت پر بیش بہا معلومات ملتی ہیں اور ان کی اس قسم کی معلومات کو قبول کرنا درست ہے۔

وہ لوگ جو پیچھے رہ گئے اور جنہوں نے تبوک کی مہم میں حصہ نہیں لیا۔

تین صحابہ کرامؓ ایسے تھے جو تبوک کی مہم میں شریک نہ ہو سکے اور پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ تینوں صحابہ کرامؓ حضرت کعبؓ بن مالک، حضرت مرارہؓ بن ربیع اور حضرت ہلالؓ بن امیہ تھے۔ یہ انصاری صحابہؓ اپنے کمال ایمان اور تقویٰ میں مشہور تھے۔ حضرت کعبؓ بن مالک نے بدر کے علاوہ تمام معرکوں میں شرکت فرمائی تھی، اور بیعتِ عقبہ ثانیہ میں بھی وہ شریک تھے۔ ان سے سفر کی تیاری میں تاخیر ضرور ہوگئی تھی، لیکن ان کا پیچھے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بعد میں پھلوں اور سایہ دار درختوں کی کشش ان کے اوپر حاوی ہوگئی حتیٰ کہ لشکر روانہ ہو گیا اور حضرت کعبؓ بن مالک لشکر میں شامل نہ ہو سکے۔

حضرت مرارہؓ بن ربیع اور حضرت ہلالؓ بن امیہ دونوں غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً ۸۰ (۳۷) سے زائد افراد پیچھے رہ گئے تھے۔ واقدی کہتے ہیں کہ یہ تمام کے تمام مدینے کے منافقین تھے، بنو غفار اور دیگر قبائل کے جو بدو پیچھے رہ گئے تھے، ان کی تعداد ۸۲ ہے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ان لوگوں کے علاوہ تھے، اور ان کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ (۳۸) ان تمام لوگوں میں سے جو پیچھے رہ گئے تھے، ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ فوج میں اس کی عدم موجودگی کسی کے علم میں بھی نہ آ سکے گی۔ (۳۹)

تبوک جاتے ہوئے راستے میں رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں میں سے چند کے بارے میں استفسار فرمایا، جو پیچھے رہ گئے تھے، مثلاً آپؐ نے ابورہم کلثوم بن حسین الغفاری سے بنو غفار اور بنو اسلم (۴۰) کے لوگوں کے بارے میں دریافت فرمایا اور تبوک پہنچ کر آپؐ نے حضرت کعبؓ بن مالک کے بارے میں پوچھا۔ (۴۱)

سورۃ التوبہ میں پیچھے رہ جانے والوں کے رویے کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور ان

کے پیچھے رہ جانے پر تنقید کی گئی ہے، جب کہ ہر فرد کے لیے جہاد کو فرض عین قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ وحی نازل ہوئی کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور ان کا صدقہ بھی اس لیے قبول کر لیا گیا کہ انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ اسی سورۃ میں منافقوں کی مختلف بداعمالیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، مثلاً یہ کہ انہیں خدا تعالیٰ کی تقدیر پر یقین نہیں تھا، وہ زندگی کی محبت میں گرفتار تھے اور جہاد میں حصہ لینے کو اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ کہیں مر نہ جائیں۔ علاوہ ازیں ان میں اور بھی برائیاں تھیں، اگر رقم خرچ کرتے تھے تو بادلِ ناخواستہ اور بدنیتی کے ساتھ، بدکلامی میں وہ ماہر تھے، دوسروں پر بزدلی کا الزام لگاتے تھے اور جب ان سے بازپرس کی جاتی تھی تو یہ کہہ کر الگ ہو جاتے تھے کہ وہ تو مذاق کر رہے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے جھوٹے بہانے اور باطل معذرتیں قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا اور انہیں علی الاعلان کافر قرار دیا۔ مزید براں ان کے لیے دعائے مغفرت کرنے اور ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ انہیں یہ وعید بھی سنائی گئی کہ دنیا کی عارضی زندگی میں وہ جو تمسخر کرتے ہیں، اس کے عوض انہیں ابدی زندگی میں رونا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ منافقوں کو مستقبل میں کسی بھی جہاد میں حصہ لینے سے منع کر دیا گیا۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ منافق ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پائیں، مومن ان سے ممتاز ہو جائیں اور ان کی صفوں کی تطہیر ہو جائے تا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی کمزوری اور پست ہمتی پھیلانے کے قابل نہ رہ سکیں۔ قرآن کریم کی ایک آیتِ مبارکہ میں ان لوگوں کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا جو منافق نہیں تھے، اور اپنے پیچھے رہ جانے پر دل سے پشیمان وشرمندہ تھے۔

اس سورۃ میں مدینے کے ان شہریوں اور گرد ونواح کے ان بدوؤں کو زجر وتوبیخ کی گئی ہے، جو پیچھے رہ گئے تھے، کیوں کہ جب فوجوں کو جمع کرنے کے لیے عام منادی کر دی جائے تو جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جہاد میں حصہ لینے پر اجرِ عظیم کی بشارت بھی سنائی گئی ہے۔

تبوک میں آمد

بعض مآخذ میں حضور ﷺ کا ایک طویل خطبہ نقل کیا گیا ہے جو آپ ؐ نے تبوک کے مقام پر ارشاد فرمایا تھا۔ اگر چہ اس خطبے کا پورا متن کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، (۴۲) لیکن اس کے کچھ حصے ایسے ہیں جو معروف احادیث سے لیے گئے ہیں۔ ان احادیث میں سے کچھ ''صحیح'' اور کچھ ''حسن'' ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض راویوں نے مختلف احادیث سے ٹکڑے لے کر انہیں خطبے کی شکل دے دی ہے۔

تبوک پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ دومۃ الجندل روانہ فرمایا۔ عروہ بن زبیر ایک ''مرسل'' سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ ۴۲۰ سوار روانہ فرمائے تھے۔ (۴۳) حضرت خالدؓ نے دومۃ الجندل کے اولی گورنر اکیدر بن عبدالملک کو اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ شہر سے باہر شکار میں مصروف تھا۔ (۴۴) رسول اللہ ﷺ نے اس شرط پر اس کے ساتھ امن کا معاہدہ کر لیا کہ وہ جزیہ ادا کرے گا۔ (۴۵) مسلمانوں نے اُکیدر کو نفیس جبہ زیب تن کیے دیکھا تو اس کے جبے کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ''تم اس جبے کی تعریف کرتے ہو؟ قسم ہے اس خدا کی! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جنت میں سعدؓ بن معاذ کے رومال اس جبے سے بدرجہا بہتر ہیں''۔ (۴۶) ایک روایت کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید کو اُکیدر کے پاس سے جو مال غنیمت ملا تھا، وہ آٹھ سو قیدیوں، ایک ہزار اونٹوں، چار سو ڈھالوں اور چار سو نیزوں پر مشتمل تھا۔ (۴۷)

جس وقت رسول اللہ ﷺ تبوک میں قیام پذیر تھے تو ایلہ کے بادشاہ نے آپ کی خدمت میں تحفے کے طور پر ایک خچر اور ایک چادر روانہ کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ بھی اس شرط پر معاہدۂ امن کر لیا کہ وہ جزیہ ادا کرے گا۔ (۴۸)

ایک کمزور روایت سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تبوک میں قیام کے دوران میں رسول اللہ ﷺ اور بازنطینی حکمران ہرقل کے درمیان خط وکتابت ہوئی۔ حضور ﷺ نے دحیہ الکلبی کو اس

کے پاس بھیجا اور ہرقل نے التنوخی کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا تاکہ وہ نبوت کی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرے۔(۴۹) اگر یہ روایت ''صحیح'' ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے دو مرتبہ دحیہ کلبی کو ہرقل کے دربار میں بھیجا تھا۔ ایک مرتبہ اس سے قبل بھی دحیہ کلبی ۷ھ کے اوائل میں حضور ﷺ کا نامۂ مبارک لے کر ہرقل کے پاس جا چکے تھے۔

اس مہم کے دوران میں بازنطینیوں اور عرب عیسائی قبائل سے لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ مسلمان تبوک پہنچ گئے، لیکن بازنطینیوں نے مسلمانوں کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ شہروں کے مقامی حکام نے صلح کے معاہدے کرنے کو ترجیح دی اور جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ مسلمان فوج ۲۰ دن (۵۰) تبوک میں قیام پذیر رہی جس کے بعد مدینے واپسی ہوئی۔

تبوک سے واپسی

تبوک سے مدینے واپس آتے ہوئے مسلمانوں کا گزر الحجر نامی بستی سے ہوا۔ یہ قوم ثمود کا علاقہ ہے اور قرآن کریم کے بیان کے مطابق ایک اونٹنی کے ذریعے اس قوم کی آزمائش کی گئی تھی۔ یہ لوگ اس آزمائش پر پورے نہ اتر سکے اور اونٹنی کو ذبح کر ڈالا۔ اس جرم کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوا اور پوری قوم ہلاک ہوگئی۔(۵۱) جب مسلمانوں کی نظر ان کی بستی پر پڑی تو وہ دوڑ دوڑ کر ان کے تباہ شدہ گھروں میں داخل ہونے لگے تاکہ ان کی تباہی کے آثار دیکھ سکیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور فرمایا: ''ایسے لوگوں کی رہائش گاہوں میں مت داخل ہو جو خود اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، اور اگر داخل ہونا چاہو تو روتے ہوئے داخل ہو، ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی عذاب کا شکار ہو جاؤ جس کے وہ شکار ہوئے تھے''۔ یہ فرما کر رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر مبارک کپڑے سے ڈھانپ لیا اور تیز گامی سے چلتے ہوئے اس وادی سے نکل گئے۔ آپؐ نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اس بستی کے کنوؤں کا پانی نہ پیو اور نہ اس سے وضو کرو، نیز وہاں کے پانی سے اگر کسی نے آٹا گوندھا ہے تو اسے چاہیے کہ یہ آٹا اپنے اونٹ کو کھلا دے اور خود اس کے کھانے سے پرہیز کرے۔(۵۲)

واپسی کے سفر میں مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے اونٹوں کی کمزوری اور

تھکاوٹ کی شکایت کی۔آپؐ نے یہ سن کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی: ''اے اللہ! ان اونٹوں کو اتنی طاقت اور قوت عطا فرما کہ یہ ہمارے بوجھ بآسانی اٹھا سکیں۔آپ ہی کمزور اور طاقتور کو، اور خشک وتر کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ خشکی اور سمندر میں بوجھ لے کر چل سکیں''۔آپؐ کی دعا کے ساتھ ہی اونٹوں کی طاقت عود کر آئی، وہ تازہ دم اونٹوں کی طرح مدینے تک سامان لے گئے اور مسلمانوں کو اونٹوں سے دوبارہ کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔(۵۳)

تبوک سے واپسی پر منافقوں نے رسول اللہ ﷺ کی سواری کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ بدک جائے اور آپؐ سواری سے نیچے گر جائیں۔اگر چہ انہوں نے اپنے چہرے اس غرض سے ڈھانپ رکھے تھے کہ پہچانے نہ جائیں، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے انہیں پہچان لیا اور انہیں دور بھگانے کا حکم دیا۔(۵۴)

جب فوج مدینے کے نزدیک پہنچی تو نوعمر لڑکے فوج کے استقبال کے لیے ثنیۃ الوداع تک آئے۔رسول اللہ ﷺ مدینہ شہر میں داخل ہوئے اور اپنی مسجد میں جا کر دوگانہ ادا کیا۔اس کے بعد آپ وہاں کچھ دیر لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہے، وہ منافق جو پیچھے رہ گئے تھے، ایک ایک کر کے آئے اور مختلف عذر پیش کرنے لگے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کے ظاہر کو قبول کیا اور باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، ان سے حلفِ وفاداری لیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔اس کے بعد حضرت کعبؓ بن مالک حاضرِ خدمت ہوئے۔ان سے پہلے ان کے دو ساتھی حضرت ہلالؓ بن امیہ اور حضرت مرارہؓ بن ربیع بھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ان تینوں اصحاب نے باہم یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں ساتھ جانے میں کوئی عذر مانع نہیں تھا اور پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان سے ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے، اب وہ جھوٹ بول کر اس گناہ میں مزید اضافہ نہیں کریں گے۔رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان تینوں اصحاب کے ساتھ بول چال بالکل بند کر دیں، چنانچہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔پچاس روز تک مسلمانوں نے ان کا مکمل معاشرتی مقاطعہ کیے رکھا، حتیٰ کہ ان کی بیویوں کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان سے بالکل علیحدگی اختیار کر لیں۔وہ آپؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے اپنے میکے چلی گئیں، لیکن

حضرت ہلالؓ بن امیہ ایک بوڑھے انسان تھے، ان کی اہلیہ نے حضور ﷺ سے خصوصی اجازت طلب کی کہ انہیں اپنے شوہر کی خدمت کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرما دی۔ اس تمام عرصے میں یہ تینوں اصحاب غم اور صدمے سے نڈھال تھے۔ اسی دوران میں حضرت کعبؓ بن مالک کو ایک اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ غسان کے بادشاہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں ایک خط لکھا جس میں انہیں یہ پیش کش کی کہ اگر وہ اس سے آ کر ملیں تو انہیں اس کے دربار میں عزت کا مقام دیا جائے گا۔ حضرت کعبؓ بن مالک نے اس خط کو ذرا بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا، فوراً نذر آتش کر دیا اور کہنے لگے کہ یہ ایک اور آزمائش ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر ڈالی گئی ہے۔ مسلمانوں کی جانب سے ان کا یہ مقاطعہ جاری تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی جو اس بات کا اعلان تھا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان لوگوں کی توبہ قبول فرمالی ہے:

> اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا، یہاں تک کہ زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے، اس کی طرف رجوع کیا جائے، پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی تا کہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں (التوبۃ: ۱۱۸:۹)۔ (۵۶)

غزوۂ تبوک کے دوران میں جاری شدہ احکام

تبوک میں قیام کے دوران میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو کسی خاص وجہ سے نماز کے لیے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے امامت کے فرائض ادا کیے۔ یہ فجر کا وقت تھا۔ نماز کے دوران ہی میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، آپؐ کو دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے پیچھے ہٹنا چاہا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اشارے سے منع فرما دیا اور ان کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی۔ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ ادنیٰ رتبے کا شخص امامت کر سکتا ہے

اور اعلیٰ رتبے کا فرد اس کی اقتداء میں نماز ادا کر سکتا ہے۔ (۵۷)

مدینے واپس آتے ہوئے حضرت معاذؓ بن جبل نے حضور ﷺ سے ایک ایسے عمل کے بارے میں دریافت کیا جو انہیں جنت میں لے جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''ہر وہ عمل جس کی بنیاد توحید پر ہو، اس کا ڈھانچا نماز اور زکوٰۃ ہو اور اس کی چوٹی جہاد ہو''۔ (۵۸)

اسی غزوے کے دوران میں حضور ﷺ سے سُترہ کے بارے میں دریافت کیا گیا، (یعنی نمازی کے سامنے کتنی آڑ ہونا چاہیے)۔ آپ نے جواب دیا کہ اس کا حجم اونٹ کی کاٹھی کے برابر ہونا ضروری ہے۔ (۵۹) اسی غزوے کے دوران میں حضور ﷺ نے ظہر اور عصر، نیز مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع فرمائیں۔ (۶۰)

آپؐ نے تبوک میں بیس روز قیام فرمایا اور اس دوران میں آپؐ نے قصر نمازیں ادا فرمائیں۔ (۶۱)

واپس آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ایک باغ کی قیمت کا تخمینہ لگایا جو پکی ہوئی کھجوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیمت کا تخمینہ لگانا جائز ہے۔ (۶۲)

تبوک ہی میں قیام کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے ایک گھر سے پانی طلب کیا۔ آپ ﷺ کو چمڑے کے بنے ہوئے برتن میں پانی دیا گیا۔ اس موقع پر مردہ جانور کی کھال کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: ''اگر کھال کو رنگ لیا جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے''۔ (۶۳)

ان تینوں صحابہ کرامؓ کا معاشرتی مقاطعہ کرنے سے (جو اس غزوے میں پیچھے رہ گئے تھے،) یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی مسلمان سے تین روز سے زیادہ ترکِ کلام کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی کوئی شرعی وجہ موجود ہو۔ (۶۴)

تبوک کی طرف پیش قدمی کرنے میں حضور ﷺ کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ پوری طرح حاصل ہو گیا، یعنی آپؐ چاہتے تھے کہ عرب کے شمالی علاقوں پر اسلام کا رعب قائم ہو جائے اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھ جائے۔ بازنطینیوں کی طرف آپؐ کی پیش قدمی دراصل فتحِ شام کا

مقدمہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے انتقال سے قبل حضرت اسامہؓ بن زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک فوج تیار کر لی تھی، لیکن اس فوج کی روانگی کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت قائم ہوگئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے امارت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضرت اسامہؓ کی فوج کو جلد از جلد شام کی طرف روانہ کرنے پر اصرار فرمایا، حالانکہ اس وقت حالات بہت خطرناک تھے، اور ارتداد کی تحریکوں کے سبب شہر مدینہ اور دین اسلام کو سخت خطرات لاحق تھے۔ جونہی صورتِ حال قابو میں آئی، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام اور عراق کو آزاد کرانے کی خاطر فوجوں کو ساز و سامان سے آراستہ کیا تاکہ اسلام کا مقصدِ وحید پورا ہو جائے، یعنی انسانیت کو ظلم اور تشدد کے شکنجے سے آزاد کرا کے خداے واحد کی بندگی میں اس طرح دینا: ''کہ عقیدہ میں کوئی فساد نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے'' (الانفال ۸:۳۹)۔

حواشی

۱- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۸۴۔ اس بیان، یعنی غزوۂ تبوک محاصرۂ طائف کے ۶ ماہ بعد پیش آیا، کے سلسلے میں یہ بتانا مناسب ہے کہ یہ امر محمد بن عائذ کی ایک روایت میں مذکور ہے۔ محمد بن عائذ مغازی کے مصنف ہیں اور انہوں نے یہ روایت عثمان بن عطاء خراسانی اور ان کے والد سے ایک کمزور سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ یہ روایت اس معلوم اور معروف بیان سے زیادہ متضاد نہیں کہ یہ واقعہ رجب میں پیش آیا تھا، اور رسول اللہ ﷺ طائف کے محاصرے سے واپسی پر ذوالحجہ کے مہینے میں مدینہ شہر میں داخل ہوئے تھے۔

۲- ابن سعد، **الطبقات الکبری**، ۲:۱۶۵

۳- یعقوبی، **تاریخ**، ۲:۶۷

۴- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۲:۵، مزید دیکھیے: طبری، **تفسیر**، ۱۱:۱۷

۵- ابن کثیر، **تفسیر**، ۵:۲۱۰-۲۱۱۔ سبب نزول کے متعلق روایت کا مآخذ ابن عساکر کی تاریخ دمشق (۱:۱۶۷-۱۶۸) میں مذکور ہے، اس کی سند میں احمد بن عبدالجبار عتریدی شامل ہے جو

''ضعیف'' ہے۔

۶- **تفسیر طبری**، ۱۱:۲۷۔ یہاں وہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم عدوی (متوفی ۱۸۲ھ) کی تفسیر کی وضاحت کرتے ہیں جو ایک عظیم مفسر قرآن تھے، لیکن محدثین کرام انہیں ''ضعیف'' مانتے ہیں (**تقریب**، ۱:۴۸۰)۔

۷- **صحیح مسلم**، **کتاب الفضائل**، ۷:۶۰-۶۱

۸- **صحیح بخاری**، **کتاب التوحید**، ۹:۱۲۹، نیز دیگر ابواب؛ **صحیح مسلم**، ۵:۸۲۔ مزید دیکھیے: **فتح الباری**، ۸:۸۴۔ معاشی مشکلات کے حوالے سے مزید دیکھیے: **صحیح مسلم**، ۱:۲۶-۲۷، ۴۱-۴۲؛ نووی، **شرح صحیح مسلم**، ۱:۲۲۱-۲۲۳؛ قرطبی، **تفسیر**، ۸:۲۷۹

۹- دونوں سندیں ''منقطع'' ہیں، کیوں کہ قتادہ اور مجاہد نے اس کا بذات خود مشاہدہ نہیں کیا۔ وہ سند جو قتادہ تک جاتی ہے، ''صحیح'' ہے، لیکن وہ سند جو مجاہد تک جاتی ہے، سنید بن داؤد مصیصی کی وجہ سے کمزور ہے۔

۱۰- طبری، **تفسیر**، ۱۱:۵۵

۱۱- ابن حجر، **فتح الباری**، ۳:۳۴۳-۳۴۴

۱۲- **صحیح بخاری**، **کتاب الوصایا**، ۴:۱۱؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۵:۳۰۶

۱۳- احمد، **مسند**، ۵:۵۳؛ ترمذی، **سنن**، **کتاب المناقب**، ۱۳:۱۵۴-۱۵۵۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہ حدیث اپنی سند میں ''حسن غریب'' ہے، اگرچہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا۔ ذہبی اس پر متفق ہیں کہ یہ ''صحیح'' ہے، لیکن اس کے راویوں نے اسے ''صحیح'' قرار دینے میں نرمی اختیار کی، کیوں کہ اس کی سند میں ابن سمرہ کے غلام، کثیر بن ابی کثیر شامل ہیں جن کے متعلق حافظ ابن حجر نے **تقریب** میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ وہ ''مقبول'' ہیں (۲:۱۳۳)۔ عجلی اور ابن حبان نے انہیں ''ثقہ'' سمجھا ہے اور انہوں نے نرمی اختیار کی ہے (**میزان الاعتدال**، ۳:۴۱۰)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حدیث کو ثبوت کے طور پر لیا جا سکتا ہے اور اسے دوسروں نے ''حسن'' کے درجے تک تقویت دے دی ہے۔

۱۴- ترمذی، **سنن**، **کتاب المناقب**، ۱۳:۱۵۳-۱۵۴۔ انہوں نے کہا: ''یہ حدیث اس سند کے اعتبار سے غریب ہے اور ہم اسے سکن بن مغیرہ کی حدیث کے ذریعے سے جانتے ہیں''۔ حاکم، **مستدرک**، ۳:۱۰۲ (انہوں نے اسے ''صحیح'' سمجھا اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے، لیکن اس میں فرقد ابوطلحہ شامل ہیں جو'' مجہول العین'' (قطعی غیر معروف) ہیں (**تہذیب التہذیب**

۸:۲۶۴)، چنانچہ حاکم کا اس روایت کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ ''صحیح'' ہے، قابل قبول نہیں ہے۔

۱۵- طبری، **تفسیر**، ۱۰:۱۹۱-۱۹۶، حوالے میں مثنّٰی بن ابراہیم آملی، جو غیر معروف ہیں، اور عمر بن ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف شامل ہیں۔ شیخ محمود محمد شاکر نے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ عمر کو سند سے نکال دیا گیا تھا اور یہ سند ''ضعیف'' ہو گئی ہے (**مسند احمد**، ۱۰:۱۹۷)۔ یہاں سند میں محمد بن رجاء ابوسہل شامل ہیں جو معروف نہیں ہیں، اور عامر بن یساف شامل ہیں جو ''ضعیف'' ہیں۔ مزید دیکھیے: ایضاً، ۱۰:۱۹۴-۱۹۵

یہ مجاہد کی مراسیل میں سے ہے اور اس کی سند میں عبداللہ بن ابونجیح شامل ہے جو ''مدلّس'' ہے اور اس نے مجاہد سے ''عنعنہ'' کا ارتکاب کیا ہے (ایضاً، ۱۰:۱۹۵)۔ قتادہ کی ''مرسل'' روایت کا حوالہ ہے جو دو ''صحیح'' سندوں کے ساتھ ان تک جاتی ہے۔

۱۶- **صحیح بخاری**، کتاب **التفسیر**، ۵:۵۶؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۳۳۰

۱۷- طبری، **تفسیر**، ۱۰:۱۹۷، ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔

۱۸- ایضاً، ۱۰:۱۴۲، ایک ''صحیح مرسل'' سند کے ساتھ روایت ہے جو مجاہد تک جاتی ہے۔

۱۹- ابن حجر، **فتح الباری**، ۳:۲۱۴، ۸:۳۳۳۔ ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ

۲۰- واقدی، **مغازی**، ۳:۹۹۰۔ جن لوگوں نے اسے واقدی کے بعد ذکر کیا ہے، انہوں نے واقدی کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ اگر واقدی کسی چیز کے بیان کرنے میں تنہا ہوں تو اسے ثبوت کے طور پر نہیں لیا جا سکتا۔ صحابہ کرامؓ جس طرح اندرونِ مدینہ حرکت میں آ گئے تھے، اسی طرح بیرونِ مدینہ قبائل کو جمع کرنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی متبادل صورت نہیں تھی۔

۲۱- طبری، **تفسیر**، ۱۰:۱۳۳، اس کی سند کے راوی جن کا سلسلہ مجاہد تک جاتا ہے ''ثقہ'' ہیں، لیکن یہ روایت ''مرسل'' ہے اور اس میں عبداللہ بن ابونجیح مکی کا ''عنعنہ'' شامل ہے جو ''مدلّس'' ہے۔

۲۲- طبری، **تفسیر**، ۱۰:۲۷، ایک ''حسن''، لیکن ''مرسل'' سند کے ساتھ جو قتادہ تک جاتی ہے۔

۲۳- بخاری، **صحیح**، ۵:۱۱۷ اور دیگر ابواب؛ مسلم، **صحیح**، ۷:۱۲۰-۱۲۱

۲۴- طبرانی نے روایت کیا (**فتح الباری**، ۸:۱۱۹)۔ ابن اسحٰق نے اس روایت کو بغیر سند کے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے (**سیرة ابن هشام**، ۴:۱۶۳-۱۶۴)۔ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ دونوں نے اسے ذکر کیا ہے اور اس پر اضافہ کیا ہے (ابن کثیر، **البداية والنهاية**، ۵:۷-۸)۔ مسلم (**صحیح**، ۸:۱۰۷)، نیز احمد (**مسند**، ۶:۳۸۷-۳۸۸) نے اس روایت کے ایک حصے کے طور پر یہ اضافہ

کیا ہے: ''یہ ابوخیثمہؓ ہوں گے''۔

۲۵- حضرت علبہؓ بن زید کا واقعہ بہت سے مخارج کے ساتھ ایک کمزور سند سے روایت کیا گیا ہے۔ اس کا ایک ''صحیح'' شاہد ہے، لیکن اس کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا جس نے صدقہ دیا۔ مجموعی طور پر اسے ایک تاریخی ثبوت کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے: ابن حجر، **الاصابۃ**،۴: ۵۴۶-۵۴۸

۲۶- **صحیح بخاری**؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱۰-۱۱۱؛ احمد، **مسند**،۴: ۳۹۸، ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔

۲۷- طبری، **تفسیر**،۱۰: ۲۱۱۔ جن لوگوں کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے ان کے ناموں کے متعلق کوئی چیز بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی ہے۔ اس معاملے میں روایت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیت رونے والوں کی بابت نازل ہوئی ہے، یا عرباض بن ساریہ، یا عائذ بن عمرو، یا بنو مقرن کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۲۸- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۲۶

۲۹- **صحیح بخاری**؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱۴

۳۰- ''صحیح'' حدیث ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے؛ **فتح الباری**، ۸: ۱۱۳

۳۱- مسلم، **صحیح**، ۸: ۱۱۲

۳۲- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱۸

۳۳- واقدی، **مغازی**، ۳: ۹۹۶

۳۴- ایضاً، ۲: ۹۹۹۔ واقدی ''متروک'' ہیں۔ روایت کی سند کا جائزہ لینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیوں کہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذوخشب میں ظہر اور عصر کو جمع کیا تھا۔ یہ ایک قانونی مسئلہ ہے اور واقدی خاصے کمزور ہیں، اس لیے میں نے متن میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

۳۵- واقدی، **مغازی**، ۲: ۹۹۶؛ ابن سعد، **طبقات**، ۳: ۱۶۹

۳۶- ابن عساکر، **تاریخ دمشق**، ۱: ۴۱۶۔ ابن عساکر کی سند بھی واقدی تک جاتی ہے۔

۳۷- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱۴؛ طبری، **تفسیر**، ۱۱: ۵۸۔ زہری کی ''مرسل'' روایت ہے۔

۳۸- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱۹

۳۹- ایضاً، ۸: ۱۱۴

۴۰- ابن ہشام، **سیرۃ**،۴: ۱۷۲-۱۷۳۔ ابن اسحٰق نے زہری سے روایت لی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر یہ بیان نہیں کیا کہ انہوں نے یہ بات سنی ہے، لیکن انہوں نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں: ''زہری

نے ذکر کیا"۔ ابن اسحٰق نے غالبًا اسے زہری کی **مغازی** سے لیا ہے، اور اسے زہری کے حوالے سے معمر کے واسطے سے روایت کیا گیا تھا (**موارد الظمآن فی زوائد ابن حبّان**، ص ۴۱۸)۔ روایت "حسن لغیرہ" کے درجے تک قوی ہے۔

۴۱- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸:۱۱۴

۴۲- امام احمد (**مسند**، ۳:۳۸) اور ابو عبید (**الاموال**، ص ۲۵۵-۲۵۶) نے ایک مختصر خطبے کا متن روایت کیا ہے۔ ان کی سندوں میں ابو خطاب مصری شامل ہیں جو مجہول ہیں۔ حافظ ابن کثیر (**البدایة والنهایة**، ۵:۱۳-۱۴) نے ایک طویل خطبے کا متن روایت کیا ہے۔ ان کی سند میں عبدالعزیز بن عمران شامل ہیں جو "متروک" ہیں۔

۴۳- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۵:۱۷۔ ان کی سند میں ابو اسود کے واسطے سے ابن لہیعہ شامل ہیں۔ ابن لہیعہ یہاں کمزور ہیں۔ مزید براں یہ عروہ کی "مرسل" احادیث میں سے ایک ہے۔

۴۴- ابن حجر، **الاصابة**، ۱:۴۱۲-۴۱۵۔ ابن اسحٰق نے عاصم بن عمر بن انس کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ یہ روایت "حسن" ہوتی، اگر ابن اسحٰق کا "عنعنہ" نہ ہوتا جو "مدلّس" ہیں۔ سیوطی، **الخصائص الکبریٰ**، ۲:۱۱۲-۱۱۳۔ یہ بھی ابن اسحٰق سے ہے جو ان کے شیوخ عبداللہ بن ابی بکر اور یزید بن رومان سے مروی ہے۔ یہ "مرسل" ہے۔ ابن اسحٰق نے واضح طور پر سماع کا اعلان کیا ہے۔

۴۵- ابن ہشام، **سیرة**، ۴:۱۸۲

۴۶- ایضاً، ۴:۱۷۰، ایک "حسن" سند کے ساتھ روایت ہے۔

۴۷- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۵:۱۷۔ اس کی سند میں ابو اسود کے واسطے سے ابن لہیعہ شامل ہیں۔ یہاں ابن لہیعہ کمزور ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ عروہ کی "مرسل" احادیث میں سے ایک ہے۔

۴۸- **صحیح بخاری**، **کتاب الجزیة**، ۶:۷۷؛ مسلم، **صحیح**، **کتاب الفضائل**، ۷:۶۱

۴۹- احمد، **مسند**، ۱:۲۰۳، ۳:۴۴۲، ۴:۴۷، ۵:۲۹۲؛ ایک سند کے ساتھ جس میں سعید بن ابی راشد شامل ہیں۔ یہ "مقبول" ہیں اور واحد شخص ہیں جنھوں نے اسے روایت کیا ہے۔

۵۰- **موارد الظمآن الی زوائد ابن حبّان**، ص ۱۴۵۔ ایک "صحیح" سند کے ساتھ۔

۵۱- **صحیح بخاری**؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۴:۱۱۸-۱۱۹؛ مسلم، **صحیح**، ۸:۲۲۰-۲۲۱

۵۲- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۵:۱۱۔ ایک "حسن"، لیکن "مرسل" سند کے ساتھ جس کا سلسلہ عباس بن سہل بن سعد الساعدی تک جاتا ہے۔

۵۳- احمد، **مسند**، ۶: ۲۰۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ، **موارد الظمآن فی زوائد ابن حبّان**، ص ۴۱۸

۵۴- احمد، **مسند**، ۵: ۳۹۰۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ روایت ہے۔ بیہقی، **السنن الکبریٰ**، ۹: ۳۲-۳۳۔ دو سندوں کے ساتھ مروی ہے، ایک ابن اسحٰق سے بغیر سند کے اور دوسری عروہ بن زبیر سے۔ یہ بھی ''مرسل'' ہے، وہ سند جس کا سلسلہ عروہ تک جاتا ہے، اس میں ابن لہیعہ کی وجہ سے کچھ کمزوری آ گئی ہے۔

۵۵- احمد، **مسند**، ۵: ۳۹۰، ایک '' حسن'' سند کے ساتھ روایت ہے۔ بیہقی، **السنن الکبریٰ**، ۹: ۳۲-۳۳۔ دو سندوں کے ساتھ مروی ہے، ایک ابن اسحٰق سے بغیر سند کے اور دوسری عروہ بن زبیر سے۔ یہ بھی ''مرسل'' ہے، یہ سند اور دوسری جو عروہ بن زبیر سے ہے، وہ بھی ''مرسل'' ہے۔ وہ سند جو عروہ تک جاتی ہے، اس میں ابن لہیعہ کی وجہ سے کچھ کمزوری آ گئی ہے۔

۵۶- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۱۳-۱۱۶۔ بخاری کی ایک روایت ہے۔

۵۷- مسلم، **صحیح**، ۱: ۱۵۸-۱۵۹؛ **صحیح بخاری**، ۱: ۴۳-۴۴

۵۸- احمد، **مسند**، ۵: ۲۴۵-۲۴۶، ایک ''حسن'' سند کے ساتھ

۵۹- نسائی، **سنن**، ۲: ۶۲۔ ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ

۶۰- زرقانی، **شرح مؤطا امام مالک**، ۲: ۵۵-۵۸

۶۱- **موارد الظمآن فی زوائد ابن حبّان**، ص ۱۴۵۔ ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ

۶۲- ابن حجر، **فتح الباری**، ۳: ۴۳-۴۴

۶۳- ابوداؤد، **سنن**، **کتاب اللباس**، ۴: ۶۴۔ ایک ''حسن'' سند کے ساتھ روایت ہے۔

۶۴- اس سے جو بے شمار فوائد حاصل کیے گئے، اس کے لیے دیکھیے: ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۲۳-۱۲۴۔ انہوں نے تفصیلات دی ہیں۔

عام الوفود

ہجرت کے نویں سال کو عام الوفود کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیوں کہ ۸ ھ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ کی الجعرانہ سے واپسی کے ساتھ ہی عرب کے اطراف و جوانب سے مختلف قبائل کے وفود اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کرنے کے لیے اُمڈ اُمڈ کر مدینے آنا شروع ہو گئے تھے۔ دراصل ان لوگوں نے فتح مکہ تک اپنے قبولِ اسلام کو مؤخر کیے رکھا۔ جونہی مکہ فتح ہوا، عرب کے تمام قبائل جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ قدیم مآخذ میں **طبقات ابن سعد** واحد مأخذ ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کتاب میں ان وفود کے بارے میں معلومات کا جامع ترین ذخیرہ موجود ہے (۱)۔ بتایا جاتا ہے کہ ان وفود کی تعداد ۶۰ سے متجاوز تھی۔(۲)

عام طور پر ان وفود کے بارے میں جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ بغیر سند کے نقل کی گئی ہیں۔ ابن اسحٰق قدیم ترین مصنف ہیں جنہوں نے ان روایات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ وہ جا بجا ان مآخذ کا ذکر بھی کرتے ہیں جن سے انہوں نے معلومات جمع کیں اور ان کی سند بھی بیان کرتے ہیں۔(۳) یہ چند روایات زہری، عبداللہ بن ابی بکر اور حسن بصری کی ''مراسیل'' ہیں، سوائے ضمام بن ثعلبہ کی روایت کے، جو ایک وفد کے ساتھ آئے تھے۔ اس روایت کی جو سند وہ نقل کرتے ہیں، اس کا سلسلہ حضرت ابن عباسؓ تک جاتا ہے اور محمد بن ولید بن نویفی بھی اس سلسلے میں شامل ہیں جو قابلِ قبول تو ہیں، مگر قابلِ اتباع نہیں ہیں۔ اس سلسلۂ سند میں ان کی موجودگی سے یہ روایت کمزور ہو گئی ہے۔ ابن اسحٰق نے جن وفود کا ذکر کیا ہے وہ بنو تمیم، بنو عامر،

بنو سعد بن بکر، عبدالقیس، بنو حنیفہ، طے، بنو زبید، کندہ جو حمیر کے بادشاہ تھے، بنو حارث بن کعب، ہمدان، عدی بن حاتم، فروہ بن مسیک المرادی، صرد بن عبداللہ الازدی، فروہ بن عمرو الجذامی کے وفود تھے۔ پڑھنے والوں کو بہت سی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کا ابن اسحٰق نے ان وفود کی روایات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

ابن سعد نے ان وفود کے بارے میں تمام روایات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ایک ایک روایت کی اچھی طرح چھان پھٹک کی ہے، لیکن ان کی زیادہ تر روایات وہ ہیں جو واقدی اور ہشام الکلبی کے ذریعے سے آئی ہیں اور یہ دونوں اصحاب ''متروک'' ہیں۔ بقیہ روایات، سوائے چند ایک کے، علی بن محمد المدائنی کی روایت کردہ ہیں جو ''صدوق'' ہیں، تاہم وہ تمام سندیں جنہیں ابن سعد نے روایت کیا ہے، کسی نہ کسی اعتبار سے ناقص ہیں، کیوں کہ ان کے راوی کمزور ہیں، یا وہ ''مرسل'' ہیں۔ ان کی چند ایک روایات ایسی ہیں جو عفان بن مسلم اور عارم بن فضل السدوسی کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں۔

ان وفود کے بارے میں جو مفصل روایات ہمیں مؤرخین کے ہاں ملتی ہیں، اگرچہ محدثین کے خیال میں وہ ''صحیح'' نہیں ہیں، لیکن ان میں سے چند ایک وفود کے بارے میں روایات ''صحیح'' ہیں، کیوں کہ ان کے متعلق دیگر روایات بھی موجود ہیں۔ (۵) امام بخاری نے بنو تمیم کے ایک وفد کی آمد کا ذکر کیا ہے اور سورۃ الحجرات میں ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس وفد کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدتہذیبی کا برتاؤ کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بداخلاق اور اجڈ لوگ تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر بلند آواز سے آپؐ کو پکارنا شروع کر دیا، اور آپؐ سے اجازت لیے بغیر ہی باہر کھڑے ہو کر زور زور سے بولنے لگے۔ اس موقع پر سورۃ الحجرات نازل ہوئی۔ اس سورۃ میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرنے کے کچھ آداب ہیں اور آپؐ سے گفتگو کرنے کے لیے کن طور طریقوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

بخاری نے عبدالقیس اور بنو حنیفہ کے وفود کی آمد کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان وفود میں

مسیلمہ کذاب بھی شامل تھا، اس نے اپنے قبولِ اسلام کے لیے یہ شرط عائد کی کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد وہ آپ کا جانشین ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس نے مجھ سے کھجور کی شاخ کا ایک ٹکڑا بھی مانگا ہوتا تو میں اسے نہ دیتا۔ اس وقت آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ مسیلمہ کے ذریعے دنیا میں بہت ظلم اور فساد پھیلے گا۔ امام بخاری نے نجران کے ایک وفد کا تذکرہ کیا ہے جس میں نجران سے عاقب اور سیّد نام کے دو حاکم شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر آپؐ نے انہیں مباہلے کی دعوت دی:

> بے شک حالتِ عجیبہ عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالتِ عجیبہ آدم کے ہے کہ ان کو مٹی سے بنایا، پھر ان کو حکم دیا کہ ہو جا، بس وہ ہو گئے۔ یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے، سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جایے۔ پس جو شخص آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حجت کرے، آپ کے پاس علم آئے پیچھے تو آپ فرما دیجیے کہ آ جاؤ ہم بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو، اور تم خود بھی آ جاؤ، پھر ہم خوب دل سے دعا کریں اس طور سے کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو ناحق پر ہوں (آل عمران ۳:۵۹-۶۱)۔

پہلے تو انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی، مگر بعد میں انہیں یہ خوف پیدا ہوا کہ وہ کسی لعنت کا شکار نہ ہو جائیں، اس لیے وہ پیچھے ہٹ گئے اور مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اس شرط پر صلح کی درخواست کی کہ وہ جزیہ ادا کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو ان کے ہمراہ روانہ کیا، تاکہ ان سے جزیہ لے لیں۔ اہل نجران (۲) کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے اور ان سے جزیہ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بازنطینیوں کے ساتھ ان کا جو تعلق قائم تھا، وہ منقطع ہو گیا اور وہ لوگ اب اسلامی ریاست کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی پشت مضبوط ہو گئی اور وہ شام کے بازنطینیوں کے ساتھ عظیم الشان مقابلے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

امام بخاریؒ نے ان کے علاوہ جن وفود کا تذکرہ کیا ہے، ان میں اشعریوں اور یمنی قبائل، موسیٰ اور طے کے وفود اور عدی بن حاتم طائی کی آمد شامل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ بنوسعد بن بکر نے ضمام بن ثعلبہ کو مدینے روانہ کیا۔ وہ ایک قوی آدمی تھے، ان کے بال گنجان تھے جو دو چوٹیوں کی شکل میں گندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسجد کے دروازے پر اپنے اونٹ کو بٹھایا اور اسے باندھ دیا، پھر وہ مسجد میں داخل ہوئے اور حضورﷺ کے پاس پہنچے۔ آپؐ اپنے اصحابؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ انہوں نے جاتے ہی سوال کیا۔ ''تم میں سے عبدالمطلب کا بیٹا کون ہے''؟ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ''میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں''۔ ضمام بن ثعلبہ نے پوچھا: ''محمد!'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں''۔ ضمام نے کہا: ''محمدﷺ! میں تم سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں، لیکن تم ناراض نہ ہونا، کیوں کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں''۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ''تم جو پوچھنا چاہتے ہو، پوچھو''! ضمام نے کہا: ''میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا اس نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ان بتوں اور شریکوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباء واجداد کیا کرتے تھے''؟ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ''ہاں! مجھے اللہ نے حکم دیا ہے''۔

اسی طرح ضمام بن ثعلبہ نے ہر بار اللہ تعالیٰ کی قسم دلائی اور تمام فرائض کے بارے میں دریافت کیا۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکے تو انہوں نے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور آپؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں وہ تمام فرائض ادا کروں گا جن کا آپؐ نے حکم دیا اور ان تمام محرمات سے بچوں گا جن سے آپؐ نے منع کیا ہے، میں نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم''۔ پھر وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''اگر انہوں نے ایسا ہی کیا، جیسا کہا ہے تو یہ جنت میں داخل ہوں گے''۔

اس کے بعد ضمام اپنے قبیلے کی طرف واپس چلے گئے۔ تمام لوگ انہیں دیکھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے پوری قوم کے سامنے واشگاف الفاظ میں لات اور عزیٰ کو مسترد کر دیا۔ لوگوں نے خوفزدہ ہو کر کہا: ''اے ضمام! ڈرو اس وقت سے کہ تم کوڑھ یا جنون میں گرفتار ہو

جاؤ‘‘۔ضمام نے جواب دیا:’’تمہارا ناس ہو! یہ بت کسی کو نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے اور ایک کتاب تمہارے لیے نازل کی ہے تاکہ تمہیں جاہلیت کے اس اندھیرے سے نکالے جس میں تم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہو۔میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔میں ان سے مل کر تمہارے پاس آیا ہوں اور تمہارے لیے ان کی تعلیمات کا بیش بہا خزانہ لے کر آیا ہوں، انہوں نے تمہیں کچھ کام کرنے کا حکم فرمایا ہے اور کچھ کاموں سے روکا ہے‘‘۔خدا کی قسم! شام ہونے بھی نہ پائی تھی کہ وہاں موجود قبیلے کے تمام افراد نے جن میں مرد وزن دونوں شامل تھے، اسلام قبول کر لیا۔(۷)

اس میں کوئی شبہ نہیں، ۹ھ میں مختلف قبیلوں کی طرف سے قبول اسلام کے اعلان کے لیے وفود مدینے آئے، تاہم تفصیلی روایات کا متن اس امر کا متقاضی ہے کہ تاریخی اعتبار سے ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ان نظموں کا بھی نسبتاً سخت ناقدانہ جائزہ لینا چاہیے[جن کا ابن اسحٰق نے تذکرہ کیا ہے]، تاکہ معلوم ہو جائے کہ تاریخی حوالے سے وہ صحیح ہیں یا نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ۹ھ میں اسلام تمام جزیرہ نمائے عرب میں غالب آ چکا تھا اور انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پورا عرب اسلام کے جھنڈے تلے متحد ہو گیا، ورنہ اس سے قبل چھوٹی موٹی ریاستیں اور محدود سیاسی نظام ہی وجود میں آئے تھے۔ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں معین، سبا، حمیر، کندہ، الغساسنہ اور المناذرہ جیسی ریاستیں شامل تھیں۔ان میں سے کوئی ریاست بھی اس قابل نہیں تھی جو جزیرہ نمائے عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر سکتی۔دراصل اسلام سے قبل ان ریاستوں میں تہذیب وتمدن بالکل مفقود ہو کر بدویانہ اثرات غالب آ چکے تھے، جب کہ رسول اللہ ﷺ دس برس کی قلیل مدت میں ہی عرب کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے، اس کے باوجود کہ قبائلی عصبیت اور جاہلی اثرات لوگوں کے اندر جڑ پکڑے ہوئے تھے۔یہ اتحاد کوئی سطحی، یا عارضی قسم کا نہیں تھا، بلکہ لوگوں کے دل، دماغ، سوچ اور رویوں میں پوری طرح گھر کر چکا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ملک عرب اسلامی ریاست کی ترقی اور نشوونما کے لیے ایک ٹھوس اور مضبوط

بنیاد ثابت ہوا۔ وہی اسلامی ریاست جس کا اقتدار اور شکوہ مستقبل میں ایشیا، افریقہ اور یورپ کے علاقوں پر بھی قائم ہونا تھا۔

حواشی

۱- حافظ ابن حجر نے اس کا حوالہ دیا ہے، لیکن انہوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ ابن سعد نے ہوازن کے وفد کا تذکرہ کرنے سے اعراض کیا ہے۔

۲- ابن ہشام، **سیرۃ**،۴: ۲۲۱-۲۲۲؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۸۳

۳- ابن ہشام، **سیرۃ**،۴: ۲۳۵، ۲۴۱، ۲۵۴، ۲۶۰

۴- **الطبقات الکبریٰ**، ۱: ۲۹۱-۳۵۹

۵- ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، ۵: ۴۰

۶- ابوداؤد، **سنن**، ۳: ۱۶۷؛ ابن سعد، **طبقات**، ۱: ۷

۷- ابوداؤد، **سنن**، ۱: ۷۹؛ حاکم، **مستدرک**، ۳: ۵۴-۵۵؛ احمد، **مسند**۔ ابن عباسؓ کی حدیث ہے۔ حاکم نے اسے ''صحیح'' سمجھا اور ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے، لیکن یہ صرف ''حسن'' ہے، کیوں کہ یہ ابن اسحٰق کے توسط سے آئی ہے اور اس میں محمد بن ولید بن نویفع اسدی شامل ہیں جو ''مقبول'' ہیں۔ ابوداؤد کی روایت میں اس کا ایک متابعہ ہے جو سلمہ بن کہیل سے مروی ہے، اور یہ ''ثقہ'' ہیں۔ ہر دو ائمۂ کرام، یعنی بخاری اور مسلم نے مختصر طور پر ضمام کی مدینے میں آمد کا ذکر کیا ہے۔ مسلم، **صحیح**، ۱: ۳۲؛ بخاری، **صحیح**، ۱: ۲۲

۱۹

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں حج کی ادائیگی

رسول اللہ ﷺ نے اس سال حج ادا نہیں فرمایا جس سال مکہ فتح ہوا، بلکہ آپؐ عمرہ ادا کر کے مدینے واپس تشریف لے گئے۔ ۸ھ میں مشرکوں اور مسلمانوں نے مل کر حج ادا کیا اور ۹ھ میں آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حج کی ادائیگی کے لیے روانہ فرمایا۔ وہ ذوالحجہ میں مکے روانہ ہوئے (۱)، ان کے ہمراہ حج ادا کرنے والوں کی تعداد کا تذکرہ ہمیں صرف واقدی کے ہاں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حج کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تین سو صحابہؓ تھے جو اپنے ساتھ قربانی کے بیس جانور لے کر گئے تھے۔ (۲)

جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ عازمینِ حج کو لے کر مدینے سے نکلے تو سورۃ التوبہ نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سورۃ کی ابتدائی آیات حضرت علیؓ کو دے کر فوراً مکے روانہ فرمادیا، تاکہ حج کے دن مجمع عام میں پڑھ کر سنا دی جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سورۃ کے ابلاغ کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص کو نہیں دی جا سکتی، سوائے میرے گھر کے ایک فرد کے''۔ (۳) جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت علیؓ کو آتے ہوئے دیکھا تو ان سے دریافت فرمایا کہ آیا وہ احکام جاری کرنے آئے ہیں یا احکام پہنچانے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا: ''میں احکام پہنچانے آیا ہوں''، پھر یہ دونوں اصحاب باہم مل کر اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ (۴) حضرت ابوبکرؓ نے امیرِ حج کے فرائض انجام دیے اور حضرت علیؓ نے سورۃ التوبہ کا پہلا حصہ لوگوں تک پہنچایا۔ اس کارِ عظیم میں متعدد صحابہؓ نے حضرت علیؓ کی مدد فرمائی جن میں حضرت ابوہریرہؓ بھی شامل ہیں۔ (۵)

کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب کو چار احکام دے کر روانہ کیا گیا تھا: ''کوئی کافر جنت میں داخل نہیں ہوگا، کوئی شخص برہنہ ہو کر خانۂ کعبہ کے گرد طواف نہیں کرے گا، اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، اور جس نے بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے، وہ اس وقت تک باقی رہے گا، جب تک معاہدے کی مقررہ مدت پوری نہیں ہو جاتی''۔(٦)

سورۃ التوبہ کے ابتدائی حصے کے ذریعے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان خطِ امتیاز قائم کر دیا گیا۔ ان آیات کے ذریعے مشرکوں کو ہمیشہ کے لیے حج کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ذریعے ان لوگوں کو جن کے مسلمانوں کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم تھے، اس وقت تک مہلت مل گئی جب تک ان کے اتحاد کی مقررہ میعاد ختم نہیں ہو جاتی اور جن لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ عہد تھا، انہیں غیر معینہ وقت مل گیا، یا چار ماہ تک کے لیے ان کی مدت مخصوص ہو گئی جو محرم سے شروع ہوتی تھی۔ ان مشرکوں کو جن کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی عہد نہیں تھا، حرام مہینوں کے اختتام تک کا وقت دیا گیا جو ۵۰ دن کا عرصہ تھا اور محرم کے آغاز پر ختم ہوتا تھا۔ [اس اعلان کی رُو سے] جب یہ مقررہ مدت ختم ہو جائے گی تو وہ مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں سمجھے جائیں گے: (٧)

> اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے دست برداری ہے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا، سو تم اس سرزمین پر چار مہینے چل پھر لو اور یہ جان رکھو کہ تم خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کریں گے اور اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین سے، پھر اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے بہتر ہے (التوبة ٩:١-٣)۔

اسلام کی دعوت و تبلیغ کو اب ۲۲ سال پورے ہو چکے تھے۔ اس دوران میں مسلمانوں نے اسلام کے آفاقی پیغام کو دنیا میں پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جدوجہد کی اور ہر جائز طریقہ استعمال کیا، تاہم اب تک کچھ مشرک ایسے باقی تھے جو اس پر مسلسل

مصر اور بضد تھے کہ وہ بت پرستی جاری رکھیں گے اور خانۂ کعبہ کا طواف بھی جاہلی رسم ورواج کے مطابق کریں گے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ دعوتِ حق کے بارے میں ان کی جہالت اور ہٹ دھرمی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔

معاملے کو یہاں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ اسلامی شعور کو بیدار کرنے اور دور دراز علاقوں کو اسلامی مملکت کے تحت متحد کرنے کی مہم کا بھی آغاز کر دیا گیا۔ حجۃ الوداع سے قبل، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن روانہ فرمایا تاکہ وہ دونوں مل کر ایک صوبے کا انتظام سنبھال لیں۔ آپؐ نے ان دونوں اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا اور ان کے لیے مشکلات نہ پیدا کرنا! لوگوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا سلوک کرنا اور ان پر سختی نہ کرنا! لوگوں کو خوشخبری دینا! متنفر نہ کرنا!'' (۸)

آپؐ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا: ''تم اہل کتاب کے پاس جاؤ گے، جب تم ان سے ملو تو سب سے پہلے انہیں اس چیز کی طرف دعوت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی عبادت کے لائق نہیں ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ اگر وہ اس معاملے میں تمہاری اطاعت کریں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں پانچ مرتبہ ان کے اوپر نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس معاملے میں تمہاری اطاعت کریں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو مال کی ایک مقررہ مقدار ہے جو ان کے امراء سے لے کر ان کے غرباء کے درمیان تقسیم کر دی جائے گی، اور اگر وہ اس میں تمہاری اطاعت کریں تو پھر محتاط رہو اور ان کے بہترین مال (زکوٰۃ کے طور پر) مت لو اور مظلوم کی بد دعا سے ڈرو، کیوں کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا''۔ (۹)

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت خالدؓ بن ولید کو یمن بھیجا، اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو ان کی جگہ روانہ فرمایا۔ حضرت علیؓ نے کچھ عرصے وہاں قیام فرمایا، بعد ازاں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شرکت فرماتے ہوئے واپس آ گئے۔ حضرت علیؓ کو ہمدان کے قبائل میں اسلام کی نشر واشاعت میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ (۱۰)

حواشی

۱- یہ ابن سعد کا بیان ہے، جو صحیح روایت پر مبنی ہے اور اس روایت کا سلسلہ مجاہد سے جا کر ملتا ہے (**الطبقات الکبری**،۲:۱۶۸)۔ابن اسحٰق،**سیرۃ ابن ھشام**،۴:۲۰۱

۲- ابن حجر،**فتح الباری**،۸:۸۲

۳- ابن اسحٰق نے ''حسن'' سند کے ساتھ بیان کیا ہے،لیکن یہ محمد بن علی باقر کی ''مرسل'' روایات سے ہے(**سیرۃ ابن ھشام**،۴:۲۰۳؛طبری، **تفسیر**،۱۰:۶۵)۔اس کے شواہد موجود ہیں اور انہی کی وجہ سے اسے تقویت حاصل ہوئی ہے۔ابن کثیر،**البدایۃ والنھایۃ**،۵:۳۷-۳۸

۴- ایضاً

۵- احمد،**مسند**،حدیث ۵۹۴،''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔ترمذی، **سنن**،۴:۱۱۶۔انہوں نے اسے ''صحیح'' سمجھا ہے۔طبری، **تفسیر**،۱۰:۶۳-۶۴

۶- ابن کثیر، **البدایۃ والنھایۃ**،۵: ۳۸۔احمد بن حنبل کی **مسند** سے منقول ہے۔انہوں نے کہا ہے:''اس کی سند جید ہے''۔

۷- طبری،۱۰:۶۶،۷۴۔اس روایت کے بارے میں طبری کا خیال ہے کہ زیادہ معقول ہے۔ابن کثیر کی رائے یہ ہے کہ ''صحیح'' کچھ اس طرح ہے:''جو کوئی مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرے گا،اس کی مہلت اس وقت تک باقی رہے گی،جب تک اس معاہدے کی مدت ختم نہ ہو جائے،اگر چہ وہ چار ماہ سے تجاوز کر جائے۔اور جس کسی نے مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کیا،اس کی مہلت چار ماہ باقی رہے گی۔تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے معاہدے چار ماہ سے قبل ہی اپنی مدت پوری کر لیں گے۔اس گروہ کو غالباً پہلے گروہ کے ساتھ رکھا گیا ہوگا،تاکہ ان کی مہلت اس وقت تک چلے،جب تک ان کے معاہدے تکمیل کو نہیں پہنچ جاتے،خواہ یہ چار ماہ سے کم عرصے کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان کی مہلت کی مدت چار ماہ تک بڑھا دی گئی ہو،کیوں کہ بہرحال انہیں ان لوگوں پر ترجیح حاصل ہے جنہوں نے سرے سے کوئی معاہدہ ہی نہیں کیا،اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے''۔

۸- بخاری نے روایت کیا؛ابن کثیر، **البدایۃ والنھایۃ**،۵:۹۹

۹- ایضاً

۱۰- بخاری نے روایت کیا؛ابن کثیر، **البدایۃ والنھایۃ**،۵:۱۰۴

حجۃ الوداع

حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے اور مختلف روایات کے مطابق ہجرت کے چھٹے، نویں یا دسویں سال فرض کیا گیا۔(۱) ۱۰ھ میں رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ آپ ؐ حج کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ مکے سے مدینے ہجرت کے بعد یہ آپ ؐ کا پہلا اور آخری حج تھا۔ یہ اعلانِ عام سن کر تمام جزیرہ نمائے عرب سے مسلمان آپ ؐ کے ہمراہ حج کرنے کے ارادے سے جمع ہونے لگے۔ ابھی ذوالقعدہ کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ روز باقی تھے کہ آپ ؐ مدینے سے روانہ ہوئے۔(۲) جب آپ ؐ نے میدانِ عرفات میں قیام فرمایا تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا(۳)(المائدۃ ۵:۳)۔

اس موقع پر مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے تمام مناسکِ حج سیکھے۔ آپ ؐ نے فرمایا تھا کہ ''مجھ سے تمام مناسکِ حج سیکھ لو''۔ آپ ؐ کا حج مکمل طور پر شریعت کے تمام احکام کا نمونہ تھا بالخصوص احکامِ حج کا، اس کے علاوہ تمام چیدہ چیدہ دینی احکام کا اعلان آپ ؐ نے اپنے خطبۂ عرفات میں فرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے حجۃ الوداع کا نہایت گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور اس سے احکام کا استنباط کیا ہے ۔ یہ تمام احکام مناسکِ حج اور دیگر اہم امور کے متعلق ہیں جن کی تشریح اور توضیح سے حدیث اور فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں ۔بعض اہلِ علم نے صرف حجۃ الوداع کے موضوع پر ہی کتابیں مرتب کی ہیں ۔

اس موقع پر مسلمانوں کا ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ تمام لوگوں نے حضور ﷺ کا الوداعی خطبہ سنا۔ آپؐ نے یہ خطبہ عرفات کے میدان میں ایام تشریق کے دوران میں دیا (ایام تشریق سے مراد ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ کی تاریخیں ہیں)۔

یقیناً تمہارا خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے آج کا دن، یہ مہینہ اور یہ جگہ محترم اور مقدس ہے۔ یادرکھو! آج سے جاہلیت کے تمام رسم ورواج ختم کر دیے گئے اور یہ سب میرے ان قدموں کے نیچے ہیں۔ جاہلیت کے تمام خون معاف کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ اسلام سے پہلے کے تمام سود معاف کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو، یقیناً خدا نے انہیں تمہارے قبضے میں دیا ہے اور خدا ہی کے حکم سے تمہارے لیے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنا جائز قرار دیا گیا ہے۔ ان کے اوپر تمہارے بھی کچھ حقوق ہیں، اور وہ یہ کہ وہ کسی ایسے شخص کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں ہلکی سزا دے سکتے ہو اور ان کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ تم انہیں مناسب کھانا اور کپڑا مہیا کرو۔ میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا تو کیا جواب دو گے؟

حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا: ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا اور نبوت کا حق ادا کر دیا''۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے تین مرتبہ فرمایا: ''اے اللہ! تو گواہ رہنا، اے اللہ! تو گواہ رہنا، اے اللہ! تو گواہ رہنا''۔ (۴)

اس کے بعد آپ ﷺ نے منیٰ میں ایک اور خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپؐ نے

فرمایا: ''ایسا نہ کرنا کہ میرے بعد کفر میں گرفتار ہو جاؤ اور ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو''۔(۵)

حجۃ الوداع سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے جحفہ کے نزدیک غدیر خم کے مقام پر لوگوں سے خطاب فرمایا۔اس روز ذوالحجہ کی ۱۸ تاریخ تھی۔آپؐ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: ''علیؓ اس کا دوست ہے جو مجھے دوست رکھے''۔ حضرت علیؓ یمن سے آکر آخری حج میں شریک ہوئے تھے۔(۶) چند مجاہدین نے آپؐ سے حضرت علیؓ کی شکایت کی تھی اور کہا تھا کہ حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ سخت معاملہ فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ کے نائب نے چند کپڑے ان کے درمیان تقسیم کیے تھے،لیکن حضرت علیؓ نے وہ سب کپڑے واپس لے لیے۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے غدیر خم کے مقام پر لوگوں کے سامنے حضرت علیؓ کا بلند و بالا مرتبہ واضح کیا اور ان کے اوصافِ حمیدہ کی طرف توجہ دلائی۔یہ سن کر لوگوں نے حضرت علیؓ کے خلاف شکایات کا سلسلہ بند کر دیا۔(۷)

حواشی

۱- ابن کثیر، **البدایة و النهایة**،۵:۱۰۹

۲- ابن حجر، فتح الباری،۸:۱۰۴۔ابن اسحٰق،ایک ''حسن'' سند کے ساتھ روایت ہے۔(**سیرة ابن هشام**،۴: ۲۷۲)۔ابن کثیر، **البدایة و النهایة**،۵:۱۱۱۔یہ روایت ابن اسحٰق کی روایت جیسی ہے۔ابن کثیر کے نزدیک ''اس کی سند جید ہے''۔

۳- **صحیح بخاری؛ فتح الباری**،۸:۱۰۸

۴- **صحیح مسلم**،۴:۳۸-۴۳۔جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔شیخ محمد ناصر الدین البانی نے اس پر کچھ مختصر اضافے کیے ہیں۔یہ اضافے حدیث کی دیگر کتب سے لیے گئے ہیں،جنھوں نے جابر کی حدیث کو کچھ ''صحیح'' اضافوں کے ساتھ روایت کیا ہے (**حجة النبی**،ص۷۱-۷۳، نیز دیکھیے: **حجة النبی**، ۳۸-۴۱) خطبے کے ایک حصے کے لیے دیکھیے: **صحیح بخاری؛ فتح الباری**،۸:۱۰۸۔ابن اسحٰق نے الوداعی خطبے کے طویل متن کو سند کے بغیر ذکر کیا ہے۔امام احمد نے حجۃ الوداع کے خطبے کا

طویل متن نقل کیا ہے جو ایامِ تشریق کے وسط میں دیا گیا تھا۔ اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان شامل ہیں جن کے بارے میں حافظ ابن حجر نے تقریب میں کہا ہے کہ وہ کمزور ہیں۔ البنّا نے کہا: ''البزار نے اسی مفہوم کی اس سے ملتی جلتی ایک روایت ابن عمر سے ایک مختلف سند کے ساتھ روایت کی ہے''۔ ائمۂ حدیث نے اس کے مختلف حصوں کو اپنی کتب کے مختلف ابواب میں صحیح سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور اللہ بہتر جاننے والا ہے (**الفتح الربانی**، ۹:۲۷۹-۲۸۱)۔

۵- **صحیح بخاری: فتح الباری**، ۸:۱۰۷؛ **مسلم، صحیح**، ۱:۸۲

۶- ابن کثیر، **البدایة والنهایة**، ۵:۲۰۹۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ احادیث کی سند 'جید قوی' ہے اور انہوں نے اسے دوسری سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے، جن میں سے ایک کو ذہبی نے ''صحیح'' سمجھا ہے۔ انہوں نے اس پر رسول اللہ ﷺ کے اس قول کا اضافہ کیا ہے: ''اے اللہ! جو علیؓ سے دوستی رکھے، تو اس کے ساتھ دوستی رکھ اور جو علیؓ کا دشمن ہو تو اس کا دشمن ہو جا''۔ اس کی سند کے متعلق انہوں نے کہا: ''یہ ایک 'جید' سند ہے اور سنن کی شرائط کے مطابق اس کے افراد 'ثقہ' ہیں''۔ ترمذی نے دوسری حدیث کو اسی سند کے ساتھ ''صحیح'' قرار دیا ہے۔

۷- **ایضاً**، ۵:۱۰۶

۲۱

لشکرِ اسامہؓ کی تیاری

حجتہ الوداع کی ادائیگی کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینے واپس تشریف لے آئے۔ ذوالحجہ کے باقی ماندہ ایام، نیز محرم اور صفر کے مہینے گزرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے شام روانگی کے لیے لشکر کی تیاری کا آغاز فرمایا۔ آپؐ نے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ بن حارثہ کو اس لشکر کا امیر مقرر فرمایا اور انہیں یہ حکم دیا کہ بلقاء اور فلسطین کی طرف پیش قدمی کریں۔ لوگوں نے زور شور سے جہاد کی تیاری کرنا شروع کر دی۔ ان لوگوں میں مہاجرین اور انصار بھی شامل تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسی جلیل القدر ہستیاں بھی پا بہ رکاب تھیں۔ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کی عمر مبارک اس وقت صرف اٹھارہ سال تھی اور انہیں امیرِ لشکر مقرر کیا گیا تھا۔ اس پر چند لوگوں نے اعتراض کیا کہ اتنے بلند مرتبہ مہاجرین اور انصار کی موجودگی میں ایک ایسے نوعمر لڑکے کو امیر مقرر کیا گیا ہے جو ایک آزاد کردہ غلام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اسامہؓ کے تقرر پر لوگوں کی تنقید کی کوئی پروا نہ کی اور فوج کو حکم دیا کہ اپنے امیر کی مکمل اطاعت کرے۔(۱) فوج کی روانگی میں تاخیر کیوں ہوئی؟ اس کا سبب یہ تھا کہ لشکر کو تیاری شروع کیے دو ہی روز گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مبارک ناساز ہو گئی۔ حضرت اسامہؓ نے وہ علم سنبھالا جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے باندھا تھا اور جرف میں خیمہ زن ہوئے۔(۲) لشکرِ اسامہؓ کے حجم کا ذکر صرف واقدی کے ہاں ملتا ہے جن کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی تعداد تین ہزار تھی۔(۳)

حواشی

۱- دیکھیے: احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی، **الفتح الربانی**،۲: ۲۲۱-۲۲۳

۲- **صحیح بخاری**،۴: ۳۲۸؛ ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۵۲

۳- ابن حجر، **فتح الباری**، ۸: ۱۵۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

حجۃ الوداع سے تقریباً تین ماہ بعد رسول اللہ ﷺ کی طبیعت مبارک ناساز ہوگئی۔(۱) آپؐ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے گھر قیام پذیر تھے۔(۲) آپؐ دس روز علیل رہے(۳) اور ۱۲ ربیع الاول کو پیر کے روز آپؐ کا انتقال ہوا۔(۴) اس وقت آپؐ کی عمر شریف تریسٹھ سال تھی۔(۵) یہ ایک ''صحیح'' روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ناسازی طبع کا آغاز دراصل ۷ھ میں ہو چکا تھا، جب آپؐ فتح خیبر سے واپس تشریف لائے۔ خیبر میں ایک یہودی سلام بن مشکم کی بیوی نے آپؐ کو دھوکے سے زہر آلود گوشت کا ایک ٹکڑا کھلانے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ آپؐ نے اسے زبان پر رکھتے ہی تھوک دیا تھا اور نگلنے کی نوبت نہیں آئی تھی، لیکن اس کے باوجود زہر نے کچھ نہ کچھ اثر کر دکھایا تھا۔(۶) علالت کے دوران میں آپؐ نے اپنی بیویوں سے یہ اجازت لے لی تھی کہ آپؐ کا مستقل قیام ام المومنین حضرت عائشہؓ کے گھر میں رہے اور وہیں آپؐ کی تیمارداری ہو۔(۷) حضرت عائشہؓ قرآن حکیم کی آخری دو سورتیں (معوذتین) پڑھ کر رسول اللہ ﷺ پر دم کرتی تھیں۔(۸)

جب آپؐ کی بیماری بڑھتی گئی اور وفات کا وقت قریب آنے لگا تو آپؐ نے ایک روز صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے''! یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے آپس میں اختلاف کیا، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ آپؐ کے حکم کی فوری طور پر تعمیل کریں اور قلم کاغذ لے کر حاضر ہو جائیں، لیکن دوسرے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے لیے تکلیف اور بے آرامی کا باعث ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری رائے ہی زیادہ

صائب تھی اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان کسی اشد ضرورت اور غیر معمولی احتیاج کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ یہ محض ایک تجویز تھی جس کے جواب میں حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا: ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے''۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ اس بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ آپؐ نے جو کچھ حکم دیا تھا، اگر وہ اتنا ہی ضروری ہوتا تو آپؐ یہ بات دوبارہ ارشاد فرماتے، کیوں کہ اسی علالت کے دوران میں آپؐ نے یہ احکام بھی ارشاد فرمائے تھے کہ مشرکوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دینا اور وفود کے ساتھ عزت اور احترام سے پیش آنا۔ (۹)

آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو بلوایا اور ان سے کوئی راز کی بات کہی جسے سن کر وہ رونے لگیں۔ اس کے بعد آپؐ نے دوبارہ ان سے سرگوشی میں کچھ فرمایا جسے سن کر وہ ہنس پڑیں۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت فاطمہؓ نے بتایا کہ پہلی مرتبہ آپؐ نے اپنی وفات کی خبر دی تھی جس پر وہ رو پڑیں۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ اطلاع دی کہ حضرت فاطمہؓ خاندان کی سب سے پہلی فرد ہوں گی جو رسول اللہ ﷺ سے آملیں گی۔ یہ سن کر حضرت فاطمہؓ مسکرانے لگیں، (۱۰) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ بھی نبوت کی ایک علامت تھی۔

جب آپؐ کی علالت شدت اختیار کر گئی تو آپؐ نماز کی امامت کے لیے گھر سے باہر نہ جا سکے، آپؐ نے حکم دیا کہ حضرت ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہؓ نے جب یہ فرمان سنا تو انہیں یہ خوف پیدا ہوا کہ لوگ جب ان کے والد کو رسول اللہ ﷺ کی جگہ پر کھڑا ہوا دیکھیں گے تو اسے اچھا شگون نہیں سمجھیں گے، اس لیے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ''ابوبکرؓ ایک رقیق القلب آدمی ہیں، ان کی آواز بھی پست ہے اور جب قرآن پڑھتے ہیں تو بہت روتے ہیں''، (۱۱) لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات پر ہی اصرار فرمایا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ باہر گئے اور امامت کے فرائض ادا کیے۔ (۱۲) اس کے بعد ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے۔ آپؐ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ آپؐ نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے۔ اس موقع پر آپؐ نے اشارتاً یہ بھی ذکر فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپؐ

کو دنیا اور آخرت میں اختیار عطا فرمایا تھا اور آپؐ نے اپنے لیے آخرت ہی کو پسند فرمایا ہے۔(۱۳)

آپؐ کا آخری خطبہ وہ تھا جو آپؐ نے وفات سے پانچ روز قبل دیا تھا۔ اس خطبے میں آپؐ نے فرمایا: ''خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو دنیا اور اس کی رونقیں دکھائی ہیں، لیکن اس نے اپنے لیے آخرت کو پسند کیا ہے''۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب یہ بات سنی تو سمجھ گئے کہ وہ بندے خود رسول اللہ ﷺ ہیں، یہ سوچ کر آپ رونے لگے۔ لوگوں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا، کیوں کہ لوگ اس جملے کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے تھے۔(۱۴)

جس روز رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا، اس روز فجر کی نماز کے وقت آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کا پردہ تھوڑا سا سرکایا اور مسلمانوں پر نظر ڈالی جو صفیں باندھے نماز ادا کرنے میں مشغول تھے۔ یہ دیکھ کر آپؐ کے چہرۂ مبارک پر ایک بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی اور یوں لگتا تھا، جیسے آپؐ انہیں آخری بار الوداع کہہ رہے ہیں۔ آپؐ کو جھانکتے دیکھ کر مسلمان خوشی سے بے قابو ہو گئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مصلّے سے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ یہ سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھانے کی خاطر باہر تشریف لا رہے ہیں، لیکن آپ نے ہاتھ سے انہیں یہ اشارہ کیا کہ وہ امامت جاری رکھیں اور نماز مکمل کر لیں۔ اس کے بعد آپؐ نے پردہ برابر کر دیا اور اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔

حضرت فاطمہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور تأسف بھرے لہجے میں کہنے لگیں: ''ہائے! میرے باپ کی تکلیفیں''۔ آپؐ نے اس پر ان سے ارشاد فرمایا: ''آج کے بعد تمہارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی''۔(۱۵) اسی دوران میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کمرے میں داخل ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے خاموشی کے ساتھ اشارے سے ان کے لیے دعا کی، کیوں کہ اس وقت آپؐ تکلیف کی شدت سے بول نہیں سکتے تھے۔(۱۶)

جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپؐ کا جھکاؤ حضرت عائشہؓ کے سینے پر تھا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰنؓ سے ایک مسواک لی، اس کے آخری سرے کو چبا کر نرم

کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس مسواک کی مدد سے اپنے دانت صاف کیے۔(۱۷)

آپؐ کے پاس پانی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا۔ آپؐ اپنا دستِ مبارک پانی میں بھگو کر بار بار اس سے اپنا چہرہ صاف کرتے جا رہے تھے اور زبانِ مبارک پر **لا اله الا الله** کے الفاظ جاری تھے۔(۱۸) آہستہ آہستہ آپؐ کی آواز بند ہونے لگی۔ اس وقت آپؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: **فاولئک مع الذین انعم الله علیهم** (وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ النساء۴:۶۹)۔(۱۹) اس کے ساتھ ساتھ لوگوں نے یہ الفاظ بھی سنے: ''نہیں، بلکہ وہ رفیق اعلیٰ ہی بہتر ہے''۔ یہ سن کر حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں کہ آپؐ کو اختیار دیا گیا اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی رفاقت کو ہی پسند فرمایا۔(۲۰)

اللہ تعالیٰ آپؐ کی ذات مطہرہ پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل فرمائے! جس وقت آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو سہ پہر کا وقت تھا، البتہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دوپہر کا وقت تھا۔ آپؐ کا سر مبارک اس وقت حضرت عائشہؓ کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اس موقع پر وہاں موجود تھے۔ وہ خبر ملتے ہی تیزی سے آئے، کمرے میں داخل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر پڑا ہوا کپڑا اٹھایا۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے اوپر جھکے اور آپ ﷺ کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اس کے بعد کمرے سے باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کے پاس پہنچے۔ لوگ اس وقت دو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے، کچھ لوگ وہ تھے جنہوں نے اس خبر پر یقین کر لیا تھا اور کچھ لوگ وہ تھے جو اس خبر کو درست ماننے کو تیار نہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی نظر حضرت عمر فاروقؓ پر پڑی جو لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ یہ غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے۔ لوگوں نے جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا تو ان کے گرد جمع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

بلا شبہ جو شخص محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا، وہ جان لے کہ محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں، اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فرمان ہے: ''اور محمد ﷺ نرے رسول ہی تو ہیں آپؐ سے پہلے اور

بھی بہت رسول گزر چکے ہیں، سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جائے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا، اور خدا تعالیٰ جلد ہی عوض دے گا، حق شناس لوگوں کو (آل عمران ۳:۱۴۴)۔

اس کے بعد لوگوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ حضرت عمرؓ بے خود ہو کر زمین پر گر پڑے، ان کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ کھڑے ہو سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی یہ آیت نہ سنی تھی۔ (۲۱) حضرت فاطمہؓ نے سن کر کہا:

اے میرے والد! آپ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا۔

اے میرے والد! آپ کا ٹھکانا جنت ہے۔

اے میرے والد! ہم آپ کی موت کی خبر جبریل کو دیتے ہیں۔ (۲۲)

اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرمائے اپنے نبی ﷺ پر! آپؐ کے اہل خانہ پر اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر! تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

حواشی

۱۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے ۸۱ دن بعد وفات پا گئے (البدایۃ والنہایۃ، ۵:۱۰۱)۔

۲۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ روایت متفق علیہ ہے، دیگر متنازعہ روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی علالت کا آغاز اس وقت ہوا جب آپؐ ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ، یا ریحانہؓ کے مکان پر مقیم تھے۔ فتح الباری، ۸:۱۲۹

۳۔ سلیمان تیمی نے زور دے کر یہ بات کہی ہے۔ بیہقی نے اسے ایک ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ۱۳ دن تھے۔ ابن حجر، فتح الباری، ۸:۱۲۹

۴۔ حافظ ابن حجر نے ابو مخنف کی رائے اختیار کی ہے کہ آپؐ کی وفات ۲ ربیع الاول کو ہوئی اور لوگوں نے غلطی سے ۲ کے ساتھ ۱۰ کا ہندسہ بڑھا دیا ہے۔ ابن حجر، فتح الباری، ۸:۱۳۰

۵- صحیح بخاری؛ ابن حجر، فتح الباری، ۱۵۰:۸

۶- ایضاً، ۱۳۱:۸

۷- ایضاً، ۲۷:۸؛ احمد، مسند (الفتح الربانی، ۲۲۶:۲۱) ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔

۸- صحیح بخاری ؛ ابن حجر، فتح الباری، ۱۳۱:۸

۹- ایضاً، ۱۳۲:۸

۱۰- ایضاً، ۱۳۵:۸

۱۱- ابن ہشام، سیرۃ، ۳۳۰:۴؛ ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲۳۳:۵

۱۲- ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲۳۲:۵-۲۳۳

۱۳- صحیح بخاری؛ ابن حجر، فتح الباری، ۲۷:۸، مزید دیکھیے: احمد، المسند (الفتح الربانی ۲۳۱:۲۱)؛ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲۹۹:۵-۲۳۰

۱۴- احمد، مسند (الفتح الربانی، ۲۲۲:۲۱، حاشیہ۳)؛ ترکۃ النبی ، بخاری، مسلم، احمد اور بیہقی نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا، جس کے افراد ''ثقہ'' ہیں، لیکن روایت ''مرسل'' ہے۔

۱۵- صحیح بخاری: ابن حجر، فتح الباری ، ۱۳۹:۸

۱۶- ابن ہشام، سیرۃ، ۳۲۹:۴؛ ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔

۱۷- بخاری، صحیح ؛ فتح الباری، ۱۳۸:۸

۱۸- ایضاً، ۱۴۴:۸

۱۹- ایضاً، ۱۳۶:۸

۲۰- ایضاً، ابن ہشام، سیرۃ، ۳۲۹:۴۔ ''صحیح'' سند کے ساتھ روایت ہے۔

۲۱- صحیح بخاری؛ فتح الباری، ۱۴۵:۸

۲۲- ایضاً، ۱۳۹:۸

اشاریہ

ب

﴿غ﴾

﴿ ن ﴾

ہ

اس کتاب کے بارے میں

مدنی معاشرہ (عہد رسالت میں) ــــ یہ ایک ایسی کاوش ہے جو ابتدائی مسلم معاشرے کے بہت سے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب کے مؤلف پروفیسر اکرم ضیاء العمری (ولادت: موصل، ۱۹۴۲ء) نے جامعہ بغداد سے اسلامی تاریخ میں ایم۔ اے کی سند لی اور جامعہ عین الشمس قاہرہ سے ڈاکٹریٹ کی۔ وہ ایک طویل عرصے تک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تاریخ حدیث اور سیرت نبوی پڑھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخ اسلام کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، اور متعدد اہم متون کی تصحیح و تنقیح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی تالیفات میں بحوث فی السنۃ المشرفۃ، الرسالۃ والرسول، قیام المجتمع الاسلامی من المنظور الحضاری اور المجتمع المدنی فی عہد النبوۃ شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا ترجمہ پیش نظر ہے۔

پروفیسر اکرم ضیاء العمری نے زیر نظر کتاب میں واقعات سیرت کو محض دہرایا نہیں ہے، بلکہ تاریخ نگاری کا ایک منہج متعارف کرایا ہے۔ انھوں نے محدثین کے اختیار کردہ منہج کو تاریخی نقد ونظر کے جدید منہج کے ساتھ کامیابی سے یک جا کیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں اس معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو آقائے دو جہاںؐ اور صحابہ کرامؓ نے قائم کیا، اور یہ معاشرہ ابتداء سے آج تک ہر آنے والی نسل کے لیے دینی و دنیاوی ہر دو لحاظ سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے حصے میں ابھرتے ہوئے مسلمان معاشرے کے ساتھ ان طاقتوں کے روابط کا ذکر کیا گیا ہے جو اول الذکر کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں۔

پروفیسر اکرم ضیاء العمری کی منفرد اور ایک تاریخی منہج مقرر کر دینے والی اس کتاب کو مرحومہ عذرا نسیم فاروقی (نومبر ۱۹۵۶ء - ۱۴ اگست ۲۰۰۴ء) نے اردو میں منتقل کیا ہے۔

مرحومہ اسلامی علوم کی نہ صرف فاضلہ تھیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دین کا بے پناہ درد بھی دیا تھا۔ مرحومہ نے دینی پیغام کی ترسیل و اشاعت میں زبان و قلم سے خوب کام لیا۔ خواتین کے دینی و دعوتی اجتماعات کے انعقاد و انصرام، اور ان میں تقریر و درس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ترجمہ و تالیف کا قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کی دو مختصر تالیفات Purification of Soul اور The Quran Speaks to Us دعوۃ اکیڈمی۔ اسلام آباد نے شائع کی ہیں۔ الادب المفرد (تالیف امام محمد بن اسمٰعیل بخاری) کا انگریزی ترجمہ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تالیف The Muslim Conduct of State کا اردو ترجمہ اور تفسیر مواہب الرحمن کے بعض حصوں کی تسہیل بھی ان کی کاوشوں میں شامل ہیں۔ آخر الذکر تینوں کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔